بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہم سفر

ہم سفر

حمیدہ اختر حسین
(رائے پوری)

دانیال

اختر کے نام

ناشر : حوری نورانی

مکتبۂ دانیال، وکٹوریا چیمبر ۲
عبداللہ ہارون روڈ صدر، کراچی

طابع : ذکی سنز پرنٹرز، کراچی

چھٹی بار : ۲۰۰۸ء

سرورق : امیر ضیار

قیمت : ۳۵۰ روپے

Maktaba-e-Danyal: Victoria Chamber 2,
Opposite Jabees Hotel,
Abdullah Haroon Road, Karachi 74400
Phone : 5681457 5682036
e-mail: danyalbooks@hotmail.com

ترتیب

اختر حسین رائے پوری

اختر کے ماموں، حبیب الدین بیتر، سیکریٹری گورنر۔ پی

اختر کی نانی، بیگم بدرالدین بیتر جی۔ دختر نواب حشام الدین دیوان ریاست سکتی

اختر اور میں ۔ ۱۹۳۶ء دہلی

میں (حمیدہ اختر حسین) اور میرا خاندان

اختر حسین رائے پوری، میں، میرے بچے اور ملازمین

عدنان بے اور خالدہ ادیب خانم۔ پیرس ۱۹۳۸ء

اختر حسین رائے پوری

میری دوست منیر بانو
حیدرآباد (دکن) ۱۹۳۶ء

خالدہ ادیب خانم، میرے بیٹے کامران کو
گود میں لیے ہوئے پیرس ۱۹۳۸ء

دل کی بات

نصف صدی سے کچھ زیادہ ہی وقت، میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی "ہم سفر" رہی۔ ۲ جون ۱۹۹۲ء کو ایک ہفتے کی علالت کے بعد اپنی اس تاریک دنیا سے رشتہ توڑ کر بلند و بالا روشن مقام پر پہنچ گئے اور میں سکتے کے عالم میں اپنے تخت کے ایک کونے پر بیٹھی دنیا مافیہا سے بے خبر، سامنے اختر کی کرسی کی طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہتی۔

چند دن بعد اختر کے عزیز دوست جمیل جالبی صاحب اسلام آباد سے پرسے کے لئے میرے پاس آئے۔ ان کو دیکھتے ہی میرے آنسوؤں کا رکا ہوا طوفان بہہ نکلا۔ ہچکیاں بندھ گئیں۔ بار بار ان سے کہہ گئی "بھائی میرے! مجھے کچھ تو بتا دیں کہ جو ماضی کی فلمیں میرے دماغ میں کھل رہی ہیں جن کو میں سوتے جاگتے دیکھ رہی ہوں، ان کو کیسے روکوں؟

جمیل بھائی میرے بہتے آنسوؤں کو دیکھ کر گھبرا سے گئے ہوں گے۔ بڑی رندھی آواز سے بولے "بھابھی میرا ایک کام کر دیں گی؟" "ایک کام نہیں میں تو آپ کے دس کام کروں۔"

"تو پھر یہ کریں کہ جو بھی آپ سامنے چلتی ہوئی فلم پر دیکھ رہی ہیں، بس قلم پکڑ کر سلسلے وار اس کو کاغذ پر لکھتی جائیں اور بیان اس طرح کریں جیسے مجھے سنا رہی ہیں۔"

"بھائی میرے پاس کاغذ قلم ہی نہیں۔"

"کوئی بات نہیں میں اسلام آباد جا کر آپ کو قلم درجن بھر اور کچھ رجسٹر بھیج دوں گا۔ ایک رجسٹر ختم ہوتے ہی آپ وہ مجھے بھیج دیجئے گا۔ میں ایک نظر دیکھ کر آپ کو واپس کر دوں گا۔ جس کو آپ صہبا صاحب کو بھیج دیجئے گا تاکہ قسط وار وہ "افکار" میں چھپوانا شروع کر دیں۔ یوں لوگوں کی رائے بھی معلوم ہو جائے گی۔"

مجھے ان کے اس بھولپن پر ہنسی آ گئی کہ گویا ان کے بھیجے قلم کو پکڑ کر میں لکھ سکوں گی۔ جس نے آج تک ایک سطر بھی نہ لکھی ہو اور نہ ہی لکھنے کی جسارت کی ہو۔ چند دن بعد ڈاک سے ایک پارسل ملا، چند رجسٹر اور ۲ عدد قلم۔ اب کیا کروں؟ میں نے زندگی بھر جب بھی کسی سے وعدہ کیا تو نبھایا ضرور۔ مگر اس کو کیوں کر پورا کر سکتی ہوں۔ تخت کے کونے پر گم سم بیٹھی

ہوں اور سامنے نظر کے قلمیں چل رہی ہیں۔ گردن موڑو تو پاس رکھے رجسٹر اور قلم مجھے دہلاتے، مسکراتے محسوس ہوتے۔

چند دن اور گزر گئے۔ دوپہر کے وقت اپنے اندھیرے کمرے میں پلنگ پر آنکھ بھینچ کر لیٹ گئی۔ غنودگی طاری ہو گئی کسی نے میرے شانے پر آہستہ سے ہاتھ رکھ کر کہا "حمیدہ آپا" کون؟ "میں فہمیدہ ریاض" "فہمیدہ، بڑا اچھا ہوا تم آ گئیں۔ شائد تم مجھے بتا سکو کہ جس چکر میں مجھے جمیل جالبی صاحب نے ڈال دیا۔ باہر تخت پر چند پیڈ اور بارہ قلم رکھے ہوئے ہیں نا۔ میرے دماغ میں ہردم بیتے دنوں کی قلمیں جو کھلتی رہتی ہیں ان کو مجھ سے قلمبند کروانا چاہتے ہیں۔ میں ان سے وعدہ کر بیٹھی۔ پر میں یہ کیسے کروں۔"

"لیجئے میں آپ کو بتائے دیتی ہوں۔" تخت پر سے ایک رجسٹر اور قلم لا میرے پلنگ کے پاس قالین پر بیٹھ کر بولیں "ہاں تو آپ اب جو بھی قلم دیکھ رہی ہیں۔ با آواز بلند دیکھیں، میں شروع کرتی ہوں، آپ ختم کریجئے گا۔"

میں بولنے لگی اور وہ لکھنے لگیں۔ ایک پیراگراف لکھا۔ میں سو گئی اور وہ چلی گئیں۔ اٹھی تو تکیہ کے پاس رجسٹر اور قلم ملا۔ پڑھا تو میں حیران سی رہ گئی کہ یہ کیا ہوا؟ مجھے فہمیدہ ریاض کا وہ جملہ کچھ یاد سا آیا "میں شروع کرتی ہوں۔ آپ ختم کریجئے گا۔" تخت پر آ کر بیٹھ گئی۔ اور لکھنا شروع کر دیا۔ چند دن میں رجسٹر بھر گیا۔ ڈر کے مارے ورق پلٹ کر بھی نہ دیکھا کہ اگر پڑھا تو خود پھاڑ کر پھینک دوں گی۔ بھلا کبھی کسی ۷۲ سالہ بڑھیا نے کچھ لکھا ہو گا۔ جمیل جالبی بھائی نے لکھوایا ہے۔ کاغذ ان کا، قلم ان کا اب وہ خود ہی پھاڑیں اور ردی کی ٹوکری میں ڈالیں۔ ختم شدہ رجسٹر روانہ کروا دیا۔ چند دن بعد مجھے ان کا خط ملا۔

"بھابھی رجسٹر موصول ہوا۔ شکریہ۔ چند صفحے پڑھے۔ آپ کی زبان سبحان اللہ۔ کیسی ٹکسالی ہے۔ انداز بیان بھی ڈگر سے ہٹ کر اور بہت دلچسپ ہے۔ سب رجسٹر موصول ہونے پر ایک ساتھ پڑھوں گا۔ یقیناً اردو میں ایک خوبصورت کتاب کا اضافہ ہو گا۔"

سوچ میں پڑ گئی کہ یہ کیا لکھا کہ زبان ٹکسالی۔ یہ تو کوئی اچھی چیز نہیں ہوتی۔ میرے دماغ کے کونے کھدرے میں یہ تھا کہ ٹکسالی زبان کوچوں اور گلیوں کی بولی ہوتی ہے۔ خیر جو بھی ہو، میں تو اب لکھتی جاؤں گی کہ اس طور میرے دل کا بوجھ اور غم کا عالم کم ہو کر سکونی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ اپنے ماضی کے خوش کن لمحات اپنے چاروں طرف بکھرے محسوس کرتی۔ اختر کا قرب یوں لگتا کہ ہاتھ بڑھا کر چھو سکتی ہوں۔

اختر کے ساتھ گزاری زندگی میں زبان پر قفل تالا لگائے رہی کہ ان کا رعب مجھ پر ہمیشہ طاری رہا۔ اپنے کو کمتر اور ان کو اس قدر برتر گردانا کہ ہمیشہ سر اٹھا کر ہی دیکھا کی۔

اختر نے جب اپنی سوانح عمری "گرد راہ" لکھوا کر ختم کر لی اور میں نے اس کو پڑھا۔ دل چاہا کہ ان کی ان کہی کو جا بجا پر کروں۔ اور زندگی میں ہم دونوں کو جو بڑی عظیم ہستیاں ملیں ان کا تفصیل سے ذکر کر کے ان کی شفقت اور محبت کا قرض کچھ ادا کروں۔ مگر میری مجال نہ تھی۔ اب "گرد راہ" اور "ہم سفر" کو پڑھ کر لوگوں کے دلوں میں اختر حسین رائے پوری کے لئے اور بھی اونچا مقام ہو گا۔

اس طور جو میں بجائے حال کے اپنے ماضی میں جیتے لگی تھی تو بہت کچھ اختر اور اپنی فطرت کی خامیوں اور خوبیوں کو گہرائی میں جا کر سمجھ سکی۔ اب بات کی تہ تک پہنچی کہ آخر میں عمر بھر اختر کی ہر بات کیوں سنا کی اور ان کا اس قدر لحاظ اور ادب کیوں کرتی رہی؟

جس لڑکی کے براتی، دولہا اور بزرگوار مولوی عبدالحق اسٹیشن پر اترتے وقت یہ گا کر اعلان کر رہے ہوں۔

"لائق دولہا لائیں ہیں
جاہل لڑکی لے لیں گے"

شاید یوں اپنی جہالت کا احساس میرے دماغ میں بیٹھ گیا ہو اور ہمیشہ ان کی بات ماننا اور رعب میں مبتلا یوں رہی کہ ہمارے مولوی صاحب پہلے دن سے چپکے چپکے یہ بات کان میں ڈالتے رہتے "دیکھو اختر سے ڈر کر بچ کر رہنا، بڑا بگڑے دل ہے، اس کی ہر بات کو مان لیا کرنا ورنہ منہ اٹھا کر نہ جانے کدھر کو چل دے"

پچی میں سہم کر پوچھتی "تو کیا مجھے چھوڑ کر کہیں چلے جائیں گے؟" تو ہنس کر کہتے۔ "تم اپنے متعلق کبھی خوش فہمی میں مبتلا نہ ہونا۔ جو ہر رشتہ ناتا توڑ سکتا ہے، گھر بار چھوڑ سکتا ہے، نہ مڑ کر دیکھے نہ ذکر کرے نہ کرنے دے تو وہ کیا نہیں کر سکتا؟"

تو میں اب سمجھی کہ یہ مولوی صاحب کی دین تھی کہ میری فطرت یوں بدلی کہ اختر کے سامنے کچھ اور پیٹھ پیچھے اصل اپنی فطرت پر۔ یوں ہم دونوں کی زندگی بڑے مزوں سے گزری کہ ان کے مزاج کے خلاف کوئی بات نہ کی، تو ان کو کوئی موقع ہی نہ ملا کہ چڑی بدل کوئی اور رخ اختیار کر لیتے۔

جمیل بھائی کی میں بڑی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میرے انتہائی کرب ناک دنوں کو

گزارنے کے لئے ماضی کے خوش کن دور میں پہنچا دیا تھا۔ کبھی کبھی ہمارے مولوی صاحب اختر سے کہا کرتے۔ "بھئی اختر! تم جب بھی پشاور جانا تو اپنی بیوی کو بازار قصہ خوانی کے چوراہے پر بٹھا کر آواز لگانا "لوگوں آؤ آج ایک عورت قصہ خواں سے قصہ سن لو!"

جو اختر تو نہ کر سکے، مگر جمیل بھائی نے قصے دور دور تک سنوا دیئے۔ یوں یہ سب میرے ساتھ دفن ہو جانے سے بچ گیا۔

جب "افکار" میں "محفل یاراں" کے خطوط پڑھتی تو خود حیران رہ جاتی کہ آخر "ہم سفر" میں ایسی کون سی بات ہے جو لوگوں کو پسند آرہی ہے۔ میں تو اس نتیجہ پر پہنچی کہ کیونکہ ہر واقعہ سچا ہے۔ گو ٹکسالی زبان ہے۔ تغیت اور تصورات کا فقدان ہے۔ پر دل سے نکلی بات ہے۔ بابائے اردو اور اختر کی شخصیت کے چھپے ہوئے پہلوؤں کو اجاگر ہوتا دیکھ رہے ہیں 'اس لیے دلوں کو بھا رہا ہے۔

انسان کبھی کبھی ایک جملہ سے کیسا گرفتار بلا ہو جاتا ہے جیسے جمیل بھائی میرے آنسوؤں کے دریا کو بہتا دیکھ کر ہوئے ہیں کہ "ہم سفر" جیسے بچکانہ مسودہ کو پڑھنے کے لئے ایک سال لگا بیٹھے۔ نوک پلک سے درست کیا، گو نہ کوئی جملہ کاٹا اور نہ ہی بڑھایا مگر پھر بھی صفحات لال گلال ہو گئے۔ پر کیوں؟ وہ ایسے کہ پورے مسودہ میں نہ پیراگراف تھا' نہ فل اسٹاپ' نہ کاما۔ زیر زبر غائب' ہجوں کی ہزارہا غلطیاں!! ہمارے زمانے کے الفاظ اسکو۔ کنکو۔ انکو۔ ہمکو وغیرہ بدل کر اس کو' کس کو' ان کو' ہم کو وغیرہ ہو گئے ہیں۔ پھر آخری پروف بھی خود ہی پڑھنے کا ذمہ لیا۔ اختر کی آخری کتاب "گرد راہ" کا آخری پروف خود جمیل بھائی نے پڑھا تھا اور اب میری پہلی کتاب کا۔

اب یوں "ہم سفر" آپ کی نظروں کے سامنے ہے۔

حمیدہ اختر حسین
۸ اپریل ۱۹۹۵
کراچی

یہ کتاب

ایک ایسی خاتون خانہ کا تصور کیجیے جن کی عمر ستر برس سے زائد ہے اور جنھوں نے ساری زندگی امورِ خانہ داری کی نذر کر دی۔ ان کی زندگی کے دو ہی مقصد تھے۔ بچوں کی بہترین تربیت اور مصاف زندگی میں شوہر کی پروانہ وار رفاقت۔ ان دونوں مقاصد میں انھیں مثالی کامیابی حاصل ہوئی۔ بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اپنی اپنی دنیاؤں میں کھو گئے اور یگانۂ روزگار شوہر ادب اور زندگی کے میدانوں میں اپنے پیچھے کامیابیوں اور کامرانیوں کی داستانیں چھوڑ کر اس منزل کی طرف روانہ ہو گیا جو ہر انسان کا مقدر ہے۔ یہ خاتون جب ایک بھرپور زندگی گزار کر تنہا روی کے سفر کے دوران اپنے آپ سے ہم کلام ہوئیں تو انھوں نے محسوس کیا کہ وہ تنہا نہیں ہیں۔ یادوں کا ایک ہجوم ہے جو چراغوں کی صورت ان کے راستے کو روشن کر رہا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان سے کہا۔ "یہ جو باتیں آپ مجھ سے اور دوسروں سے کرتی ہیں ایسی نہیں ہیں کہ انھیں دو چار نیاز مندوں کی سماعت تک محدود رکھا جائے۔ انھیں آنے والی نسلوں کے لیے بھی محفوظ ہونا چاہیے۔"

"وہ کیسے؟" خاتون نے پوچھا۔

"اپنی تقریر کو تحریر کے قالب میں ڈھال دیجیے۔"

خاتون نے یہ سن کر قہقہہ لگایا اور کہا۔ "میں نے تو کبھی کچھ نہیں لکھا۔ اور اب اس عمر میں کیا لکھوں گی۔ میں ادیب تو ہوں نہیں جو آپ کے کہنے پر لکھنا شروع کر دوں۔ لکھنے کے لیے تو ایک ایک جملے پر سو سو بار سوچنا پڑتا ہے اور یہ میرے بس کی بات نہیں۔"

ڈاکٹر جمیل جالبی زندگی بھر کرم خوردہ مخطوطات سے ادیبوں کو برآمد کرتے رہے ہیں' مگر یہاں معاملہ ایک جیتی جاگتی خاتون کا تھا جن میں جالبی صاحب کی چشم جوہر شناس کو ایک طرح دار ادیبہ نظر آرہی تھی۔ انھوں نے خاتون کا جواب سن کر کہا۔ "میں کوئی ایسی فرمائش

نہیں کر رہا جس کی تعمیل آپ کے بس میں نہ ہو۔ میں صرف یہ عرض کر رہا ہوں کہ آپ جو کچھ زبان سے بیان کرتی ہیں، اسے اب زبانِ قلم سے بیان کر دیجیے۔ لکھتے وقت یہ تصور کیجیے کہ میں آپ کے سامنے بیٹھا ہوں اور آپ مجھ سے باتیں کر رہی ہیں۔"

یہ بات خاتون کے دل کو لگی اور انھوں نے زبانِ قلم سے ڈاکٹر جمیل جالبی سے باتیں کرنی شروع کر دیں۔ شروع شروع میں تو انھیں یہ کام عجیب سا لگا لیکن چند ہی صفحے لکھنے کے بعد انھوں نے محسوس کیا کہ وہ لکھ نہیں رہیں، گزری ہوئی زندگی کو از سرِ نو بسر کر رہی ہیں۔ بس پھر کیا تھا، انھیں اس کام میں مزہ آنے لگا۔ گزرے ہوئے خوبصورت لمحے دوبارہ مل جائیں تو اس سے بڑی نعمت اور کیا ہو سکتی ہے!

بیگم حمیدہ اختر حسین رائے پوری نے اپنے نامور شوہر کے ساتھ گزرے ہوئے لمحوں کی روداد کچھ اس طرح بیان کی ہے کہ یہ کتاب بیک وقت "گردِ راہ" کا تکملہ بھی بن گئی ہے اور مصنفہ کی آپ بیتی بھی۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے "گردِ راہ" اس زمانے میں لکھی جب ان کی بینائی جواب دے چکی تھی۔ خود لکھنے سے وہ معذور تھے، اس لیے پوری کتاب ان کے زبانی بیان کی تحریری تشکیل ہے۔ ظاہر ہے کہ خود لکھنے کی بجائے بول کر لکھوانے سے بہت فرق پڑ جاتا ہے۔ لکھوانے والا لکھنے والے کی زحمت کا خیال کر کے تفصیل کی بجائے اجمال سے کام لیتا ہے اور بعض حالات و واقعات کو چھوڑ بھی دیتا ہے۔ "ہم سفر" میں نہ صرف "گردِ راہ" کے اجمال کی تفصیل پائی جاتی ہے بلکہ بہت سے ایسے حالات و واقعات بھی ملتے ہیں جو "گردِ راہ" میں بیان ہونے سے رہ گئے تھے۔ ان میں سے بعض حالات و واقعات ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کو سمجھنے میں بڑی مدد دیتے ہیں جیسے ان کا ننھیالی خاندانی پس منظر یا ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کے وہ روشن پہلو جنھیں خود ڈاکٹر صاحب نے برینائے انکسار قابلِ ذکر نہ سمجھا۔

"ہم سفر" کے صفحات میں مصنفہ نے اپنی یادوں کے حوالے سے جو دنیا آباد کی ہے، وہ بظاہر ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے ساتھ گزرے ہوئے لمحوں کی روداد ہے، لیکن اس دنیا میں کئی اور دنیاؤں کی سیر بھی شامل ہے۔ خصوصاً کتاب کا وہ حصہ جو مصنفہ کے اپنے خاندانی پس منظر اور ان کے والد محترم ظفر عمر کے بارے میں ہے۔ ظفر عمر اپنے زمانے کے مقبول ترین ادیبوں میں سے تھے۔ ان کی کتابیں "نیلی چھتری" اور "لال کنور" وغیرہ پوری اردو دنیا

میں مقبول تھیں اور آج بھی ان کے پڑھنے اور پسند کرنے والے برِصغیر میں ہر جگہ موجود ہیں۔ "ہم سفر" میں ظفر عمر کو پہلی دفعہ قریب سے دیکھا اور دکھایا گیا ہے۔

اگر اس کتاب کو اہم شخصیات کا نگار خانہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ قائدِ اعظم، مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو، سروجنی نائیڈو، خالدہ ادیب خانم، قاضی عبدالغفار، ڈاکٹر محمد اشرف، ن۔ م۔ راشد اور دوسرے بہت سے مشاہیر سے ہم نہ صرف ملتے ہیں بلکہ ان میں سے بعض کو بہت قریب سے دیکھتے بھی ہیں اور ان کے بارے میں ہمیں بہت سی نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ حیرت بابائے اردو مولوی عبدالحق سے مل کر ہوتی ہے۔ مولوی صاحب کی شخصیت پر علم اور سنجیدگی کے جو دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں، انھیں ہٹا کر مصنفہ نے ہمیں ایک ایسے شخص سے ملوایا ہے جس کی خوش مزاجی اور زندہ دلی لڑکپن کی شوخیوں کو بھی مات کر دیتی ہے۔ یہ شخص اپنے سے چھوٹوں میں، انھیں کی سطح پر آ کر اور سن و سال کے فرق کو مٹا کر، اس طرح گھل مل جاتا ہے کہ علمی و تحقیقی کاموں میں مصروف رہنے والے مولوی عبدالحق سے بالکل مختلف دکھائی دیتا ہے۔ اس کتاب میں مولوی عبدالحق کی بڑی نادر تصویر نظر آتی ہے۔ کہیں وہ چہرہ بگاڑ کر بچوں کو ڈرا رہے ہیں، کہیں براتیوں کے ساتھ مل کر گانے گا رہے ہیں اور کہیں بیڈ منٹن، تاش اور پنجیی کھیل رہے ہیں۔ یہ کھلنڈرے مولوی عبدالحق اس کتاب کے سوا کسی دوسری جگہ دکھائی نہیں دیتے۔

یہ کتاب مروجہ کتابی زبان میں نہیں لکھی گئی۔ مصنفہ نے اپنی روزمرہ کی زبان میں گفتگو کی ہے۔ اسلوبِ بیان ایسا دلکش ہے کہ پڑھنے والا۔ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ کے طلسم میں اسیر ہو جاتا ہے اور اسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کوئی کتاب نہیں پڑھ رہا، مصنفہ کی زبان سے ان کی باتیں سن رہا ہے۔ سن ہی نہیں رہا، بیان کردہ واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس کتاب کا کچھ حصہ رسالہ "افکار" میں قسط وار شائع ہوا تو ادبی حلقوں میں اسے اردو میں اپنی نوعیت کی منفرد تحریر قرار دیا گیا۔ ایسی کتابیں کبھی کبھار ہی وجود میں آتی ہیں۔

مشفق خواجہ

زبانِ بے زبانی

صبا لکھنوی صاحب نے اختر حسین رائے پوری سے بڑے ہی جتن کر کے "گردِ راہ" اردو ادب کو ایک عظیم ادبی شہ پارہ دلوا کر ایک اہم کارنامہ سرانجام دیا۔

اختر "گردِ راہ" کے حرفِ آغاز میں لکھتے ہیں۔ "ستم ظریفی دیکھیے کہ جوانی میں پیری کی کہانی لکھنے بیٹھ گیا تھا اور اب قلم سے کہہ رہا ہوں کہ بیتے دنوں کی داستان مرقوم کر۔ معلوم نہیں یہ روٹھا ہوا دوست کس حد تک میرا ساتھ دیتا ہے۔ وہ اٹکتا ہے تو دلاسا دیتا ہوں کہ میرے حافظے کا ساتھ دے۔ البتہ خود فیصلہ کر کہ کیا کہنی ہے اور کیا ناگفتنی ہے۔"

ہمارے جمیل جالبی صاحب نے بارہ عدد قلم اور چار رجسٹر بھیج کر مجھ بہتر سالہ بڈھے سے خواہش ظاہر کی کہ اس پیری میں غم کے پہاڑ کو اٹھاتے ہوئے جوانی کی کہانی قلم بند کرنے بیٹھ جاؤں۔ بھلا میں آپ کے ان قلموں سے کیا کہہ سکتی ہوں کہ میرا ساتھ دو۔ میں نے تو زندگی بھر اپنا قلم پکڑا ہی نہ تھا۔ ہاں آپ کی فرمائش پر جوانی سے اب تک کی کہانی سنانے بیٹھ تو گئی۔ اب آپ کے قلم اگر اس کو قلمبند کرلیں تو یہ آپ کی کرامت ہوگی لیکن بعد میں آپ کو اگر شرمساری کا طوق زیرِ گلو کرنا پڑا تو اس کی ذمے داری آپ کی اپنی ہوگی۔

ہماری ملاقات اختر حسین رائے پوری سے ڈاکٹر کے ایم اشرف کے گھر ہوئی جو آل انڈیا کمیونسٹ پارٹی کے پہلے جنرل سکریٹری تھے۔ ڈاکٹر اشرف چوتھی کلاس سے میرے بھائی شوکت عمر کے ساتھ علی گڑھ میں پڑھ رہے تھے۔ ان کی پڑھائی کی ابتدا یوں ہوئی کہ جن صاحب کے بچے کے ساتھ کھیلنے اور ان صاحب کا حقہ بھرنے کے لیے ملازم رکھا گیا تھا، وہاں اشرف صاحب نے خود اپنی تعلیم کا آغاز کردیا۔ جب بچے کو پڑھایا جاتا تو اشرف صاحب کی یادداشت میں سب محفوظ ہو جاتا۔ راتوں کو چھپ کر وہ کتابوں کی نقل اپنی کاپی پر کیا کرتے اور اس طرح اپنی اتالیقی خود کرتے رہے۔ اس لڑکے کی ذہانت اور شوق کو دیکھ کر اشرف کو اسکول میں داخل کروا دیا گیا۔ میرے بھائی شوکت عمر یہاں سے ان کے ہم جماعت بنے۔ دوستی کا ایک ایسا بیج بویا گیا جس نے ایک تناور درخت کی شکل اختیار کرلی۔ جب اشرف صاحب کی کفالت کرنے والے صاحب کا تبادلہ ہونے لگا تو اشرف کے لیے مسئلہ پیدا ہوا کہ اب تو ان کو اپنے گاؤں متھرا ہی جانا پڑے گا اور تعلیم کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔ اب وہ اپنے دوست سے مشورہ کرتے ہیں کہ ان حالات میں آخر وہ اپنی تعلیم کو کیوں کر جاری رکھ سکتے ہیں۔ میرے بھائی نے اپنے دوست کو دلاسہ دیا اور کہا چند روز بعد وہ بتاسکیں گے کہ کیا کرنا چاہیے۔ شوکت عمر نے ابا کو خط لکھا۔ یہ پانچ چھ سطروں کا خط اب بھی میری یادداشت میں محفوظ ہے۔

شوکت عمر نے لکھا تھا۔ "ہماری اماں بچپن میں جو کہانیاں سناتی تھیں، ان میں سے ایک کہانی میں کوئی لڑکا کسی لڑکے کو بھائی بنا لیتا ہے اور ساری عمر اس کا ہاتھ پکڑے زندگی کی سیدھی سڑک پر چلتا چلا جاتا ہے۔ میں نے بھی کسی کا ہاتھ پکڑ کر اس کو اپنا بھائی بنا لیا تھا۔ اشرف نامی لڑکے کو اماں میرے توسط سے خوب جانتی ہیں۔ انھوں نے کئی بار فرمایا کہ گویا اللہ میاں نے ان کو چھٹا بیٹا دے دیا ہے۔ اب آپ کو صرف کرنا یہ ہے کہ میری بورڈنگ کی فیس کے ساتھ ساتھ اشرف کے اخراجات اور فیس کے روپے بھیج دیا کیجیے ورنہ ایک عظیم دماغ مشقت کے گرد و غبار کی تہوں میں ہمیشہ کے لیے دفن ہو جائے گا۔"

جواب دینے سے پہلے میرے والد نے اماں سے بات کی اور دونوں نے نادیدہ اشرف کو اپنا بیٹا بنا لیا۔ مظفر عمر صاحب نے بیٹے کو تار کے ذریعے "GO AHEAD" کے الفاظ کے ساتھ اشرف کی ذمے داری اٹھانے کی ہامی بھرلی۔ گرمی کی چھٹیوں میں اشرف صاحب، شوکت عمر کے ساتھ متھرا جانے سے پہلے ہمارے گھر آتے اس طرح ان کو ڈھیر سارے نئے بہن بھائی مل گئے۔

میٹرک تک یہ حال تھا کہ کلاس میں کبھی اشرف صاحب اول تو کبھی شوکت عمر۔ میٹرک میں دونوں نے پوزیشن حاصل کی۔ اشرف اول اور شوکت عمر دوئم آئے۔ کالج کے زمانے میں جو ہر سال الہ آباد میں آل انڈیا مباحثوں کا مقابلہ ہوتا تھا اس کی ٹرافی ہر

سال بھی شوکت عمر اور کبھی سال اشرف جیت کر پہلے ہمارے گھر آتے یعنی جہاں بھی والد کی تعیناتی ہوتی۔ پھر یہ ٹرافی علی گڑھ یونیورسٹی بھجوا دی جاتی تھی۔ ٹرافی ایک شیشے کے کیس میں قفل پہ مہر تھی۔ علم کی مورتی ایک اس کے اوپر اٹھی ہے۔ نیچے پانی میں ایک کھلا ہوا کنول کا پھول اس پر اس کا ایک پاؤں رکھا ہوا مسکرا رہی ہے۔ چاندی پر جہاں وہاں سونے کا پانی پھرا ہوا ہے۔ اس وقت میری نگاہوں کے سامنے ہے۔ بی اے میں اشرف نے اوّل پوزیشن اور شوکت عمر نے دوم پوزیشن حاصل کی۔

اب والد صاحب نے شوکت عمر کو بجلی کی انجینئرنگ پڑھنے کے لیے ولایت بھیجنے کا انتظام شروع کر دیا۔ وہ بار بار والد صاحب سے یہ اصرار کرنے لگے کہ ولایت جا کر آگے تعلیم حاصل کرنے کا حق پہلے تو اشرف کا ہے ان کا نہیں۔ جب دیکھا کہ والد صاحب سُنی ان سُنی کر رہے ہیں تو اتنا کہا کہ منہ بولا بیٹا بھلا کیسے اپنے بیٹے کی طرح آپ کو لگ سکتا ہے۔ ایسے لوگ اور ایسی دوستی بھلا اب کہاں نظر آ سکتی ہے۔ والد صاحب پر بیٹے کے اس جملے کا کچھ ایسا اثر ہوا کہ "فوراً" ہی فیصلہ ہوا کہ اشرف کو بھی باہر بھیجنا ہے تاکہ دونوں دوست ساتھ ساتھ رہ کر آگے کی تعلیم حاصل کریں۔ ریاست ریوا کے مہاراجہ اور بیگم بھوپال، والد کے بڑے قدر دانوں میں تھے۔ مجھے جہاں تک یاد پڑتا ہے مہاراجہ ریوا نے اسکالر شپ کی ہامی بھرلی۔ یہ دونوں دوست اور ان کے تیسرے دوست ذکاء اللہ خاں (جو ڈاکٹر رشید جہاں کے شوہر محمود الظفر کے کزن تھے) اکٹھے ولایت کے لیے روانہ ہوئے۔ ذکن بھی پانچویں جماعت سے میرے بھائی شوکت عمر کے ساتھ پڑھ رہے تھے۔ ذکن (ذکاء اللہ خاں) کا لڑکپن سے ہمارے گھر آنا جانا یوں تھا کہ ان کے والد ممتاز اللہ خاں صاحب والد کے عزیز دوستوں میں سے تھے۔ بڑے ہی روشن خیال تھے کہ اپنی دو بیٹیوں زہرہ اور عذرا کو اودے شنکر کے ساتھ کام کرنے کی اجازت خوشی خوشی دے دی کہ جب قدرت نے ان کو ناچ اور ایکٹنگ کے لیے صلاحیت دی ہے تو کیوں نہ استعمال کریں۔ جمیل بھائی! سوچیے تو آج سے ساٹھ سال پہلے مسلمان لڑکیوں کے لیے سرِعام اسٹیج پر آ کر ناچنا، اور ایکٹ کرنا کیا معنی رکھتا ہوگا۔ خاندان والوں اور دوستوں کی لعن طعن کی بوچھار ہی ان پر ہوئی مگر انھوں نے اس کی کوئی پروا نہ کی۔ بعد میں زہرہ کی شادی سہگل نامی ایک ہندو سے ہوئی اس طرح وہ زہرہ سہگل کے نام سے مشہور ہوئیں اور لندن میں بودوباش اختیار

کر کے وہاں اپنا ایک ڈانسنگ اسکول کھول لیا۔ لندن میں بہت سے اسٹیج کے ڈراموں اور فلموں میں بھی کام کیا اور اب دو سال سے دلی میں قیام پذیر ہیں، ایک اکیڈمی کی سربراہ ہیں۔ عذرا کی شادی حمید بٹ سے ہوئی اور وہ بمبئی میں رہنے لگیں۔ بہت سی فلموں میں کام بھی کیا۔ کہا ہے کہ ٹی وی میں ڈرامے کرتی رہیں، پھر پاکستان آ گئیں۔ [illegible] ہونے پر پنڈی سے لاہور میں رہائش اختیار کرلی ہے۔ اسی طرح اب تک تھیٹر اور ڈراموں میں حصہ لیا کرتی ہیں۔ چند ماہ قبل زہرہ سہگل تین ہفتے کے لیے پاکستان آئیں تو دونوں بہنوں نے اپنی بھتیجی ذارا ممتاز اور کامل ممتاز (جو ان کے بھتیجے ہیں) ان کی لڑکی ثمینہ ممتاز کے ساتھ مل کر ایک اسٹیج شو لاہور میں اور پھر کراچی میں کیا۔ اس طرح ایک ہی خاندان کی چار نسلیں ایک ساتھ اداکاری کر رہی تھیں "ایک تھی نانی" جس نے وہاں اور یہاں دیکھا ہے۔ وہ کچھ ایسا تھا کہ کبھی فراموش نہ کر سکیں گے۔

اشرف صاحب کے والد متھرا کے پاس ایک گاؤں میں رہتے تھے اور کھیتی باڑی کر کے کنبہ پال رہے تھے۔ جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ ان کا بیٹا ولایت پڑھنے کے لیے جا رہا ہے تو جانے کی اجازت اس شرط پر دی کہ وہ شادی کر کے جائیں ورنہ تو کوئی نہ کوئی میم ان کو دبوچ لے گی اور پھر وہ کبھی گاؤں واپس نہ آئیں گے۔ ولایت جانے کے شوق نے ہامی بھروائی اور کسی کسان کی لڑکی کے ساتھ ان کا بیاہ رچا دیا گیا۔

تینوں دوست شوکت، اشرف اور ذکاء اللہ ولایت پہنچ کر اپنی اپنی پڑھائیوں میں لگ گئے۔ اب شوکت عمر کو ایک یہ خیال آیا کہ غضب ہی تو ہو گیا، اشرف چار سال یہاں رہ کر جب گھر واپس جائیں گے تو اس بیچاری کلثوم کو جو جاہل مطلق ہے ان کا دل دماغ ایک ایسی لڑکی کو کیوں کر قبول کرے گا؟ بہت سوچ کر اس نتیجے پر پہنچے اور والدہ صاحب کو یہ خط لکھا۔

والدہ محترمہ۔ آداب

خدا کرے گھر پر سب بخیر ہوں۔ میری، اشرف اور ذکن کی پڑھائی اطمینان بخش ہے۔ پر میرے دل و دماغ کا سکون غائب ہے کہ میں نے ایک دوست اور بھائی بن کر اشرف کے ساتھ ظلم کر دیا۔ وہ یہ کہ جب وہ یہاں سے فارغ التحصیل ہو کر متھرا واپس اپنے گھر لوٹیں گے تو بیچاری کلثوم کو کس طور قبول کریں گے۔ میری امّاں! آپ میرے اور اشرف کی

خاطر یہ کریں کہ بہنوں کو اپنے ساتھ متھرا لے جائیں اور اشرف کے والد اور والدہ سے یوں بات کریں کہ کلثوم کا سسرال آپ کا گھر بھی ہے۔ آپ ان سے اجازت لیں کہ اس عرصے میں کلثوم علی گڑھ آپ کے پاس رہ کر اور سب لڑکیوں کے ساتھ کلثوم کی تعلیم اور تربیت کریں۔ مجھے امید کہ جس قدر ان دونوں کے دلوں میں آپ کا اور ابا کا احترام ہے وہ انکار نہ کریں گے۔ شاید ان کے دلوں میں بھی وہی پریشانی ہو جو میرے دل میں ہے۔ یوں کلثوم "نیلی چھتری" آ کر اور آپ کے سائے تلے رہ کر کچھ پڑھ لکھ جائیں گی اور نشست و برخاست کے طور طریقوں کو اس چار سال کے عرصے میں بہت کچھ سیکھ لیں گی۔

آپ کا بیٹا

شوکت" [1]

اس طور کلثوم بھابی ہمارے گھر آ گئیں۔ ہمارے تو کسی بھائی کی شادی نہ ہوئی تھی۔ ہم سب بہنوں اور اماں نے بڑے لاڈ کیے۔ صبح ماسٹر اور شام کو مولوی پڑھانے آتے۔ دن میں والدہ سلائی سکھاتیں۔ جب ہم لوگ اسکول سے واپس آ جاتے تو باری باری پڑھاتے اور لکھواتے۔ ان کا دماغ تھک سا جاتا، کبھی کبھی کاپی یا کتاب ہمارے منہ پر دے مارتیں کہ میرا پیچھا چھوڑ دو ورنہ کل سے کچھ نہ پڑھوں گی۔ قدرت نے ان کو ذرا کند ذہن دماغ دیا تھا۔ ہاں کھانا پکانا اور سلائی جلد سیکھ گئیں۔ گرمی کی چھٹیوں میں کلثوم متھرا پہنچا دی جاتیں اور ہم سب والد کے پاس جس جگہ بھی ان کی تعیناتی ہوتی چلے جاتے۔

وقت ہوا کے گھوڑے پر بھاگتا چلا گیا اور دیکھتے دیکھتے چار سال گزر گئے۔ اللہ کا کرنا دیکھیے کہ تینوں دوستوں کو اپنی پہلی ملازمت علی گڑھ یونیورسٹی میں ملی۔ شوکت عمر بجلی کے اور ذکاء اللہ خاں سول انجینئر کالج میں لگے اور اشرف بھائی ہسٹری کے لیکچرار ہو گئے۔

"نیلی چھتری" (والد نے اپنے پہلے جاسوسی ناول کے نام پر گھر کا نام رکھا تھا) کوٹھی کے ساتھ کئی ایکڑ زمین تھی جس پر پھلوں اور سبزیوں کے باغ۔ ایک کالج کافی سال پہلے اس پر بنوائی تھی۔ جس میں ریاضی کے پروفیسر بھٹاچاریہ صاحب کرائے پر رہ رہے تھے۔ جب

[1] والد صاحب کی عادت تھی کہ اپنے بچوں کے خطوں کی فائل بنا کر رکھتے تھے۔ اس طرح بہت سے خطوط عرصہ دراز کے بعد مجھے پڑھنے کو ملے

ان کو کالج خالی کرنے کو کہا تو ان کا جواب یہ تھا۔ "آپ اپنی کوٹھی خالی کر دیں۔ آپ کوئی کرایہ بھی نہیں دیتے، میں کرایہ دیتا ہوں۔ ہرگز خالی نہیں کروں گا۔" اس [illegible] ہو گئے اور ایک نئی کالج بیٹے کے واپس آنے سے پہلے ہوا اس کو [illegible] گیا۔ ان کو یقین کامل تھا کہ پہلی ملازمت بیٹے کو علی گڑھ ہی میں ملے گی۔ بھائی جان کی خوشی کی حد نہ تھی کہ والدین نے کس پیار سے ان کے لیے کالج بنوا کر دی ہے۔ کپڑے اور کتابیں کالج میں اور خود "نیلی چھتری" میں کالج سے واپسی کے بعد کا وقت والد صاحب اور ان کے دوستوں میں گزارتے۔ جب اماں کے پاس زنان خانے میں آتے تو پاس بیٹھ کر ولایت کے قصے سناتے۔ ہم چھوٹی بہنیں اور بھائی لوگ ان کو ایک ہیرو کی طرح دیکھتے۔ ڈرتے بھی تھے اور بے انتہا چاہتے بھی تھے اور جب والد صاحب اپنی پوسٹنگ پر چلے گئے تو ہم سب بہت خوش ہوئے کہ اب بھائی جان زیادہ وقت اندر ہم سب کے ساتھ گزارا کریں گے۔

اس طرح ایک ماہ ان کو ملازمت کرتے گزر گیا۔ اپنی پہلی تنخواہ اماں کے ہاتھ میں لا کر دی۔ انھوں نے اس میں خود پچاس روپے رکھ کر پھر بیٹے کے ہاتھ میں دے دی اور دس روپے کا نوٹ ان کے سر سے گھما کر صدقہ اتارا۔ ہمیں یہ تماشا دیکھنے میں پہلی بار آیا تھا۔ پھر وہ ہم سب کو باری باری بلا کر دس دس روپے دینے لگے۔ ہم سوچ رہے تھے کہ اتنے ڈھیروں روپیوں سے ہم کیا کریں گے؟ اماں ایک بار بول پڑیں۔ "شوکت مجھے تو تمہارے چہرے پر کچھ اداسی اور پریشانی نظر آ رہی ہے۔ آخر بات کیا ہے؟ اب لالا کیا کہتا ہے۔"

"کل اشرف اور ذکی نے مل کر ایک گھر "امیر محل" کرائے پر لیا ہے۔ جب گھر آیا تھا تو پہلے ان دونوں کے ساتھ گیا۔ صرف تین ان کی کتابیں اور چند برتن۔ مجھے شرم سی آئی اپنے کالج کے خیال پر۔ اماں کیا آپ اپنے دوسرے بیٹے کے گھر کے لیے کچھ نہ کریں گی۔" "مگر وہ دونوں تو ہوسٹل میں کمرے لے کر رہ رہے تھے۔" ---- "اماں میری آپ نے یہ کیوں نہ سوچا کہ کلثوم کب تک گاؤں میں رہیں گی۔" اماں نے کہا۔ "تو تم جو مناسب سمجھو ان کی ضرورت کا سامان بھجوا دو۔"

دوسرے دن بھابی کلثوم متھرا سے آ گئیں۔ "امیر محل" "نیلی چھتری" سے بس ایک فرلانگ پر تھی۔ بھائی جان سامان بھجوا کر ہم تین بہنوں کو ساتھ لے کر "امیر محل" گئے۔

بھابی کلثوم کو ہم نے اپنے ساتھ لگا کر خاصے قاعدے سے بیٹھنے کا کمرہ' کھانے کا کمرہ اور
پلنگ وغیرہ کمرے میں سجائے۔ باورچی خانے میں پتیلیاں برتن وغیرہ رکھے۔ اشرف بھائی
انتہائی خوش مزاج انسان تھے۔ برابر ہم سے لڑتے جھگڑتے رہے کہ یہ چیز کہاں ہے اور وہ
شے کدھر ہے۔ ساتھ ساتھ کہتے جاتے کہ میری بہنیں کس قدر بے ڈھنگی ہیں وغیرہ وغیرہ'
کو ہم برابر کہے جاتے ارے بابا! صبر تو کریں کچھ کل پر بھی تو چھوڑا جاسکتا ہے۔ ڈکن
خاموش طبع ضرور تھے پر جب اور جو بھی بولتے روکھا سا منہ بنا کر بڑی مزے دار بات
کرتے۔ بھابی کلثوم پکار پکار کے جاتیں شوکت بھائی سب کھانا کھا کر جائیں گے مگر بغیر اماں
کی اجازت کے وہ ایسا کیسے کرسکتے تھے اور پھر ہم سب گھر آگئے۔

ان دنوں لڑکیوں کا آنا جانا دوسرے گھروں میں صرف مولود شریف یا کسی شادی پر
والدہ کے ساتھ ہوتا تھا۔ بھابی کلثوم اکثر "نیلی چھتری" آجایا کرتیں۔ بے حد خوش کہ
کوٹھی میں رہتی ہیں۔ شوہر ولایت پلٹ ہے اور پروفیسر ہے۔ انہوں نے اشرف بھائی کو
لکچرار سے پروفیسر بنا دیا تھا' لیکن بیچاری کے ایک بات سمجھ میں نہ آئی تھی کہ ڈاکٹر ہو کر
کسی کا علاج کرنا کیوں نہیں جانتے۔ بہت سمجھانے کی کوشش کرتے کہ کچھ ڈاکٹر ایسے بھی
ہوتے ہیں جو پڑھا کر دماغوں کا علاج کرتے ہیں تو وہ سہم سی جاتیں کہ کیا اشرف یونیورسٹی
میں پاگلوں کا علاج کرتے ہیں یا پھر ان کو پڑھاتے ہیں۔

"امیر منزل" کی بناوٹ کچھ یوں تھی کہ پہلے آپ دس سیڑھیاں چڑھیں تو چوڑا سا
برآمدہ' اس کے ایک سرے پر ایک چھوٹا سا بیڈ روم اور غسلخانہ' برآمدے کے دوسرے
سرے پر باورچی خانہ۔ اندر دو بیڈ روم' باتھ روم اور بیٹھنے کا خوب بڑا سا ہال۔ پھر ساتھ
ہی بڑا سا کھانے کا کمرہ اور کوٹھی کے سامنے بڑا سا باغ۔

ہمارے والد نے نہ کبھی اماں سے پردہ کرایا اور نہ ہی کسی لڑکی کو پردے میں رکھا۔ جو
بھی گھر پر ابا کے دوست آتے' ہماری اماں ان کے ساتھ بیٹھتیں اور ہر قسم کی بات چیت
میں حصہ بھی لیتیں۔ ہم لڑکیوں کو اجازت تھی کہ ان کے سامنے آئیں' آداب کریں
مہمانوں کی خاطر مدارات کرکے خاموشی سے واپس چلے جائیں۔ خاندان کے بہت سے
لوگوں کو اس پر اعتراض ہوتا مگر ہمارے والدین نے کبھی برا نہ مانا۔ صرف مسکرا دیتے'
کہتے تعلیم کا یہ بھی ایک بڑا حصہ ہے۔

بھائی جان ہمیں "امیر منزل" لے جاتے۔ ہم بیٹھنے کے کمرے میں جمع ہوتے۔ ہم بھابی
کلثوم کے پاس رہتے۔ جب کچھ اور دوست بھی آجاتے تو گرما گرم بحثوں کی آوازیں ہم
سنا کرتے۔ ایک دن بھابی کلثوم کی زبانی معلوم ہوا کہ برآمدے والے کمرے میں کسی اور کو
مہمان کے طور پر یوں رکھنا پڑا کہ اشرف اور ڈکن کی تنخواہ کرائے اور گھر کے اخراجات
کے لیے ناکافی ہوتی ہے۔

ہم گرلس کالج کی بس پر اسکول آیا جایا کرتے تھے۔ ہمارے لڑکپن میں ایسا دستور تھا
کہ لڑکیاں جو ہاتھ لگ جائے اس کو پڑھیں۔ بیشتر والدین کی نظر رہتی کہ کون سا رسالہ
اور کون سی کتاب پڑھنے کو دی جائے۔ کبھی کبھی جاڑوں کی سہ پہر اپنے شاہد اور اقبال
بھائی کے کمرے سے کوئی رسالہ' کبھی کوئی ناول چپکے سے لے آتیں مگر صرف دن بھر کے
لیے۔ ہم چند سہیلیاں مزے لے لے کے پڑھتے اور پھر وہ گھر جاتے وقت اپنے ساتھ لے
جاکر اس کو وہیں رکھ دیتیں۔ ایک بار وہ رسالہ "نگار" (جو محض مردوں کے پڑھنے کے
لیے سمجھا جاتا تھا) لے آئیں اس میں ایک افسانہ "زبان بے زبانی" تھا۔ اس کو ایک
نہیں دو تین بار پڑھا۔ یہ افسانہ ڈگر سے ہٹ کر تھا اور ایسا محسوس ہوا کہ لکھنے والے نے
اپنی تمام تر دل کی گہرائیوں کے ساتھ خون جگر سے لکھا ہے۔ اس کی اپنی زندگی تنہائیوں
میں گزری ہے۔ محبت اور خوشیوں کی محرومیوں سے لبالب بھری ہوئی ہے۔ وہ کہنا چاہتا
ہے پر کوئی سننے والا نہیں۔ محبت کا بوجھ کاندھے پر بڑھتا جاتا ہے۔ میں یہ نہیں کہہ
سکتی کہ میری دوست سعیدہ ایوب اور صفیہ نے بھی ایسا سوچا تھا یا نہیں مگر دونوں کو بے
حد پسند ضرور آیا۔ یہ خیال ہم تینوں کے دلوں میں پکا ہو گیا کہ کاش یہ رسالہ ہمارا اپنا
ہوتا تو کئی بار اور پڑھتے یا پھر اس کے لکھنے والے کا کوئی اور افسانہ ہاتھ لگ جاتا۔ میری
خوشیوں سے بھرپور زندگی چونکہ سکون اور چین سے گزر رہی تھی شاید اسی وجہ سے مجھے
شدت سے "ایک انسان کا" برگد کے پیڑ کی طرح تن تنہا ہو کر اطراف کی چہل پہل اور
لوگوں کی خوشیوں کو حسرت سے دیکھنا اور سوچنا۔ بار بار یوں سوچنے پر مجبور کر رہا تھا کہ
ایسے لوگوں کی زندگی میں جو بھی ہمدردی اور محبت کی رنگ آمیزی کرے گا تو وہ صرف
اس کے لیے نہیں بلکہ خود اپنی ذات کے لیے خوشیاں بٹورے گی۔ کاش کچھ اور بھی اس
شخص کا لکھا ہوا افسانہ ہاتھ لگ جائے۔ کاش "نگار" کا یہ پرچہ پھر سے مل جائے۔ کیا خبر

تھی یہ افسانہ میری اپنی زندگی کو یوں موڑ کر رکھ دے گا کہ اسی برگد کے نیچے ساری
زندگی گزار دوں گی۔ یہ تناور اونچا پیڑ ہمیشہ اور اونچا اور گھنا ہوتا رہے گا اور میں اس کو
گردن اٹھا کر اس زینہ پر کھڑی دیکھا کروں گی۔ اس کی گھنیری چھاؤں' پت جھڑ' موسم گرما
اور شدت کا جاڑا مجھے سب ہی عزیز رہیں گے۔ گویا میں ایک امر بیل بن جاؤں گی جس
سے چھٹکارا صرف "موت" کے ذریعے ممکن ہوگا۔

ادھر بھائی کلثوم کا یہ بتانا کہ "جانے کس خوشی میں لڑکے کو اپنے گھر کا کمرہ دے دیا
ہے۔ ذکی' اشرف اور شوکت کہاں' پروفیسر اور انجینئر اور کہاں یہ کالج میں پڑھنے والا
لڑکا۔ عمر اور رتبے کا اتنا فرق مگر اس سے چپکے ڈرتے ہوں۔ وہ بولتا تو بولتا چلا جاتا' بحثیں
کرتا اور غضب تو یہ سب مل کر اس کی باتیں سنتے رہتے۔ یہ تینوں تو ولایت کے پڑھے
ہوئے تھے مگر مجال ہے کہ کسی کو گردانتے ہوں۔ یہ لڑکا بڑا لکھنے والا ہے۔ مجھے تو وہ کچھ
خبطی لگتا ہے۔ اپنا کمرہ بند کرکے قینچی سے اخباروں کو کاٹا کرتا' پھر تالا لگا کر کمرے سے نکل
جاتا۔ یوں کمرے کی صفائی کا سوال ہی نہیں تھا۔ ایک دن تالا کھلا رہ گیا اور میں نے
جمعدار سے کمرہ جھڑوا کر اخباروں کے کٹے پٹے تمام کاغذ پھکوا دیے۔ نہ پوچھو کیسا شیر کی
طرح غراتا پھرا کہ کون میرے کمرے میں آیا اور کس نے میرے کاغذ پھینکے۔ کدھر ہیں وہ
سب اخبار؟ مجھے بھی پھر غصہ آگیا اور صاف صاف کہہ دیا' اب آپ اگر کوڑا کچرا بھی جمع
کرتے رہے تو میں ہرگز کمرے کی صفائی کروانے کی نہیں اور آپ بھی میرے پکائے
ہوئے کھانے میں سو سو طرح کی برائیاں گنوانی نہ شروع کریں۔ میرا کلیجہ پک گیا سن سن کر'
کہ یہ سالن ایسا ہے۔ بھجی ویسی ہے۔ مرچ کم ہے' نمک زیادہ ہے۔" کبھی یہ کہ "اس
لڑکے کی قلمیں جیسے انگلی لمبی' ذرا ابھرے سر کے بال' موٹے ہونٹ علی گڑھ میں میاں صاحب
پڑھتے ہیں مگر شیروانی نہیں پہنتے۔ روز دو آنے فائن کے بھرتے ہیں۔ بڑے نواب کا بچہ
بنتے ہیں۔ یہ تینوں جو ولایت میں چار سال رہے اور ڈگریاں لیں' سیدھے سادے کپڑے
پہنتے ہیں اور ان حضرت کی قمیض جانے کس طرح کی ہے۔ چوکا چپٹا کالر' ایک کالی ڈوری
چاروں طرف بندھی' ایسے ہی آستینوں کے کف ہیں۔

بھائی کلثوم کو جیسے اس لڑکے سے چڑھ اور نفرت سی تھی۔ ایک دن میں پوچھ بیٹھی۔
بھائی اس لڑکے کا آخر کوئی نام بھی تو ہوگا؟ آپ ہمیشہ "وہ لڑکا" کیوں کہتی ہیں؟" تو یہ تو

جیسا خود ہے ویسا نام بھی اختر ان پوری۔ میں تو کہوں کہ وہ چوری بھی اپنے نام کے ساتھ
ناک سے تو زیادہ بہتر ہو۔" ہم سب ہنس پڑے مگر مجھے "وہ لڑکا" دیکھنے کی خواہش ضرور
ہوگئی اور یکایک دماغ میں ایک خیال گزرا کہ کہیں اختر حسین رائے پوری کو تو یہ ان
پوری نہیں سمجھ بیٹھی ہیں۔ پوچھا بھائی ذرا سوچ کر بتائیں کہ اختر رائے پوری تو نام نہیں؟
کچھ دیر چپ رہ کر بولیں۔ "ہاں ہاں' شاید یہی نام ہے۔" ہم بہت خوش ہوئے کہ اب
بھائی کے ذریعے "نگار" کا پرچہ حاصل کرلیں گے۔ جب ان کو سمجھانے کی کوشش کی یہ تو
ایک بڑا لکھنے والا ہے' ہم کو ان سے "نگار" رسالہ مانگ کر دلوا دیں تو صاف انکار
کردیا۔ "میں تو اس سر پھرے کے منہ نہیں لگوں گی۔ میں نے دل میں سوچ لیا کہ اگر کبھی
ان صاحب سے آمنا سامنا ہوگیا تو جھٹ سے فرمائش کردیں گے اور شاید کچھ اور مضمون
بھی پڑھنے کو مل جائیں۔

ایک دن شوکت بھائی کے ساتھ جو آئی تو وہ لپکتے ہوئے آٹھ سیڑھیاں چڑھ گئے۔ میں
بیچ چنبیلی کی بیل سے جو ان صاحب کے کمرے کی کھڑکی کو ڈھانپتی ہوئی اوپر چھت پر چڑھ
گئی تھی' پھولوں سے لدی ہوئی تھی' کچھ پھول توڑنے رک گئی۔ جب مٹھی بھر پھول توڑ
کر پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تو برآمدے سے "وہ لڑکا" نیچے اتر رہا تھا۔ حیرت اور غور سے
سر اٹھا کر دیکھنے لگی کہ ہاں سچ تو ہے بکھرا ابھرا بال' لمبی قلمیں' موٹے موٹے ہونٹ' رومی
کٹ کی قمیض' بے ساختہ ہنسی آنے لگی۔ وہ مجھے یوں گھورتا اور حیرت زدہ محسوس کرکے
آہستہ آہستہ رک رک کر نیچے اترنے لگا۔ جب ایک سیڑھی درمیان میں رہ گئی تو میں نے
ہمت کرکے کہا۔ "مہربانی کرکے مجھے "نگار" کا وہ پرچہ دے دیجیے جس میں آپ کا افسانہ
"زبان بے زبانی" چھپا ہے۔ اختر کے ہنسنے میں موٹے ہونٹ اور بھی موٹے لگنے لگے۔ یہ
کہتے ہوئے آخری سیڑھی اترے۔ "خوب رہی پہلے ہمارے پھول چوری چوری توڑے'
اب دیدہ دلیری سے "نگار" مانگ رہی ہیں!" یہ کہا اور یہ جا وہ جا۔ بڑی خفت ہوئی اور کچھ
غصہ بھی آیا۔ سوچا کلثوم بھائی ٹھیک ہی تو کہتی ہیں لیکن کچھ ضد سی بھی آگئی کہ ضرور ان
سے رسالہ وصول کرنا ہے۔ صفیہ سے شرط ہارنا نہیں۔ واپسی پر دو لائنیں لکھ کر دروازہ
کے نیچے کھسکا کر آگئی کہ "مہربانی کرکے رسالہ دے دیجیے۔ دو دن بعد واپس کردوں گی۔"
کئی روز ہمارا تو وہاں جانا نہ ہوا اور بھائی کلثوم بھی نہ آئیں۔ پھر ایک دن جو وہ آئیں تو

نگار کا پرچہ ہاتھ میں لیے ہوئے' یہ کہہ کر دیا۔ "اس لڑکے نے پڑھنے کے لیے بھیجا ہے۔" بیچاری بھابی نے اس کو کھول کر دیکھا بھی نہیں۔ اس میں اپنے افسانے کے اوپر ایک پرچہ لکھ کر پن سے اٹکا دیا تھا۔ "آپ کی ہمت اور جسارت داد طلب تھی ورنہ ایک ہندوستانی مسلمان لڑکی کسی غیر مردوئے سے بات کرے اور کوئی شے مانگے۔ میں نے اب تک ایسا نہ دیکھا۔ واپس نہ کیا تو جرمانہ لینا ہم خوب جانتے ہیں۔ آپ کی جسارت اور خوش مزاجی کی داد دیے بنا رہا نہ گیا۔ اس لیے مجبوراً" رسالہ پیش خدمت ہے۔" لکھائی کچھ ایسی جیسے ہندی کی بہن یا بھائی ہو۔ مشکل سے پڑھی گئی۔ دل ہی دل میں اپنی فتح پر اترائی اور خوش ہوئی۔ یہ خبر نہ تھی کہ زندگی بھر ان صاحب کی فتح ہوتی رہے گی اور میں تاحیات جرمانے بھرتی رہوں گی۔

اگلے روز صفیہ اور سعدیہ کو دور سے رسالہ دکھایا اور جب تک صفیہ سے دو روپے شرط کے وصول نہ کر لیے ان کو نہ دیا۔ اس افسانے کو بار بار پڑھا ہی نہیں بلکہ باری باری نقل بھی کر لیا۔ پھر ہم تینوں سے نقل لے کر اور بھی بہت سی لڑکیوں نے اس کی نقل اتار لی۔ اب ان دونوں کا حکم کہ جواب لکھ کر نیچے لگا کر واپس کرو گی۔ میرا انکار اور ان کا اِصرار اور زبردستی۔ آخر کار ڈرتے ڈرتے رضامند ہو گئی اور چند سطری جواب جس پر تینوں نے اِتفاق کیا۔ "بندی حضور کی خدمت میں شکریہ پیش کرکے امیدوار رہے گی کہ گاہے گاہے ہم کو ہر وہ رسالہ جس میں آپ کا افسانہ شائع ہو عنایت فرماتے رہیں گے۔ شکریے کے ساتھ آپ کی امانت اس دعا کے ساتھ واپس کر رہی ہوں۔ "اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔"

—○—

قارئین کرام جو فٹ نوٹ شائع ہونے سے رہ گئے ہیں وہ تمام فٹ نوٹ کتاب کے آخری صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔

مشاعرہ

جمیل بھائی آپ نے بڑا غضب کیا کہ درجن بھر قلم بھیج کر اصرار کیا کہ جو کچھ سوچ رہی ہوں بس اس کو قلم بند کرتی جاؤں۔ قدرت کی ستم ظریفی کہ اختر اپنی جوانی میں بوڑھے برگد کی کہانی لکھ گئے اور میں غم سے چور بڑھاپے میں جوانی کی کہانی سناؤں۔ آپ نے نصف صدی سے زیادہ مجھے پیچھے دھکیل دیا ہے۔ آپ کے قلم ضرور ہیں پر ہاتھ تو نہیں۔ کہاں آپ اور کہاں میں؟ ایک زنگ خوردہ گاڑی جس کے کچھ کل پُرزے جراحوں کے ہاتھوں کاٹا چھنی کی نذر ہو گئے باقی کل پرزے زنگ خوردہ! اب آپ کا ایسی گاڑی سے تقاضا ہے کہ "چلا چل مسافر چلا چل"

آج پورا ایک ماہ اختر کو اپنے آخری سفر پر گئے ہو گیا۔ وہ ہزاروں بار سفر پر گئے اور ہنستے ہوئے واپس آئے۔ پچاسوں سفر مجھے ساتھ لے کر کیے۔ میں نے اکثر ان سے پوچھا کہ پہلے خط کے پُرزے میں آپ نے مجھے دھمکی دی تھی کہ جرمانہ وصول کرنا میں خوب جانتا ہوں پر وہ کبھی وصول نہیں کیا۔ یا مجھے خبر نہ ہوئی۔ ہنستے اور کہتے "میں بھولنے والا بشر نہیں۔ جرمانہ وصول ضرور کروں گا اور صرف ایک ہی بار جس کو آپ تاحیات یاد رکھیں گی۔" آج یوں لگ رہا ہے کہ جیسے ان کو یقین رہا ہو کہ وہ اپنے آخری سفر پر پہلے روانہ ہو کر مجھ بدنصیب سے باقی کی زندگی جرمانہ وصول کرتے رہیں گے۔

ہاں تو پھر گاڑی کو دھکے دے کر آگے چلانے کی کوشش کرتی ہوں۔ کیا سوچ رہی تھی؟ اسی زمانے میں اختر' سبط حَسن کو "امیر منزل" لانے لگے اور بھائی شوکت سے ان کی ملاقات ہو گئی۔ وہ سبطِ حسن کو ہمارے گھر بھی لے کر آئے اور اماں ابا اور ہم سب کی ان سے ملاقات ہو گئی۔ ان ہی دنوں "امیر منزل" کے اشتراکی گروپ میں ایک اور نوجوان شامل ہو گیا۔ شرف اطہر علی' یہ والد صاحب کے دوست کے بیٹے تھے۔

اکثر "امیر منزل" جانے پر جیسے کوئی دَھم سے کمرے سے کود نکلتا۔ کبھی "ساقی" کبھی

"نگار" کا پرچہ ہاتھ میں تھما کرے میں پھر غڑپ ہو جاتے۔ نیا کوئی افسانہ اس میں ہوتا اور کبھی کبھی ہندی کا رسالہ دے دیا جاتا۔ دو چار لائنیں بطور نوٹ اس تاکید کے ساتھ کہ واپسی شرط ہے۔ "محمل نا تمام" "میری ڈائری کے چند اوراق" پڑھ کر میرے دل میں بڑی سی کسک اٹھی کہ یہ شخص جو بظاہر بڑی اکڑفوں کرتا ہے۔ اندر سے کتنا تنہا ہے۔ کیا اس کا کوئی نہیں؟ کیا اس کو سمجھنے والی کوئی بھی مل جائے گی۔ پر خدا کرے ایسی ہو جو اس کو سمجھ سکے۔ "میرا بچپن" اس کی نگاہ میں رہے۔

ادھر "اوڑی" (یہ شمالی یوپی میں ہمالیہ کی ترائی کے نزدیک ہے) جہاں ان دنوں والد صاحب کی پوسٹنگ تھی' اماں کے نام تار آیا کہ وہ بیمار ہیں' کچھ عرصے کو آجائیں۔ کلثوم "نیلی چھتری" آکر رہ لیں' شوکت تو موجود ہی ہیں۔

اماں کی پابندیوں سے زیادہ بھابھی کلثوم ہم پر پابندیاں عائد کرتیں۔ نہ خود اپنے گھر جاتیں' نہ ہم وہاں جا سکتے تھے۔ ہاں یہ بتانا تو بھول گئی کہ شوکت عمر کی شادی میرے ماموں (خان بہادر سید حامد حسین) کی بیٹی اور جنرل شاہد حامد کی بہن جمیلہ سے ہو چکی تھی۔ بھابھی جمیلہ بڑی آزاد خیال اور روشن دماغ تھیں۔ سیاست' اشتراکیت اور سوشلزم پر بے دھڑک گروپ میں بیٹھ کر باتیں کرتیں۔ پارٹی کی سرگرم رکن بھی تھیں۔ ڈاکٹر رشید جہاں سے گہری دوستی کی شاید یہی وجہ ہو۔ اشرف کے چھوٹے بھائی کے ایم حیدر کو ٹی بی ہو چکی تھی۔ وہ شوکت بھائی کے گھر آکر رہ رہے تھے۔ ان کی دیکھ ریکھ' غذا اور علاج کا تن من دھن سے خیال رکھتیں۔ حیدر آٹھ سال میرے بھائی کے گھر رہے۔ علی گڑھ سے رڑکی اور وہاں سے امرتسر ان کے ساتھ ساتھ گئے ان سب کا اڈا بھی "امیر منزل" اور بھی بھائی جان کی کاٹیج پر جمتا۔ اکثر باتوں باتوں میں "اس لڑکے" یعنی اختر کی شعلہ کلامی' ہٹ دھرمی اور روشن دماغی پر جب وہ بھائی جان سے تبصرے کرتیں تو ہم کان لگا کر سمجھنے کی کوشش کرتے مگر سب سر سے گزر جاتا۔

ان ہی دنوں یونیورسٹی کے ہال میں ایک مشاعرہ ہوا۔ جوش ملیح آبادی' جگر مراد آبادی' ساغر نظامی' مجاز اور جانے کون کون شاعر آئے۔ ہم بہنیں تڑپ اٹھیں کہ کاش ہمیں بھی جانے کی اجازت ہوتی۔ بھابھی جمیلہ ایک نڈر اور بے باک شخصیت کی مالک تھیں۔ دل میں کچھ ٹھان کر ہم کو تسلی دی کہ وہ یہاں "نیلی چھتری" میں ایک مشاعرہ کرا دیں گی۔

ہماری سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ اماں یہاں ہیں نہیں' بغیر ان کی اجازت یہ کیسے ممکن ہے۔ مشاعرے سے آکر خوشی خوشی ہم کو یہ خوشخبری دی کہ انہوں نے شوکت بھائی کو راضی کر کے چند شاعروں کو کل رات کے کھانے پر بلایا ہے۔ بعد میں ہم ان کا کلام سن سکیں گے۔ دو چار کزن بہنیں پڑھنے کے لیے مستقل "نیلی چھتری" میں رہتی ہی تھیں۔ چند اور دوستوں کو بھی بلا لیا۔ ہماری سب کی جیسے عید ہو گئی۔

کھانے کے بعد ہال میں قالینوں پر شاعروں اور مردوں کی بیٹھک ہو گئی۔ ہم لڑکیاں کافی دور کھانے والے حصے میں کھانے کی میز کے قریب قالینوں پر بیٹھ گئے۔ ہماری پشت پر دروازہ تھا۔ اس کے آگے چھوٹا سا برآمدہ۔ اس کے ایک طرف پینٹری تھی جس میں کھانے کے برتن' گلاس' پیالیاں اور پانی کے گھڑے رکھے تھے۔ کھانا پکنے کے بعد وہاں پتیلیاں رکھ دی جاتیں۔ یہاں سے کھانا نکل کر پہلے زنان خانے کے کھانے کی میز پر چھوٹی پود کے لیے رکھ دیا جاتا۔ بعد میں کھانا ڈونگوں اور ڈشوں میں نکل کر مردانے میں جاتا۔ یہ دستور ہمارے گھر کا تھا کہ چودہ سال سے اوپر کے لڑکیاں لڑکے باہر کھانا کھاتے۔ کھانے کی یہ میز چودہ بیس لوگوں کے لیے تھی۔ "نیلی چھتری" در حقیقت ایک چھوٹا سا محلہ تھا۔ اس میں صرف ان کی اپنی اولاد ہی نہ رہتی تھی' دس بارہ چچا' ماموں اور خالاؤں اور والدین کے دوستوں کے لڑکے جن کو ہوسٹل سے ان کی شرارتوں یا نالائقیوں کی وجہ سے نکالا مل جاتا۔ وہ "نیلی چھتری" کے بورڈنگ ہاؤس میں جگہ پا لیتے۔ دو سال کے لیے مولانا محمد علی کے نواسے خالد علی اور مولانا شوکت علی کے پوتے اور مولانا محمد علی کے نواسے طارق علی جانے کس جرم کی پاداش میں بورڈنگ سے نکل کر ہمارے ہاں پہنچ گئے تھے۔ گو ہم کو ان میں کبھی یہ نہ لگا کہ یہ کوئی بے قاعدگی برتنے پر نکالے گئے ہوں گے۔ خالد علی بے حد ذہین حاضر جواب اور خوش مزاج اور طارق بیچارے ہر وقت منہ بسورے خاموش اور کھوئے کھوئے سے رہتے۔

ہاں تو ذکر مشاعرے کا ہو رہا تھا۔ بیٹھنے کے کمرے میں خوب تیز روشنیاں تھیں۔ کھانے والا حصہ تاریکی میں تھا۔ ہاں پیچھے کے برآمدے کی تھوڑی بہت روشنی ہم سب لڑکیوں پر پڑ رہی تھی۔ ہم سب اس طور سے بیٹھی ہوئی تھیں کہ برآمدے کا دروازہ ہماری پشت پر تھا۔ اس لیے اتنا گھس کر بیٹھ گئے کہ اگر کوئی پانی یا پان پتہ وغیرہ لینے پینٹری میں

جائے تو اس کی گزر آسانی سے ہو سکے۔ میری پشت دروازے کے پاس تھی۔ ہم نے کبھی نہ کوئی مشاعرہ یوں سنا تھا' نہ کسی شاعر کو اتنے قریب سے دیکھا تھا۔ دل بے طرح دھڑک رہے تھے۔ سب سے پہلے مجاز کی باری آئی شاید "رات اور ریل" سے شروع کیا۔ ایک دبلا پتلا' سوکھا' چڑمڑ' لمبے لمبے الجھے ہوئے بالوں کے ساتھ کس خوش الحانی سے پڑھ رہے تھے۔ کم سے کم ہم سب لڑکیاں تو حیرت زدہ' مسحور کن' جادوئی کیفیت میں تھیں۔ اتنے میں کوئی برابر سے دو گلاس پانی ہاتھ میں لیے گزرا تو کچھ پانی میرے سر پر گر اگیا۔ ڈوپٹے سے پونچھ لیا۔ اس وقت سر اٹھا کر بھلا کیا دیکھتے نگاہیں تو مجاز پر تھیں۔ پھر ان سے فرمائش کر کے ایک اور نظم سنی گئی۔ یہ نظم جس جذبے اور انداز سے انہوں نے لکھی تھی اسی جوش اور جذبے سے انہوں نے پڑھا تو ہمارے آنسو نکل پڑے۔ مجاز کی یہ نظم آگے چل کر علی گڑھ یونیورسٹی اور گرلس کالج کا ترانہ بن گئی اور آج تک وہاں اس کو ہر موقع پر جوش اور جذبے کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ یوں مجاز علی گڑھ کے ساتھ ہمیشہ زندہ و تابندہ رہیں گے اور ان کا ترانہ فضاؤں میں گونجتا رہے گا۔ مجاز کے بعد ساغر نظامی کلام سنانے آئے۔ صاف و شفاف رنگت' سڈول جسم' مناسب قدو قامت' چکنے چپڑے' بال جمے ہوئے' پھر کوئی پاس سے گزرتا ہوا برآمدے میں چلا گیا۔ واپسی پر جب قریب سے گزرا تو پھر سر پر گلاس سے پانی گراتا ہے۔ اب سر اٹھا کر دیکھا تو حضرت اختر حسین رائے پوری ہیں۔ غصہ دل کے اندر ہی رہ گیا کہ ساغر جس انداز سے پڑھ رہے تھے ان کو سنیں یا ان صاحب کو کچھ سنا دیں۔ آنچل سے پھر پانی خشک کر لیا اور محو ہو کر سننے لگے۔ میں صفیہ سے اور چپک کر بیٹھ گئی پر ایک ہاتھ جہاں کا تہاں رہا۔ اب جاں نثار اختر (جن کو صفیہ جان و دل سے پسند کرتی تھیں اور یہ راز خود عیاں کر چکی تھیں) کوئی خوب صورت رومانی غزل پڑھنے لگے اور صفیہ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی۔ میرے ہاتھ کو کسی نے بڑے جھٹکے سے ہٹاتے ہوئے کہا "باہر جانے کا راستہ کیوں روک دیا؟" بے ساختہ منہ سے نکل گیا "اف کتنا سرد ہاتھ ہے؟" جواب دیا "ہمارا دل جو گرم ہے۔" بڑی کوفت ہوئی۔ یہ مشاعرہ نہ خود سن رہے ہیں نہ سننے دیتے ہیں۔ بس پانی پر پانی بڑی تہذیب سے پیش کیے جا رہے ہیں۔ یجیے' جگر مرادآبادی کی باری آ گئی۔ دبلے پتلے انسان کے گلے سے بڑے دلکش انداز میں سُریلے اشعار نکل رہے تھے۔ دل نے کہا یہ ہمیشہ پڑھتے رہیں اور ہم سنا

کریں۔ فرمائش پر ایک اور غزل سنائی اور پھر جب جوؔش صاحب گورے چٹے' بالشت بھر کا چمکتا چوڑا ماتھا' بڑی بڑی آنکھیں جن میں بلب جیسی چمک تھی جو ہم سب اتنی دور سے بھی دیکھ سکتے تھے۔ اختر شاید مین ان کے سامنے اپنی ساقی گری کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ جوش صاحب نے ڈپٹ کر کہا "میاں آپ سامنے سے ہٹ جائیں پیچھے کچھ خواتین بھی بیٹھی ہیں۔" لیجیے ہنا کیا ہم بالکل باہر ہی چلے جاتے ہیں۔ اپنے جھوا بھریالوں کو طیش میں جھٹکا دیتے ہوئے پھر برآمدے میں آ گئے۔ ہم سب تو جوؔش صاحب کی گھن گرج' پاٹ دار مگر موسیقی سے پُر آواز اپنے پورے وجود سے سننے میں محو تھے۔ جوؔش صاحب اپنا کلام پڑھتے ہوئے ایسا لگ رہا تھا جیسے کچھ اور اونچے اور چوڑے ہو گئے ہیں۔ واہ واہ کا شور ہال میں گونج رہا تھا۔ اختر اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پاس سے گزرے اور ذرا جھک کر یہ کہتے ہوئے "باہر دیوار پر ایک شعر لکھا ہے ذرا دیکھ لیجیے گا۔" شکر ہے اور کسی نے نہ سنا۔ میں تو سہم سی گئی۔ جوش صاحب لک لک کر پڑھ رہے تھے۔ میں پیچھے سے برآمدے میں سرک گئی۔ موٹے موٹے حرفوں میں کوئلے سے یہ شعر لکھا ہوا تھا۔

اتنی کبھے پڑی تھی کہ پتھر کو پوجتا
سجدوں سے میرے رونقِ بت خانہ ہو گئی

ڈوپٹہ گیلا کر کے جلدی جلدی اس کو مٹایا مبادا کوئی اور نہ دیکھ لے۔

محفل ختم ہو گئی۔ میں رات کو دیر تک اس شخص کے متعلق سوچتی رہی کہ بے شک یہ انسان بہت ڈھیٹ' نڈر' اور بے باک ہے۔ اس سے ڈر اور بچ کر رہنا چاہیے۔ ان صاحب کا تو مذاق ہو گا اور میں بری طرح ماری جاؤں گی اگر اماں' اَبّا کو ذرا بھی بھنک پڑ گئی۔ مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اس شخص کے ساتھ میری زندگی کا بندھن بندھنا تھا اور میری پوری عمر دل ہی دل میں سجدے کرتے گزر جائے گی اور مجھے اپنی قسمت پر ناز ہو گا۔ آج جب وہ نہیں ہیں تو ایک کٹی پتنگ کی طرح ہَوا میں اُڑ رہی ہوں۔ دل میں رہ رہ کر یہ آرزو کرتی ہوں کہ کسی شے سے ٹکرا کر میں فضاؤں میں بکھر جاؤں۔

ہاں کیا سنا رہی تھی آپ کو؟ تیسرے دن بھائی جان کے ہاں محمود الظفر اور ڈاکٹر رشید جہاں آئے۔ کھانے پر "امیر منزل" کے کیمپ اور سبطِ حسن' شرف الطفر علی اور مجاز بھی آئے۔ بھابھی جمیلہ نے مجھے' خدیجہ اور رشیدہ کو بھی بلا لیا۔ ان سب کی گفتگو اتنے اعلیٰ

قسم کی تھی۔ ہم سب بور ہونے لگے۔ پیچھے سے سنک جانے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اختر
ہمارے قریب آکر یوں بیٹھ گئے جیسے کوئی بالکل اپنا ہی ہو۔ ہلکی پھلکی باتیں کرنے
لگے "ہر گدھے کا بچہ بے شک بول نہیں سکتا مگر انسان تو بول سکتے ہیں۔ آپ سب خاموش بُت
تک "ہم سب کو گھورے جاتی ہیں۔ منہ میں زبان ہے یا نہیں؟ مجھے تو یہ شک ہو رہا ہے"
میرے منہ سے بے ساختہ نکل پڑا "تو کیا آپ ہم سب کو گونگا سمجھ رہے ہیں؟ نہ کوئی ہم
سے مخاطب ہے، نہ ہم کسی سے۔" "ارے بات کیسی تو بچی جی۔ یہ کیوں نہیں مان لیتیں کہ
پڑھنے ہی کچھ نہیں پڑھا۔ اخبار پڑھیں، کچھ سیریس کتابیں پڑھیں۔ افسانوں اور ناولوں کی
دنیا سے باہر آئیں آپ کو یہ معلوم ہی نہیں کہ اس وقت یونیورسٹی میں کیمونزم نامی ایک
مرض کے جراثیم بڑی تیزی سے پھیل رہے ہیں اور ہم سب کی کوشش ہے کہ جلد سے
جلد اور تیزی سے اس مرض کو پھیلایا جائے۔ ملک کو آزاد کرانے کی کوشش ہر جتن سے
کر رہے ہیں۔ آپ خواتین کو بھی اس نیک کام میں شریک ہونا چاہیے۔ پرسوں میں اور
سجاد حسن، جواہر لال نہرو کو دلی سے علی گڑھ لا رہے ہیں۔ پروفیسر حبیب صاحب کے یہاں
ٹھہرائیں گے۔ وہاں آپ سب کا آنا جانا ہے۔ جمیلہ کے ساتھ وہاں آیے۔ شاید ان کی
باتیں سن کر آپ لوگ بھی جاگ جائیں۔ یہ مٹی کی مورتیاں بن کر اگر ملک کی آدھی
آبادی بیٹھی رہے گی تو کام کیوں کر بنے گا؟ "قطرہ قطرہ دریا می شود" جو بھی اور جب بھی
اس نیک کام میں شامل ہوگا۔ گاڑی آگے بڑھے گی اور انگریز کی غلامی کا طوق ہمارے
ملک کے گلے سے اتر سکے گا۔ بے شک یہ باتیں ہم کو بھی اور ایک نیا سا جذبہ دل میں
جگہ پانے لگا تھا۔ میرے ہاتھ میں ساقی کا پرچہ اختر نے تھما دیا۔ اس میں ان کا افسانہ
"اندھا بھکاری" چھپا تھا۔

تیسرا دن آیا تو سنا کہ جواہر لال نہرو وائس چانسلر کے مہمان ہیں۔ پروفیسر حبیب کے
نہیں۔ اسی شام اسٹریچی ہال میں ان کی تقریر ہے مگر وہاں ہم لوگ کیسے جا سکتے تھے۔ تقریر
ختم ہوتے ہی ڈائس کے پاس پیچھے کی کھڑکی سے اختر جواہر لال نہرو کو یہ کہہ کر لے گئے کہ
صرف اسی طرح حبیب صاحب کے ہاں لے جایا جا سکتا ہے۔ وہاں پر ہم خیال چیدہ چیدہ
حضرات آجائیں گے اور یوں آپ سے بے تکلفی سے خیالات کا تبادلہ ہو سکے گا۔ اس پر
وہ جانے پر راضی ہوئے۔ کھڑکی کے قریب پروفیسر شریف نے اپنی موٹر پارک کر رکھی

تھی۔ وہ اس میں بیٹھے ہی تھے کہ بقول ان کی بچی صحت کے ایک عجیب بالوں اور لمبی
قلموں والے لڑکے نے پیچھے کا دروازہ کھول کر کہا "ڈرائیور! جواہر لال جی کو حبیب
صاحب کی کوٹھی لے چلو۔" انہوں نے اس وقت اپنے کو ڈرائیور ظاہر کرتے ہوئے موٹر
اسٹارٹ کر کے حبیب صاحب کی کوٹھی پر جا کر گاڑی روکی اور جب ان کی نظر وہ تھی میں
پروفیسر شریف کو دیکھتی ہے تو چپکے ہوئے برآمدے اور بڑے کمرے میں چلے گئے۔ جواہر لال
آہستہ آہستہ اسی رخ ہو لیے۔ میں فوراً سمجھ گئی کہ یہ کون ہو سکتا ہے۔

دوسرے دن شوکت بھائی کے پاس خط آتا ہے کہ رڑکی میں بجلی کے انجینئرنگ
ڈیپارٹمنٹ میں سرکاری ملازمت کے لیے ان کو منتخب کر لیا گیا ہے۔ اور بھائی کا خط آتا
ہے کہ وہ فی الحال علی گڑھ واپس نہیں آئیں گی کہ قیامت گرد ہو گئے ہیں۔ حمیدہ، خدیجہ
اور رشیدہ کو بورڈنگ میں چھوڑ کر وہ رڑکی چلے جائیں۔ چھوٹے بھائی اور ذکیہ تو پہلے ہی
ان کے ہمراہ جا چکے تھے۔ محمود تلک ٹی کالج لکھنؤ جا چکی تھیں۔ یوں "نیلی چھتری" کچھ
عرصے کے لیے سونی ہو گئی۔ باقی کیس بھی اپنے اپنے ٹھکانوں پر روانہ کر دیے گئے۔

بورڈنگ سے "امیر منزل" جانے کا سوال ہی نہ تھا۔ ساری تفریح یا تو تھی کہ اب
اختر رائے پوری کی کوئی چیز پڑھنے کو نہ ملے گی۔ راتوں کو اشرف، ڈاکٹر رشید جہاں اور
اختر کی ٹولی "نیلی چھتری" کے آگے سڑک پر عجیب و غریب قسم کے گانے ایک نرالے
انداز میں گاتے گزرتی تھی۔ وہ اب تو کبھی سننے میں نہ آئیں گے۔ یہ کیا خبر تھی کہ اپنے ہی
گھر بیٹھ کر سن سکیں گے۔ مرے تک جب بے تکلف دوستوں کی دعوت کی اور جب ڈاکٹر
کا ساتھ برسوں کراچی میں رہا اور میرے بھائی زاہد اور شوکت عمر یہاں تھے تو کھانے کے
بعد ان کی فرمائش پر دونوں مل کر بلا تکلف ان گانوں کو اسی طرح گاتے۔ تمیں بھائی کیا
آپ بھی سنیں گے؟ تو یہ لیجیے وہ چار گانے آپ کو بھی سناؤں۔

گاڑی جھاڑی میں کو آئی
گاڑی سر افراز ہوئے
اس میں بیٹھے ہیں شوقین
کپڑے پہنے ہیں حسین
ان کی جیبوں میں ہے کوکین

چوری بابو نے کرائی
چوری اوروں پہ لگائی
گاڑی جھاڑی میں کو آئی

کھڑکیاں کھول دے بابو
ہمیں گرمی ستاتی ہے
کھڑکیاں نہ کھلیں ری
ہوا پچھم سے آتی ہے

آگ لادے پانی لادے
حُقّہ کردے تازہ
میاں جمن جمن۔ میاں جمن جمن
تیری ایسی تیسی
کڑک تمباکو لایا
میاں جمن جمن
حُقّہ جو ہے حضورِ مُعلّا کے ہاتھ میں
کہکشاں ہو جیسے ثریّا کے ہاتھ میں

اللہ میاں خوب بنی تیری شان
سب بہنن میں ایکو بی بی وہ بی بی فاطمہ
سب کتابن میں ایکو کتاب بنائی
اللہ میاں وہ بھی کتاب قرآن
ساری چھتوں میں ایکو چھپّر چھوایا
اللہ میاں تو نے بنایو آسمان
سب برتن میں ایکو برتن بنایا

وہ بھی برتن پاندان
سارے خاندانوں میں ایک ہی خاندان
اللہ میاں تو نے بنایا عمر خاندان

عجیب نرالی دُھن' الو کے ترنگ۔ ہم سب بھاگ کر زنان خانے کے صحن والی سیڑھیوں پر چڑھ بیٹھتے اور ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ گانے والوں اور سننے والوں میں فاصلہ اتنا ہوتا کہ کسی کی شکل کی پہچان کرنا ناممکن تھا۔ "نیلی چھتری" آخری کوٹھی تھی۔ آگے جا کر ایک قلعے کے کھنڈر تھے جس میں لوگ دن میں جاتے ڈرتے تھے۔ رات تو پھر رات تھی۔ ہم سب کا خیال تھا کہ کسی بھانڈوں کی ٹولی نے قلعے میں ڈیرا کر لیا ہے۔ یہ وہی لوگ تھے جو گاتے بجاتے قلعے میں جاتے اور وہیں سو جاتے۔ واپسی بڑی خاموشی سے ہوتی۔ شادی کے بعد اختر سے معلوم ہوا کہ یہ ان کی ہی اختراع تھی۔

ہوسٹل کی زندگی چند سال پہلے بھی لکھنؤ میں گزار چکی تھی اس کا اپنا الگ مزہ تھا۔ وہاں کی پابندیاں اور بے مزہ کھانے یاد تھے۔ اس لیے بورڈنگ میں رہنا زیادہ شاق نہ گزرا پھر بھی کچھ یادیں کبھی کبھی دل میں چٹکیاں سی ضرور لیتیں۔ کبھی سوچتی کہ "امیر حویلی" میں نہ جانے کیا کیا ہوتا ہوگا۔ بھابھی کلثوم متھرا کے گاؤں ایک ماہ کے لیے چلی گئی تھیں۔ وہ بھی تو ملنے نہ آئیں گی اور اس ہوسٹل کی اونچی اونچی دیواروں کے باہر کی کوئی خبر نہیں مل سکے گی۔

—○—

پیغام

"نیلی چھتری" کے زنان خانے کے لق و دق صحن کی پشت پر آٹھ نوکروں کے کوارٹر تھے۔ دو میں شکور نامی ہمارا دھوبی اس کے بیوی بچے، دو میں جمعدار معظو اور اس کا کنبہ، دو کوارٹروں میں دو عدد مالی اپنے ٹبر سمیت، دو میں ان سب کی گائے بکریوں کا چارہ، دانہ بھرا رہتا۔ صحن کی دوسری طرف دیوار کے ساتھ ابا کے بیرے کا چھوٹا سا گھر، پھر خانساماں کا کوارٹر، ساتھ میں باورچی خانہ، اس کے بعد ڈرائیور حمایت کا کوارٹر۔ ہم سب تو پاکستان بنتے ہی یہاں چلے آئے، مگر شاباش ہے کہ وہ سب نمک خواری اور وفاداری کا ثبوت دینے کے لیے آج بھی اسی طرح ڈٹے بیٹھے ہیں۔ وہ خود نہ رہے تو ان کی اولادیں ہیں۔ ہم میں سے جب بھی کوئی گیا، اور ہمیشہ ہی بے اطلاع گئے تو خدا بخش کے کمرے میں اماں ابا کی بڑی سی تصویروں پر تازہ بیلا، چنبیلی کے پھولوں کے گجرے دیکھ کر رو پڑے۔ "نیلی چھتری" خود تو آثار قدیمہ کی شکل اختیار کر چکی ہے، مگر ان سب کے کوارٹر درست حالت میں ہیں۔ سارے باغ کے اونچے گھنے پیڑ کٹ پٹ کر چولہوں کی لکڑی کی شکل اختیار کر کے ختم ہو چکے۔ پھلوں کے درختوں کا نام و نشان نہ رہا۔ نہ کسی طرف کسی جگہ پھول اور بیلے کی جھاڑیاں ہیں نہ ہی لان، مگر پیچھے نوکروں نے سبزیوں کے کھیت اور بیلے کے پھول لگا رکھے ہیں تاکہ موتیا اور چنبیلی کی کمی نہ ہو کیوں کہ گجرا بھی تو بنتا ہے اور تصویر پر ڈالنا ہے۔ اس لیے کہ بیگم صاحبہ کو موتیا، چنبیلی سے عشق تھا۔ ان کا پورا وجود ان کی خوشبوؤں سے بسا رہتا۔ سبزیاں یوں ضروری ہیں کہ یونیورسٹی کے کسی نہ کسی ہوسٹل کے باورچی خانے کے لیے وہ ہمیشہ بھیجا کرتی تھیں۔ والدہ کی قبر یونیورسٹی کے قبرستان میں ایک مثالی قبر ہے۔ سنگ مرمر پر بڑا سا حجرہ کٹاؤ دار جالی سے بنا ہوا ہے۔ انار کے پیڑ اور موتیا کی جھاڑیاں اس لیے شاداب و تر و تازہ ہیں کہ ان کی دیکھ ریکھ کرنے والے اب بھی "نیلی چھتری" کے صحن کی پشت پر آباد ہیں اور پشت در پشت آباد رہیں گے اور اس عظیم

خاتون کی قبر کو جس کو وہ مزار کہتے اور لکھتے ہیں، جانے کب تک اسی طور اس کی دیکھ ریکھ کرتے رہیں گے۔

ہمارے کپڑے شکور دھوبی کی بیوی دھو کر ہوسٹل پہنچاتی تھی۔ وہ میرے دھلے کپڑے رکھتے ہوئے میری نظر ایک لفافے پر پڑی "نام حمیدہ عزیز بذریعہ شکور دھوبن۔" گھبرائی جاتی پہنچاتی تھی۔ دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ کوئی دیکھ نہ لے۔ شکر کہ اس وقت رشیدہ، خدیجہ اور جو تھی روم میٹ کمرے میں نہ تھیں۔ جلدی سے چھپا دیا۔ وہ میز کی دراز میں ایک پڑے کے بیچ کر پڑھا اور پھر پڑھا۔ پھاڑ کر پھینک دینے کو دل نہ چاہا۔ پھر الماری میں چھپا کر رکھ دیا۔ رات کے نیند نہ آئی کہ الٰہی اب میں کیا کروں؟ کیسے اس انسان کو منع کروں کہ آئندہ ایسی حرکت پھر ہرگز نہ کریں۔ کسی کو معلوم ہو گیا، پرنسپل خاتون آپا کو خبر ہو گئی تو بورڈنگ سے نکال دی جاؤں گی۔ خدا اماں ابا کو بھیج دیا جائے گا اور پھر کیا ہو گا؟ کئی رات تک میں جاگتی اور کروٹیں بدلتی رہی۔ پھر ایک ترکیب سوجھی کہ فوراً بھابی جمیلہ کو ورڑی خط لکھوں کہ وہ اختر کو خط لکھ کر اچھی طرح ڈانٹیں اور آئندہ ایسی حرکت سے منع کریں۔ فوراً خط لکھا اور جانے والی ڈاک کے ڈبے میں رکھ دیا۔ اس کا اثر اتنا ضرور ہوا کہ شکورن کو دینے کے بجائے صفیہ (اعجاز کی بہن) کبھی ساقی، کبھی نگار رسالے جو ان کو دیے جاتے اور جس میں ایک خط ضرور ہوتا مجھ تک پہنچ جاتے۔ ہر بار جان نکل جاتی۔ میٹرک کے امتحان کی تیاری تھی اور حشر سا دماغ، خوف اور وحشت طاری۔ کبھی صفیہ یا سعیدہ کی زبانی معلوم ہوتا کہ اختر حسین رائے پوری نے یونیورسٹی میں ایک اودھم سا مچا رکھا ہے۔ ایک ہفتہ وار اشتراکی قسم کا اخبار نما ہاتھ سے لکھ کر ہوسٹل کی دیوار پر چسپاں کر دیتے ہیں جس کی نقل تیزی سے ہر ہوسٹل کی دیوار پر لگا دی جاتی ہے۔ اس کی خبریں ساری ہی تو اشتراکی اور آزادی کے لیے جدوجہد کی ترغیب، ہندو مسلم اتحاد (یونٹی) کے لیے کام کرو۔ انگریزوں کی مخالفت کرو۔ نماز فجر کی حاضری رجسٹر پر لگائی جاتی تھی۔ اختر ایک ہزار دانوں والی تسبیح ہاتھ میں لیے عربی جبہ پہن کر نماز کے لیے جاتے، اس پر بیچارے خیری صاحب گرفت بھی نہ کر سکتے تھے، لیکن اور لڑکوں کی ہنسی ان کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ اختر "امیر منزل" سے اٹھ کر واپس ہوسٹل میں اس لیے آ گئے تھے کہ بھابی کلثوم اختر کو اور جمیل نہ سکتی تھیں اور یہ خود ان بیچاری کی بھولی بھالی

باتوں کو جہالت گردان کر مزید برداشت نہ کر سکتے تھے۔

میں سوچا کرتی کہ ایم اے کا امتحان سر پر ہے اور یہ لاأبالی پڑھائی پر دھیان دینے کے بجائے کیسے کیسے چکروں میں ہے۔ ان کی ذات سے میری ہمدردی بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ خطوط سے بخوبی اندازہ ہو گیا کہ انھیں ہر طرح کی محرومیت کا احساس ہے کہ وہ دنیا میں اکیلے ہیں۔ ماں باپ کی شفقت اور محبت سے محروم، ملک کی غلامی کے احساس سے دبا ہوا، انقلاب برپا کرنے کی فکر میں ہر شے، ہر انسان سے ٹکر لینے کے درپے۔ میری دنیا میں خوشیوں اور محبتوں کے انبار تھے۔ زندگی بھر اپنے چاروں طرف یہی بکھری پائی تھیں۔ پھر ایک ایسے شخص کے لیے ان سب کی غیر موجودگی کس طرح اپنے اطراف سے سمیٹ سمٹ کر اس کے حصے میں ڈال دوں؟ یوں اس کے خلوص دل سے ملک اور قوم کی خدمت کی چنگاری کو مدھم کرنے کے بجائے تیز تر کر دوں۔ یہ شخص تو عام انسانوں سے کس قدر مختلف ہے۔ ایسا سوچنے پر شاید میں اس لیے مجبور تھی کہ میں تو واقف نہ تھی کہ دل کا اندھیرا، تنہائی، اپنوں کی کمی، راحت و آرام کا نہ ہونا کیا ہوتا ہے۔ میں تو کسی بھی ایسی شے سے آشنا نہ تھی۔ ایک چھوٹے شہر رائے پور سے نکل کر کلکتہ جیسے غدار شہر میں سولہ سال کی عمر میں پڑھ بھی رہا ہو اور ساتھ ہی ملازمت کر کے اپنے پاؤں پر کھڑا بھی ہو گیا ہو۔ کسی مسلمان لڑکے یا لڑکی کا ہندی، سنسکرت اور بنگلہ جاننا ایک عجیب و غریب سی بات لگتی تھی اور پھر اتنی کم عمری میں اتنے بڑے ہندی اخبار میں کام کرنا اور لکھنا۔ اردو فارسی اور گجراتی سے واقفیت!! قدرت نے اس کو ایک طرف ہر محرومی دے کر کس کس طور سے نوازا بھی ہے۔ آخر یہ معمہ کیا ہے؟ جانے کیا کیا الٹے سیدھے خیال دل میں آتے، پڑھائی خاک نہ ہو سکتی تھی اور اپنے فیل ہونے کا یقین پختہ ہوتا گیا تھا۔

امتحان ختم ہو گئے۔ کالج بند ہوا۔ میں پہلے میرٹھ اپنے چچا آفتاب عمر کے ہاں چلی گئی اور رشیدہ اور خدیجہ اماں ابا کے پاس اورئی۔ اور "یہ" دہلی لاہور ہوتے ہوئے بمبئی اور وہاں سے پھر علی گڑھ پہنچ گئے اور یہاں سے مولوی عبدالحق "اختر" کو اپنے ساتھ حیدر آباد لے گئے۔ میں تین ہفتے میرٹھ میں رہ کر اورئی آ گئی۔ خط پہلے روزی جاتا۔ بھابھی جیلہ دوسرے لفافے میں بند کر کے مجھے بھیج دیا کرتیں۔ جانی پہچانی لکھائی کا خط مجھے بے کھٹکا مل جاتا۔

اب مجھ کو حیدر آباد پہنچ کر یہ خبر دیتے ہیں کہ مولوی صاحب ان سے ڈکشنری پر جو کام کروانا چاہتے ہیں اس کی نوعیت یہ ہے کہ جہاں جہاں سنسکرت، ہندی، بنگلہ اور گجراتی کے الفاظ آئے ہیں وہ صحیح ہیں یا غلط۔ "رسالہ اردو" کے نگراں کی حیثیت سے بھی کام کرنا ہے اور وہ مقالہ "ادب اور انقلاب" حیدر آباد جانے سے پہلے "رسالہ اردو" میں چھپ چکا تھا۔ اسی مقالے سے مولوی صاحب کو اختر جیسے مخلص کا انتخاب کرنے اور ان کو ہر حال میں انجمن کے لیے نہایت موزوں و مناسب مخلص سمجھا۔ جب پروفیسر رشید صاحب کے گھر پر انھوں نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا اور بہت زور دیا کہ وہ منظور کریں ان کے ساتھ حیدر آباد چلے جائیں۔ اختر کا انکار تھا کہ ان کو تو ایک اخبار نکالنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کرنا تو مولوی صاحب نے ان سے وعدہ کیا کہ جیسے ہی ڈکشنری کا کام ختم ہو جائے گا وہ ان کو دلی جانے کی اجازت ہی نہ دیں گے بلکہ ایک سال اخبار نکالنے کا کل خرچہ بھی برداشت کریں گے۔ اخبار جب تک اپنا خرچہ برداشت کرنے لگے گا۔ اختر نے ساتھ جانے کی ہامی بھری کہ یوں ان کی زندگی بھر کی تمنا پوری ہو جائے گی۔ "ادب اور انقلاب" کا چرچا ہر طرف ہو رہا تھا۔ میں سوچتی کہ الہی یہ انقلاب کس قسم کا ہے جو ادب میں آنا چاہتا ہے۔ کچھ سمجھ میں آیا اور کچھ نہ آیا۔

میری بڑی بہن محمودہ لکھنؤ آئی ٹی کالج سے بی اے کر رہی تھیں۔ اب ان کی معرفت کچھ کتابیں بھی میرے لیے آنے لگیں۔

جمیل بھائی میری زندگی کا سب سے قیمتی اور عزیز ترین سرمایہ اختر کے وہ سب خطوط رہے۔ ان کی کوشش ہمیشہ یہ رہی کہ ان کے ہاتھ لگ جائیں تو یہ ان کو پھاڑ کر پھینک دیں۔ بھلا میں یہ انمول علم و ادب کے شہ پارے کیسے ان کے ہاتھ لگنے دیتی۔

آپ کا اصرار ہے کہ اصل کہانی کو آگے بڑھاؤں۔ یہ دائیں بائیں کی کیا باتیں لے بیٹھی ہوں۔ ہاں تو پھر یوں ہوا کہ حیدر آباد سے اختر نے ایک خط خود ابا کو پیام کا لکھ ڈالا (یہ میں نے ابا کی کسی فائل میں "نیلی چھتری" کی لائبریری میں دیکھا تھا) سن سن کر میرا برا حال ہوا اور اس تصور سے کہ ابا پر اس کا کیا اثر ہوا ہو گا۔ اس قسم کے خط سے ان کو طیش ضرور آیا ہو گا۔ بھلا بزرگوں کو اپنے معاملے میں کوئی خط لکھا کرتا ہے۔

یہ خط القاب کے بعد یوں شروع ہوتا ہے۔

پڑھوں میں شکوے سے یوں، راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

ایک بندۂ ناچیز جس کا دنیا میں کوئی نہ ہو، پر علم کی دولت کے خزانے کی چابی مٹھی میں تھامے ہوئے مزید اس کو حاصل کرنے کے عزم کے ساتھ اس کی سمت رواں دواں ہے۔ آپ کی صاحبزادی حمیدہ عمر کے لیے خواست گزار ہے۔

اگر قبول کریں۔ تو زہے نصیب اور قبول نہ فرمائیں تو شکوہ آپ سے نہیں بلکہ اس خدا سے ہوگا جو بڑا رحیم و کریم ہے!

آپ خود سوچ لیں کہ اس انداز کے خط سے والد صاحب کیسے چراغ پا ہوئے ہوں گے۔ ابا نے اس کی نقل شوکت بھائی کو بھیجی، اصل کو فائل میں لگادیا اور ان کا جواب بھی فائل میں دیکھنے کو ملا۔ میری یاد بھر وہ کچھ یوں تھا:۔

"اس لڑکے کو میں اور جمیلہ خوب اچھی طرح جانتے ہیں۔ میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اختر نام ہی کا اختر نہیں بلکہ وقت کے ساتھ درحقیقت ایک روشن ستارہ اور بخت کا اختر بن کر رہے گا۔ یہ مولانا عبدالحق کے ساتھ رہ کر چھ ماہ سے کام کر رہے ہیں ان سے دریافت کرلیں کہ ان کی ذاتی رائے کیا ہے اور پھر فیصلہ جو بھی آپ اور اماں کریں گی"

والد صاحب نے اپنے اس بیٹے کی بات کبھی ٹالی نہیں تھی۔ انہوں نے مولوی صاحب کو خط لکھا۔ خط انگریزی میں تھا۔ مولوی صاحب اور والد صاحب کے یہ خطوط میرے پاس اسی طرح موجود ہیں کہ ایک روز نہ جانے کس ترنگ میں تھے کہ مجھ سے پوچھا "یہ تو بتاؤ تم نے میرے خط دیکھے تھے جو میں نے ظفر عمر کو لکھے تھے" میرا جواب یہ تھا کہ بھلا ابا مجھے کیوں دکھاتے۔ کچھ دیر سوچ کر بولے "اچھا تو میں تم کو دکھاتا ہوں" اٹھے اور اپنی لوہے کی کیبنٹ کی خانے دار الماری میں سے ٹٹول ٹٹال کر یہ چند خط میرے ہاتھ میں دے دیے۔ یہ خط انہوں نے انگریزی میں اپنے قلم سے لکھ کر، ٹائپ کرا کر دستخط کرکے ابا کو بھیجے تھے، میں ہنسنے لگی۔ پوچھا "لڑکی ہنستی کیوں ہو؟ میں نے کہا یہ دیکھ کر کہ آپ اور خط انگریزی میں لکھیں" ہنس کر بولے "اس لیے کہ تمہارے باوا پر رعب ڈالنا منظور تھا کہ یہ

حضرت یہ نہ سمجھیں کہ بچ بچ کے مولوی کے گھر اپنی بیٹی کیسے دے دیں وہ کچھ ذرا زیادہ ہی صاحب بہادر اور روشن خیال ہو بنتے ہیں۔"

جمیل بھائی ان خطوں کو پڑھ کر آپ ایمان سے بتائیں کہ بابائے اردو کے قلم سے کسی بھی شخص کے لیے اس قدر تعریف کے الفاظ آپ کی نظر سے گزرے۔ فوٹو کاپی ساتھ میں ہے۔ اب اس کا ترجمہ آپ خود کرلیں۔ ان کے معیار کی کسوٹی پر اختر پورے اترے نا؟

لیجیے یوں اس خط کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ہمارے والد اختر کے خاندان یا ان کے حالات کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں کرنا چاہتے اور ہاں کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

والدہ صاحبہ گھبرا رہی تھیں۔ وہ لڑکی کا ہاتھ اس طور، کسی معلومات کے بغیر، تھما دینے کے خلاف تھیں۔ البتہ مولوی صاحب کے خط سے اتنا ان کو معلوم ہو گیا ہے کہ اختر کا کوئی تعلق اپنے والد سے نہیں ہے۔ شوکت بھائی اور جمیلہ بھابی سو فی صد اس رشتے کی موافقت میں ہیں۔

اماں کی سمجھ میں ایک ہی بات آئی کہ وہ مجھ سے تحریری اقرار لے کر ابا کو دے دیں۔ شروع جولائی کا مہینہ ہے۔ رات گھپ اندھیری، سیاہ بادلوں نے رات کی سیاہی کو تاریک تر کردیا ہے۔ گاہے گاہے بجلی کی چمک، بادل کی گرج سے میں ڈر کے مارے تکیہ سر پر رکھ کر کان بند کرلینے کی ترکیب کر رہی ہوں کہ اماں کے قدموں کی چاپ میرے پلنگ کے پاس آکر رک جاتی ہے۔ میں سخت حیران ہوئی کہ اس وقت یہ کیوں آئیں اور پھر خاموش کیوں کھڑی ہیں۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد آہستہ سے پوچھتی ہیں۔ "حمیدہ جاگ رہی ہو نا؟" تم آخر بجلی کی کڑک اور چمک سے اتنا کیوں ڈرتی ہو۔ میں خوش ہی تو ہو گی کہ آج اماں کو میرے ڈر کا خیال تو آیا (ہماری اماں دوسری ماؤں سے بہت مختلف تھیں اولاد کے ساتھ کبھی لاڈ و دلار اور چاؤ چونچلے نہ کرتی تھیں۔ لفظ ڈر سے ان کو نفرت تھی)

اب اماں میرے پلنگ پر سرہانے کی طرف بیٹھ گئیں۔ زور کی بجلی چمکی تو ان کا چہرہ صاف دیکھ سکی۔ پریشانی صاف عیاں تھی۔ میرے سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔ پھر بولیں۔ آج میں تم سے ایک بہت سنجیدہ بات کرنا چاہتی ہوں۔ میں نے گھبرا کر کہا "جی۔" بولیں "تم اب بڑی ہو چکی ہو۔ ماشاء اللہ جوان ہو۔ بھولی اور سیدھی بہت ہو مگر اتنی بھی نہیں

کہ بات کو سمجھ نہ سکو۔" زور کی گرج اور چمک پر میں اماں سے چمٹ گئی۔ وہ آہستہ سے مجھے پرے ہٹا کر سوال کرتی ہیں۔ "حمیدہ اگر ایسی ایسی بجلیاں رات دن تم پر گریں اور گرتی ہی رہیں تو تم کو کیسا لگے گا؟" میں حیران کہ آخر اماں کہہ کیا رہی ہیں۔ "میری بات کا جواب دو۔"

اماں "اس کا کوئی جواب ہی نہیں کیوں کہ جب بجلی کسی پر گرتی ہے تو اسی وقت اس کو بھسم کر دیتی ہے۔ بار بار اس پر گرے تو اس کو بھلا کیا معلوم ہو سکتا ہے۔"

"بے وقوف لڑکی وہ بجلیاں جو بار بار کسی ایک ہی انسان پر گر سکتی ہیں وہ اس آسمانی بجلی کی طرح کی نہیں ہوتیں۔ وہ بجلیاں کسی کے الفاظ کی، کردار کی، طور طریق کی، بے حسی کی اور بے پروائی کی ہوتی ہیں۔"

میں کچھ بھی نہ سمجھ پائی۔ ان سے بس اتنا کہا "اماں آخر آپ مجھ سے کہنا کیا چاہتی ہیں؟"

"تو لو سنو۔ تمہارے ابا نے تمہاری شادی ایک "اختر حسین" نامی لڑکے سے کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ میں نے بسا اوقات بہت سمجھایا کہ پہلے اس شخص کے متعلق معلومات کر لینی چاہیے، کس خاندان کا ہے اور باپ سے تعلق نہیں تو کیوں نہیں؟ مگر وہ تو کسی طور میری بات سننے کو تیار نہیں۔ کہتے ہیں جب مولوی عبدالحق صاحب نے تعریفوں کے پل باندھ دیے ہیں اور شوکت اور جمیلہ اس رشتے کے حق میں ہیں تو مزید معلومات کی کیا ضرورت ہے۔ بہت کہا کہ کم سے کم لڑکے کو بلا کر دیکھ لیجیے تو۔ اس کی بھی ان کو ضرورت محسوس نہیں ہوئی کہ مولانا کی رائے اس کے متعلق اس قدر اچھی ہے تو ان کو نہ ملنے کی ضرورت ہے نہ معلومات حاصل کرنے کی۔ لڑکی کا ہاتھ تھماتے وقت سو باتیں معلوم کی جاتی ہیں۔ اب میری سمجھ میں صرف ایک ہی بات آ رہی ہے کہ تم کاغذ پر خود یہ لکھ دو کہ "مجھے یہ رشتہ منظور نہیں ہے۔ پھر وہ کچھ نہ کر سکیں گے" میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا "مگر کیوں؟"

"تو سنو یہ لڑکا ایک رائٹر ہے۔ میرے خیال میں ہر شاعر، ہر رائٹر، ہر مصور اپنی شریک حیات سے چاہتا ہے کہ میری آنکھ سے دیکھو، اور میرے دماغ سے سوچو۔ جو ممکن نہیں ہوتا کہ ہر شخص اپنی آنکھ رکھتا ہے اور اپنا دماغ۔ ہر ایک کی زندگی میں اونچ نیچ آتی

ہے، مگر ایسے لوگوں کے ساتھ پہاڑ اور سمندر پار کرنا بہت مشکل کام ہے۔ پھر تم جیسی سیدھی لڑکی کے بس کی یہ بات ہو ہی نہیں سکتی۔ اس لیے یہ بیل منڈھے نہ چڑھ پائے گی۔"

میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ بجلی کی کڑک اور بادلوں کی گرج سے بے پروا ہو کر ان کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کرنے کی عادت اور جسارت عمر بھر ہم میں سے کسی کو نہ ہوئی تھی مگر خدا جانے وہ کون سا جذبہ تھا کہ ان کی طرف دیکھتی رہی، بجلی کی چمک میں جو اداسی سے بھری ہوئی تھی۔ دل کڑا کر کے جواب دیا "اماں آپ نے ہم سب کو ہمیشہ یہ سبق پڑھایا کہ میری ڈکشنری میں لفظ ناممکن نہیں۔ اگر انسان خدا پر بھروسہ کر کے ہمت اور ولولے کے ساتھ جو بھی کام کرے گا اس کو کر ہی لے گا۔ ہو سکتا ہے محنت بہت کرنا پڑے، کبھی ناکامی بھی ہو، مگر حوصلہ اس کو کامیاب ضرور کراتا ہے (ان کی اپنی زندگی کا ہمیشہ یہ فلسفہ رہا) کوئی وجہ نہیں کہ آپ کی بیٹی ہو کر میں کبھی ہمت ہاروں یا آگے بڑھا کر قدم روک لوں۔" "اچھا رات بھر سوچو، صبح مجھے جواب دینا" یہ کہہ کر وہ اٹھ کر چلی گئیں۔

واقعی میں صبح چار بجے تک جاگتی رہی۔ کبھی خوشی سے بے حال کہ ابا نے فیصلہ کر لیا ہے، کبھی گھبراہٹ کہ دن کی روشنی میں اماں کی نظروں سے نظر ملا کر میں کیسے اور کیا کہوں گی؟ اماں کی گفتگو اور بھابی کلثوم کے سارے وہ الفاظ "وہ لڑکا کہہ کہہ کر بیان کرتا کہ بڑا جلالی ہے، خود سر ہے، غصہ ناک پر دھرا رہتا ہے۔ کسی پروفیسر کو بھی اپنے آگے کچھ سمجھتا نہیں، اپنی ہی بات پر اڑا رہتا ہے اور مین میخ نکالنا اس کا مشغلہ ہے وغیرہ وغیرہ" مسلسل گونجتے رہے۔ مجھے کیا کہنا ہے اماں سے؟ دل نے کہا چلو اختر کے خط پھر سے پڑھو ایک بار۔ سو وہی کیا جب اس خط کو پڑھا جس میں لکھتے ہیں "تمہیں حاصل کرنے کے لیے نہ اپنی خودداری کو سرنگوں ہونے دوں گا اور نہ ضمیر فروشی کروں گا۔ میں آزاد ہوں اور یونہی رہوں گا۔ آج نہیں تو کل جیل جانے کے لیے کمربستہ رہوں گا، بلکہ اس سے بھی زیادہ کے لیے۔ میں تمہیں عیش سے نہ رکھ سکا ہوں نہ اس کی کوشش کروں گا۔ اب تم خود اپنے دل سے پوچھو کہ اس کے باوجود ایسے آدمی کا ساتھ دے سکتی ہو یا نہیں؟ میں نہ کوئی وعدہ کرتا ہوں نہ ترغیب دیتا ہوں۔ اتنا اوچھا نہیں کہ اپنے لیے کوئی قربانی کرنے کو کہوں۔ یہ تو تیرے اخلاص پر حق ہے۔ میری تو ہمیشہ یہ خواہش رہے گی کہ جس سے محبت

کی میں انھیں راحت سے دیکھوں۔ میں نے تو اغراض و مقاصد کی یگانگت کا ذکر صرف اس لیے کیا تھا کہ تم میری شورش طلب زندگی دیکھ لو اور سمجھ لو اور یہ جان لو کہ ایسے آدمی سے صرف تب ہی نبھ سکتی ہے جب اس کی ذات سے نہیں بلکہ ان چیزوں سے ہمدردی ہو جن کے لیے وہ زندہ ہے۔ پایا۔ تمام مردوں کے معیار سے مجھے کیوں جانچتی ہو' جو گھربار سے بے نیاز' نہ نام اور نمود کا خواہاں' نہ دولت اور غرض کا بندہ۔ آخر دو مردوں سے وہ کچھ تو مختلف ہے۔"

یہ خط پڑھتے ہی باقی بے پڑھے بند کرکے رکھ دیے۔ پلنگ پر آکر بیٹھی تو تازہ دم' حوصلے اور ولولے سے سرشار تھی کہ جس کے خیالات اتنے بلند ہوں' جو زندگی سے لڑکر آگے بڑھ رہا ہو' جو ملک اور قوم کی خاطر جیل بھی جانے کو خوش بختی سمجھے' جس کی دنیا میں تنہائی ہی تنہائی رہی ہو' جس نے بچپن سے کوئی خوشی نہ دیکھی ہو اور پھر بھی اتنی صاف گوئی کہ خوشیاں حاصل کرلینے کے لیے ذرا سا جھکاؤ بھی برداشت کرنے سے صاف منکر ہو' ہاں یہ ہے اس انسان کی عظمت۔ یہ ایک عظیم انسان ہے اور میں کچھ بھی تو نہیں۔ بس ساری عمر' محبت' سکون اور آرام حاصل کرتی رہی۔ خوشیاں' قہقہے اور سرتیں بٹورا کی۔ اختر جو ہمت کے ساتھ علم کی دولت سے آراستہ ہیں۔ ان کا ساتھی بن جانا میرے لیے باعث فخر ہوگا اور جو اماں کہہ رہی تھیں۔ بجلیاں' سمندر' پہاڑ تو میں اپنے "ہم سفر" کے ساتھ رہ کر سب کو پار کرلوں گی۔ ایک پرچے پر بس اتنا لکھا "آپا کا فیصلہ مجھے منظور ہے" اپنے تکیے کے نیچے رکھ کر غافل سو گئی۔

صبح بہت دیر سے اٹھی جیسے کوئی لمبا سفر کرکے تھکن سے چور چور ہو کر جاگے۔ تخت پر اماں بیٹھی سبزیاں کاٹ رہی تھیں۔ آداب کہہ کر وہ پرچہ ان کے سامنے رکھا اور وہاں سے تو دو گیارہ ہو گئی۔ دوسرے کمرے کا پردہ ہٹا کر آڑ سے ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔ انھوں نے یہ پرچہ کئی بار پڑھا۔ ان کا چہرہ اداس سا لگا۔ میں سارا دن ان کے سامنے نہ گئی۔ اب ان کو "مجبوراً" صبری کرلینا تھا۔

میری بڑی بہن محمودہ' آئی ٹی کالج لکھنؤ میں پڑھ رہی تھیں۔ تین دن بعد چھوٹی دو بہنیں خدیجہ اور رشیدہ لکھنؤ مسلم گرلس اسکول بھیج دی گئیں۔

اب اماں میری شادی کے کپڑے وغیرہ بیچنے اور سلوانے کی تیاری میں لگ گئیں۔

میں ان سے دور دور ہی رہتی۔ جب میرا ان سے آمنا سامنا ہوتا تو میں ان کے چہرے پر اداسی محسوس کرتی۔ کچھ میری وجہ سے اور کچھ سب سے بڑی بہن منور بیگم کی وجہ سے' جن کو ہم سب آپا کہتے تھے۔ وہ ٹی بی کے موذی مرض میں مبتلا تھیں۔ آپا کے دو ننھے ننھے بیٹے خورشید عمر اور جمشید عمر بڑے ہی پیارے تھے۔ سینی ٹوریم میں ایک سال کے قریب رہ کر گھر واپس آگئی تھیں کہ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا۔ ان کی طرف سے اماں کی پریشانی جائز تھی اور پھر ان کو میں نے پریشان کردیا تھا۔ میں تو زیادہ وقت ان دو ننھے بچوں کے ساتھ گزارتی کہ بچے آپا کے کمرے میں جا نہیں سکتے تھے۔ پھر میری ہرنی رانی بھی تو تھی۔ جب موقع ملتا آپا کے کمرے میں چلی جاتی۔ کس ہمت اور حوصلے کی خاتون تھیں۔ کبھی اپنی بیماری یا مایوسی کی باتیں نہ کرتیں۔ بس مجھے آنے والی زندگی کے اونچ نیچ بتایا کرتیں کہ کس قسم کی لڑکیاں کامیاب زندگی گزارتی ہیں۔ اس کے لیے کیسے جتن کرنے ہوتے ہیں۔ انھوں نے مجھے مولوی عبدالحق صاحب کے متعلق بہت کچھ بتایا کہ ان کی شخصیت کتنی عظیم ہے۔ ان کی زندگی کا مشن صرف اور صرف اردو زبان کو فروغ دینا ہے۔ انھوں نے شادی کبھی نہیں کی۔ ان کی کوئی آل اولاد نہیں۔ کبھی کہتیں کہ جب تم بیاہ کر اپنے گھر جاؤگی تو ہر طرف کتابوں کے ڈھیر اور اخباروں کے انبار پاؤگی۔ اس گھر میں صرف دو شخص ہوں گے۔ اختر اور مولوی صاحب۔ بڑی دقیق قسم کی گفتگو سنوگی جو شاید تمھاری سمجھ سے باہر ہو' مگر دیکھو کبھی اپنے چہرے سے عیاں نہ ہونے دینا کہ تم کچھ سمجھ نہیں رہی ہو۔ غور سے سنوگی تو آہستہ آہستہ دماغ کو چلا مل ہی جائے گی۔ سناٹے اور تنہائی کا احساس ہو بھی تو کبھی اپنے منہ پر نہ لانا۔ بے شک تم ایک اتنے بڑے کنبے سے نکل کر ایک اور ہی ماحول میں پہنچ جاؤگی' مگر اپنے کو وہاں کے ماحول کے مطابق ڈھال لینا تاکہ زندگی بھر خوش رہو۔ اور ہاں دیکھو کبھی بات بات پر ہمارے گھر میں یہ' ہمارے گھر میں وہ' ہرگز نہ کہنا کیونکہ درحقیقت چند ماہ بعد تمھارا یہ گھر نہیں رہے گا۔ اصل گھر وہ ہوگا۔ میں سوچتی۔ الٰہی وہ کیسا گھر ہوگا؟ دل کہتا وہاں اختر جو ہوں گے۔ پھر بھی ایک وحشت سی ضرور تھی۔

یہ چند ماہ تیزی سے گزر گئے' دسمبر آگیا۔ ۳۰ دسمبر [illegible]ء کی صبح برات آجائے گی۔ شام کو نکاح اور رات کو کھانا۔ بھائی شوکت عمر اور جمیلہ بھابھی ایک ہفتہ پہلے سے آگئے۔

مولانا عبدالحق برات لے کر آ رہے ہیں۔ ان کے شایانِ شان انتظام ہونا چاہیے۔ وہ انتظامات کے ماہر تھے۔ مولوی صاحب نے پہلے سے لکھ دیا تھا کہ نکاح کے دوسرے روز وہ "کالپی" دریا کے کنارے لنچ کھانا چاہتے ہیں۔ اس لیے وہاں کا ریسٹ ہاؤس بھی سجایا گیا۔

ہر ضلع میں اس وقت تین بہت باحیثیت شخصیتیں ہوتی تھیں جو عام طور سے انگریز ہوتے۔ کبھی اکا دکا آپ کو کوئی ہندو یا مسلمان مل سکتا تھا۔ "اورئی" میں میرے والد مسلمان سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے۔ باقی دونوں انگریز سول سرجن اور کمشنر تھے۔ انگریزوں نے اپنے افسروں کے لیے ہر ہر ضلع میں کئی کئی ایکڑ زمین پر کوٹھیاں بنوائی ہوئی تھیں۔ یہ شہر سے ہٹ کر چھاؤنی کے قریب ہوتیں۔ بے شمار بڑے بڑے کمرے بے حد اونچی چھتیں۔ یا تو کھپرل کی یا کڑیاں رکھ کر دو دو فٹ موٹا پھونس' بڑے لق و دق ہال اور کھانے کے کمرے تاکہ بوقتِ ضرورت ان کو ڈانس ہال کی طرح استعمال میں لایا جا سکے۔ گہری دیواریں بے تحاشا موٹی تاکہ گرمی کا اثر کم ہو۔ چوڑے چوڑے برآمدے۔ کوٹھی کے چاروں طرف جانے کیوں؟ ہر کوٹھی گولائی میں بنائی گئی تھی۔ چاروں طرف ان کے باغات کئی ایکڑ زمین پر پھیلے ہوئے' سرکاری چار چار مالی دیکھ ریکھ کے لیے۔ آموں' امرود اور سنتروں کے گھنے باغات' جن کے تلے لڑکپن اور بچپن کے کھیل آج بھی یاد ہیں۔ یہاں گھن کا سوال ہی نہ تھا۔ کوٹھی سے آدھ فرلانگ ہٹ کر باورچی خانہ اور ملازمین کے کوارٹر۔ دوسرے رخ پر گارڈ کے کوارٹر الگ۔ ان تینوں کوٹھیوں پر بارہ عدد پولیس کی نفری تعینات رہتی۔ چھے سپاہی دن میں چھے رات میں' دو دو کر کے کوٹھی کے اطراف پہرا دیا کرتے۔ شہر سے بالکل باہر ہونے کی وجہ سے رات بھر گیدڑ بولا کرتے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا چیتا اپنے شکار کے تعاقب میں بنگلے کے باغ سے گزر جاتا اور سپاہیوں کی بلند آوازیں ہم کو سوتے سے جگا دیتیں۔

بنگلے کے عین سامنے لق و دق لان اور چاروں طرف پھولوں کی کیاریاں۔ ایک طرف ٹینس کورٹ کا وجود ضروری ہوتا۔ ان چند ماہ میں اپنی پیاری آپا کے دو چھوٹے بچوں' تین چھوٹے بھائیوں اور ایک پانچ سالہ بہن ذکیہ کے ساتھ رہی۔ کوئی ہم عمر بہن نہ تھی۔ ابا کو میرے اکیلے پن کا خیال آیا تو شام کو کلب کے ٹینس کوچ کو بلوا کر میرے ٹینس کھیلنے کا

انتظام کر دیا۔ بیڈ منٹن تو ہمیشہ کھیلا کرتی تھی۔ خاصی جلدی مجھے اس کھیل میں بھی مہارت حاصل ہونے لگی اور دو گھنٹے کھیلنے کے بعد گہری نیند آ جاتی۔

سونے سے پہلے اپنی آپا کے کمرے میں جا کر ان کے پلنگ کی پٹی سے لگ دری پر بیٹھ جاتی اور وہ اپنے محبت بھرے ہاتھ میرے سر پر پھیر کر بڑے خوب صورت طریقے سے جینے کے گر بتایا کرتیں۔ ایک اچھی بیوی کے فرائض ذہن نشین کراتیں۔ ایک بار خوب ہنس ہنس کر کہا "حمیدہ! تم کو خبر نہیں اس گھر میں پہنچ کر تمہیں دو بچے ایک بوڑھا اور ایک جوان ملیں گے۔" آپا میری' آخر یہ کیوں کر؟ بولیں "ایک بچپن سے ماں باپ کی محبت سے محروم رہا اور دوسرا جس نے عقیدت اور اردو کے عشق میں سرشار رہ کر اپنے کو ہر چیز سے بے نیاز کر لیا۔ پہلی بار ایک گھر میں ایک لڑکی کی موجودگی کا احساس جاگے گا۔ دونوں ننھے ضدی بچوں کی طرح تم جیسی الھڑ لڑکی پر اپنا حق جتا کر تنگ کریں گے۔ بڑی عقلمندی برتنا پڑے گی۔ اگر ڈوری کو ڈھیل دے کر رکھا تو چین سے زندگی گزارو گی۔ چلو بھاگو یہاں سے' نماز پڑھ کر سو جاؤ۔ کل ہماری چھوٹی سی بہن کی برات آ رہی ہے۔"

ان تمام سیتوں میں خاص کر آج کی رات مجھے اپنے زاہد عرفی جو ہمارے سب سے چہیتے اور لاڈلے بھائی تھے۔ یاد بے طرح ستاتی رہی کہ ان سے میں بے تکلف تھی اور بلا جھجک ان سے بہت کچھ کہہ سکتی تھی' مگر وہ تو ہم سے ہزاروں میل دور لندن میں پڑھ رہے تھے۔ میرا دل آپا کی آج رات کی باتوں سے بری طرح دھڑک رہا تھا۔ بار بار سوچتی کہ آپا آخر یہ کیا کہہ رہی تھیں کہ میرا واسطہ ایک جوان اور ایک بوڑھے بچے سے پڑے گا۔ مگر سچ سچ ہوا یہی!!

میرٹھ سے میرے دادا دادی' چچا آفتاب عمر اور چچی جو میری سگی خالہ بھی تھیں اور ان کے بچے۔ لکھنؤ سے تینوں بہنیں' ماموں ابا و جنرل شاہد حامد کے والد خان بہادر سید حامد حسین وغیرہ پہنچ چکے تھے۔ سب سو رہے تھے اور میں پلنگ پر لیٹی جاگ رہی تھی۔

—O—

انوکھے براتی

۳۰ دسمبر ۱۹۴۳ کو گیارہ بجے وہاں ٹرین پہنچی۔ پلیٹ فارم پر فرسٹ کلاس کے ڈبے کے سامنے لال قالین بچھے ہوئے تھے۔ دونوں اطراف پولیس کے بینڈ والے کھڑے بگل دھنوں میں شادی کے گانوں کی دُھن بجا رہے تھے۔ قالین کے دونوں طرف شہر کے معزز لوگ اور خاندان والے برات کی پیشوائی کے لیے کھڑے تھے۔ ریل چھک چھک کرکے رک گئی۔ سب سے پہلے کود کر مولوی صاحب پھر ان کے پیچھے اختر وارد ہوئے اور پھر یکے بعد دیگرے ڈاکٹر اشرف، سبط حسن، مجاز، ذکاء اللہ خاں، شرف الطہر علی، بشیر صاحب (علی گڑھ یونیورسٹی کے لائبریرین) اختر کے دو بنگالی دوست، منندر اور رام لعل برآمد ہوئے۔ مولوی صاحب سب سے آگے تھے اور ساتھ میں دولہا میاں اختر اور سارے براتی باآواز بلند گا رہے تھے۔

"لا رویا لالا ہو، لالا کی شادی کردیں گے، ابھی کردیں گے، ابھی کردیں گے"

(زوردار سب کی تالیاں)

لائق دولہا لائیوں ہیں

ان پڑھ لڑکی لے لیں گے

ابھی لے لیں گے۔ ابھی لے لیں گے

(پھر تالیوں کی گونج)

بینڈ والے ایک منٹ کی خاموشی کے بعد اسی دُھن کو بجانے لگے!! ابا، چچا، ماموں کی گردنیں جھک سی گئیں مگر شوکت بھائی مسکرا رہے تھے۔ باقی لوگ حق حیران، ان انوکھے براتیوں کو دیکھ رہے تھے۔ برات کے ساتھ کوئی خاتون نہ تھیں۔

اشرف بھائی اور اختر کو شوکت بھائی نے اپنے ساتھ موٹر میں بٹھایا، بیٹھتے ہی پوچھا کہ یہ کیا ادھم اور نرالی حرکت تم سب نے کی؟ اور مولانا کو کیا ہو گیا تھا؟ بتایا گیا کہ گاڑی

رُکنے سے پندرہ منٹ پہلے مولوی صاحب نے خود ہی تُک بندی کی، ذکّن اور مجاز نے دُھن نکالی، پھر ان ہی کی رائے ہوئی کہ سب گاتے ہوئے اتریں اور ذرا خاکی وردی والے صاحب یعنی (والد صاحب) کا پیچ و تاب دیکھا جائے۔

یہ تو ان کی اپنی خوشی کا اظہار تھا۔ باغ میں ہر براتی کے لیے بڑے خوب صورت خیمے لگائے گئے تھے۔ مولوی صاحب اور اختر کے خیمے زیادہ بڑے تھے۔ ہر غسلخانے میں گرم پانی رکھا ہوا تھا۔ نہا دھو، تیار ہو کر بجائے بنگلے میں آنے کے سب نے باغ کا رخ کیا۔ دور امرود کے باغ میں ہلکی سی گانے کی آواز سن کر شوکت بھائی لپکتے ہوئے وہاں پہنچے تو ان کو معلوم ہوا کہ اختر اور ذکّن کسی گانے کی دھن نکال رہے ہیں اور مولوی صاحب ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو کر اس کی طرز بنانے کی کوشش کر رہے ہیں! شوکت بھائی کو آتا دیکھ کر سب کے سب چُپ ہو گئے۔ شوکت بھائی سب کو گھیر کر اندر لاتے ہوئے کہتے جاتے تھے کہ "اب کوئی اور گُل نہ کھلانا۔ ابا پہلے ہی اسٹیشن پر سب کے سامنے شرمندہ ہو چکے ہیں۔

اور کسی کو تو ہمت نہ ہوئی کہ اماں کو اسٹیشن پر براتیوں کے اترنے اور گانے کا حال سناتا مگر ماموں اُبا بہن کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف لے گئے اور بہت مسکرا کر سارا سین بیان کیا۔ اُماں اپنے بھائی جان سے لپٹ کر آب دیدہ ہو کر بولیں۔ "خدارا! بھائی جان آپ شوکت کے اُبا کو سمجھائیں ابھی وقت اپنے ہاتھ میں ہے۔ میرا ماتھا تو جب ہی ٹھنک گیا تھا جب پچھلے ماہ مولوی صاحب کو ہزار روپے کا چیک یہ لکھ کر کہ اختر سے کہیے کہ اس میں سے ایک شیروانی، کرتا پاجامہ اور ایک سوٹ اور جوتے وغیرہ لے لیں (اس وقت کے ہزار روپے آج کے دس ہزار روپے کے برابر تو ضرور ہوں گے) تو ان حضرت مولانا نے چیک کے چار ٹکڑے کر کے یہ لکھ کر کہ "تم نے مجھے اختر سے شرمسار کرایا۔ کیا سمجھا ہے؟ کہ ان کے پاس اپنے کپڑے جوتوں کے لیے روپے نہیں؟" چیک کے ٹکڑوں کے ساتھ خط بھیجا۔ ماموں اُبا نے ہنس کر کہا۔ "تو یہ اسٹیشن پر گانا ان کا ظفر کو شرمندہ کرنے کی ترکیب تھی۔ مولانا کے مذاق کے طریقے، سنا تھا کہ کچھ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ دیکھو اب کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ مالک ہے اس لڑکی کا۔"

بہت بڑے کھانے کے ہال میں چوبیس لوگوں کی میز پر لنچ (جو سب انگلش کھانا تھا۔ اس

کے ساتھ ہر ایک کے سامنے ایک ایک ٹماٹر سوس کی بوتل تھی) سفید کپڑوں میں بیرے اونچی کلاہ کے صافے باندھے مودب کھڑے تھے۔ لال وردی میں بینڈ کے بیگ پائپر انچیو کی طرح منتظر کھڑے تھے کہ مہمان کرسیوں پر بیٹھ جائیں تو یہ میز کے چاروں طرف گھوم گھوم کر کوئی دُھن بجانا شروع کریں۔ شوکت بھائی نے ہر ایک کو خاص انداز سے بٹھایا۔ بیرے گرم گرم کھانے کی ڈشیں لاکر کھانا پیش کرنے لگے اور دُھن شروع ہوگئی۔ سب نے کھانا لے لیا۔ مولوی صاحب براتیوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔ "بھئی اس توں' توں' پی پی میں کھانا کیوں کر کھایا جا سکتا ہے؟ چلو تو پھر پی ہی لیں۔" یہ کہہ کر ٹماٹر سوس کی بوتل منہ سے لگا کر غٹ غٹ پینے لگے۔ ان کی دیکھا دیکھی ہر براتی اور اختر نے بھی یہی حرکت کی۔ اَبا نے ہاتھ کے اِشارے سے بیگ پائپر کو باہر جانے کو کہا۔ تب ٹماٹر سوس کی بوتلیں میز پر رکھ دی گئیں اور مہمانوں کے سامنے اَبا کو پھر کیسی شرمساری ہوئی۔ بہنیں دوسرے کمرے کے پردوں کی آڑ سے یہ تماشا دیکھ کر ہنسی سے بے حال میرے کمرے میں دوڑی آئیں اور سارا ماجرا بیان کیا۔ میری تو جان نکلے جا رہی تھی کہ الٰہی یہ کس قسم کے لوگ ہیں۔ آگے کیا ہوگا؟

کھانا ختم کر کے مولوی صاحب یہ کہتے ہوئے اٹھے۔ "چلو چلو اپنے خیموں میں ہم سب کو تو بنجارا سمجھا گیا ہے۔" ان کے پیچھے سب چل پڑے۔ باقی مہمان حق دق ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔"

پیچھے شام آ ہی گئی۔ مہمان آنا شروع ہو گئے۔ قاضی صاحب بھی آ گئے۔ تب یہ نہ ہوتا تھا کہ مہر پہلے سے طے کر لیا جائے بلکہ اسی وقت خاموشی سے سر جوڑ کر بات چیت کر کے مہر طے پاتا تھا۔ نہ نکاح کے چھپے ہوئے فارم ہوتے تھے۔ قاضی صاحب اپنے قلم سے لکھتے۔ لڑکے اور لڑکی کی طرف والے دستخط کر دیتے۔ سیّد حامد حسین میرے ماموں' مولوی صاحب کے پاس آکر مودب ہو کر جھک کر بڑی آہستہ آواز میں دریافت کرتے ہیں۔ "مولانا صاحب آپ مہر کا طے کر دیں۔" مولوی صاحب اُچھل سا پڑتے ہیں اور با آواز بلند بڑی معصومیت سے کہتے ہیں۔ "حامد تم یہ مہر کا کیا نام لے رہے ہو۔ ہم تو اختر کی شادی حمیدہ سے کرنے آئے ہیں۔" وہ گھبرا کر کچھ پیچھے ہٹ کر پھر آگے بڑھتے ہیں یہ کہتے ہوئے۔ "جی وہ مہر کوئی لڑکی نہیں ہے۔ یہ شادی کے وقت جو رقم بطور مہر طے کی جاتی ہے میں تو

اس کی بات کر رہا ہوں۔" تو مولوی صاحب بے ساختہ اور بھی زور سے کہتے ہیں۔ "اچھا تو تم لڑکی کو بیچ رہے ہو۔ سنا لوگو!" سب حق حیران کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ "اچھا بولو بولو کیا بولی تم سب نے اس بچاری لڑکی کی لگائی ہے۔"

"جو بڑی بہن اور گھر کی بہو کا ہے یعنی پچیس ہزار' وہی مہر رکھیں گے۔" مولوی صاحب نے جھٹ جیب سے چیک بک نکال اتنی رقم کا چیک لکھ کر ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ پہلے قاضی صاحب کے کان میں کچھ کہہ کر چیک لے کر اماں کے پاس اندر آئے اور ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ میری والدہ کے تن بدن میں جیسے آگ سی لگ گئی۔ چیک کے چار ٹکڑے کر کے (جیسے والد صاحب کے چیک کے چار ٹکڑے کر کے مولوی صاحب نے ان کو واپس کیے تھے' ایک چاندی کی تھالی میں رکھ کر اپنے بھائی کے ہاتھ میں دی اور بولیں' بھائی جان یہ آپ ان بزرگوار کو دے آئیں۔ انھوں نے سمجھا کیا ہے کہ مہر لینے کے لیے لکھوایا جاتا ہے یہ تو مجھے انتہائی بدنیت لوگ لگ رہے ہیں۔" ماموں ابا انکار کیے جاتے کہ نا بابا میں تو یہ ٹکڑے لے جا کر ان کو دے کر بھری محفل میں مولانا کی اتنی سیدھی بات سننے والا نہیں۔

اماں نے بھائی کو قسم دی کہ آپ یہ ان کو دے آئیں۔ آخر کو وہ باہر گئے اور خاموشی سے چاندی کی طشتری ان کے ہاتھ میں دے کر جلدی سے وہاں سے ہٹ گئے۔ مولوی صاحب چیک کے ٹکڑے دیکھ کر خوب ہنسے اور ایک ایک ٹکڑا ہاتھ میں پکڑ کر پھونک مار مار کر اِدھر سے اُدھر اُڑا دیا۔ اندر آکر پہلے مجھ سے پوچھا گیا پھر باہر جا کر "حمیدہ بنت عمر... وغیرہ وغیرہ آپ کو قبول؟" مولوی صاحب بول اٹھے۔ "قبول نہ ہوتی تو ہم حیدر آباد سے اٹھ کر آتے ہی کیوں؟" قاضی صاحب' مولوی صاحب کی حیثیت اور دبدبے سے ناواقف ذرا اکھڑ کر بولے۔ "اس کا جواب دولہا میاں خود دیں گے۔ آپ خاموش رہیں۔" تو جھٹ ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش ہو بیٹھے۔ چلیے یہ مرحلہ ختم ہوا۔ اب جو صاحب سہرا لکھ کر لائے تھے' وہ اُٹھ کر کھڑے ہوئے کہ "ایک سہرا بندہ لکھ کر لایا ہے وہ پیش خدمت ہے۔" مولوی صاحب جھٹ سے کھڑے ہو کر کہتے ہیں کہ "جناب آپ کس خوشی میں سہرا پڑھیں گے۔ خوشی کا موقع تو ہمارے لیے ہے کہ ہم دلہن بیاہ کر لے جا رہے ہیں۔" مجاز کی طرف دیکھ کر کہا میاں چھوٹے آپ اِدھر آجائیں۔" قریب بیٹھے لوگ سمجھے کہ

میاں جوش کہا۔ ادھر اُدھر دیکھ کر آپس میں کہا مگر جوش صاحب یہاں تو نظر نہیں آئے۔ اختر تخت سے اٹھ کر مولوی صاحب کے پاس آ گئے۔ باقی براتی تو پہلے ہی سے ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ پہلے مولوی صاحب کھڑے ہوئے اور ساتھ براتی کھڑے ہو گئے۔ ابا' چچا' آفتاب عمر' ماموں حامد حسین صاحب اور شوکت عمر کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں کہ اب کیا اور گل یہ سب مل کر کھلائیں گے اور ہوا بھی یہی۔ جمیل بھائی! ذرا سہرے کے بول تو سنیے۔ بھلا آپ اس قدر ہنس کیوں رہے ہیں۔ یہ تو بابائے اردو نے خود ہو ڈو تو ڈکر کے کیا ہے۔

ایک یار ہمارا پھرتا تھا یوں مارا مارا
جیسے ہو ایک مرغ بچارا
ڈھونڈ ہے سارا ڈربے کا ڈربے کا
یہ کیا تم نے دل میں ٹھانی
لکھ ڈالی سب رام کہانی
سہ مندر کی' بھئی مندر کی
بس کھلونا بھائی تماشا
آگے تانگا پیچھے گھوڑا
بھان متی کے کنبہ سے
تم نے ہے رشتہ جوڑا
پہنے خاکی وردی ہاتھ میں ڈنڈا
تن کے چلے ہے دلہن کا باوا

جمیل بھائی آپ ایمان لگتی کہیں کہ اگر اس نئے زمانے میں بھی براتی ایسی حرکات کریں تو کیا ڈنڈے لگا کر برات اسی وقت بھگا نہ دی جائے۔ مگر یہاں واسطہ تو مولوی عبدالحق صاحب سے تھا جن کے اس وقت سارے ہندوستان میں ڈنکے بج رہے تھے۔ بزرگوں کا حال بس یہ تھا "تک تک دیدم۔ دم نہ کشیدم"

سہ اختر کا ایک افسانہ "میرے خوابوں کا مندر" ہے۔ اشارہ اسی کی طرف ہے۔

کھانا میز پر لگ گیا۔ پہلے براتیوں کو لے کر شوکت عمر آگے آگے چلے اور پیچھے سے بیلے اور اشرف سے کہا۔ "خدا کے لیے اب کوئی اور نیا گل نہ کھلانا۔ ابا کے صبر کا پیانہ لبریز ہو چکا ہے۔" ------ "ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔" اب مولوی صاحب اپنے بچکانہ موڈ سے نکل چکے تھے۔ مختلف لوگوں سے سنجیدہ ہو کر بات چیت کرتے رہے۔

کھانے کے بعد مہمان رخصت ہونا شروع ہو گئے۔ جانے بھائی جان کو کیا سوجھی جو مولوی صاحب سے کہا۔ "ذرا اندر تشریف لے چلیں اور ایک نظر جہیز دیکھ لیں تاکہ جہیز بند کر دیا جائے۔ کالپی (اورئی شہر سے دس میل پر ہے) یہ کالپی نامی دریا بڑے حسین مقام سے گزرتا ہے۔ دونوں طرف چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں' ڈھلان پر پہلے پھلوں کے باغات اور اس کے بعد ہرے بھرے کھیت حد نظر تک چلے گئے تھے۔ چھوٹی چھوٹی کشتیاں جب گزرتیں تو دسمبر کے مہینے میں وہ لاکھوں پرندے جو برفانی علاقوں سے پناہ لینے آجایا کرتے تھے۔ پرے کے پرے اُڑ کر ادھر سے اُدھر ہو جاتے۔ ٹیلوں پر سے کبھی کبھار ہرنوں کی ٹولیاں کھیتوں کا رخ کرتیں' نیچے کی طرف چھلانگیں لگاتی دکھائی دیتیں اور کبھی بارہ سنگوں کا غول نظر آتا۔ اس علاقے میں چیتوں کی کمی نہ تھی۔ ریسٹ ہاؤس جو خاصی بلندی پر تھا وہاں سے چیتے کو ہرن یا بارہ سنگے کے شکار کے تعاقب میں زقانٹے بھرتے بھی دیکھ سکتے تھے۔ اس لیے لوگ بس ریسٹ ہاؤس کے کنارے سے دریا اور ان جانوروں کا نظارہ کرنے پر اکتفا کرتے۔

ہاں تو شوکت عمر مولوی صاحب کو لے کر اس کمرے میں گئے جہاں جہیز سجا کر رکھا گیا تھا۔ ان کی نظر سب سے پہلے اس کونے کی طرف گئی جہاں پتیلیاں ایک دوسرے پر رکھی ایک چھوٹے سے مینار کی شکل میں تھیں۔ اپنی چھڑی سے ان کو ٹھک ٹھک کیا۔ وہ دھما دھم نیچے ڈھلک کر گرنے لگیں۔ بولے "بھئی یہ سب کیا ہے؟ کیا ہمارے گھر میں پکانے کو برتن نہیں؟ میز پر سب سے پہلے ان کو چاندی کا پاندان اور خاصدان نظر آیا۔ اس کو بھی چھڑی سے نیچے گرایا۔ "چھی چھی یہ اور ہمارے گھر جائے؟" پھر ادھر اُدھر نظر دوڑا کر کہا۔ "یہ الّم غلّم کچھ ہمارے ساتھ نہیں جائے گا۔" "صرف حمیدہ کے اپنے پہننے کے کپڑے اور ذاتی استعمال کی دو چار چیزیں' اور یہ بستروں کا ڈھیر! کیا ہمارے گھر میں بستر نہیں؟ بھائی جان نے ڈرتے ڈرتے آہستہ سے کہا۔ "مگر یہ سب چیزیں تو ہر لڑکی کو دی ہی جاتی ہیں۔"

"تمہارے گھر میں اور جو دسیوں لڑکیاں ہیں ان کے لیے رکھ لو۔" یہ کہہ کر کمرے سے
بے زار سے نکل گئے۔ پل پل کی خبریں چھوٹے بہن بھائی آ کر دے رہے تھے۔ اپنی بڑی
بہن محمودہ کی بڑی خوشامد کی کہ سوٹ کیس میں کپڑے کم کر کے میرے دونوں تکیے ضرور
رکھ دیں کہ میں بنا ان کے سو نہیں سکتی تھی اور یہ میری عادت آج تک نہ گئی۔ رات کو
کئی گھنٹے آتش بازی چھٹتی رہی اور وہ سب مگن ہو کر دیکھا کیے۔

صبح ناشتے کے بعد وہ سب اور ہم پلنگ کا سامان لے کر کالپی روانہ ہو گئے۔ ریسٹ
ہاؤس میں پہلے اِطلاع کی جا چکی تھی' ہر طرح کا انتظام تھا۔ بھائی جان نے اپنے ساتھ اختر'
اشرف اور سیلے کو بٹھا لیا۔ مولوی صاحب ابا اور ماموں' ابا کے ساتھ موٹر میں بیٹھے۔ ہم
سب اور باقی براتی پانچ موٹروں میں روانہ ہوئے۔ اب ابا کی مولوی صاحب سے کیا بات
چیت ہوئی۔ وہ مجھے یوں معلوم نہیں کہ مولوی صاحب نے نہ خود ذکر کیا اور نہ میں نے
پوچھا۔ اختر نے کبھی ہنس ہنس کر بتایا کہ بھائی جان نے تینوں کو قائل کرنے کی کوشش کی
کہ تم سب کی حرکات بڑی شرمساری کا باعث بنیں' موقع محل تو دیکھنا تھا۔ جس پر اشرف
بھائی نے کہا۔ "ہم سب کو موقع محل ہی تو مدِ نظر تھا' کیوں کہ مولوی صاحب نے کہہ دیا تھا
کہ ہم سب بہت خوش خوش ایک بڑی خوشی پر جا رہے ہیں۔ ہر صورت میں ہماری طرف
سے خوشی اور مسرت کا اظہار ہونا چاہیے تاکہ لوگ عرصے تک اس شادی کے براتیوں کو
یاد رکھیں۔ پھر انہوں نے خود سب کے ساتھ مل کر تک بندی کی۔ اس میں اختر کا بھی ہاتھ
تھا۔ اب یہ اور بات ہے کہ تم لوگ بڑے بدمذاق ہو' سمجھنے اور محظوظ ہونے کی صلاحیت
ہی نہ تھی۔ یا گردنیں جھکی ہوئی تھیں یا چہرے ہونق تھے۔ شادی کی محفل تھی۔ خوشی کا
موقع تھا' کوئی مجلس تو نہ تھی جو ہم سب ماتم کرتے ہوئے اترتے"!! کالپی میں تو خدا را
انسانیت کا دامن پکڑے رہنا۔ اختر نے کہا۔ "شوکت تم انسانیت کہیں سے اگر ہم کو لا دو
تو ہم صرف دامن ہی نہیں اس کا گریبان بھی پکڑ لیں گے۔"

موٹروں سے جب سب اُتر گئے تو شوکت بھائی میرا ہاتھ پکڑ کر مولوی صاحب کے پاس
لے گئے۔ "یہ حمیدہ ہیں۔" میں نے جھک کر آداب کیا۔ میرا سر ضرورت سے زیادہ ہی
شاید جھکا ہوا تھا اور دوپٹہ اس طرح کھینچ کر اوڑھے ہوئی تھی کہ منہ نہ دیکھ سکیں۔ اس
وقت میرے دُبلاپے کا ایک عالم تھا۔ ان کو شاید میں بہت ہی چھوٹی سی لگی۔ خود کو خوب

جھکا کر میرا منہ دیکھا اور اپنا سر اونچا کرنے کے بعد کہا۔ "ابھی ہم کو تو ڈر ہے کہ کہیں
"شاردا ایکٹ"* میں ہم لوگ دھر نہ لیے جائیں۔ یہ تو ذرا سی لڑکی ہے۔" پھر میرے سر
پر ہاتھ پھیرا اور ایک ڈبیہ میرے ہاتھ پر رکھ دی۔ اس میں بے حد خوب صورت جھمکے
کے لیے لیے بندے تھے۔ جواب میں نے اپنی سب سے چھوٹی بہو کو دے دیے۔ میرا دوسرا
ہاتھ پکڑ کر اختر کے پاس لائے اور بولے۔ "بیٹی ان کو بھی سلام کرو' ان کا نام اختر حسین
رائے پوری ہے مگر یہ ہیں بڑی توپ چیز' ذرا سی بات پر بگڑ جاتے ہیں۔ چھوٹی سی بات پر
خوش بھی ہو جاتے ہیں۔" دل بے حد چاہا کہ ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھوں کہ بگڑنے کے
موڈ میں ہیں یا خوش ہونے کے۔ پر اتنی ہمت کیسے کرتی؟

اختر نے ایک ڈبیہ اپنی جیب سے نکالی اور میرا الٹا ہاتھ پکڑ کر انگوٹھی پہنانے کی کوشش
کی۔ انگوٹھی فیروزے کی تھی مگر اتنی چھوٹی کہ میری چھوٹی انگلی میں آئی۔ اب مولوی
صاحب اماں کی طرف بڑھے' انہوں نے تسلیم کرنے کے بعد پوچھا۔ "آپ کے مزاج عالی
ٹھیک ہیں نا؟ میں آپ سے صرف اتنا کہنا چاہتی ہوں۔ حمیدہ ایک بہت بڑے کنبے سے نکل
کر آپ کے ساتھ بہت دور جا رہی ہے۔ بھولی بھی اور معصوم بہت ہے۔ اس کے ساتھ
آپ اور اختر میاں بس اتنا مذاق روا رکھیے گا جتنا اس کا کچا دماغ سمجھ سکے۔ ہو سکتا ہے
اس کو آپ کے گھر میں تنہائی کا احساس ہو اور اس کا اظہار بھی کبھی کبھار کرے تو آپ
درگزر کیجیے گا۔" اماں کا اندازِ تکلم ان کو کچھ اس قدر وزن دار لگا کہ بغیر جواب دیے
میرے پاس آئے میرا ہاتھ پکڑا' پھر اختر تک جا کر ایک ہاتھ ان کا پکڑا اور گردن موڑ کر
کہا۔ "ہم دریا کے کنارے سیر کو جا رہے ہیں' کھانے کے وقت تک لوٹ آئیں گے اور تم
سب بھی تو سیر کر آؤ۔" میں نے گردن موڑ کر اماں کو اجازت طلب نظروں سے دیکھا۔
انہوں نے سر سے اشارہ کر دیا گویا اجازت دے رہی ہیں۔

جب ہم ریسٹ ہاؤس سے ڈھلان پر اُترنے لگے تو مالی بھاگا ہوا آیا۔ "بچے زیادہ نہ
جائیے گا' آج کل کئی چیتوں کے جوڑے اس علاقے میں آئے ہوئے ہیں۔" مولوی
صاحب بولے۔ "یہ تو بہت اچھا ہے ان سے بھی ملاقات ہو جائے گی پھر جانے بھی کہاں

* [illegible]

آنا ہو بھی یا نہیں۔" اور تیز تیز قدم بڑھاتے باغوں میں گزرنے لگے۔ سامنے جب لہلہاتے ہوئے کھیت اور بل کھاتا ہوا دریا اور اس میں تیرتے ہوئے لاکھوں پرندے نظر آئے تو بہت خوش ہوئے۔ بلا تکلّف مجھ سے باتیں کرتے جاتے۔ اگر چیتا سامنے آگیا تو تم ڈر کر کیا کرو گی؟ میں نے جواب دیا۔ "میں کیوں ڈروں گی۔ چیتے تو ہزار بار میں نے بھاگتے ہوئے دیکھے ہیں۔ ہاں شیر کی اور بات ہے' جب وہ دھاڑتا ہے تو اس کی آواز سے ڈر کر پتّے کی طرح کانپ اٹھتی ہوں۔ ہمارے والد' ماموں اور بھائیوں کو شکار کا بے حد شوق تھا۔ کئی بار والد کی پوسٹنگ ہمالیہ کی ترائی والے ضلعوں میں ہو چکی تھی۔ بچپن سے ان کے ساتھ شکار پر جاتے۔ شیر کے شکار میں پیڑوں پر بنے مچانوں پر بیٹھتی۔ گو وہ شیر کی گرفت سے بہت اونچی ہوتیں لیکن جب شیر کی دہاڑ سنتی سارا جسم کانپ اٹھتا تھا۔ شکار کے چٹخارے میں والد کی ایک ٹانگ شیر کی نذر ہو چکی تھی۔ ایک بھائی کے ہاتھ پر گولی لگ چکی تھی مگر ابّا کا شوق اسی طرح رہا اور نہ ہماری والدہ ہی ان حادثوں سے ڈریں۔ اکثر جب والد ہم سب کو اپنے ساتھ لے جاتے تو وہ خود بھی جاتیں۔

اب میری باری تھی کہ مولوی صاحب کو ذرا غور سے دیکھا جائے۔ میرے ایک ہاتھ کو مولوی صاحب بڑی آہستگی سے پکڑے ہوئے تھے اور دوسرے ہاتھ کو اختر بہت مضبوطی سے۔ ایک بول رہے تھے اور دوسرے خاموش۔ میں نے ایک منٹ کے لیے قدم روک لیے تو لامحالہ دونوں کو رُکنا پڑا' میں مولوی صاحب کی طرف گردن موڑ کر ان کی آنکھوں کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگی' ان کی نظریں میری اس جسارت پر حیران ہو کر لمحہ بھر کو مجھے غور سے دیکھنے لگیں۔ ساتھ ہی ماتھے پر دو بل بھی نمودار ہوئے۔ کتنی صاف شفاف اور محبت شفقت سے لبریز نگاہیں تھیں۔ نظر جما کر وہ بھی میری طرف دیکھنے لگے۔ ان کی نگاہ کی گہرائی کا احساس ہوا کہ جیسے یہ مجھے پڑھ رہے ہیں۔ مجھے تو یوں لگا جیسے میرا ایکسرے لے لیا انہوں نے۔ اس عمر میں کیسی روشن اور موتی جیسی چمک۔ ہلکا سا مسکرائے بولے۔ "بس دیکھ لیا۔ کیا لگا میں تم کو' ہوّا تو نہیں ہوں۔" میرا جواب تھا۔ "نہیں ایسی کوئی بات نہیں' مجھے تو لگا کہ آپ کی شفقت بھی ملے گی اور دوستی بھی۔" خوب ہنسے کہا۔ "بھئی اختر یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ لڑکی بولنا جانتی ہے اور نہ ہم سے ڈرتی ہے اور نہ چیتے سے۔" "اب اختر مجھ سے مخاطب ہو کر بولے۔ "آپ کسی خوش فہمی میں نہ رہیے گا۔ یہ حضرت گھڑی

میں مہربان اور پل میں "قہرمان" ہو جاتے ہیں۔" پھر کچھ شکار کی باتیں شروع کر دیں اور اختر سے کہنے لگے۔ "کیا خیال ہے اگر ہم یہاں کالپی میں اس دریا کے کنارے ایک زمین خرید کر چھوٹا سا کاٹیج بنوالیں۔ سال میں ایک بار ایک دو ماہ یہاں آکر رہا کریں اورنگ آباد کا حُسن انسانوں کے ہاتھ کی سجاوٹ کے ساتھ ہے اور یہاں حُسن صرف قدرت کی کرشمہ گری ہے۔" ایک کھیت میں سے گزرتے ہوئے ایک بڑا سا برگد کا پیڑ تھا جس کی جڑ کے ساتھ ایک پکّا چبوترا اور اس پر ایک مورتی بیٹھی ہوئی تھی' کچھ دیے جو کبھی جلائے گئے ہوں گے رکھے تھے۔ اِدھر اُدھر کچھ سیندور اور سوکھے گیندے کے پھول بکھرے ہوئے تھے۔ مولوی صاحب یہاں رک گئے اور جھک جھک کر حیدر آبادی طریقے کے کئی سلام کیے۔ اختر نے کہا۔ "حضرت مولوی صاحب دیوی کو سلام نہیں نمسکار کی جاتی ہے۔" ہنسے اور بولے۔ "جناب میں تو "زبان بے زبانی" سے (اختر کا یہ پہلا افسانہ میں نے پڑھا' دل پر بے حد اس کا اثر ہوا اور سچ تو یہ ہے کہ اس افسانے ہی نے ہم دونوں کو یک جا کر دیا) برگد کو سلام کر رہا تھا جس کے طفیل ہم کو ایک بیٹی بھی مل گئی۔ اچھا اب تم دونوں دریا کے کنارے تک سیر کر آؤ۔ میں تو چبوترے پر لیٹ کر لطف اٹھاؤں گا۔

مجھے اب مولوی صاحب ذرا بھی اجنبی انسان نہ لگے اور نہ ان سے ڈر لگا' جیسے ہمیشہ سے ان کو جانتی ہوں۔ میں نے کہا۔ "جی نہیں' ہم آپ کو اکیلے چھوڑ کر آگے نہیں جائیں گے۔ آپ کے ہاتھ میں تو چھڑی ہے۔ کوئی چیتا آگیا تو آپ اس کو چھڑی سے ماریں گے اور وہ ہم پر پل پڑے گا۔" خوب ہنسے اور بولے۔ "پھر تم دونوں بھی دس منٹ یہاں بیٹھ جاؤ پھر واپس چل پڑیں گے۔ ورنہ ظفر عمر کے سپاہی ہماری تلاش میں نکل پڑیں گے۔" کچھ دیر بعد ہماری واپسی شروع ہو گئی۔

لان پر بڑی سی لال اور نیلی دھاری کی دری بچھی ہوئی تھی۔ اس کے درمیان ایک سفید بُراق دسترخوان' سلیقے سے برتن اور گلاس رکھے ہوئے' درمیان میں اچار چٹنیاں چھوٹی چھوٹی کٹوریوں میں' اور بڑے بڑے تھالوں میں ملے جُلے پھل' جیسے ہم تینوں کے انتظار میں سب لوگ تھے۔ فوراً ہی تو کھانا لگنا شروع ہو گیا۔ مولوی صاحب ابّا کے پاس بیٹھے "کالپی" کی خوب صورتی کی باتیں کرنے کے بعد اُردو کے متعلق باتیں کرنے لگے کہ "اورئی" ضلع میں جو اسکول ہیں ان میں کتنوں میں اردو زبان ہے؟ کتنوں میں ہندی؟ ان

کی معلومات رکھنا ہر مسلمان افسر کا فرض ہے۔ میرے والد ایک باخبر انسان تھے تفصیل سے ان کو بتایا تو مولوی صاحب نے بڑے افسوس ناک لہجے میں کہا۔ جب اس ضلع کی مسلمان آبادی زیادہ ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہر اسکول میں ہندی کے ساتھ "اردو" شامل نہ ہو۔ تمہاری یہ لائن نہ سہی مگر اپنے اثر و رسوخ سے گورنمنٹ کی توجہ دلانے کے لیے کوشاں ہو جانا چاہیے۔ یہ ہر شخص کا فرض ہے۔ وقت تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ غفلت برتنا تباہی کے غار میں گرنے کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ پھر بہت سارے ان لوگوں کے بارے میں دریافت کیا جو ان کے اور ابا کے مشترکہ جاننے والے اور دوست تھے۔ آخر میں پوچھا کہ پھر ان یوسف الزماں ؎ کی بیٹیوں کا کیا بنا جن کو وہ خدا کو پیارے ہوتے وقت تمہارے سپرد کر گئے تھے۔ ہم سب ہی کے کان کھڑے ہو گئے کہ مس یوسف اور ان کی باجی سے ہم سب کا واسطہ پڑا تھا اور لندن میں ہمارے زاہد عمر بھائی کا مس یوسف سے اسی وقت، جب وہ لندن میں پڑھنے گئے۔ شروع میں ان صاحبہ کے گھر رہے تھے۔ وہاں پہنچنے کے بعد سے ان کا ہر خط مس یوسف کے ظالمانہ سلوک کے قصوں سے بھرا ہوتا تھا۔ یہ ایک بڑی دلچسپ کہانی ہے۔ وقت میرے پاس کم ہے اس کو لکھنے بیٹھ گئی تو اصل کہانی شاید ادھوری ہی رہ جائے گی۔

ہاں تو شام کی چائے پی کر کالپی سے واپسی ہوئی۔ رات کو نو بجے کی گاڑی سے حیدر آباد روانہ ہونا تھا۔ اب شدت سے احساس ہوا کہ ارے میں تو سب سے ہزاروں میل دور جا رہی ہوں۔ بار بار رونا آتا۔ اپنی آپا کے کمرے میں آکر رونا شروع کر دیا۔ وہ بستر پر ہر وقت لیٹی رہتی تھیں۔ اٹھ کر بیٹھ گئیں اور بہت ہنس کر پیار سے کہا۔ "بے وقوف لڑکی یہ کوئی رونے کی بات ہے تم تو اب اپنے نئے گھر جا رہی ہو۔ جاؤ اختر کو تو بلا کر لے آؤ۔ میں بھی تو ذرا ان سے ملوں۔" آنسو پونچھ کر بھائی جان سے کہا کہ اختر کو بلا دیں کہ وہ آپا کو سلام کر لیں۔ آپ کو تو خود یہ خیال آنا چاہیے تھا کہ اختر کو ان کے پاس لے جا کر ملواتے۔ واقعی وہ شرمندہ سے ہو کر رہ گئے۔ اختر، مولوی صاحب کے پاس بیٹھے تھے، بلا لائے اور مجھ سے کہا "جاؤ اب تم خود ہی اختر کو ان سے ملوا دو۔" اندر کے کئی کمرے پار کر کے پیچھے کے برآمدے میں اختر کو لائی اور اس کے کونے والے ہوا دار کمرے میں لے گئی۔ آپا ایک

؎ یوسف الزماں لکھنؤ کے اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ (خلیق الزماں کے سب سے چھوٹے بھائی)

ہاتھ کو اپنی ٹھنڈی پر رکھے ہوئے بیٹھی ہوئی تھیں۔ لیمپ کی روشنی ان کے چہرے پر سب سے زیادہ پڑ رہی تھی، کس قدر خوب صورت لگ رہی تھیں۔ بے حد صاف رنگ، تیکھے تیکھے نقوش، سیاہ لمبے بال، ان کی بڑی بڑی آنکھیں اور چہرہ بخار کی تمتماہٹ سے دمک رہا تھا۔ اس موذی ٹی بی کے مریض کو شام سے ہی بخار چڑھ جاتا ہے۔ قدموں کی چاپ سن کر چہرہ دروازے کی طرف موڑا، مسکرائیں اور بولیں "آیئے، میاں اختر آیئے، اس کرسی کو ذرا لیمپ کی طرف کھینچ کر دو گھڑی بیٹھ جائیں کہ میں اچھی طرح آپ کو دیکھ سکوں۔ برسوں سے لڑکیوں کی زبانی مزے دار باتیں آپ سب کی سنتی رہی ہوں۔ بڑا اشتیاق تھا آپ کو قریب سے دیکھنے اور کچھ باتیں کرنے کا۔ قدرت کی ستم ظریفی پر ہنسی سی آتی ہے کہ جو ہماری بہن سب سے زیادہ بدھو ہے، وہ آپ جیسے علم کے رسیا کے پلے پڑ رہی ہے۔ شاید اللہ میاں توازن کو ایسے ہی طریقوں سے قائم رکھتے ہیں۔

اختر کی نظریں ان کے چہرے پر یوں جمی ہوئی تھیں جیسے یہ مرقع چغتائی کو ہمیشہ کے لیے اپنے ذہن کے کینوس پر جما رہے ہیں۔ اختر کے پورے وجود پر مجھے یوں لگا کہ جیسے غم کا سایہ پھیل گیا ہو۔ پھر بولیں۔ "ہماری یہ بہن ایسی ہے کہ پلّے کا سب کچھ دے کر واپس مانگنا نہیں جانتی۔ اس کا آپ اگر تھوڑا سا بھی خیال رکھیں گے اور بڑی کنجوسی سے محبت دے سکے تو خود آپ عمر بھر بہت کچھ اس سے حاصل کریں گے۔ میری ایک ہی نصیحت دونوں کے لیے ہے کہ خوش رہیں اور خوش رکھیں، ورنہ اس زندگی میں دھرا ہی کیا ہے۔" ہم دونوں کو اپنے پاس بلا کر اپنا نازک لمبی لمبی انگلیوں والا ہاتھ پھیرا۔ "خدا تم دونوں کا محافظ ہے۔ اچھا اب جاؤ۔" میں رو پڑی تو ذرا ڈپٹ کر بولیں۔ "یہ بودا پن نہ اماں کو پسند ہے نہ مجھے۔ ہاں وہ سامنے ہلالی کی گٹھری تمہارے لیے تیار کر کے رکھی ہے اٹھا لو ورنہ مردانے گھر میں تم کو نہ سوئی ملے گی نہ بٹن دھاگا۔ اس گٹھری کی یہ تاریخ ہے کہ اماں کی نانی کی تھی۔ بیٹیوں کو ملتی رہی۔ اسی طرح تم بھی کسی بیٹی کو دے دینا۔ سوچو کہ یہ چار پشتوں کے ہاتھوں سے گزر کر تم کو مل رہی ہے۔ بھلا بتاؤ کہ اس کی عمر کتنی ہو چکی ہے۔" میں وہ گٹھری ہاتھ میں اٹھا کر ان کو مڑ مڑ کر دیکھتی اختر کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آئی۔ بولے "تمہاری یہ بہن کتنی خوش شکل ہیں۔ مجھے ایسا لگا کہ مرقع چغتائی سے کوئی تصویر نکل کر پلنگ پر بیٹھ گئی ہے۔" اور لمبی گہری سانس بھی لی۔ اختر نے اپنی اتنی کم عمری

کے باوجود دنیا بہت دیکھ لی تھی۔ شاید وہ سمجھ گئے کہ ان کی زندگی کی شمع بس بجھنے والی ہے۔ میں ان کے اتنے پاس رہ کر بہن ہو کر بھی نہ سمجھ سکی۔

اسٹیشن کے لیے روانگی کا وقت آچکا تھا۔ سامان اسٹیشن پہلے ہی بھیج دیا گیا تھا۔ میں ایک ایک سے مل کر رونے لگی تو اختر خود بھی رو پڑے۔

اماں نے مجھے ذرا سا پرے لے جا کر میرا چہرہ اونچا کر کے کہا "آنسو تو بہاؤ نہیں مجھے یہ بہت ناپسند ہیں۔ حمیدہ یہ یاد رکھنا گھر اینٹ پتھر سے نہیں بنا کرتے بلکہ دل میں بنتے ہیں۔ کبھی دل و دماغ میں اختر کا اپنے بھائیوں سے مقابلہ نہ کرنا۔ نہ کبھی اپنے ابا کے گھر سے اپنے گھر کا مقابلہ کرنا۔ تمہارے ابا اپنی زندگی کے آخری سرے پر آ گئے ہیں اور اختر زندگی شروع کر رہے ہیں۔ کبھی کسی کا زیور مانگ کر نہ پہننا اور نہ ادھار پر گھر چلانا۔ جو روپے تم کو گھر کے خرچ کے لیے دیے جائیں اس کا حساب ہر روز لکھنا' اس کو یوں سمجھنا کہ یہ امانت تمہارے ہاتھ میں دی گئی ہے۔ مولوی صاحب کا ادب اپنے ابا کی طرح کرنا مگر اس کوشش میں لگی رہنا کہ اختر اپنے والد سے مل جائیں' تب ہی تم میری بیٹی ہوگی۔ اچھا اب تم سوار ہو۔" جس طور انہوں نے یہ باتیں کہیں' ہرگز ان کی آواز یا آنکھوں سے مجھے یہ معلوم نہ ہونے پایا کہ غمگین ہو رہی ہیں تو لامحالہ مجھے اپنے کو رونے سے باز رکھنا پڑا۔ ابا نے دو قدم آگے بڑھ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا' خدا حافظ کہا اور اپنے کمرے کے اندر چلے گئے۔

بھائی جان' چچا ابا' چھوٹے بہن بھائی اور بہت سے رشتے دار اسٹیشن پر ہم کو سوار کرانے آئے۔ ریل کھڑی ہوئی تھی جو ڈبہ مولوی صاحب حیدر آباد سے رزرویشن کروا چکے تھے' اس میں سامان رکھا جا چکا تھا۔ یہ چار سیٹ والا کوپے نہ تھا بلکہ چھے سیٹ والا تھا۔ ایک بنگالی صاحب ان کی بیگم مع دو عدد بچوں کے پہلے سے موجود تھے۔ مولوی صاحب کا مزاج ایک دم بگڑ گیا کہ ہم نے تو چار سیٹر کوپے بک کروایا تھا۔ خیر ہم خود ہی رستے میں ان صاحب اور صاحبہ سے نپٹ لیں گے۔

ہم تینوں ڈبے میں چڑھے ریل نے سیٹی بجائی' گارڈ نے جھنڈی دکھائی اور ریل چل پڑی۔ نیچے کی تین سیٹیں ہماری تھیں ایک پر دو بنگالی بچے اور اوپر کی دو سیٹوں پر ان کے والدین بستر بچھائے براجمان تھے۔ اختر کا موڈ بھی ان کی موجودگی سے خراب سا ہو گیا۔

ریل نے جب اسپیڈ پکڑی تو مولوی صاحب نے اختر کے کان میں آکر کچھ کہا۔ اختر ہنس کر بولے۔ "بہت خوب بہت خوب۔" ہم دونوں ایک سیٹ پر پاس پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ مولوی صاحب ایک اخبار لے کر سیٹ پر لیٹ گئے۔ میں نے اختر سے پوچھا کہ مولوی صاحب نے آپ کے کان میں کیا کہا تھا۔ ہنسے اور کہا کچھ دیر میں خود دیکھ لینا۔ میں نے گھبرا کر پوچھا کہ وہ ان بچوں کو کہیں باہر نہ پھینک دیں۔ کہہ جو رہے تھے کہ ہم خود نپٹ لیں گے۔ "نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں کریں گے۔" میں تو چوکس ہو بیٹھی کہ اب یہ کیا کرنے والے ہیں' کہ اتنے میں دونوں بچے ڈر کر زور زور سے چیخے اور بنگلہ میں کچھ کہنے لگے۔ میں اور مولوی صاحب بنگالی نہ سمجھ سکے' اختر سمجھ گئے اور خوب زور سے ہنسے۔ میں نے بہت پوچھا' کچھ بتائیں یہ کیا ہوا۔ بولے کچھ بھی تو نہیں' بھوکے بنگالی کھائیں بھر بھر تھالی' اور پھر بھی خوب روتے اور ڈرتے ہیں۔ میں بچوں کی طرف دیکھ رہی تھی کہ پھر ان کا زور سے ڈر کر رونا اور بنگالی میں کہنا۔ اب بنگالی بابو نے مولوی صاحب سے مخاطب ہو کر بگڑ کر اپنی ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا۔ "بڑا شاحب آپ بچوں کو ڈرا کیوں رہا ہے۔" مولوی صاحب جھٹ بول اٹھے ہمارا تو منہ ہی ایسا ہے اور تیز حاحت کر کے دونوں ہاتھوں سے چونچ بنا کر نچانے لگے۔ بچے پھر چلا کر رو دیے۔ اب ان کی نظریں اختر کی طرف تھیں۔ میں نے جلدی سے گردن موڑ کر اختر کی طرف دیکھا تو وہ بھی تیز حاحت کیے' ہاتھوں کی چونچ بنائے ان کو سناٹ ٹھمار رہے تھے۔ میں ڈر کر ذرا پرے کو سرک گئی اور پوچھا الٰہی خیر یہ آپ دونوں کر کیا رہے ہیں۔ تو کیا ان حضرات سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش۔ اوپر سے بنگالی بابو اٹھ کر بیٹھ گئے اور بولے۔ "تم دونوں شاحب پاگل ہے کیا؟" تو بولے "اور کیا پاگل تو ہے ہم' تم نے باہر لکھا ہوا پڑھا نہیں کہ اس ڈبے میں دو پاگل بھی سفر کر رہا ہے!" بنگالی بابو نے بیوی سے کچھ کہا۔ دونوں نے جلدی جلدی اپنے بستر لپیٹ لیے۔ نیچے اترے بچوں کے بستر تک جا کر کے ایک بستر بند میں باندھ دیے اور نیچے سیٹ کے رکھے ہوئے دو ٹین کے بکسے کھینچ کر دروازے کے قریب لا کر بیٹھ ہماری طرف کر کے بچوں کو گود میں دبکا کر آنے والے اسٹیشن کا انتظار کرنے لگے۔ اب مولوی صاحب کسی وقت ہولناک آوازیں نکالنے لگے۔ بچے چیخ کر ماں باپ سے بندروں کی طرح چپک جاتے اور ایسا لگتا جیسے ڈر کر لرز رہے ہیں۔ ماں باپ بھی پاگلوں کے خوف سے کانپ

کانپ اٹھتے۔ میں حق دق یہ تماشا دیکھ رہی تھی اور خود بھی سہمی ہوئی تھی۔ گو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ ان سب کو ڈبے سے بھگانے کے لیے یہ سب کچھ کیا جا رہا ہے۔ آخر اسٹیشن آیا۔ ریل رُکی اور یہ بڑی جلدی سے نیچے اتر گئے تو مولوی صاحب کے قہقہے اس قدر زوردار تھے کہ ڈبہ گونج اُٹھا۔ کہتے جائیں۔ "پاگل بن جانے میں کس قدر مزہ آیا' ورنہ حیدر آباد تک ان کا ساتھ سچ مچ ہم کو پاگل بنا دیتا۔

اب مولوی صاحب اطمینان کا سانس لے کر اپنی سیٹ پر دراز ہو گئے۔ کہنے لگے۔ "اس وقت تو حقہ بہت یاد آ رہا ہے۔" شاید حقے کی تمباکو کا تصور کر رہے ہوں مگر ناک میں کسی اور قسم کی خوشبو کو محسوس کرتے ہوئے ناک کو چڑھا' بھنویں سکیڑ' نظریں مجھ پر جما کر پوچھتے ہیں۔ "یہ کھانے جیسی خوشبو کہاں سے آ رہی ہے۔ میں نے بتا دیا کہ اماں نے کل کے لیے کچھ کھانا ساتھ کیا ہے۔ پتیلیاں سیٹ کے نیچے رکھی ہیں۔ ایسے جھٹکے سے اٹھے جیسے کرنٹ لگ گیا ہو۔ بولے اب اس سے بھی چھٹکارا حاصل کرنا ہے۔ جیسے ہی ریل ہلکی ہوئی جلدی جلدی پتیلیاں گھسیٹ کر دروازے کے پاس کر لیں۔ ریل رکی تو با آواز بلند پکارنے لگے۔ کسی کو کھانا چاہیے۔ کوئی نہیں آیا تو ایک قلی سے کہا کہ جلدی سے یہ سامان اتارو۔ جب تینوں پتیلیاں اتار لی گئیں تو جھٹ سے دروازے کی کنڈی لگا کر کھڑکی میں سے کہا۔ "جاؤ یہ گھر لے جاؤ۔ موج کرو۔"

اسٹیشن چھوٹا سا تھا۔ ریل زنّاٹے بھرتی ہوئی چل پڑی۔ میں نے دل میں شکر کیا کہ اگر مجھے اتار دیتے تو میں کیا کر لیتی۔ دل پھر سہم گیا کہ آخر یہ لوگ ایسے کیوں ہیں۔ پھر ایک خیال دل میں آیا کہ شاید یہ سوچ کر آئے ہوں کہ "گربہ کشتن روزِ اوّل" مجھے اچھی طرح سمجھا رہے ہیں کہ سوچ لو بی بی ہم یوں بھی کر سکتے ہیں۔ میں نے فوراً ہی تو سوچ لیا کہ اگر میں ان دونوں سے سہمی اور ڈری تو زندگی حرام ہو جائے گی۔ اس لیے مجھے ڈٹ کر نہلے پر دہلا ڈالنا ہی پڑے گا۔ میں جا کر اپنی سیٹ پر لیٹ گئی۔ تب سب سے جدائی کا احساس اجاگر ہوا اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اختر نے ہاتھ بڑھا کر میری طرف کی لائٹ بند کر دی۔ مولوی صاحب کے پاس ان کی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ "کسی کانفرنس میں مدراس جانا ہے۔" اس کے متعلق باتیں کرنے لگے۔ میں یہ سوچتے ہوئے سو گئی کہ پھر میرا کیا بنے گا؟

صبح کو میرے لیے خود سے اٹھنے کا سوال ساری عمر نہ ہوا' جب تک کوئی جھنجھوڑ کر نہ اٹھا دے۔ صبح پانچ بجے مولوی صاحب خود اٹھ گئے ہوں گے اور اختر کو آواز دے کر اٹھایا ہو گا یا وہ خود ہی جاگ گئے ہوں گے۔ دونوں بے چین ہو کر آوازوں پر آوازے لگاتے رہے بھلا مجھ پر کیا اثر ہو سکتا تھا۔ آٹھ بجے بیرا ناشتے کی ٹریز دے گیا ہو گا۔ اب تو نو بج گئے تھے۔ مولوی صاحب کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ دونوں ناشتہ کر چکے' میری چائے ٹھنڈی پانی جیسی ہو گئی۔ دونوں میں سے کسی میں یہ ہمت نہ تھی کہ ہاتھ سے جھنجھوڑ دیں۔ آخر مولوی صاحب کو ترکیب سوجھ گئی' دور کھڑے ہو کر اپنی چھڑی سے میرے تلووں کو کوچنے لگے۔ میں گھبرا کر اٹھی اور ایک منٹ کے لیے یہ بھول گئی کہ میں ہوں کہاں اور یہ ہو کیا رہا ہے؟ نیند سے بوجھل آنکھیں ہاتھ سے مل کر کھولیں تو دیکھا کہ مولوی صاحب بھد سے اپنی سیٹ پر چھڑی سمیت لیٹ گئے۔ بولے یوں نہیں کام چلے گا کہ لوگ نو نو بجے تک سوتے رہیں۔ ہمارے گھر میں سب پانچ بجے اٹھ جاتے ہیں۔ سو سو کر سارا مزا کرکرا کر دیا۔ بھوپال کی پہاڑیوں کے پیچھے سے سورج خان کس شان سے نکل رہے تھے۔ میں بھی کسی صاحب کا ذکر کر رہے ہیں۔ "جی" کہہ کر چپ ہو گئی "اچھا اب جلدی سے اٹھ کر ٹھنڈا ناشتہ کرو اور ٹھنڈی چائے پیو۔"

اب دن کی جھکاجھک روشنی میں دو انجان مَردوں سے دوبدو سارے دن سامنا کرنا ہے۔ خطوط اور افسانوں والے اختر کو تو خوب جانتی تھی مگر ان صاحب کو نہ جاننے کے برابر تھا اور یہ مولوی صاحب سارے دن اتنے قریب بیٹھ کر جانے کیا کیا فقرے بازی کریں گے۔ اختر سے بے شک مجھے بہت سی باتیں پوچھنا تھیں کہ مجھے ان کے گھر جا کر کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں؟ مگر وہ تو اب اَنجانے پن کا اظہار کرنے پر تُلے ہوئے تھے۔ جیسے میرا وجود ان کے لیے کوئی معنی نہ رکھتا ہو' اخبار پڑھ رہے ہیں۔ مولوی صاحب سے سیاست پر باتیں ہو رہی ہیں۔ گھوم پھر کر ڈکشنری پر تان ٹوٹتی۔ ناشتہ کر کے میں نے بھی ایک اخبار ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اب تک اخبار پڑھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی کہ ہم سے مطلب کہ سارے جہاں میں کیا ہو رہا ہے۔ پھر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔ اختر کہنے لگے آپ نے ٹھیک ہی کیا کہ اخبار رکھ دیا' کیوں کہ پلّے تو کچھ نہ پڑ رہا ہو گا۔ ہاں ہرے بھرے کھیت دیکھیں۔ کہیں کہیں ہرن بھاگتے بھی نظر آئیں گے تو شکار یاد آئے گا اور بھی بہت

کچھ۔

مولوی صاحب کو جیسے کچھ یاد سا آگیا۔ "ہاں' یہ تو بتاؤ کہ تمہارے ابا اور بھائی لوگ ان معصوم حسین جانوروں کے پیچھے کیوں لگے رہتے ہیں۔ ان بیچاروں نے آخر ان کا کیا بگاڑا ہے؟" --- "یہ بات تو آپ کو ان ہی سے پوچھنا تھی۔" بس پھر مسکرا کر چپ ہو گئے۔

آخر دن گزر ہی گیا۔ ہر بڑے اسٹیشن پر مولوی صاحب کے ملنے والے جن کو اطلاع دی جا چکی تھی' ملنے آئے اور ڈبے میں ڈھیر سے پھولوں کے ہار جمع ہو گئے تو مجھے اپنی اماں کے وجود کی خوشبو سی آتی محسوس ہونے لگی۔ ان کو بیلے چنبیلی کا بے حد شوق تھا۔ روز ڈھیر سارے پھول وہ اپنی کپڑوں کی الماری کے ہر خانے میں ڈال دیا کرتیں۔ پھر رات آئی اور خیر سے گزر گئی۔ صبح نو بجے حیدر آباد اسٹیشن پر گاڑی رُکی۔ شکر کیا کہ یہ ایک مرحلہ بخوبی طے ہو گیا۔ اسٹیشن پر مولوی صاحب اور اختر کے بہت سے دوست چنبیلی اور بیلے کے موٹے موٹے ہار لیے کھڑے تھے۔ نیچے اُترے۔ اپنے حصے کے ہار تو پہن چکی تھی۔ اختر نے اپنے والے اور مولوی صاحب کے بھی میرے گلے میں ڈال دیے۔ بوجھ سے جھکی جا رہی تھی اور نیچی نظروں سے دیکھ رہی تھی کہ شاید اب کوئی خاتون نظر آجائیں مگر اس کا کیا سوال تھا۔ اسٹیشن سے باہر آئے ایک موٹر پھولوں سے سجی کھڑی تھی اس میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ رستے میں پھلوں کی دکانوں پر جو نظر پڑی تو کیا ہی بڑے بڑے شریفے دکھائی دیے۔ میری جان شریفے پر جاتی تھی۔ دل کرے کہ موٹر رُکوا کر کچھ خرید لوں' مگر یہ ممکن نہ تھا۔

—○—

حیدر آباد

لیجیے ہم اب گھر پہنچ گئے۔ "نادر منزل" ایک پہاڑی نما ٹیکری پر دور سے دکھائی دی۔ اختر نے ادھر اشارہ کر کے بتایا کہ وہ رہی "نادر منزل"۔ "میرا دل دھڑکنے لگا' گھبراہٹ اور وحشت سی شروع ہو گئی۔ آج سال کا پہلا دن یعنی ۱۹۳۶ء نیا گھر' زندگی کا نیا دن اور نئے لوگ! موٹر پھاٹک کے اندر داخل ہوئی اور سیدھے ہاتھ پر بہت بڑے لان کے ساتھ ساتھ چلتی رہی' اُلٹے ہاتھ کی طرف گھنے پیڑ اور ساتھ ہی ڈھلان کا سلسلہ شروع ہوتا تھا جس پر بڑی گنجان جھاڑیاں تھیں۔ لان کے ایک طرف ایک بہت ہی اونچا اور ایک ہی پیڑ تھا اور وہ بھی "برگد" کا جس کے چاروں طرف بہت ہی اونچا اور چوڑا چبوتروں کے لیے بنا ہوا تھا۔ جس کو چار حصوں میں تقسیم کر کے چار طرح کی خوب صورت رنگا رنگ چڑیاں اُڑ رہی تھیں اور کچھ بیٹھی ہوئی چہچہا رہی تھیں۔ لان اور کوٹھی کے درمیان پورچ تھا جس میں موٹر آکر رک گئی۔ برآمدے میں چار ملازم ہاتھوں میں ہار لیے باادب کھڑے تھے۔ ہم تینوں اُترے۔ انہوں نے سلام کرنے کے بعد میرے اور اختر کے گلے میں ہار ڈالے۔ مولوی صاحب بڑی شفقت سے میری پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر برآمدے سے گزر کر ڈرائنگ روم میں لائے۔ اس کے بعد ہم بہت بڑے ہال سے ہوتے ہوئے ایک چھوٹے سے کمرے میں سے گزرے جہاں لکھنے کی میز اور دو کتابوں کی الماریاں تھیں جن میں موٹی موٹی ڈکشنریاں نظر آئیں تو سوچا یہ شاید مولوی صاحب کا اپنا دفتر ہوگا۔ بولے چلو اب گھر میں چلو' ادھر سب دفتر اور مردان خانہ ہے۔

اب ہم ایک بہت بڑے چوڑے اور لمبے برآمدے میں داخل ہوئے۔ اس کے ایک کونے والے کمرے کے قریب ایک چھوٹی سی میز اور چار کھانے کی کرسیاں رکھی تھیں۔ تھوڑے فاصلے پر چند موڑھے' ایک آرام دہ لمبی کرسی' قریب ہی ایک عجیب قسم کا حقّہ' ایک چمکدار تھالی میں رکھا ہوا۔ اس حقّے کو دیکھ کر یوں لگا جیسے کسی بہت لمبے سانپ نے

چاروں طرف کنڈلی ڈال رکھی ہو' چاندی کی منہ نال لگی ہوئی تھی۔ برآمدے کی دو سیڑھیاں اُتر کر کوئی بیس فٹ چوڑی جگہ پر سرخ بجری پڑی تھی۔ اس کے ساتھ ہی سلامی لیے ہوئے ڈھلان شروع ہو گئی۔ اس جگہ ہری ہری کچوک گھاس پھر چوڑی چوڑی پھولوں کی کیاریاں' جن میں پھول کھلے ہوئے تھے۔ اس کے آگے پھر سپاٹ بہت بڑی جگہ تھی' آگے پھر ڈھلان شروع ہو جاتی جو بہت گنجان سبز جھاڑیوں سے یوں ڈھکی ہوئی جیسے کوئی جنگل کا حصہ ہو۔ بیچ بیچ میں اونچے گھنے درخت تنے کھڑے تھے۔ میں چند منٹ رُک کر ادھر دیکھا کی اور سوچنے لگی کہ مولوی صاحب کا ذوق بہت اچھا ہے۔ اختر نے کہا۔ "چلیں اپنا کمرہ دیکھ لیں۔ نہا دھو لیں۔ میں نے کہا' پہلے میں مولوی صاحب کا کمرہ تو دیکھ لوں جو برآمدے کے ایک سرے پر تھا اور دوسری طرف ہمارا۔ مولوی صاحب کا کمرہ نہ بہت بڑا نہ چھوٹا' اس کے ساتھ ایک ڈریسنگ روم اور غسل خانہ۔ پہلے یہ اختر کو دے رکھا تھا مگر اوری آنے سے پہلے بڑی ضد کر کے اپنا بڑا سا کمرہ ساتھ ڈریسنگ روم اور غسل خانہ ہم دونوں کے لیے خالی کر کے خود ادھر والے کمرے میں منتقل ہو گئے۔ ان کے کمرے میں دو طرف کتابوں کی الماریاں' بیچ میں مسہری کچھ ہٹ کر ایک لکھنے کی میز اور کرسی' اس کے ساتھ ہی ایک لوہے کی کیبنٹ' اس پر کچھ بوتلوں میں خشک میوہ اور چند دوائیں (اختر کی ڈیسک کے پاس بھی ساری عمر خشک میوے کی بوتلیں رہیں۔ ان میں سے نکال کر بچوں کو اپنے ہاتھ سے دیا کرتے تھے۔ بچے سب بڑے ہو گئے تو ان کے بچوں کو دیا کرتے۔)

اب وہ خود تو اپنے کمرے میں رہ گئے۔ اختر مجھے برآمدے میں لے کر چلے تو میری نظر اس پتلی لمبی میز پر پڑی جو مولوی صاحب کے کمرے کی دیوار سے ملی ہوئی رکھی تھی جس پر چار پانچ طرح کے چائے کے ڈبے اور ایک ساوار رکھا دیکھا۔ اس میں سے ابلتے پانی کی بھاپ نکلتی دکھائی دی۔ ایک طرف چند پیالیاں اور چائے دان بھی تھا۔ برآمدے کی دوسری طرف ہمارا کمرہ تھا۔ اس کے دو دروازے برآمدے میں کھلتے تھے' ایک برآمدے میں' دوسرا باغ کی طرف۔ ان پر چقیں پڑی تھیں۔ کمرہ بڑا کشادہ' دو مسہریاں درمیان میں۔ ادھر کی مسہری کے قریب ایک چھوٹا ڈیسک اور کرسی۔ دوسری طرف دو نیچی نیچی کتابوں کی الماریاں کتابوں سے بھری ہوئی' ایک پھول دان اس پر رکھا ہوا جس میں گلاب کے تازہ سرخ پھول بھی تھے۔ ایک پھول دان ڈیسک پر بھی تھا۔ کمرے کے ایک

کونے میں دو آرام دہ کرسیاں اور سامنے کی میز پر ایک 555 کا سگریٹ کا ٹن اور ایش ٹرے (راکھ دان) سارا فرنیچر عمدہ قسم کی ٹیک کی لکڑی کا' ریکس پالش کیا ہوا جھل مل کر رہا تھا۔ ڈریسنگ روم میں دو بڑی بڑی کمروں کی الماریاں' ایک سنگھار میز' اس کے سامنے اسٹول' کمرے میں نیلے رنگ کا بڑا سا قالین تھا۔ اس میں بھی ایک چھوٹا سرمئی رنگ کا قالین۔ ایک طرف کو میرے کیبن ٹرنک اور اختر اور میرے سوٹ کیس ایک پر ایک رکھے ہوئے۔

پہلے اختر نہانے چلے گئے۔ میں نے جلدی جلدی اٹیچی کیس سے سامان نکال کر ڈریسنگ ٹیبل پر لگا دیا۔ سوٹ کیس سے اپنے دونوں تکیے جلدی سے نکال کر اپنے پلنگ پر رکھے اور وہ گدھا سا موٹا روئی کا تکیہ پلنگ کے نیچے چھپا دیا۔ اپنے کپڑے نکال چکی تو اختر نہا کر باہر نکل آئے۔ میں نے اختر کو سفید کرتے پاجامے میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ جھوا سے بال دھلنے کے بعد عجیب سے نہ لگے کہ یہ سٹ کر اچھے خاصے ہو گئے۔ کن انکھیوں سے اختر کو دیکھتی ہوئی اپنے کپڑے لیے غسلخانہ میں چلی گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد اختر آوازیں دے رہے تھے۔ "جلدی آیے چائے تیار ہے۔ مولوی صاحب زیادہ دیر انتظار کرنے کے عادی نہیں۔ اپنے گیلے بال پیچھے کر کے دوپٹہ اوڑھ کر برآمدے میں آئی تو دیکھا پیالیاں میز پر رکھی ہوئی ہیں' شکر دان اور دودھ دان بھی۔ اب وہ خود کھڑے ہو کر مختلف ڈبوں میں سے کسی حساب کے ساتھ پتی چائے دان میں ڈال رہے تھے۔ پھر ساوار کی ٹونٹی کھول کر چائے دان میں کھولتا ہوا پانی ڈالا اور میز پر چائے دان رکھ کر ایک چھوٹا سا تولیہ ڈھانک دیا کہ چائے کچھ دیر دم کھائے۔ میں نے نہایت غور سے سب دیکھا کہ شام کی چائے میں دم کروں گی۔

مجھے تو گھر میں اماں نے یہ سکھایا تھا کہ لڑکی یا کوئی خاتون ہو تو چائے پیالیوں میں اس کو ڈالنا چاہیے۔ میں نے جیسے ہی ہاتھ سے تولیہ ہٹا کر چائے بنانے کا قصد کیا۔ مولوی صاحب نے اپنی گرج دار آواز میں کہا۔ "ہائیں ہائیں یہ کیا کرتی ہو۔ چائے ہم خود بنائیں گے۔" میں نے ہاتھ کھینچ لیا۔ اب انہوں نے آہستہ سے پہلے تولیہ ہٹا کر مجھ سے پوچھا کہ تم ہلکی چائے پیتی ہو یا تیز؟ میرے منہ سے جانے یہ کیسے نکل گیا کہ "چائے اور چاہ جیسی بھی مل جائے۔" مولوی صاحب ہنس ہنس کر دوہرے ہو گئے۔ اختر بھی ہنس پڑے۔ بس میں

کھسیانی سی ہو گئی۔ مولوی صاحب چائے بناتے جائیں اور کہتے جائیں لڑکی ہے چٹ پٹی!!
چائے کی پیالی ختم کر کے کہا۔ "چلو تم کو باہر کا دفتر وغیرہ بھی دکھا دیں۔ یہ صرف آج کے
لیے تم کو ادھر آنے دیا جا رہا ہے پھر ہمیشہ کے لیے تمہارا اس طرف داخلہ ممنوع رہے گا۔
آج جمعہ ہے دفتر میں کام نہیں ہو رہا ہے۔ ایک بہت بڑا ہال جس میں چاروں طرف بہت
ہی اونچی اونچی الماریاں موٹی موٹی کتابوں سے بھری ہوئی تھیں۔ ہال کے بیچ میں ایک پتلی
لمبی سی میز جس پر طرح طرح کے رسالے اخبار رکھے ------ کچھ کرسیاں ادھر ادھر رکھی
ہوئیں۔ میں نے دل میں سوچا یہ اس کوٹھی کا اصل ڈرائنگ روم ہوا کرتا ہوگا۔ اب وہ
دوسرے قدرے چھوٹے ہال میں لے کر گئے۔ اس میں بھی چاروں طرف الماریاں اور
خستہ بوسیدہ حال کتابیں تھیں۔ ان الماریوں میں تالے لگے ہوئے تھے۔ ایک بہت بڑا
ڈیسک جس کے دونوں طرف درازیں تھیں۔ ان میں بھی تالے لٹک رہے تھے۔ ایک لمبی
پتلی میز پر ویسا ہی سماوار جیسا برآمدے میں تھا۔ کئی قسم کی چائے کے ڈبے' چائے دان'
شکردان رکھا تھا۔ مجھے بتایا کہ ان سب الماریوں میں نہایت قیمتی قلمی نسخے اور بہت انمول
قیمتی کتابیں ہیں اور یہ ان کا اپنا آفس ہے۔ میں نے سوچا یہ ضرور کبھی کھانے کا کمرہ ہوگا۔
اس کے پیچھے چار پانچ اور بھی کمرے تھے۔ ایک کے پاس سے گزرتے ہوئے کہا یہ آفس
عابد حسین کا ہے اور وہ کمرہ پنڈت کیفی کا۔ تیسرا جانے کیا نام لیا اور جب چوتھے کمرے کے
سامنے آئے تو اس کا دروازہ پاٹم پاٹ کھلا ہوا تھا۔ یہاں ایک دری پر جازم بچھی ہوئی تھی
اس پر نیچا سا ڈیسک' ادھر اُدھر پیلے پیلے رنگ کے لمبے لمبے کاغذ' جیسے ان میں کلف لگا دی
گئی ہو۔ اسٹر کھلے اور کچھ تہ شدہ رکھے ہوئے تھے۔ کاغذوں پر بہت کاٹا پیٹی' لال سبز
رنگ کے قلموں سے کی ہوئی دور سے بھی نظر آ رہی تھی۔ میں سوچنے لگی کہ یہ صاحب
بیٹھ کر کام کرتے ہیں۔ پر اس قدر لکیریں کسی کے ساتھ کچھ گولے کی شکل اور بھی کئی
طرح گورکھ دھندے سے کیوں بناتے ہیں؟ کہ مولوی صاحب ناراضگی کے انداز میں
بولے "احتشام الحق کمرہ کھلا چھوڑ کر لاٹھی ٹیکتے دو تین بجے رات کو خود نکل گئے اور
دروازہ پھر بند نہ کیا۔" اس نام پر میرے کان کھڑے ہوئے کہ ابا نے آتے وقت مجھ سے
کہا تھا کہ اپنے تین دوستوں کو وہ خط لکھ چکے ہیں اور یہ تینوں میرا خیال ضرور رکھیں
گے۔ ان میں سے ایک نام (احتشام الحق) لیا تھا۔ اشارہ کر کے بتایا۔ ادھر والے تین

کمرے کاتبوں اور پروف ریڈرس کے لیے ہیں۔ کوٹھی سے کچھ دور پر باورچی خانہ اور
ملازمین کے لیے کوارٹر ہیں اور ہاں کوٹھی کی پشت پر جو کھلا بڑا سا میدان ہے اس میں
راجہ[1] اور رانی" نے اپنا اڈہ جما رکھا ہے۔ دیکھ کر بتانا کہ تمہاری رانی زیادہ اچھی ہے
یا ہماری؟" میں بغیر دیکھے ہی بتا سکتی ہوں کہ آپ کی رانی زیادہ اچھی ہوگی کہ اس کا راجہ
اس کے ساتھ ہے اور میری رانی کی اُداس اُداس بڑی بڑی آنکھیں اپنے راجہ کا انتظار
کرتی رہتی ہیں۔" خوش ہو کر بولے۔ "یہ بات تو تم سچ کہہ رہی ہو۔"
واپسی کے وقت اختر سے کہا۔ "بہت وقت ضائع ہو چکا بس اب کل سے اوقات میں
باقاعدگی ہونا چاہیے۔" جس کمرے میں سے ہو کر ہم برآمدے میں داخل ہوئے۔ بتایا کہ یہ
اختر کا آفس ہے۔ اس کی میز پر بھی کاغذات کا ڈھیر لگا ہوا تھا مگر سب قاعدے سے رکھے
ہوئے تھے۔ قریب ہی دو نیچی نیچی الماریوں میں موٹی موٹی کتابیں' ذرا غور سے دیکھا تو جیسے
کئی اور زبانوں کی ہیں' شاید ہندی' بنگلہ وغیرہ کی ہوں۔ کہا "یہاں بھی آپ کی تحریف کا
ذکر نہیں آسکتا۔"
برآمدے میں آ کر جب وہ لمبی کرسی پر دراز ہو گئے تو محبوب نے حقہ لا کر تھوڑے فاصلے پر
رکھ کر اس کے گرد لپٹی ہوئی نے کو کھولنا شروع کیا۔ یہ کم از کم دو گز لمبی ہوگی۔ دریافت
کیا۔ خوب اچھی طرح کئی بار پیچوان کو نرم کیا تھا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ یہ پیچوان ہے۔
یہ بھی پوچھا گیا۔ لکھنؤ سے تمباکو کا پارسل آ گیا تھا۔ "جی سرکار۔"
یہ دونوں آپس میں کاپی کی خوب صورتی کا ذکر کرنے لگے۔ پھر ڈکشنری کی بات چیت۔
میرا وجود جیسے بھول گئے ہوں۔ میں اکتا سی گئی اور چپکے سے وہاں سے کھسک کر اپنے کمرے
میں آ گئی۔ جلدی جلدی اپنے کپڑے نکال کر الماری میں لگائے۔ کچھ کڑھی ہوئی چیزیں
ادھر اُدھر بچھائیں۔ سوچا چلو اب اختر کے کپڑے نکال کر ان کی الماری میں رکھ دوں تاکہ
یہ سب سوٹ کیس کیبن ٹرنک بیچ سے ہٹا دوں۔ ایسا ہی کیا۔ قاعدے سے جوتے کے
اسٹینڈ پر اپنے جوتے' چپلیں رکھنے کے بعد اب اختر کے جوتے رکھ رہی تھی کہ اختر آ گئے۔
میرے ہاتھ میں ان کے جوتے تھے۔ گھبرا کر کہا "ہائیں ہائیں یہ کیا کر رہی ہیں؟" میرے

[1] میں نے کسی عالم میں اختر کو اپنی بیوی اور بیوی کے حقوق کہا تھا۔ مولوی صاحب سے [illegible]
[illegible] دل لیتے ہیں۔ ایک راجہ اور ایک رانی۔

ہاتھ سے جوتے گر گئے۔ میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر بولے' دیکھیے اب بھی میرے جوتوں کو ہاتھ نہ لگایے گا۔" (کو شادی کے بعد سے دو سال تک ہر روز ان کے جوتے کو اس طور ہاتھ لگایے کہ اختر جوتے کی ڈوری میں ڈبل بو باندھنا نہیں سیکھ پائے۔ میں ہر روز ان کا ایک پاؤں کرسی یا اسٹول پر رکھوا کر ڈبل بو باندھنا سکھاتی مگر ہرگز نہ سیکھ پائے۔ ہر بار یہ کرتے کہ آخر ڈوری اتنی لمبی کیوں بنائی گئی ہے۔ آدھی ڈوری کو انگلی سے جوتے میں ٹھونس لیتے۔ آخر کو میں نے تنگ آکر سکھانا چھوڑ دیا اور ہار مان لی۔

دوپہر کو ہلکا پھلکا کھانا ہوا۔ بعد میں محبوب نے پھل لا کر رکھ دیے۔ سبز اور کتھئی رنگ کے بے حد بڑے بڑے بیر! گویا یہ پھل ہیں۔ مجھے یہ بھی کچھ بہت عجیب سی بات لگی۔ دریافت کیا دہلی سے نواب لوہارو کے باغ سے بیروں کا پارسل آگیا تھا۔ "جی جناب" چھری سے بیر تراش کر مزالے کر کھاتے رہے۔ میں نے ہاتھ سے اٹھا کر بیر کھانا شروع کیا۔ کچھ بڑی ناگواری سے میری طرف دیکھا۔ جیسے کہہ رہے ہوں کہ ان کو کھانے کا طریقہ یہ نہیں۔

شام کی چائے پھر مولوی صاحب نے خود اپنے ہاتھ سے دم کی اور پیالیوں میں ڈالی۔ میں نے سوچا کل سے میں خود چائے دم کر کے پیالیوں میں ڈالوں گی۔ یہ تو بہت بری بات ہوگی کہ میری موجودگی میں مولوی صاحب یہ زحمت کریں۔ چائے کے بعد اپنے کمرے میں گئے۔ اپنی الماری کی ایک دراز کنجی لگا کر کھولی اور ایک گڈا نوٹوں کا لا کر میرے ہاتھ میں دیا۔ "یہ رکھو کل سے تم بشیر خانساماں کو بتاؤ گی کہ کیا پکے اور سب کی تنخواہیں بھی دے دینا۔ میرے فرشتوں کو کیا خبر کہ کس کو کیا دینا ہے اور یہ دونوں کیا کھانا پسند کرتے ہیں؟ بولے یہ لو چابیاں تمہارے ڈبک کے خانوں کی ہیں۔ مطلب یہ کہ میں ان کو بند کر کے رکھ لوں۔ کچھ دیر میں ان کا منہ تکتی رہی۔ اختر ذرا بھی میری مدد کو نہ آئے۔ کھڑے مسکراتے رہے۔ کمرے میں چلی گئی۔ کچھ دیر نوٹوں کو دیکھتی رہی' میں نے تو اپنی زندگی میں اتنے ڈھیر سارے نوٹ اپنے ہاتھ میں نہ لیے تھے۔ ایک پریشانی کی کیفیت تھی۔ ایسا لگا جیسے امتحان کا پرچہ سامنے رکھ دیا گیا ہو۔ نوٹ بند کر کے کرسی پر بیٹھ کر سوچنے لگی کہ کل صبح جب بشیر پوچھے گا تو اس کو کیا بتانا چاہیے۔ ارے اختر سے پوچھ لوں گی۔ جب ان سے پوچھا تو جواب ملا۔ "میں کیا جانوں جو مناسب سمجھنا بتادینا۔"

رات کا کھانا نمٹنا ہوتے ہی یعنی مغرب کے وقت برآمدے کی میز پر لگ گیا۔ مجھے اس پر بھی حیرانی ہوئی کہ یہ وقت تو بچوں کے کھانے کا ہوتا ہے' بڑے تو دیر سے کھاتے ہیں۔ کھانا کھاتے جائیں اور اختر سے مدراس کے دورے سے متعلق باتیں کرتے رہے اور میں؟ ظاہر ہے مجھے ساتھ لے جائیں گے۔ اس گھر میں مجھے اکیلا تو نہ چھوڑیں گے۔ کھانے کے بعد اختر سے کہا۔ موٹر باہر کھڑی ہے' "تم دونوں حسین ساگر ہو آؤ۔ ہم دونوں چل دیے۔ جب وہاں پہنچے تو دل خوش ہی تو ہو گیا۔ کس قدر بڑا تالاب تھا۔ جیسے کوئی جھیل ہو۔ جہاں حسین ساگر ختم ہوتا تھا اس کے بعد چھوٹی بڑی پہاڑیوں کا سلسلہ تھی طرف' یوں لگا جیسے یہ اس حسین جھیل کو ہاتھ پھیلائے اپنی گود میں لیے ہوئے ہیں۔ چاند نکل چکا تھا۔ پہاڑیوں پر کوٹھیاں' ان کی بتیاں یوں لگ رہی تھیں کہ ہزار ہا جگنو جگمگ کر رہے ہوں۔ کنارے پر بیٹھتے ہی اختر نے کہا۔ "یہ آپ' جناب بہت ہو لیا مجھ سے تم کر کے بات کیا کرو اور ہاں ایک بات اپنے پلّے میں باندھ لیں کہ کبھی مجھ سے میرے خاندان کے متعلق سوال جواب نہ کرنا۔ یعنی ایک ایسی لکیر کھینچ دی جس کو مجھے پار کرنے کی اجازت نہیں۔

جمیل بھائی! خدا گواہ ہے کہ میں نے ساری عمر ان سے خاندان کے متعلق کوئی بات ہی نہ کی یعنی وہ لکیر جو پہلے دن کھینچی گئی اس کے قریب جا کر تو نہ پھلانگا' ہاں دور دور سے کس کس طرح کچھ نہ کچھ ضرور معلوم کر لیا جس کا بے حد مزہ آیا اور میری نظروں میں اختر اور بھی اونچے ہو گئے۔ اس شخص نے بچپن میں لوریوں' کہانیوں کے ساتھ ساتھ ان کی اپنی والدہ کی طرف سے ملنے والی جائیداد' سولہ سال کی عمر میں ولایت پڑھنے جانے کے لیے بینک میں جمع روپیہ اور ان کے لیے زیورات اتنے کہ ایک چھوٹے ٹرنک کو ایک مرد بمشکل اٹھا سکے۔ شہر میں دسیوں دکانیں' کئی مکانات اور کئی گاؤں۔ یہی لڑکا اپنی سولہ سال کی عمر میں جب یہ سنتا ہے کہ ایک گاؤں اور اس مکان کے علاوہ کچھ نہیں۔ اگر آگے پڑھنا ہے تو خود کماؤ اور اپنے کو پڑھاؤ۔ وہ اب ایک چھوٹے سے شہر راۓ پور سے نکل کر بے سروسامانی میں کلکتہ جیسے غدار شہر میں علم کی جستجو میں خالی ہاتھ پہنچ کر روزی کماتا ہے اور علم حاصل کرتا ہے۔

ہاں تو پھر رات آئی اور گزر گئی۔ صبح کو یاد آیا اختر خود اٹھ گئے ہوں گے یا مولوی صاحب

نے آواز دی اور ہمیشہ کی طرح سیر کو نکل گئے۔ نہا دھو کر تیار ہو جانا' پھر ناشتہ کر کے اخبار پڑھ کر دفتر چلے جانا اس گھر کا روز کا معمول تھا۔ اختر واپسی پر نہانے چلے جاتے۔ میں سو رہی ہوتی' مولوی صاحب کمرے میں جھانک کر دیکھتے۔ یہ بے قاعدگی ضرور ناگوار گزری ہوگی۔ اب مجھے اٹھانے کی ترکیب یہ کی کہ ڈھیر ساری موٹی موٹی کتابیں میرے اوپر لاد دیں۔ مجھے اوندھا ہو کر سونے کی عادت تھی۔ میں پھر بھی نہ جاگی تو ایک صندوقچہ کمر پر رکھ دیا' پھر بھی نہ اٹھی تو رائٹنگ ٹیبل کے ساتھ کی کرسی بڑی احتیاط سے رکھی ہوگی۔ خود تو غائب ہو گئے' میں تو لیٹی ہوئی تھی مجھے تو کچھ دکھائی نہ دیا۔ مگر سانس جیسے رکی جاتی' نہ ہاتھ ہلے نہ پاؤں۔ الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ اختر اپنے پلنگ پر تھے۔ نل سے پانی گرنے کی آواز آرہی تھی۔ بڑا غصہ آیا کہ یہ کس قسم کا بیہودہ مذاق ہے' اختر اب نہا رہے تھے۔ بڑا زور لگا کر سیدھے ہونے کی کوشش کی۔ دھڑام سے صندوقچہ گرا۔ لگا بم پھٹ گیا۔ دھڑ سے کرسی اور کتابیں گریں۔ چیخ کر کے جا رہے ہیں۔ "حمیدہ بیگم" آپ کیا توڑ رہی ہیں؟ بکھری ہوئی چیزوں کو دیکھ کر میں اتنا ہی بگڑ کر بولی۔ "یہ جو آپ کتابیں' صندوقچہ' کرسی میرے اوپر لاد گئے ہیں ان کو گرا رہی ہوں۔ یہ کس قسم کا بیہودہ مذاق ہے سوتے ہوئے انسان کے ساتھ۔"

اختر غسل خانے سے چیخ کر بولے۔ "خیر ہو' کچھ دماغ تو ٹھیک ہے۔ میں کیا آپ پر لاد گیا۔ یہ کیا کہہ رہی ہیں؟ غسل خانے سے نکل کر ڈریسنگ روم میں آئے۔ ادھر ادھر گری ہوئی چیزیں نظر آئیں۔ حیرت زدہ ہو کر بھناتے ہوئے برآمدے سے نکل کر مولوی صاحب کے کمرے کی طرف گئے۔ جانے کہاں سے اتنی عقل آگئی۔ بال ہاتھ سے برابر کرتی' دوپٹہ ہاتھ میں پکڑ اختر کے پیچھے مولوی صاحب کے کمرے کی طرف بھاگی۔ وہ ابھی غسل خانے میں تھے۔ اختر دروازے پر بہت بگڑے ہوئے غصے میں کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے اختر کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر ذرا زور سے کہا۔ "آپ حد کرتے ہیں کہ سمجھ بیٹھے کہ یہ سب مولوی صاحب نے کیا تھا۔ میں نے تو آپ سے مذاق کیا تھا خود آپ لوگ تو محفلوں تک میں الٹے سیدھے مذاق کریں تو وہ سب ٹھیک اور جائز' ذرا سا میں نے مذاق کیا کہ دیکھوں آپ کتنے پانی میں ہیں' کس قدر سہار ہے؟ بس اتنے سے مذاق پر ایسا برا مانا کہ مولوی صاحب سے میری شکایت کرنے آگئے۔ اب مولوی صاحب دروازہ کھول کر باہر آئے۔

میری باتیں سن ہی لی ہوں گی بولے۔ "ٹھیک تو کہہ رہی ہے۔ ہم سب نے بھی تو کوئی حد نہ چھوڑی تھی۔ دوسرے یہ کہ جب آپس میں لڑو جھگڑو تو شکایت میرے پاس نہ لانا۔" اس قدر معصومانہ انداز سے مجھے دیکھا جس میں بڑے معنی پنہاں تھے۔ "ہم تم دوست دوست"۔۔۔۔۔ میں نے کہا۔ "مولوی صاحب بالکل یہی ہماری اماں بھی ہم سے کہا کرتیں کہ نہ مجھ سے پوچھ کر کھیلیں نہ مجھ سے شکایت کریں۔"

"میں اختر کو یہی منع کرنے ان کے پیچھے پیچھے اتنی صبح آپ کے کمرے تک آئی تھی۔" اختر نے پہلے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا' پھر مولوی صاحب کی طرف دیکھ کر گویا حقیقت سمجھنے کی کوشش کی' نگران کا روکھا سا چہرہ دیکھ کر کچھ بھی اندازہ نہ لگا سکے۔

جالبی بھائی! سنی آپ نے یہ انوکھی واردات۔ ساری عمر جب بھی میں نے نئی نویلی دلہن کے ناشتے کی تیاریوں کو دیکھا کہ کس کس اہتمام سے تیار کر کے گھر والی خواتین دلہن کے اٹھ کر باہر آنے کی منتظر ہیں تو اپنی پہلی صبح یاد آجاتی اور بے اختیار ہنسی آتی۔ پر کسی سے کیا کہتی کہ میری خاطر کس طور ہوئی۔ مگر دل ہی دل میں ایک طرح کا فخر محسوس کرتی کہ گھسا پٹا طور طریقہ تو ہر دلہن دیکھتی ہے۔ پر میرے ساتھ جو ہوا وہ کبھی نہ کسی دلہن کے ساتھ ہوا اور نہ کبھی ہوگا۔"

ناشتے پر مولوی صاحب سیریس موڈ میں رہے' مگر جب میری طرف دیکھتے تو مجھے لگتا کہ کچھ کہنا چاہتے ہیں اور موقع آنے پر جب اختر سامنے نہ تھے' تو کہہ ہی بیٹھے۔ "تم نے بڑے مزے سے مجھے بچا لیا' ورنہ وہ باگڑ بلا تو میری جان کو آجاتا۔" اختر کو وہ پیار میں مجھ سے جب اکیلے میں بات کرتے تو باگڑ بلا ہی کہتے۔ ناشتے پر مجھ سے پوچھا کہ یہ تو بتاؤ تم لوگ شاموں کو اپنے گھر پر کیا کرتی تھیں۔ میری شامت اعمال ہی تو تھی جو بتا دیا کہ جب تک اندھیرا نہ ہونے لگے ہم سب بیڈ منٹن کھیلتے تھے۔ کھانے کے بعد کبھی تاش کھیل لیے کبھی پچیسی۔ تو پھر تم یہاں بھی یہی کرنا۔ پوچھا کس کے ساتھ؟" بولے "میرے اور اختر کے ساتھ!"

ناشتے کے بعد دونوں اخبار پڑھتے رہے۔ ساڑھے آٹھ بجے دونوں اپنے اپنے دفتر میں جا بیٹھے جو میرے لیے علاقہ ممنوعہ تھا۔ ابھی وہیں برآمدے میں بیٹھی سوچ رہی تھی کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے کہ اتنے میں بشیر خانساماں نے آکر دریافت کیا۔ "دلہن پاشا آج رات

کھانے پر کیا پکتا ہے۔ پہلے تو دن کے کھانے کی بات کرو۔ میں نے کہا۔ وہ حیران ہو کر میرا
منہ دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔ "ہمارے گھر میں دن کا کھانا نہیں کھایا جاتا" اس لیے "پکتا ہی
نہیں۔" "کیا؟" میں حیران کہ یہ کیسی بات ہے۔ کہنے لگا کہ "شاید آپ کو اختر میاں نے
بتایا نہیں۔" میں "نہیں" کہہ کر کچھ دیر چپ رہ کر بولی "مگر کل تو دن کا کھانا ہم سب نے
کھایا تھا۔ اس پر اس نے بتایا کہ جمعہ کا دن تھا' چھٹی ہوتی ہے بس اس دن مولوی صاحب
کے دوست آتے ہیں اور بہت سے لوگ ان کے ساتھ کھانا بھی کھاتے ہیں۔ "تو پھر یوں
کرو کہ جو پرسوں رات پکایا تھا وہی پکالو۔" بشیر اس پر ہنس پڑا کہ "پرسوں رات آپ لوگ
یہاں کب تھے۔" "اچھا تو پھر یوں کرو کہ جو ہمارے گھر میں پکتا ہے وہ پکالو۔" بشیر حیران سا
مجھے دیکھ رہا تھا۔ بولا۔ "دلہن پاشا مجھے کیا خبر کہ آپ کے ہاں کیا پکایا جاتا ہے۔" "دیکھو بشیر
اسی طرح مجھے بھی کچھ ابھی معلوم نہیں کہ مولوی صاحب کس طرح کا کھانا پسند کرتے ہیں
اور اختر صاحب کی پسند کیا ہے۔ تم خود ہی بس سوچ کر ان کی مرضی کے مطابق پکالیا کرو۔
بس اتنا کرنا کہ ایک کاپی لیتے آنا' روز مجھے حساب لکھوا دیا کرنا۔ بشیر خوش کہ اس کی راج
دھانی میں ایک عورت کے آجانے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ جب جانے لگا تو میں نے
یہ بھی کہا کہ ہاں مجھے شریفے ضرور لیتے آنا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھ کر کہا۔
"دلہن پاشا مولوی صاحب کے گھر شریفے تو ہرگز نہیں آسکتے۔ میری تو چھٹی ہی کر دی
جائے گی اور اختر صاحب کو بھی بہت ناپسند ہیں۔ میں نے کہا۔ "تو بے شک وہ دونوں نہ
کھائیں میں ہی سب خود کھالوں گی۔ دوپہر کو تم کھانا تو دو گے نہیں" "مگر شربت اور کوئی
پھل تو ملے گا۔ بشیر اچھا ذرا یہ تو بتاؤ کہ شریفے میں آخر خرابی ہے کیا؟ اور کیوں اس کو
اس قدر ناپسند کرتے ہیں۔" "یہ آپ خود ہی ان سے پوچھ لیجے گا" ------ "مگر تم آج تو
ضرور ہی لے آنا۔" وہ چلا گیا۔ میں سوچ رہی تھی کہ بیر تو اس مزے سے کھا رہے تھے
جیسے کہ کوئی بڑی نعمت ہو اور شریفے کے خلاف۔

دوپہر تک مجھے کیا کرنا ہے۔ ہاں ایک نئی کوزی ہی ڈالوں کہ چائے دان تو کیا سے نہ
ڈھانکا جائے۔ میرے سامان میں جو گٹھری میری آپا نے دی تھی' اس کو کھولا تو اس میں
سے سب ہی کچھ نکلا سوئی تاگے' ٹیپ' قینچی' بٹن اس میں بہت سے مختلف رنگوں کے
سلک کے ٹکڑے بھی تھے۔ اس گٹھری کی انہوں نے مجھے یہ ہسٹری بتائی تھی کہ والدہ کی نانی

کی تھی۔ تھوڑی دیر سوچا کی کہ یہ بہت بوڑھی ہو گئی ہے۔ چوتھی پشت کے ہاتھوں میں پہنچ
گئی۔ اب میں نے اس کو سنوار کر آپا کی پوتی کو اسی طرح سب سلائی کا سامان رکھ کر اس کو
شادی پر دوں) پرانی کوزی تو سوتی کپڑے سے بنایا ہے۔ پلنگ کی چادر میں سے ایک گرہ کپڑا
پھاڑ کر ہاتھ سے سی کر اور پلنگ پر جو گدا سا سوکھا گیا تھا جس کو میں نے پلنگ کے نیچے رکھ
دیا تھا۔ اسی میں سے روئی نکال کر بھری۔ کڑھے ہوئے ٹکڑے سے نئی کوزی کا کور سیا' پھر
جا کر مولوی صاحب کے چائے دان کو اوڑھا آئی۔ واپس آتے آتے اختر کے دفتر کی چق ذرا
سی ہٹا کر اندر جھانکا۔ ان کی پیٹھ میری طرف تھی۔ بڑے انہماک سے کام کر رہے تھے۔
میں کھڑی کچھ دیر سوچا کی کہ اختر قریب بھی اور پھر دور بھی ہیں۔ پھر جلدی سے وہاں سے
کھسک آئی کہ یہ تو میرے لیے ممنوعہ علاقہ ہے اور یہ دونوں بڑے ہی مختلف لوگ ہیں۔

بشیر نے ایک پیچ ٹرے لا کر دی جس میں سنگترے کا جوس اور ایک کیلا تھا۔ ساتھ ہی
ایک چھوٹی سی شریفے کی تھیلی بھی دی یہ کہہ کر "کھانے کے بعد چھلکے اور بیج اسی تھیلی میں
ڈال کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیجیے گا۔" میں شریفے دیکھ کر اتنا خوش ہوئی کہ [illegible]
کرنا بھول ہی گئی۔ شربت پی کر اطمینان سے پلنگ پر ٹرے رکھ پالتی مار کر اپنی شریفہ کھا
رہی تھی کہ مولوی صاحب اپنے کمرے میں کسی کام سے جانے کے لیے برآمدے میں
آئے ہوں گے۔ کہیں میری موجودگی اور اپنی صبح والی حرکت کا خیال شاید آیا ہو۔ میرے
کمرے کی چق اٹھا کر جھانکے تو یہ دیکھ کر کہ میں شریفہ کھا رہی ہوں' اچھل پڑے۔
"ارے ارے یہ کیا کر رہی ہو۔ کس نے لا کر دیے؟" بشیر نے۔ کیوں کہ میں نے اس سے
منگائے تھے۔ "خیر اور اب کبھی نہ یہ کھانا۔ آخر کیوں؟ مجھے تو شریفے بہت پسند ہیں" ایسے تو
نہ میں نے کبھی دیکھے نہ کھائے' آپ بشیر کو تو کچھ نہ کہیں۔ وہ تو لانے سے انکار کر رہا تھا۔
جب میں نے کہا کہ کیا تم میری پہلی فرمائش کو پورا نہ کرو گے۔ تو بے چارا لے آیا۔ آخر اس
کے کھانے پر آپ کو اور اختر کو اعتراض کیوں ہے؟ ہم بتائیں کیوں ہے؟ غصے سے اپنا
منہ خوب ایک طرف کو ٹیڑھا کر لیا کہ منہ یوں ہو جاتا ہے۔ میں حیرت زدہ ہو کر بولی۔ "پھر
میرا ہی منہ ٹیڑھا ہو گا۔ آپ یا اختر کا تو نہیں ہو گا۔" تو کہا "ہم ایک لقوہ زدہ منہ والی لڑکی
کو اپنے گھر رکھے رہیں گے۔ اسی وقت ٹکٹ کٹا کر ظفر عمر کے پاس روانہ کر دیں گے۔"
کچھ ماتھے پر بل ڈالے عینک ٹھیک کرتے ہوئے چلے گئے۔

ایک دم مجھے ان دو ہرنوں کا خیال آیا جو پالے گئے تھے' جن کا ذکر اختر نے میرے ہم
اپنے کسی خط میں کیا تھا۔ میں نے اورئی میں ایک ہرنی پالی تھی اس کا نام رانی رکھا تھا۔
جب مولوی صاحب سے اختر نے بتایا تو بولے ہم تم "رانی اور راجہ" کیوں نہ پال لیں۔
دوسرے ہی دن ایک ہرنوں کا جوڑا منگا لیا تھا۔ صبح شام دونوں کھڑے ہو کر ان کو دیکھ کر
خوش ہوا کرتے تھے۔ میں برآمدے سے اتر کر کوٹھی کے پچھلے حصے کی طرف جا کر رانی اور
راجہ کو چوکڑیاں بھرتے دیکھ رہی تھی۔ سامنے سے کوئی بزرگوار کمر اتنی جھکی ہوئی جیسے یہ
دوہرے ہوئے جا رہے ہوں' بہت ہی گورا چٹا رنگ' ہاتھ میں باریک سی چھڑی لیے میری
طرف بڑھ کر قریب آ کر کہتے ہیں۔ "بیٹی میں ظفر عمر کا دوست ہوں' ان کا خط مجھے کل ملا
کہ میں تمہاری خیر خبر لے لیا کروں۔ تم ٹھیک سے ہو۔ جب بھی کسی چیز کی ضرورت ہو
کوئی تکلیف ہو تو بلا تکلف مجھ سے کہہ دیا کرنا۔ میں تو تمہارا چچا ہوں۔ آداب کر کے ان
کو بتایا کہ میں ٹھیک ٹھاک ہوں کوئی تکلیف نہیں سوائے اس کے کہ شریفے اس گھر میں
نہیں آ سکتے۔ بس آپ کبھی کبھار چند شریفے میرے لیے لیتے آیا کریں۔ مگر آپ مجھے دیں
گے کس طور کیوں کہ کوئی اندر سے باہر کے حصے میں جا نہیں سکتا اور کوئی دفتر سے ادھر
قدم نہیں رکھ سکتا۔ بولے تم اس کی فکر نہ کرو' میں کاغذ میں لپیٹ کر پھولوں کی کیاری میں
رکھ دیا کروں گا۔ یہ صاحب شان الحق حقی کے والد تھے۔ جب وہ واپس جا رہے تھے تو
سوچتی رہی کہ ذرا زور کی ہوا چلی تو یہ بیچارے اڑ ہی تو جائیں گے۔ دل میں خوش کہ چلو
کوئی میرا اپنا اس دیارِ غیر میں موجود ہے۔

اپنے کمرے میں آ کر سو گئی۔ اختر نے اگر کسی وقت اندر آ کر میری خیر خبر لینے کی زحمت
کی ہو تو وہ مجھے کیا معلوم ہو سکتا تھا۔ ساڑھے پانچ بجے ہوں گے کہ اختر نے مجھے ہلا کر اٹھایا
کہ "جلدی اٹھیں۔ مولوی صاحب چائے بنانے والے ہیں۔ منہ دھو کر جھٹ پٹ باہر
آ جائیں۔ آپ کے شریفے کھانے سے ان کا پارہ بہت چڑھا ہوا ہے۔ میں جھٹا جھٹ منہ
دھو' بال برابر کر کے برآمدے میں آئی۔ دیکھا مولوی صاحب ٹی کوزی ہاتھ میں پکڑے کبھی
چائے دان پر رکھتے اور کبھی اٹھا لیتے۔ مجھے دیکھ کر مسکرائے اور بولے۔ "آج تو حد ہو گئی
کہ ہمارے چائے دان کو کسی نے ٹوپی پہنا دی۔ یہ بات تو بہت اچھی کی جس نے بھی کی۔
اب چائے دیر تک گرما گرم رہا کرے گی۔ گو صاف سمجھ رہے ہیں کہ میں نے ہی ہے مگر

بار بار کے جاتے کوئی باغ میں سے برآمدے میں آیا چائے دان کو ٹوپی اڑھا اور چلتا بنا۔
اگر ہم سے مل کر جاتا تو اس کا بہت شکریہ ادا کرتے" میں دل میں بہت خوش ہوئی۔ جلدی
سے میز کی طرف بڑھی کہ آج چائے میں دم کروں گی۔ چائے کے ڈبے کا جوں ہی ڈھکن
کھولنے لگی۔ "ارے ارے یہ کیا کرتی ہو۔ ہم کسی بھی بدنیت کے ہاتھ کی بنائی چائے پیا
ہی نہیں کرتے۔" میں نے مڑ کر کہا۔ "بھلا آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں بدنیت ہوں۔
اگر یہی بات میں کہوں تو؟" "کسی کے کہنے سے کوئی میں بدنیت ہو جاؤں گی۔ مگر برابر
مسکراتے رہے۔ آنکھوں سے جیسے شفقت ٹپک پڑے گی۔ میرا تڑ سے جواب حاضر
کر دینے پر جیسے ان کو اچھا لگ رہا تھا۔ وہ کہاں عادی تھے کہ ان کے رعب کے مارے کوئی
جواب دینے کی جسارت کرے۔ مگر میں نے تو ریل ہی میں یہ فیصلہ دل میں کر لیا تھا۔ "بی
حمیدہ ہوشیار رہنا ورنہ بری طرح ماری جاؤ گی۔ تمہارا پالا پڑا ہے بہت بِکٹ قسم کے لوگوں
سے۔ بڑی ہمت کر کے ہوشیاری کے ساتھ نہلے پہ دہلا ڈالنا ہو گا"

مولوی صاحب نے جب چائے بنا لی تو میں نے کہا۔ "اگر پانچ منٹ ٹی کوزی کو ڈھکا
رہنے دیا جائے تو چائے اچھی طرح دم کھا جائے گی۔ چائے دان ڈھک تو دیا مگر بالکل بچوں
کی طرح گھڑی پر نظر جما کر ہر منٹ کے گزرنے کا اعلان ہوتا رہا۔ لو ہو گئے پانچ منٹ۔
ایک' دو تین کہہ کر چائے پیالیوں میں ڈالی۔ خود ان کو زیادہ مزے دار لگی۔ "یہ لڑکی بھی
کبھی بات ٹھیک ہی کہتی ہے۔"

اختر نے مولوی صاحب سے پوچھا ہم دونوں آج جا کر ذرا بابا اور سروجنی نائیڈو سے مل
آئیں۔ بولے۔ "ہاں ہاں ضرور مل آؤ مگر ہماری لڑکی کو ان کے کتے سے نہ کٹوا دینا۔ بڑا
خطرناک ہے۔" میں کتوں سے بے حد ڈرتی تھی۔ "اگر وہاں ایسا کتا ہے تو میں وہاں ہرگز
نہ جاؤں گی۔" "آپ کس کی باتوں میں آتی ہیں۔ ان کو تو لوگوں کو ڈرانے اور ستانے میں
مزا آتا ہے۔ کتا وہاں ضرور ہے اور بھی بہت سے جانور ہیں۔ سب کے ساتھ مل جل کر
رہتے ہیں۔ مجھے اطمینان ہو گیا۔ جھٹا جھٹ تیار ہوئی۔ خوش ہو رہی تھی اس گھر سے باہر
کی دنیا تھوڑی دیر کو دیکھنے میں آئے گی اور ان لوگوں سے ملاقات ہو گی جن کا ذکر اختر
اپنے خطوں میں کچھ اس طور سے کیا کرتے کہ ایسا لگ رہا تھا کہ جانے پہچانے ہی لوگوں
سے ملنا ہو گا۔ چلتے چلتے اختر نے کہا کہ "اگر بابا نے بہت اصرار کیا تو شاید ہم دونوں کھانا

وہاں کھالیں۔ آپ وقت پر کھانا کھا لیجیے گا۔" جی نہیں سیدھے سیدھے ٹھیک وقت پر آجائیں۔ آج تو پہلے روز حمیدہ کا پکوایا ہوا کھانا ملے گا۔" میرا دل گھبرایا کہ خاک میں نے پکوایا۔ بشیر نے جو بھی پکایا ہو۔ کمرے میں چلی گئی کہ کہیں پوچھ نہ بیٹھیں کہ کیا پکوایا ہے۔ جلدی سے ایک ساری پہن جُوڑا لپیٹ باہر آئی۔ دونوں وہیں برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ زور سے ہنسے اور کہا۔ "لو بھئی یہ تو ایک بنگالن بن گئی۔" اختر نے خود بھی مجھے آج پہلی بار ساری میں دیکھا۔ بولے "آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔" میں جیسے جل بُھن سی گئی۔

—○—

بابائے اردو

ہمارے گھر سے چند میل پر "سروجنی ولا" تھا۔ بہت غور سے دونوں طرف گردن موڑ موڑ کر شہر کو دیکھ رہی تھی۔ کیسی چوڑی چوڑی پختہ سڑکیں، دونوں طرف بلند و بالا پیڑ جیسے ایک دوسرے سے سر جوڑے باتیں کر رہے ہوں۔ کسی کسی چوراہے پر فوارے بھی چل رہے تھے۔ بڑی بڑی خوب صورت عالی شان کوٹھیاں، سرِ شام سے بجلی کے بے شمار بلب جگ مگ جگ مگ کر رہے تھے۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے جیسے بارش اب ہوئی تب ہوئی۔ بہت حیرت سے دیکھ رہی ہوں۔ شاید اختر کی نظر میری طرف ہوگی۔ بولے "اس قدر حیران کیوں ہو رہی ہیں۔ یہ دکن کا پایۂ تخت شہر حیدر آباد ہے۔ لکھنؤ، علی گڑھ یا میرٹھ تو نہیں۔

تھوڑی دیر بعد ایک بہت بڑے احاطے میں موٹر داخل ہوئی۔ بیچ میں ایک حویلی نما بہت بڑی کوٹھی، بہت بڑا لان، باغ کے ساتھ ساتھ گزرتے ہوئے ہم سیدھے ہاتھ کی طرف ایک چھوٹے سے دو منزلہ فلیٹ کے پاس پہنچ گئے۔ اُلٹے ہاتھ کی طرف کوٹھی سے ملی ایک دو منزلہ عمارت پر بھی نظر پڑی جو آدھا فرلانگ لمبی تو ضرور ہوگی۔ اختر سے پوچھا کیا ادھر کوئی ہوسٹل ہے؟ کہا نہیں، یہ سرجن نائیڈو کا اسپتال ہے۔ جو روشن کمرے آپ کو دکھائی دے رہے ہیں، یہ مریضوں کے کمرے ہیں۔ سامنے کا فلیٹ مسز نائیڈو کے بیٹے (بابا) جے سوریا نائیڈو کا ہے۔ شاید آپ کو یہ نہ لکھا ہو کہ بابا بھی سرجن ہیں۔ سب مل کر جرمنی میں دورانِ تعلیم اور پھر اس کے بعد بارہ سال رہے۔ جے سوریا نائیڈو کی بیوی "ایوا" جرمن ہیں، بچہ کوئی نہیں، ہر قسم کے جانور اس کے فلیٹ میں موجود ہیں۔

موٹر سے اتر کر مجھے اوپر لے گئے، دونوں میاں بیوی ہمارے استقبال کو دروازے پر موجود تھے۔ اختر نے مجھے ان سے ملوایا کہ "یہ ہیں حمیدہ!"

بابا نے بڑھ کر مجھے گلے سے لگا لیا۔ ایوا نے پیار کیے۔ دونوں ہی مجھے پل بھر میں جیسے

کو پریشان نہ کریں گی۔ ہم ان سے کچھ نہ کہیں گے۔" اتنے میں بیرا چائے کی ٹرالی ان کے سامنے کر کے واپس چلا گیا۔ وہ چائے پیالیوں میں بناتی جاتیں اور اختر سے باتیں کرتی جاتیں۔ میں کئی بار لکھنؤ میں ظفر عمر صاحب کے گھر گئی۔ مگر کبھی اس لڑکی کو نہ دیکھا۔ کہیں وہ لڑکیوں کو پردے میں تو نہیں رکھتے؟" میں جھٹ سے بول پڑی۔ جب آپ ہمارے ہاں آئیں تب وہ مجھے اتنا بڑا نہ سوچتے ہوں گے۔ اس لیے باہر ہمیں آنے کو نہ کہا۔ اگر تب ہم باہر آتے تو کسی سے کیا بات کرتے۔ ہاں پردے کے پیچھے سے ہر بار آپ کو دیکھا بھی اور آپ کی پوئٹری سنی بھی۔ بھئی کیا ہی انداز آپ کے پڑھنے کا تھا۔ دل میں کہا کہ سچ مچ یہ "بلبلِ ہند" ہیں۔

ہنسنے لگیں۔ "تو چوری چوری دیکھنے اور سننے کے بجائے باہر نکل کر کیوں نہ آ گئیں؟ لو یہ سینڈوچ کھاؤ' تمہاری تو چائے بھی ٹھنڈی ہو گئی ہوگی بس تم تو ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھ رہی ہو۔"

"وہ اس لیے کہ مجھے یقین سا نہیں آرہا ہے کہ میں بالکل سامنے اور اتنے قریب بیٹھ کر آپ کو دیکھ رہی ہوں۔"

"ارے میں تو بھول ہی گئی تمہاری شادی کا تحفہ دینا۔" ایک بڑا سا ڈبّہ جس پر پھول دار کاغذ چڑھا ہوا تھا وہ میرے ہاتھ میں دیا میں سمجھ گئی کہ اس میں ساری ہے۔ اختر کو ایک ڈبّہ دیا جس پر کاغذ چڑھا نہ تھا۔ میں نے ان کے ہاتھ سے لے کر کھول کر دیکھا۔ اس میں کرسٹل کی ایش ٹرے اور ایک لائٹر تھا۔ میرا ڈبّہ خود ہی کھولا اور ساری دکھا کر پوچھا۔ "اگر اس کے رنگ پسند نہ آئیں تو میں دکان سے بدل کر لادوں گی۔" کریم رنگ کی مدراسی سلک اور سرخ چوڑا سا بارڈر۔ مجھے بے حد اچھی لگی جلدی سے ڈبّے کا ڈھکن بند کر کے ہاتھ میں پکڑ کر بولی۔ "مجھے ان دو رنگوں کی آمیزش بہت اچھی لگی۔" میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ مڑ کر اختر سے پوچھا "تم اور مولوی صاحب مدراس کب تک جاؤ گے؟ تمہارے ساتھ اپنی ایک بہن کو کچھ چیزیں بھیجنا چاہتی ہوں' لے جاؤ گے نا۔" پھر وہی مدراس کا ذکر۔ میں اس وقت ایک دم پوچھ بیٹھی۔ "میں بھی تو ان کے ساتھ جاؤں گی نا۔" اختر نے ذرا روکھائی سے کہا۔ "ہم ایک کانفرنس میں جا رہے ہیں۔ آپ کو لیے لیے کدھر پھریں گے؟"

مسز نائیڈو کی طرف دیکھ کر میں نے پوچھا۔ "تو پھر میرا کیا بنے گا۔ ذرا ان صاحب سے پوچھ کر آپ مجھے بتائیں؟"

"اختر تو کیا تم دونوں اس بچّی کو اکیلا گھر میں چھوڑ جاؤ گے۔ ایسا تو ہرگز نہ کرنا۔ بابا کا فلیٹ بہت چھوٹا سا ہے۔ میرے پاس چھوڑ دینا۔" میرا دل گھبرانے لگا کہ گویا میں ایک بکس وغیرہ ہوں کہ یہاں رکھ دینا یا وہاں؟" ایک دم مجھے مولوی صاحب کی تاکید یاد آئی اور واپس جانے کی اجازت چاہی۔ اختر بھی کھڑے ہو گئے۔ مجھے پھر پیار کرتے ہوئے کہا کہ "جب جمعہ کو اختر اور تم بابا کے ہاں آؤ اور اختر کا دل میرے پاس آنے کو نہ چاہے تو تم خود نیچے اُتر کر سیدھی میرے پاس ضرور آیا کرنا۔"

"بہت بہتر" خدا حافظ کر کے ہم گھر واپس آئے تو مولوی صاحب روش پر ٹہل رہے تھے۔ شاید ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ہم تینوں گھر میں آئے۔ کھانا کھا کر کہنے لگے۔ "تم کو ایک چیز دکھانا ہے۔" بچوں کی طرح خوش خوش بہت سی چیزیں ہاتھ میں لیے کمرے سے برآمدے میں آکر میز پر میرے سامنے رکھ دیں۔ سب ہی کاغذوں میں لپٹی ہوئی تھیں۔ مجھے معلوم نہ ہوا کہ یہ ہیں کیا؟" فرمایا کھولو کھولو' دیکھو تو۔"

جب بڑے والے بنڈل کو کھولا تو اس میں تین بیڈ منٹن کے ریکٹ' دوسرے میں نیٹ اور ساتھ والے ڈبّے میں چھے عدد شٹل کاک۔ دوسرے پیکٹ میں پچیسی کی بساط اور کوڑیاں' تیسرے ڈبّے میں دو عدد تاش کی جوڑیاں۔ خوش ہو ہو کر سب کھولتی جاؤں اور نظر اُٹھا کر اپنے مولوی صاحب کو دیکھ رہی تھی جو مسکرا رہے تھے۔ ان کی آنکھیں بچوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ میرے ہاتھ سے سب کھن کھن کوڑیاں گر گئیں۔ اختر قریب مونڈھے پر ڈٹے بیٹھے' کبھی مجھے اور کبھی مولوی صاحب کو دیکھتے ہوئے ہنسی کو اپنے موٹے موٹے ہونٹوں کو بھینچ کر روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ بھی نہ کیا کہ کوڑیاں اُٹھا دیتے۔ میں نے ساتوں چُن چُن کر اُٹھائیں مولوی صاحب پیچوان سے دھواں اُڑاتے بڑے فاتحانہ انداز سے دیکھتے رہے۔ میں نے کہا۔ "مولوی صاحب تاش تین لوگ کھیل سکتے ہیں اور پچیسی بھی مگر یہ بیڈ منٹن' دو آدمی کھیلیں یا چار' ہم تو تین ہیں۔ دو کھیلیں گے تو ایک بیٹھ کر منہ دیکھا کرے گا یا آپ کسی ایک کو کھیلنے کے لیے بلا لیا کیجیے گا۔ کیسی باتیں کرتی ہو۔ ہمارے گھر کے اندر کوئی اور آکر ہمارے ساتھ کھیلے تاکہ سارے شہر میں نہیں سارے

ہندوستان میں یہ بات مشہور ہو جائے، عبدالحق اس بڑھاپے میں بیڈ منٹن کھیلنے لگا ہے۔ یہ کیا کم ہے کہ ایک عدد تم لڑکی گھر میں گھس آئی ہو۔"

"ہائیں ہائیں آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میں کوئی خود سے تو آپ کے گھر میں گھس نہیں آئی۔ آپ خود ہی تو بڑی دور سے مجھے لینے آئے تھے جس کے گواہ کئی سو لوگ تو ہوں گے اور رہا یہ کہ شہر میں اور سارے ملک میں آپ کی بدنامی ہو جائے گی۔ بھئی کیوں ہو جائے گی۔ اپنے گھر میں بیڈ منٹن کھیلنا کون سا عیب ہے۔ بس میں تو آج ہی آپ کے منہ سے ایسی بات سن رہی ہوں۔" دونوں میری باتوں پر مسکرائے چلے جا رہے تھے۔ کہنے لگے۔ میاں اختر یہ لڑکی کج بحثی کچھ زیادہ ہی کرتی ہے۔ تمہارا تو اللہ ہی مالک ہے۔"

اتنے میں محبوب آ گیا۔ میز پر سے سب چیزیں اُٹھا کر ایک طرف رکھیں اور کھانے کے برتن لگا کر کھانا لا کر رکھ دیا۔ کھٹا پالک گوشت، بھنڈی کی سبزی اور مسور کی دال، خوش ہو کر جھک کر دیکھا اور پوچھا "بھئی یہ تم کو کیسے معلوم ہوا کہ ہم کو یہ پسند ہے؟ آج تو تم نے بتا کر پکوایا ہے۔ مگر میٹھے میں کیا ہے؟

میں جلدی سے بولی۔ "مجھے جادو سے معلوم ہو گیا۔ میٹھے میں گھریلا ہے؟" ہنسے اور بولے "اختر ہم دونوں کو ان صاحبزادی سے بڑا بچ کر رہنا پڑے گا۔ کہیں چڑیا بنا کر ہم کو اُڑا ہی نہ دیں۔"

"ہاں اگر مجھے اکیلا گھر میں چھوڑ کر گئے تو جادو کے زور سے آپ دونوں کو چڑیا بنا کر ریل کے ڈبے سے واپس بُلا لوں گی۔"

کھانا ختم ہوا۔ مولوی صاحب کا پیچوان محبوب نے لا کر رکھا۔ نیچہ کھول کر ان کے ہاتھ میں تھما کر برتن لے کر چلا گیا۔

مولوی صاحب نے کہا کیا خیال ہے اب کچھ دیر تاش یا پچیسی کھیلیں۔"

"آپ بھی بھلا کس کی باتوں میں آ گئے۔ میں تو آج کی ڈاک سے باہر کے آئے ہوئے اخبار پڑھنا چاہتا ہوں۔" بولے "بھئی تم تو کچھ بڑے ہی بدمذاق ہو۔ میں نے بھی تو زندگی بھر ایسی چیزوں کو ہاتھ نہیں لگایا۔ ہر وقت پڑھ پڑھ کر اور لکھ کر بھیجا اور آنکھیں دونوں ہی پلپلائی جاتی ہیں۔" یہ کہہ کر تاش کو ڈبے سے نکال کر بیٹھ گئے۔ بتاؤ ہم کو یہ کیسے کھیلتے ہیں؟ میری جان خشک ہونے لگی کہ اگر تاش کبھی چھوئے ہی نہیں اور پچیسی کبھی کھیلی

نہیں تو دونوں بات بات پر میری جان ضیق میں کر دیں گے اور ہوا بھی یہی۔

پہلے تو میں نے دونوں کو بتایا۔ ہم تینوں رمی کھیلیں گے۔ اس کے نمبر تینوں کے ناموں پر لکھے جائیں گے۔ بعد میں دیکھیں گے کون ہارا کون جیتا؟ دونوں کہنیاں میز پر ٹکا کر، ہاتھوں پر ٹھوڑی جمائے بڑے غور سے دیکھ رہے ہیں، دھیان لگا کر سن بھی رہے ہیں کہ غلام، بیم اور بادشاہ کے دس نمبر اور جوکر کے بھی دس نمبر، مگر اس کو آپ چاہیں تو جو پتہ بنا کر دوسرے پتوں کے ساتھ لگا سکتے ہیں جیسے سات اور نو پھول کے پتے آپ کے ہاتھ میں ہیں تو جوکر کو درمیان میں رکھ لیں تو یہ اب پھول کا اٹھا بن گیا۔ مولوی صاحب بالکل ہی کسی بچے کی طرح سب اصول دہراتے رہے، مگر اختر جز بز ہوتے رہے۔ پر دھیان دے کر سب کچھ ذہن نشین کرتے رہے۔ "اچھا اب میں پتے بانٹتی ہوں۔ تیرہ تیرہ پتے ہر ایک کو ملیں گے۔ میں اپنے والے ہاتھ میں پکڑے رہوں گی۔ آپ دونوں کے کھول کر سامنے رکھ دوں گی پھر کھیلوں گی تاکہ آپ خوب اچھی طرح سمجھ لیں۔ پھر جب سچ کا کھیل شروع ہو گا تو نمبر لکھے جائیں گے۔ پتے بانٹے، ان دونوں کے کھول دیے۔ میں نے خود ان دونوں کے پتے بنا کر سامنے لگائے کہ فالتو پتے یہ ہیں۔ گڈی سے نیا پتہ اُٹھا کر کس طرح ملتے ہوئے پتوں کے ساتھ میل کھاتا پتہ لگا کر کوئی سا نیچے ڈال دیں۔ اتفاق سے پتے ایسے آئے کہ اختر کا ہاتھ جیت گیا۔ مولوی صاحب کی تیوری پر بل آ گئے کہ تم نے جان کر اختر کو جتا دیا۔ دوبارہ جب وہ خود جیتے تو بالکل بچوں والی خوشی ان کے چہرے پر تھی اور لگے اختر کو چڑانے۔ "ہار گئے یہ حضرت تو ہار گئے۔ اختر بگڑ کر کھڑے ہو گئے بھئی یہ کیا مصیبت گلے ڈال دی۔ میں تو جا کر پڑھتا ہوں۔ آپ کھیلنا چاہیں تو ضرور شوق فرمائیں۔ یہ کہہ کر کمرے کا رُخ کیا۔ مولوی صاحب نے مجھ سے کہا بس آج کا سبق ختم۔ اب کل بتانا اور تم جلدی جاؤ، ورنہ صاحب بہادر کا پارہ چڑھ جائے گا۔

میں آداب کر کے کمرے میں آ گئی۔ دل میں سوچنے لگی کہ یہ کھیل بہت بھاری پڑیں گے۔ اس میں ہار جیت پر بگڑا ضرور کریں گے۔ اختر کو زندگی بھر میں نے ہار ماننے کی برداشت نہ دیکھی اور کہاں وہ جوانی کی افلاطونی طبیعت۔ کہنے لگے۔ "حمیدہ یہ تم نے بڑا پکا ڈال دیا۔ مولوی صاحب ہمارے اوپر سے کچھ اور ہیں مگر ان کے اندر ایک چھپا ہوا بچہ رہتا ہے۔ دیکھ لینا۔ اب وہ ہر روز کھیلیں گے۔ بڑی مشکل سے بیکیں گے اور جب بھی

بارے 'ایک قیامت برپا کریں گے۔" میں نے کہا معاف کیجیے آپ خود بھی تو ہارنے پر رو پڑے تھے۔

دوسرے دن میں نے بشیر سے کہہ کر چونا منگوایا۔ بیڈ منٹن کے دو لمبے پول برآمدے میں ایک طرف کھڑے کروا دیے گئے تھے۔ زمین کو خوب گہرا گڑھا کھدوا کر پول کھڑے کیے گئے۔ ان کے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے پتھر اور مٹی ڈال کر محبوب سے خوب کٹوایا کہ پول اپنی جگہ جم کر کھڑے رہیں۔ نیٹ بندھوایا۔ ٹیپ جو میری سلائی کی گٹھری میں میری بیمار آپا نے رکھ دی تھی اس کو نکال کر لائی۔ ایک دم مجھے ایسا لگا جیسے انہوں نے پیار سے میرے ہاتھ پکڑ لیے ہوں۔ اس وقت میں ذہنی طور پر یکایک ان کے کمرے میں پہنچ گئی اور ان کا وہ جملہ "حمیدہ حیدر آباد جا کر تمہارا واسطہ دو قسم کے بچوں سے پڑے گا۔ ایک بڈھا اور ایک جوان۔ عقلمندی سے شروع کے قدم اگر اٹھائے تو پوری زندگی مزے سے گزر جائے گی۔" اس وقت تو میں ان کی بات کو مطلق نہ سمجھی تھی، پر اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ سچ ہی کہا تھا۔ ٹیپ سے ناپ تول کر لکڑی کے ایک ٹکڑے سے زمین پر گہری لکیریں ڈال کر محبوب سے پتلے پتلے چونے کو ڈلوا دیا۔ یہ سب کارروائی کوئی گیارہ بجے کر رہی تھی کہ احتشام الحق چچا جھکے جھکے گھر کی دیوار سے لگے آتے ہوئے صاف نظر آئے۔ وہ میری کیاری میں کچھ رکھنے آ رہے تھے۔ مجھے باغ میں دیکھ کر سوچ رہے ہوں گے کہ یہ جھک جھک کر کیا کر رہی ہیں۔ جیسے ہی نیٹ بندھا تو سمجھ گئے کہ اس میں کھیل بھی ہوگا۔ اشارے سے بلا کر پڑیا ہاتھ میں دی جس میں وہی روز کی طرح دو شریفے تھے۔ ہاتھ دوسری جیب میں ڈالا اور ایک پڑیا اور نکال کر دی اس میں گٹھلیاں تھیں۔ پوچھا سب ٹھیک ہے نا؟ خوش ہو کر بتایا۔ میں خوب مزے میں ہوں۔ آج شام سے ہم لوگ بیڈ منٹن بھی کھیلیں گے۔ راتوں کو تاش اور پچیسی" ان کی دھنسی سی آنکھیں کچھ باہر کو یوں ابل پڑیں کہ بڑی لگنے لگیں۔ حیرت زدہ رہ گئے، بولے "تمہارا کیا مطلب مولوی صاحب!" میں نے کہا "تو اور کیا۔ انہی نے خود تو مجھے تاش، پچیسی اور بیڈ منٹن کا نیٹ، بلے منگا کر دیے ہیں۔ کل رات تاش کھیلنا سیکھا۔ مولوی صاحب اور اختر نے۔ آج شام کو بیڈ منٹن کھیلنا سیکھیں گے۔ مگر چچا آپ اس کا ذکر ہرگز کسی سے نہ کیجیے گا۔ میرے منہ سے اس وقت آپ کے سامنے یہ بات نکل گئی۔ کل ہی مولوی صاحب نے سختی سے منع کر دیا تھا کہ

اس کا ذکر ہرگز کسی سے نہ کروں ورنہ سارے شہر میں بات پھیل جائے گی۔ وہ تو حیرت کی ایک تصویر بن گئے۔ بس اتنا کہا "خدا تمہاری خیر کرے۔" مڑے جھکے جھکے جیسے خود اپنے قدم گن رہے ہوں۔ واپس چلے گئے۔ میں سوچ میں پڑ گئی کہ آخر ان کا مطلب کیا تھا؟

تھوڑی دیر میں مولوی صاحب اپنے کمرے میں جانے کے لیے برآمدے میں آئے۔ نیچے نیٹ اور سفید لکیروں کو دیکھ کھڑے ہو کر مسکراتے رہے۔ میں پیچھے سے سیڑھیاں چڑھ کر ان کے قریب سے گزری تو ان کو میرا قریب سے گزرنا معلوم ہی نہ ہوا۔ دل میں بڑی خوش کہ مولوی صاحب کا چہرہ خوشی سے دمکتا کیسا اچھا لگ رہا تھا۔ بالکل جیسے بچوں والی خوشی کا عالم ہو۔ وہ چق اٹھا کر اختر کے دفتر سے گزرتے ہوئے اپنے دفتر میں یا لائبریری میں چلے گئے۔ آج میں نے بھی چق اٹھا کر پیچھے سے جھانکا۔ اختر کی پیٹھ میری طرف کو تھی۔ میز پر جھکے لمبے لمبے پیلے کاغذوں پر لکیروں کو جیسے ادھر سے اُدھر کر رہے ہیں۔

اپنے کمرے میں آ کر سوچنے لگی۔ یہ اختر تو عجیب ہی ہیں، کبھی اندر آ کر ایک بار بھی میری خیر خبر نہ لی۔ میرے وجود کا احساس پانچ بجے تک مٹا رہتا ہے۔ شاید اس قسم کا کام کرنے والے ایسے ہی ہوتے ہوں گے۔ مجھے وہ شریفے اور گٹھلیاں یاد آ گئیں جو میرے ہاتھ میں دو پڑیوں کی شکل میں تھیں۔ اپنے حصے کے شربت کی ٹرے کا انتظار کروں گی، بعد میں کھاؤں گی۔ اتنے میں دو ایک خط ہی لکھ لوں۔ کرسی پر بیٹھی پیڈ اور قلم نکالا مگر خط نہ لکھا۔ سوچ میں پڑی رہی کہ لکھنے کو ابھی ہے ہی کیا۔ ایک دو روز بعد لکھ دوں گی۔ ایک رسالہ اٹھا کر پڑھنے لگی۔ یکایک خیال آیا کہ اگر ایک چھوٹا سا تخت برآمدے میں اور ایک میرے کمرے میں ہوتا تو لیٹ کر پڑھنے میں مزا آتا اور کچھ سلائی بھی تو ہو سکتی ہے۔ اچھا یہ تو میں آج ہی مولوی صاحب سے فرمائش کروں گی۔ شربت کے ساتھ آج دو بسکٹ اور سیب بھی تھا۔ سوچا آج راشن بڑھا دیا گیا۔ ٹرے کو کافی دیر دیکھ کر یہ سوچتی رہی کہ گویا یہ دن کا کھانا ہے۔ یہ کیا بات ہوئی؟ ان دونوں کو دن میں نہ کھانے کی عادت ہے اور مجھے کھانا کھانے کی۔ کیا اختر یا مولوی صاحب سے کہوں؟ اس سے تو ان کو یہ لگے گا کہ یہ لڑکی بڑی کھاؤ اور ضدی ہے مجھے خود ہی ہر طور ان کے طور طریقے اپنانا ہیں۔ شربت پیا، بسکٹ کھا کر گٹھلیاں کھالیں۔ پھر اپنے شریفے دروازہ بند کر کے کھائے۔ چھلکے کاغذ میں لپیٹ

کر ٹوکری میں ڈال دیے' پھر دروازے کی کُنڈی کھول کر الماری سے ایک کتاب نکالی اور لیٹ کر پڑھتے پڑھتے سو گئی۔

اختر نے جھنجھوڑ کر اُٹھایا۔ "حد ہوتی ہے سونے کی۔ مجھے ذرا پسند نہیں کہ شام کو دفتر سے تھکا ہارا آؤں اور آپ تیار ہو کر میرا انتظار کرتی نہ ملیں۔ اُٹھیں' جلدی کریں۔ مولوی صاحب چائے کا آج بڑا اہتمام کر رہے ہیں۔"

"کچھ زیادہ ہی خوش نظر آ رہے ہیں اور آج ہم کو قاضی عبدالغفار کے ہاں بھی جانا ہے۔"

پوچھا۔ "لیلیٰ کے خطوط والے"

"ہاں"

"اچھا تو آپ "لیلیٰ کے خطوط" پڑھ چکی ہیں؟ اسے پڑھنے کی اجازت آپ کی اماں نے کیسے دی؟" "یہ تو ایک دوست لے آئی تھیں۔ ہم نے بہت چھپ چھپ کر پڑھ کر ان کو واپس کر دی۔ اختر غسل خانے چلے گئے پانچ منٹ میں نہا دھو' چھیلا سے بن کر نکل آئے۔ تو بولے "آپ کو چھپ کر پڑھنے اور جھانکنے کی عادت ہے یعنی مجھے ہوشیار رہنا پڑے گا۔

مولوی صاحب چائے بنانے بیٹھے تھے۔ ایک انگریزی بسکٹ کا ڈبہ کھول کر سامنے کیا کہ "یہ آج کا تمہارا انعام ہے۔"

"پہلے یہ تو بتائیں کہ کس بات کا انعام؟" باہر کی طرف اشارہ کر کے' بیڈ منٹن کا نیٹ لگانے اور لکیریں بالکل سیدھی صاف ستھری ڈالنے کا۔ چائے پی کر ہم حقہ پی لیں تو کھیل شروع کیا جائے۔ میں تو جیسے غوطہ میں چلی گئی کہ آخر تین لوگ کیسے کھیلیں گے۔ دماغ سوچ رہا ہے اور چائے پی رہی ہوں۔ بسکٹ بہت اچھا لگا۔ ایک اور لینے کو ڈبے کی طرف ہاتھ بڑھایا تو مولوی صاحب نے بالکل بچوں کی طرح جھٹ ڈبے کو بند کر کے دبوچ لیا۔ میں نے بھی ہمت کر کے ان کے ہاتھ سے ڈبہ چھین لیا۔ حیرت سے میری جسارت پر مجھے گھور کر دیکھا گویا کہہ رہے ہیں۔ "میں ایسی جسارت کا عادی نہیں۔" مگر جیسے کسی نے کان میں کہا ہو کہ ڈبہ چھینا ہی ہے تو اب گھورنے سے ڈر مت جانا۔ بس ایک دو بسکٹ لے ہی لو۔ ایسا ہی کیا تو اپنا سر ایک دو بار ادھر سے اُدھر گھمایا۔ ماتھے پر ایک دو بل ڈال کر اور بھی گھور کر دیکھا۔ میں بسکٹ کی تعریف میں ایسے لگ گئی جیسے ان کے چہرے پر نظر میری پڑی

ہی نہ ہو۔ آخر وہ ہنسنے لگے اور پوچھا "کچھ اور بھی چاہیے؟" میں نے کہا "جی ہاں' دو چھوٹے تخت' ایک برآمدے کے لیے اور ایک اپنے کمرے کے لیے۔" تو زور سے ہنسنے لگے کہ "یہ خوب رہی' ابھی سے بڑی بی بن کر تخت کی زینت بن جانے کا شوق ہے' چلو یونہی سہی کل ہی دو تخت آجائیں گے۔" حقے کے کش ضرورت سے زیادہ جلد جلد لیے اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ کونے سے تینوں ریکٹ اور شٹل کاک اٹھا کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے ڈبے میں سے ایک شٹل کاک نکال کر ان کے ہاتھ میں تھما کر ذہن میں رکھ دیا کہ صرف ایک سے کھیلا جاتا ہے۔

برآمدے سے اُتر کر نیچے آئے پھر تین سیڑھیاں ڈھال کے ساتھ والی بڑی تیزی کے ساتھ اُترے جیسے مارے شوق کے بے تاب ہوں۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو اختر اسی طرح ڈٹے بیٹھے۔ جیسے ہم دونوں پر ہنس رہے ہوں۔ مولوی صاحب نے ایک آواز لگائی' "آیے' آیے میاں بیچول" میں نے حیرت سے پوچھا "یہاں تو کوئی بیچول نظر نہیں آ رہا۔" بولے یہ جو تمہارے شوہر صاحب ہیں ان ہی کا ایک نام بیچول ہو جاتا ہے۔ جب یہ اکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔" "شاید یہ نام اختر کی چڑ رہی ہو۔ ایک دم بگڑ کر بولے۔ "بیچول صاحب آپ ہی کھیلیں۔ مجھے ہرگز نہیں کھیلنا۔" الٰہی یہ نام یا خطابات کس قسم کے ہیں؟ جھگڑے کی صورت تو بغیر کھیلے ہی نظر آ رہی ہے۔ اگر کھیلے تو کیا ہوگا؟ میں نے بات بنانے کے لیے کہا۔ "ٹھیک ہے' میں اور آپ کھیلیں اور اختر دیکھیں تو کھیل کے اصول دونوں کی سمجھ میں آجائیں گے۔ اختر کرسی سے اُٹھ کر نہ آئے' منہ پھلا کر وہیں ڈٹے بیٹھے رہے۔ میں نے مولوی صاحب کو بتانا شروع کیا کہ سروس یوں ہوگی۔ نیٹ پر شٹل لگا تو باری دوسرے کی آجائے گی۔ یوں نمبر گنے جائیں گے۔ لکیروں کے باہر گرا تو آؤٹ سمجھا جائے گا وغیرہ وغیرہ۔

خیر اللہ اللہ کر کے کھیل شروع ہوا۔ مولوی صاحب ذرا ذرا دیر بعد بحث کیے جائیں۔ "جی نہیں' ایسے نہیں' ویسے نہیں۔" اختر بھی ٹینس کھیل چکے تھے۔ ان کے پلّے فوراً سب اصول آ گئے۔ اب بلا لیے نیچے آ کر کہنے لگے۔ "آپ باہر کھڑے ہو کر اب دیکھیں تو سمجھ میں بہتر آجائے گا۔"

"میں کیوں چلا جاؤں؟ تم دیر سے کیوں آئے ہو؟ مجھے بیچول کیوں کہا؟"

"اس لیے کہ آپ نے مجھے پچوٗل کیوں کہا۔"

"تم بھول کیوں گئے تمہارا تو یہ پرانا نام ہے۔"

"اچھا تو یہ بات ہے ہم دونوں رات کا کھانا آپ کے ساتھ نہیں کھائیں گے۔"

"تو تم شوق سے کھانا نہ کھانا۔ حمیدہ ضرور کھائے گی۔ آخر اس کو کس کھاتے میں بھوکا رکھنا چاہتے ہو؟" میں نے بیچ بچاؤ کی خاطر کہا "بات یوں ہے کہ آج رات کو قاضی عبدالغفار صاحب نے ہم دونوں کو کھانے پر بلایا ہے۔ مولوی صاحب کا منہ اتر سا گیا۔ ریکٹ زمین پر پھینک اوپر برآمدے میں آگئے۔ کرسی پر بیٹھ کر حقہ پینے لگے۔ میں تو بالکل چور سی ہوگئی کہ یہ کیا بات، اس پر خفا کیوں ہوگئے۔ بات یوں میری سمجھ میں آئی کہ اختر نے ان کو پہلے سے بتایا نہ تھا۔ اکیلے کھانا شاید ان کو اچھا نہ لگتا ہو۔ بول پڑی "پھر چلیے نا آپ بھی ہمارے ساتھ" خاصے غصے سے بولے "بن بلائے تو میں خدا کے ہاں بھی نہ جاؤں۔ کہاں پھر یہ قاضی صاحب جن کو میں اب منشی بنادوں گا۔" اللہ کیا مصیبت ہے ذرا سی بات پر اس قدر ناراض ہو رہے ہیں۔

آج کا کھیل تو گڑبڑ کی نذر ہوگیا۔ اختر نما دھو تیار ہو چکے تھے۔ کرسی پر بیٹھ کر اخباروں کے بنڈل جو میز پر رکھے تھے ان کو کھول کھول کر کچھ ادھر اور کچھ اُدھر رکھتے رہے۔ مولوی صاحب نے بھی ایک اخبار اٹھا لیا اور پڑھنے لگے۔ اختر بھی اخبار پڑھنے میں یوں مصروف ہوگئے جیسے کچھ گرما گرمی ہی نہ ہوئی تھی۔ میں اندر کمرے کے پاس تھوڑی دیر کھڑی ان دونوں کو دیکھتی رہی۔ یہ لوگ کیوں ذرا سی بات پر ایک دوسرے سے اُلجھ پڑتے ہیں۔ یہ پچوٗل، مچھوٗل آخر کس طرح کے نام ہیں اور کیوں ہیں۔ اچھا آج ہی اختر سے پوچھا لیا جائے گا۔

اندر سے تیار ہو کر سبز نائیلون والی ساری پہن کر باہر آئی تو مولوی صاحب نے قہقہہ لگایا "اختر، اختر ذرا مڑ کر دیکھو تم سے کوئی مدراسن ملنے آئی ہے۔" اختر گھبرا کر مڑے تو میں تھی۔ مسکرا کر بولے۔ "میں سمجھا کہ بچ بچ شاید ایک اور خاتون ہمارے گھر میں داخل ہو گئیں۔" میرے منہ سے ایک دم بے اختیار نکلا۔ "تو کیا بچ بچ ہمارے گھر میں کوئی خاتون یا لڑکی نہیں آئیں گی؟" اب مولوی صاحب ذرا تن کر بیٹھ گئے اور بہت سیدھے انداز میں بولے۔ "یہ بات کان کھول کر سن لو کہ تم ایک ہی بہت کافی ہو۔ تمہارے دم

سے گھر کا سارا انتظام اُلٹ پلٹ ہوگیا۔ اب بھی یہاں اور کوئی بیگم یا خاتون قدم نہیں رکھ سکتی۔" میرا دل واقعی اندر سے بے حد گھبرایا کہ یہ تو ایک قیدی والی زندگی ہوگی۔ اچھا اسے بھی کسی نہ کسی طرح نپٹ ہی لوں گی۔

ہم دونوں خدا حافظ کہہ کر چلنے لگے تو اداس سی شکل بنا کر کہا۔ "تو آج ناخنوں کا سبق ادھورا ہی رہ جائے گا۔ بہت دیر سے نہ آنا۔"

—○—

کھیل

قاضی صاحب سے اختر مجھے ملانے لگے تو وہ ہنس کر بولے۔ "یہ خوب رہی کہ تم مجھے میری ہی بچی سے ملا رہے ہو۔ مجھے [illegible] تھا۔ تم کو معلوم نہیں کہ میں اور وہ سگے بھائیوں کی طرح ہیں۔ ہم کو بٹھا کر اندر گئے۔ ایک خاتون کو اپنے ساتھ لائے اور ہم کو بتایا۔ "یہ تمہاری چچی ہیں۔" اختر نے بھی ان کو آج پہلی بار ہی دیکھا تھا۔ میں تو بس ان کو دیکھتی ہی رہ گئی۔ آداب کرنا بھی بھول گئی کہ یہ ضرور "لیلیٰ کے خطوط" والی محترمہ ہیں۔ شکیل بھائی میں آپ کو ان کے حسن کی تصویر کھینچ کر کیوں کر بتاؤں۔ کاش ممکن یہ ہوتا کہ آپ کو بھی کسی طور کھینچ کھانچ کر لے جا سکتی جیسے آپ نے مجھے نصف صدی سے زیادہ پیچھے کی طرف اللہ جانے کیسے کر دیا ہے! اس وقت ان کی عمر تیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ چہرے کی بناوٹ کو جیسے اللہ میاں نے بہت ہی سوچ کر بڑی توجہ دے کر اپنے ہاتھوں سے بنایا ہو۔ ناک بے حد ستواں، آنکھیں بڑی بڑی مگر لمبوتری پتلیاں ہلکی سنہری، لمبی لمبی سیاہ پلکیں اوپر کو خوب خم دار، بھنویں بہت پتلی مگر اپنی شکل کی، ہونٹ بڑے مناسب بغیر لپ اسٹک کے گلابی، رنگت بے حد صاف، چہرے پر کوئی غازہ نہ تھا۔ قدرتی طور پر گلابی اور چمکیلا، جیسے کچھ ابرق سی لگی ہو، قد عام عورتوں سے لمبا، جسم اس قدر سڈول کہ کہیں کوئی کسر نہ ہو، لمبی لمبی انگلیاں اور بے حد خوبصورت گلابی ناخن، کالے بال کمر سے نیچے، چوٹی بندھی ہوئی تھی، ماتھا بڑا کشادہ تھا، آنکھوں کی چمک جس میں متانت، ذہانت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ایک عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ آگے آئیں اور مجھے گلے لگایا تو ان میں سے اماں کے ساتھ جو چنبیلی اور بھوری والی خوشبو کے بھپکے نکلا کرتے تھے، محسوس کر کے آب دیدہ ہو گئی، اور وہ کہتی بھی کیا ہیں؟ "مجھے بس تم اپنی اماں کی طرح ہی سمجھنا۔ کوئی بھی خواہش ہو اور کام کروانے کا ہو تو بے تکلف بتا دیا کرنا۔" اب وہ ہنسیں تو ان کے موتی جیسے دانت نظر آئے۔ بس میں تو ان کو دیکھتی رہی۔

کچھ دیر دل میں سوچا، یہی ہیں "لیلیٰ کے خطوط" والی۔ گردن موڑ کر اختر کی طرف نگاہ کی تو ان کی صراحی دار گردن ہی کو تکنے لگی۔ اختر بھی بت کھڑے قدرت کی کرشمہ گری کو اپنی نگاہوں سے جیسے اپنے دماغ کے کینوس پر ہمیشہ کے لیے محفوظ کر رہے تھے۔ قاضی صاحب ہنس کر بولے۔ "آخر تم دونوں کو ہو کیا گیا کہ اپنی چچی کو ساکت کھڑے دیکھ رہے ہو۔" میری زبان تو ہمیشہ کی میرے قابو میں نہ رہنے کی عادی تھی۔ ادھر دماغ میں کوئی خیال آیا اور جملہ بے ساختہ اس پر سے پھسل کر نکل جاتا۔ "چچا مجھے معاف کیجیے گا۔ جب آپ نے چچی کو پہلی بار دیکھا ہو گا تو ضرور اسی طور تکنے کے عالم میں ہو گئے ہوں گے۔" اس پر دونوں ہی خوب ہنسے۔ مگر اختر کے تیور بتا رہے تھے کہ میرا یہ جملہ ان سے کتنا ناگوار گزرا ہے۔ میں نے دل میں سوچا کہ اگر میرا پالا عجیب لوگوں سے، تو ان کا پالا بھی ایک باؤلی سے پڑا ہے۔ کچھ لوگ ہر بات دل میں چھپاتے ہیں اور کچھ میری قسم کے بھی ہوتے ہیں جو ہر بات منہ سے کہہ گزرتے ہیں۔ قاضی صاحب نے بیٹھنے کو کہا تو چچی نے کہا "میں تو حمیدہ کو لے کر اندر جا رہی ہوں۔ آپ دونوں ادبی باتیں کریں اور اندر ہم دونوں چھوٹی موٹی گپ کر لیں۔" میری پیٹھ پر بڑی محبت سے اپنا نازک ہاتھ رکھے اندر لے جاتے ہوئے صراحی دار گردن موڑ کر کہا۔ "یہ بچی تو آٹھوں پہر مردان خانے میں رہتی ہی ہے۔"

مجھے اندر کے برآمدے میں لے آئیں۔ اس میں ایک بڑا سا تخت بچھا ہوا، سفید جھک چادر جس پر کئی موٹے موٹے گاؤ تکیے، اس کو دیکھتے ہی مجھے اپنی "نیلی چھتری" کا برآمدہ یکایک یاد آ گیا۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ انہوں نے میرے چہرے کی کیفیت سے جانے کیسے یہ اندازہ کر لیا کہ میں ماضی میں پہنچ گئی ہوں۔ بولیں "تم کو تخت دیکھ کر کچھ یاد سا آ رہا ہے۔ چلو یہیں تخت پر بیٹھو، یہ کرسیاں تو مہمانوں کے لیے ہیں۔" میں گاؤ تکیے سے لگ کر بیٹھ گئی، اف کس قدر آرام دہ یہ حساب کتاب ہے۔ آخر لوگ کرسیوں اور صوفوں کو کیوں استعمال کر کے شاد ہوتے ہیں؟

ان میں کس بلا کی ذہانت اور سوجھ بوجھ تھی۔ جھٹ سے بولیں "تم جو سوچ رہی ہو ٹھیک ہی بات ہے اور جو تم باہر کھڑی مجھے آنکھیں پھاڑ کے دیکھ کر سوچ رہی تھیں وہ بھی ٹھیک ہی تو تھا۔" ہنستے ہوئے چاندی کے تھال کو جس میں بہت سارے بیلے کے پھول کے گجرے رکھے ہوئے تھے، اس کا خوان پوش ہٹا کر پہلے میرے ہاتھوں میں، پھولوں کے

کے پہناتے ہوئے بولیں "میں سمجھ رہی ہوں کہ تم نے کپڑے وغیرہ جو نہیں پہنے ہیں وہ ضرور اس خیال سے کہ مولوی صاحب اور اختر کہیں مذاق نہ اڑائیں۔" ------ "آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں مگر آپ کو یہ خیال کیوں آیا؟" حیدر آباد میں جو خاصے عرصے سے رہ رہی ہوں۔" اب پھولوں کی بالیاں پہناتے وقت بھی مسکراتی جاتیں۔ وہ ہار پہنا کر ایک ہار یہ بتا کر کہ یہ اختر میاں کے لیے ہے تھالی میں رہنے دیا۔ میں نے بیچ ہی اپنا کوئی زیور اسی خیال سے پہنا نہ تھا کہ جانے اختر اور مولوی صاحب فقرے بازی نہ کرنے لگیں۔ پھر ایک دس روپے کا نوٹ میرے سر سے گھما کر میرے قدموں میں ڈال دیا جس کو ایک ماما نے دعائیں دیتے ہوئے اٹھا لیا۔

اب میری نظریں پورے برآمدے کا جائزہ لینے لگیں۔ ہر چیز بے حد قیمتی مگر نفاست لیے ہوئے۔ پورے برآمدے میں پھولوں اور پتوں والے گملے جگہ جگہ خوب صورتی سے رکھے ہوئے۔ کہ ایک میری نظر بچی کے پاؤں کی طرف پڑی۔ ایک جھبرے سنہری بالوں والا کتا ان کے پاؤں سے لپٹ رہا تھا۔ میں ڈر کر تخت پر بالکل پیچھے کو سرک گئی۔ انہوں نے جھک کر اپنی نازک انگلیوں سے اس کو سہلانا شروع کیا تو اس نے خوشی کی عجیب و غریب آوازیں نکالنی شروع کر دیں۔ مجھ سے ہنس کر کہتی ہیں۔ "بھئی اس سے ڈرتی کیوں ہو؟ یہ تو بڑی پیار کرنے والی کتیا ہے۔ ہاں اگر اس کے بچوں کو ہاتھ لگایا تو اس کے غرانے لگ جائیں گے۔" میں نے کہا "دور سے مجھے اس کے بچے دکھا دیں۔"

انہوں نے ماما سے کہہ کر بچوں کو منگوایا۔ "روزی" فوراً لپک کر بچوں کے پاس آگئی اور غراہٹ کی آوازیں نکالنے لگی۔ بچی نے ایک سنہری بالوں والا بچہ اپنے ہاتھ میں اٹھا لیا اور پیار کر کے مجھے دکھایا اور کہا۔ "یہ ابھی صرف ایک ماہ کا ہے۔"

مجھے بے حد اچھا لگا۔ پوچھا کیا آپ ایک مجھ کو دے سکتی ہیں؟ خوش ہو کر کہا "ہاں ضرور مگر ابھی تو دو دن سے پہلے وہ ماں سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ پھر یہ خود برتن سے دودھ پینے لگے گا۔ دو ایک ہفتوں کے بعد کھانے بھی لگے گا۔" میں دل میں بہت خوش ہوئی مگر فوراً ہی یہ خیال آیا کہ جانے اختر اور مولوی صاحب کتا رکھنے پر راضی ہوں گے یا نہیں۔ خیر دیکھا جائے گا۔ ابھی تو ایک ماہ کا ہے۔ انہوں نے بچہ پھر ٹوکری میں رکھ دیا اور ماما ٹوکری لے کر چلی گئی۔

ہاتھ دھو کر میرے پاس بیٹھ گئیں۔ بڑی بے تکلفی سے مسکرا مسکرا کر باتیں کرنے لگیں۔ ان کا بھی مجھ سے پہلا سوال وہی تھا کہ یہ تو بتاؤ۔ ایک مردانے گھر میں تمہاری گزر کیسی ہو رہی ہے؟ تم تو ماشاءاللہ ایک بہت بڑے کنبے میں پلی بڑھی ہو۔ پھر مولوی صاحب جیسی ہستی کا دن رات ساتھ رہنا آسان کام تو نہیں۔ میں ان سے ملی تو نہیں مگر باتیں بہت ان کے متعلق سُنی ہیں۔ ارے لوگ تو ان کا ذکر کرتے وقت بڑے مقطع چقطع ہو جاتے ہیں۔ مطلب میرا یہ ہے کہ ان کی پیٹھ پیچھے ان کے رعب داب میں جکڑے رہتے ہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ نظام حیدر آباد کے بعد پوری ریاست میں مولوی صاحب نمبر دو ہیں۔ کچھ تم سے بولتے چالتے ہیں؟"

"خوب باتیں کرتے ہیں۔ جب میں تڑ سے ان کو جواب دے دیتی ہوں تو بے حد محظوظ ہوتے ہیں۔ میں نے تو بچی آتے وقت ریل میں ہی سوچ لیا تھا کہ یہ دونوں انسان عام لوگوں سے بہت مختلف ہیں۔ اگر دب کر خاموش رہی تو زندگی اجیرن ہو جائے گی۔"

"بھئی ریل میں کیوں ایسا سوچا؟ کیا ایسی بات ہوئی؟"

میں نے مردانی برات کے آنے سے سفر تک کا پورا حال سنا ڈالا۔ وہ اس قدر ہنسیں کہ ان کی حسین آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "بے شک تم نے ٹھیک سوچا۔ کاش میری بھی مولوی صاحب سے مڈبھیڑ ہو جائے مگر انہوں نے تو مجھے نوٹس سا دے دیا ہے کہ ہمارے گھر میں اور کوئی خاتون قدم نہیں رکھ سکتیں۔ بچی نے کہا مگر جب وہ ولیمہ کریں گے تب تو خواتین کو بلانا ہی پڑے گا۔

لفظ ولیمہ سن کر مجھے اماں کی بات یاد آئی کہ انہوں نے ایک سبز رنگ کا کارچوبی غرارہ جو بری میں تھا' دکھا کر کہا تھا یہ تمہارے ولیمے کا جوڑا ہے اس دن اس کو پہن لینا۔ "آپ کو میں یہ تو بتانا ہی بھول گئی کہ مولوی صاحب اور اختر غضب کی بری کے جوڑے لائے تھے۔ سترہ عدد جوڑے' ہر ایک کے ساتھ بیگ اور سینڈل' کسی کے ساتھ شال تو کسی کے ساتھ سوئٹر کہ شادی جاڑوں میں ہو رہی تھی۔ ہر جوڑا نفاست اور بھاری پن میں جواب نہ رکھتا تھا۔ گھر والے اس کو دیکھ کر حیران کہ یہ سب کس نے کیا اور اتنی تفصیل میں کیا۔ مولوی صاحب؟ اختر؟ زیور میں نیلم کے ہیرے کا سیٹ۔ جب میں نے اختر سے پوچھا کہ سب لوگ بری دیکھ کر حیران ہوئے۔ تو مجھے بتایا یہ سب تمہاری جمیلہ بھابی نے کیا۔ ان کو

مولوی صاحب نے روپے بھیج دیے تھے۔ یہ ان کا ہم دونوں کے لیے پیار تھا کہ ہر چیز تک سکھ سے تیار کی۔ عجب بات ہے کہ انہوں نے تم کو بتایا نہیں۔"

چچی میں نے تو ابھی تک ویسے کا ذکر سنا نہیں' ہاں مدراس جانے کا پروگرام بن رہا ہے اور یہ کہ مجھ کو ساتھ نہیں لے جائیں گے۔ جانے مجھے اکیلا چھوڑ جائیں۔ اختر سے پوچھا تو کہہ دیتے ہیں آپ کا بندوبست مولوی صاحب خود کریں گے۔" وہ ہنس پڑیں۔ "شاید ان کا ارادہ تم کو اپنے کسی دوست کے ہاں چھوڑ کر جانے کا ہو۔"

"جی میں تو سوائے آپ کے پاس آنے کے کسی اور کے ہاں نہ جاؤں گی یا پھر اپنے گھر چلی جاؤں گی۔"

ان کا چہرہ سیریس ہو گیا۔ اپنی حسین آنکھوں سے مجھے گھور کر دیکھا اور بولیں۔ "اب بھی یہ نہ کہنا اپنا گھر۔ بس اب تمہارا گھر یہ ہے۔ لڑکی جب اور جہاں بیاہ کر جاتی ہے بس وہی گھر اس کا ہوتا ہے۔ یہ دونوں جیسا مناسب سمجھیں اس کو تم خوشی خوشی منظور کرنا۔ چنیں چناں کرنے والی لڑکیاں وہ ہوتی ہیں جن کی تربیت میں کوئی کسر رہ گئی ہو۔ وہ کھانا نکلوانے باورچی خانے کی طرف چلی گئیں۔ میں پھر ان کے حسن اور قد و قامت کے متعلق سوچنے لگی کہ اللہ میاں نے ان کو ڈھال کر سانچہ توڑ دیا ہو گا۔

جب کھانے کے کمرے میں لے جانے لگیں تو پوچھا اگر کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتا دو۔ "اور تو کچھ نہیں بس شریفے گھر میں نہیں آسکتے اور میرا دل چاہتا ہے کہ پیٹ بھر کر کھاؤں۔ دن کا کھانا نہ خود دونوں کھاتے ہیں نہ مجھے ملتا ہے۔ بھوک لگنے لگتی ہے۔ حیرت زدہ تو ضرور ہوئیں' مگر کچھ کہا نہیں۔ بھئی ایسی کون سی بڑی اور ناممکن بات ہے چار عدد شریفے تم کو روز مل جایا کریں گے۔ ایک خوب صورت سی بانس کی چھوٹی سی ٹوکری میں شریفے ایک نم کپڑے میں لپیٹ کر اوپر سے بیلے کے پھول' ہاتھوں کے لیے کپڑے رکھ پھر نم کپڑے سے ڈھانپ کر اپنے ڈرائیور کے ہاتھ بھیج دیا کروں گی ------ تو اب میں بھی احتشام الحق کو منع کر دوں گی۔ بچارے دو شریفے کاغذ میں لپیٹ کر روز ہی کیاری میں رکھ جاتے ہیں۔ چوروں کی طرح چھپکے چھپکے گھر کی دیوار سے چپکے ہوئے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے جھکے جھکے آتے ہیں تو مجھے ہر روز ہی ڈر لگتا ہے کہ کہیں بھی مولوی صاحب نہ دیکھ لیں یا کوئی نوکر نوکر ان کے پیچھے آجائے اور مولوی صاحب یا اختر کو بتا دے تو وہ نحیف و

نازک سے انسان مولوی صاحب کی گرج دار آواز سن کر گر ہی پڑیں گے۔

کھانا بہت نفیس تھا۔ بس ہم ہی چاروں تو تھے۔ اختر' قاضی صاحب سے زیادہ وقت بیٹا حسن کی ملازمت کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ اپنے جگری دوست کی بڑے زوردار طریقے سے وکالت کرتے رہے۔ چچا نے کہا۔ "اچھا ٹھیک ہے "پیام" اخبار میں کچھ نہ کچھ ان کے لائق کام کی جگہ بنالیں گے۔ ہم دونوں کھانا کھا کر جب گھر آئے تو مولوی صاحب برآمدے کی لمبی کرسی پر دراز تھے نہ چل منہ سے لگی ہوئی۔ گڑگڑی کی حقے سے آواز تو آرہی تھی پر دھواں ندارد تھا۔ یعنی چلم کب کی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ پڑھنے میں اتنے مصروف کہ اس کا احساس نہ ہوا۔

اختر حیران ہو کر بولے۔ "یہ کیا آپ اب تک برآمدے میں کیوں ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ بہت بے اصولے ہوتے جا رہے ہیں۔" تیوری پر بل ڈال کر عینک ماتھے پر کر کے بولے "تم سے مطلب؟ جو تمہارا جی چاہے تم کرو اور جو بھی میرا دل کرے گا' کروں گا۔" میں ڈری کہ کہیں یہ دونوں اب آپس میں الجھ نہ پڑیں۔ جھٹ ایک موڑھا ان کی کرسی کے پاس گھسیٹ کر اس پر ان کے نزدیک بیٹھ کر بہت آہستہ آہستہ جیسے میں اختر سے چھپا کر صرف ان سے باتیں کرنا چاہ رہی ہوں (گو واپسی کے وقت موٹر میں اختر کو اس سنہرے بھبرے بالوں والے کتے کے بچے کا بتا دیا تھا جس پر اختر نے مجھے بتایا کہ ان کا خیال نہیں کہ مولوی صاحب اس کتے کے بچے کو گھر میں رکھنے کی اجازت دیں گے کیوں کہ کبھی انہوں نے اورنگ آباد میں ایک کتا پالا تھا۔ شاید اس سے بے تحاشہ محبت کرتے ہوں گے جس کو انہیں کے پالے شیر نے جو ایک بہت بڑے لوہے کی سلاخوں والے پنجرے میں رکھ چھوڑا تھا۔ کبھی ان کا کتا سلاخوں کے اس قدر نزدیک آگیا کہ شیر نے پنجہ بڑھا کر اس کو یوں دبوچا کہ بچارہ مر گیا جس کا غم ان کو اب تک ہے۔ اس کا ذکر کرتے وقت ان کی آنکھیں آب دیدہ ہو جاتی ہیں۔ گھما پھرا کر میں پوچھوں گا ضرور۔ "نیئے مولوی صاحب اگر ایک سنہرے بالوں والا بھرا سا گول مٹول بڑا ہی خوب صورت قاضی صاحب کی کتیا کا بچہ' اگر ہم کو مل سکے تو کیسا رہے؟ پھر جب آپ اور اختر آفس کے کاموں میں ایسے مصروف رہتے ہیں کہ گویا میرا وجود کوئی معنی ہی نہیں رکھتا تو ذرا اس بچے کی دم کی رونق رہے گی اور مجھے بھی اس کی دیکھ بھال کی مصروفیت مل جائے گی مگر مشکل تو یہ ہے

کہ قاضی صاحب کی بیگم صاحب اتنے پیارے بچے کو دینے پر بھلا کیوں راضی ہوں گی۔
فوراً "اٹھ کر بیٹھ گئے۔ "وہ تم کو دیں گی کیسے نہیں۔" "فرض کیجیے وہ مان بھی جائیں تو اختر
بھلا کہاں سننے والے ہیں۔" ذرا سا ذکر میں نے موڈ میں کیا تو تخت پر برہم ہو کر کہا کہ ہمارے
گھر میں کتے کا بچہ ہرگز نہیں آسکتا' مجھے سخت نفرت ہے کتوں سے 'بڑا نجس ہوتا ہے۔"
اب تو ان کی آنکھیں چمکنے لگیں پھر تو ہم وہ بچہ ان کو جلانے کے لیے ضرور پالیں گے۔
بچوں کی طرح خوش ہو کر اس کی ماں کے روپ' رنگ اور نسل کا پوچھا اور یہ کہ اس وقت
وہ بچہ کتنا بڑا ہے؟ کب سے خود وہ دودھ پینے لگے گا۔ اس طریقے سے میں نے ان کا موڈ
بھی ٹھیک کر دیا اور اجازت بھی حاصل کر لی۔

اختر کپڑے بدل کر لیٹے کتاب پڑھ رہے تھے۔ میں نے جب جا کر بتایا کہ یہ باتیں مولوی
صاحب سے ہوئیں اور ان کا موڈ ٹھیک ہی نہیں ہوا بلکہ یہ سن کر کہ آپ کو کتوں سے
نفرت ہے سوال ہی نہیں کہ گھر میں کتا رکھا جائے تو بے حد خوش ہو کر کہا کہ پھر تو اختر کو
چڑانے کے لیے وہ بچہ ضرور لایا جائے گا۔ میں نے ہمت کر کے اختر سے یہ بھی پوچھا۔
"اللہ مجھے ذرا یہ تو بتا دیں کہ آخر آپ دونوں ایک دوسرے کو جلا کر اور ستا کر کیوں خوش
ہوتے ہیں۔ اکثر مجھ بے چاری کو چھیڑ کر جلا کر آپ دونوں خوب خوش ہوتے ہیں۔ آخر
اس سب کا مطلب کیا ہے؟ بڑی ہی سادگی اور معصومیت سے اختر نے یہ جواب دیا۔
"بات صرف یہ ہے کہ ہم دونوں ہی سولہ برس کی عمر میں اپنے اپنے گھروں کو خیرباد کہہ کر
علم کی تلاش میں اور اس کی خدمت کا جذبہ لے کر نکل کھڑے ہوئے۔ ساٹھ سال کی عمر
تک مولوی صاحب کا اوڑھنا بچھونا اردو کا فروغ رہا اور انجمن کی پرورش کرتے گزر گیا۔
سب حاصل کر کے بھی ان کو جس کو گھر کہتے ہیں میسر نہ ہوا اور شاید ان کو اس کا احساس
بھی نہ ہوا۔ مجھے اپنے ساتھ رکھ کر ان کو نادانستہ بیٹوں والی محبت ہو گئی۔ میں بڑا خوش
قسمت تھا کہ ۲۲ سال کی عمر میں باپ جیسی شفقت اور ایک اپنا گھر ہونے کا لطف میسر
آگیا۔ پھر اب جو تم آگئیں تو ان کو گھر کا مزا آنے لگا۔ اپنے طریقے سے وہ میرے اور
تمہارے دل بہلانے کا سامان کرتے ہیں اور میں بھی اپنی سی پوری کوشش کرتا ہوں۔ مگر
ہم دونوں ہی دنیا داری سے ناواقف لوگ ہیں۔ تم کس قدر مزے سے ہر موقع کو نبھا لیتی
ہو۔ شاید تم کو خود بھی اس کا احساس نہیں ہوتا ہے کیونکہ تم نے ایک بڑے گھر میں

پرورش پائی ہے۔ والدین' بہنوں' بھائیوں اور رشتے داروں کی محبت حاصل رہی اور میں
رہا ایک خودرو پودا جو ہر چیز سے محروم رہ کر خود ہی میں لگا کر آیا ہے۔ جس پودے کی کانٹ
چھانٹ نہ ہو تو وہ جیسا بھی ہو وہی بیری حالت رہی۔ اس وقت مولوی صاحب تھے میں
نوزیں تھے بلکہ روٹھے ہوئے تھے کہ ہم دونوں چلے گئے اور وہ اکیلے رہ گئے' وہ چاہتے
ہوں گے کہ تاش کھیلنے جائیں' گپ شپ ہو' کچھ چھیڑ چھاڑ ہو۔ کسی کسی وقت وہ بالکل
بچوں کی طرح بگڑتے اور جھگڑتے ہیں۔ دیکھو تمیزہ تم بھی ان کی بات کا برا نہ ماننے کا
بچہ ایک ہفتے میں ضرور لے آنا۔ مولوی صاحب سے خوب اس کو قریب کر دینا۔ میں برابر
اس سے بے تعلقی اور نفرت کا اظہار کرتا رہوں گا تو ان کی عمر دراز ہوگی مجھے جلانے کے لیے
دلچسپی خوب بڑھتی جائے گی۔

دوسرے دن دو عدد تخت درمیانے سائز کے آگئے۔ ایک میں نے برآمدے میں
رکھوایا اور ایک اپنے کمرے میں۔ اب یہ سوال کہ یہ ان پر گدے بچھاتی ہیں اور گاؤ تکیے
بھی رکھتی ہیں۔ محبوب سے رائے لی۔ اس نے کہا گودام میں بہت سے گدے ہیں صوفوں
کے لیے اور پھر بہت سے لحاف اور کمبل بھی ہیں۔ بس میرا تو کام بن گیا۔ گدے منگا کر
دونوں تختوں پر بچھائے' پلنگ کی چادریں بچھا کر لحافوں کو محبوب کے ساتھ خوب دبا دبا کر
کس کر گاؤ تکیہ بنایا اور وہ چادریں پھاڑ' ہاتھ سے غلاف سی کر چڑھا دیے۔ اور خوش
خوش برآمدے میں گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر قرینہ قلم لے کر پہلی بار گھر جما کے بیٹھ گئی۔
سوچا کہ میں نے تو حد کر دی کہ نئی زندگی اور ان دو عجیب قسم کے لوگوں میں گم ہو کر
سُدھ بُدھ کی خبر ہی نہ رہی۔ سنا اور پڑھا بھی یہ تھا کہ نئے گھر جا کر لڑکی کو اپنا گھر بہت یاد آتا
ہے اور رونا بھی آتا ہے۔ یہ جھوٹ بالکل جھوٹ۔ نئی زندگی' نیا گھر' نئے لوگ اور ان
کے الگ سے طور طریق اول گھبرانے کی مہلت ہی کہاں دیتے ہیں؟

دوسری شام بیڈ منٹن کھیلتے وقت اختر اور مولوی صاحب کی ٹھن گئی کہ میں مولوی
صاحب کی طرف داری کر رہی ہوں اور وہ یہ کہیں کہ شوہر جو ٹھہرا کیوں نہ اس کی ہی کہوں
گی۔ مولوی صاحب بلا لے کر اختر کو مارنے بھاگے۔ ظاہر ہے کہ اختر کے دوڑنے کی رفتار
تیز تھی' دوری سے بلا ایسا اچھال کر مارا کہ وہ کسی پتھر پر گر کر دو ٹکڑے ہو گیا۔ ادھر اختر
ہنس رہے ہیں ادھر میں۔ ہم دونوں پر بس نہ چلا وحشی آنکھ کا ایک ایک پر نوچ ڈالا' نئے

رات کو روز ہی کوئی نہ کوئی کھیل ہوتا۔ شام کو بیڈ منٹن میں ایک ریکٹ ضرور ہی ٹوٹ جاتا۔ رات کو تاش یا پچیسی کھیلی جاتی تو پتے پھاڑ ڈالتے۔ پچیسی کی بساط چیر پھاڑ دی جاتی۔ کوڑیاں برآمدے کے باہر اچھال دی جاتیں۔ دوسرے دن تو وہ پھر آہی آجائیں گی۔

کتے کا بچہ مدراس سے واپسی پر لایا جائے گا' مگر پہلے سے اس کے لیے برتن 'چین اور ایک کھٹلیا مع چھوٹے سے گدّے کے منگوا کر رکھوا دی۔

ایک دن فرمائش کی کہ اپنے ہاتھ سے کوئی چیز پکا کر تو کھلاؤ ذرا ہم بانگی تو دیکھیں۔ دوسرے دن بشیر سے کہا۔ آدھ سیر مچھلی' ایک پاؤ دہی اور ایک پاؤ ٹماٹر آج لیتے آنا۔ لہسن' ادرک اور دھنیا' ہلدی مرچ پیس کر الگ الگ دینا اور تھوڑے میتھی کے دانے (تب ہلدی' دھنیا اور مرچ کا پسا ہوا پوڈر نہیں ہوتا تھا) وہ میرا منہ دیکھنے لگا۔ "دلہن پاشا آپ اس سب کا کیا کریں گی؟"

"پکاؤں گی مچھلی کا سالن"

"بھلا آپ ادھر باورچی خانے میں کیسے آسکتی ہیں؟"

"یہ تو مجھے معلوم ہی ہے تم انگیٹھی میں کوئلے جلا کر لا دینا' یہیں برآمدے میں پکاؤں گی۔"

"میں پہلے مولوی صاحب کی اجازت لوں گا۔"

"ضرور' ضرور پوچھ لو' یہ ان کی ہی فرمائش ہے۔ ورنہ مجھے کوئی پکانے کا شوق تو ہے نہیں۔ اللہ کرے تم سلامت رہو اور مزے مزے کا کھانا ہم سب کو ملتا رہے۔ مگر پانچ بجے سب کچھ لا دینا تب ہی تو سات بجے مچھلی تیار ملے گی۔ اچھا یہ تو بتاؤ کہ کوارٹروں میں تم سب کے بیوی بچے ہیں۔"

"ہیں کیوں نہیں؟"

"تو پھر مجھ سے ملنے کیوں نہیں آئیں؟" وہ سخت حیران ہو کر بولا۔ "آپ کیا باتیں کرتی ہیں۔ بھلا کوئی عورت مولوی صاحب کے گھر میں آسکتی ہے۔ وہ تو جانے آپ کیسے اس گھر میں آگئی ہیں۔ اختر میاں کچھ بڑے ہی نصیبے والے ہیں کہ انہوں نے ان کی سن لی۔ بات یہ ہے کہ اختر میاں کو وہ اپنے بیٹے کی طرح سمجھنے لگے تھے مگر ان کا لحاظ بہت کرتے ہیں۔ آپ کو بیاہ کرلانے پر ہی راضی ہو جانا اور خود جا کر لے بھی آئے۔ وہ تو کبھی کسی شادی پر

جاتے ہی نہیں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ خود اختر میاں خاصے سخت مزاج اور بے پرواہ قسم کے ہیں۔ مولوی صاحب نے سوچا ہوگا کہ اگر خوشی خوشی خود جا کر بیاہ کر نہ لے آیا تو الگ جا کر رہنے لگیں گے۔ سب ہی کے منہ پر یہ بات ہے کہ مولوی صاحب کتنا بدل گئے ہیں اور تو اور کھیل تک کھیلنے لگے۔ پھر جو آپ کے آنے سے پہلے بڑی تیاری کی گئی کہ مہینوں سے "باغ عامہ" کے مالی کام کر رہے تھے ورنہ یہ کوٹھی ایسا لگتا تھا کہ ایک جنگل کے بیچ میں کھڑی ہوئی ہے۔ لان لگی' ہر طرف کیاریاں بنیں' پھولوں کے پودے لگائے گئے' چڑیوں کا اتنا زبردست پنجرہ بنا' ہرنوں کا جوڑا لایا گیا۔ صبح شام خود دریافت کرتے۔ ہرنوں کے لیے تازہ گھاس آئی' چڑیوں کو دانہ ڈالا گیا' پانی کے برتن صاف کرکے تازہ پانی ڈالا گیا۔ اپنے کمرے کو خالی کرکے وہ آپ کو دے دیا اور ان کے کمرے میں خود چلے گئے۔ اس پر اختر صاحب برہم ہوتے مگر ان کی ضد کے آگے چپ ہوگئے۔ پھر خود اختر میاں کو ساتھ لے جا کر کمرے اور ڈریسنگ روم کا فرنیچر پسند کیا۔ بسترنئے بنوائے۔ آپ کے کمرے کے قالین پر دونوں میں جھگڑا خوب چلا۔ مولوی صاحب سرخ رنگ کے قالین کو پسند کر آئے جس کو اختر صاحب نے واپس کروا کر نیلا منگوا لیا۔ انہوں نے پھر سرخ منگوا کر بچھوا لیا۔ اختر صاحب نے کہا کہ یہ خونی قالین آپ خود اپنے کمرے میں بچھوالیں' میں تو نیلے رنگ کی روشنائی اور آسمان ہوتا ہے اس لیے اس کو پسند کرتا ہوں' تو پھر آخر نیلا قالین آگیا۔ میں دوسرے کمرے سے دونوں کی بات چیت سن کر ہنس رہا تھا کہ دیکھیں جیت کس کی ہوتی ہے؟

میری معلومات میں بڑا اضافہ ہوگیا۔ دوسرے دن میرے ہاتھ کی پکائی ہوئی مچھلی کھا کر مولوی صاحب اتنے خوش ہوئے کہ اٹھ کر مجھے گلے لگا لیا۔ بڑی تعریفیں کی اور انعام دینے کا وعدہ کیا۔ میں کن انکھیوں سے اختر کی طرف دیکھ رہی تھی مگر مجال ہے جو ایک حرف تعریف کا ان کی زبان سے نکلا ہو اور یہ ادا ساری زندگی ان کی رہی کہ بے ساختہ میرے سامنے کبھی تعریف کسی بات کی نہ کی۔ ہاں پیٹھ پیچھے ضرور تعریف کی تو اس سے کیا ہوتا ہے؟

جمعہ کو ہم بابا کے ہاں پھر چلے گئے۔ اب کی میں نے غور سے ان کے طرح طرح کے پرندے' جانور اور پھول دیکھے۔ زندگی بھر میں نے کسی کے گھر پھولا پھلا ہوا نہ دیکھا تھا۔

دیواروں پر پینٹنگ لگی ہوئی۔ ایک کونے میں وائلن رکھا ہوا۔ سوچا اس کو اپوا بجاتی ہوں گی یا بابا؟ انہوں نے گراموفون پر بیتھوفن کا ایک ریکارڈ لگا دیا۔ اختر نے کہا کہ وہ اس وقت تو باخ کی سِمفنی سنیں گے۔ اب دونوں کی اسی سلسلے میں بات چیت ہونے لگی۔ میرے سر پر سے سب باتیں گزر رہی تھیں کہ الٰہی یہ باخ اور بیتھوفن کون صاحب ہیں؟ اور یہ سِمفنی کیا بلا ہوتی ہے۔ دل میں شرم سی آئی کہ میں بھی کس قدر نا سمجھ ہوں اور کیسے انسان کی رفاقت پر عمر بھر کے لیے منسلک ہو گئی۔

شکر کہ چائے لے کر اپوا آ گئیں اور میرے خیالات کا تانا بانا ٹوٹ کر اپوا کی طرف ہو گیا۔ وہ بڑی ذہین خاتون تھیں۔ میرے چہرے سے سمجھ گئیں کہ یورپین موسیقی کا آتا پتا نہیں ہے۔ مسکرا کر ہلکے سے کہا۔ "تھوڑے سے دنوں میں سب سمجھنے لگو گی اور اگر سمجھ میں نہ آئے تو اتنی وحشت چہرے پر کبھی نہ آنے دینا۔ میں نے سر جھکا کر چمچے سے شکر چائے میں ملانا شروع کر دی۔ پھر اپوا کو بتایا کہ قاضی صاحب کے کتے کا ایک بچہ ہم کو ملنے والا ہے۔ خوشی سے ان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ بولیں وہ تو بہت اعلیٰ نسل کا ہو گا۔ اپنے تجربے کی بنا پر مجھے مشورے دینے شروع کیے کہ شروع شروع میں کتنا دودھ دیا جائے۔ جب راتب شروع کرنا تو قیمے میں کچھ سبزیاں ضرور کتوا کر ڈلوانا پھر پکا کر دیا جائے تاکہ اس کو شروع سے سبزیوں کی بھی عادت ہو جائے ورنہ کتے خالی گوشت کھا کھا کر بیمار ہوتے ہیں۔ انجکشن ضرور لگوا دینا وغیرہ وغیرہ۔ یہ بھی کہا کہ ہر جمعہ کو جب ہم ان کے ہاں آئیں تو اس کو اپنے ساتھ ان کے ہاں ضرور لایا کریں۔ "یہ ممکن نہ ہو گا۔ ہم دونوں نے یہ سوچا ہے کہ کتے کو مولوی صاحب سے زیادہ ہلا کر رکھیں گے" تاکہ وہ اس سے ویسی ہی محبت کرنے لگیں جیسی کہ وہ اپنے ایک پالے ہوئے کتے سے کرتے تھے۔ اس بے چارے کو ایک شیر کے بچے نے پھاڑ چیر دیا۔ وہ شیر کا بچہ بھی تو خود انہوں نے اورنگ آباد میں پالا تھا۔ تب سے ان کو اس کے اس طرح مر جانے کا بڑا ملال ہے۔ اس شیر کے بچے کو "باغ عامہ" کے زو کو دے دیا۔ روز صبح جب باغ میں سیر کو اختر اور مولوی صاحب جاتے ہیں تو شیر کے بچے کو نکلوا کر ان سے کھیل کے بڑے خوش ہوتے ہیں۔

یہ سن کر اپوا بہت خوش ہوئیں۔ کہا "تو مطلب یہ کہ مولوی صاحب صرف علمیت کے لحاظ سے ہی بڑے نہیں بلکہ انسانیت کے درجے پر بھی پورے اترتے ہیں جو انسان

جانوروں سے پیار کر سکتا ہے اس کا دل بہت نرم ہوتا ہے۔ مجھے اب یہ فکر رہے گی کہ جب بھی تم دونوں ان سے دور جا کر رہنے لگو گے تو ان پر بہت برا وقت گزرے گا۔ اچھا اب تم ممی کے پاس چکر لگا آؤ۔ اتنے میں لنچ تیار کر لوں گی۔ میں خاموشی سے اٹھ کر نیچے کوٹھی میں چلی گئی۔

آج سروجنی نائیڈو مجھے باغ میں گشت کرتی مل گئیں۔ اپنے ساتھ لے کر مجھے اپنا پورا باغ دکھایا۔ بہت ہی نادر پودے جمع کر رکھے تھے۔ جہاں جہاں وہ جاتیں وہاں کے نادر پودے ضرور لاتیں۔ بتانے لگیں۔ "حمیدہ سنو ایک بات' یہ پودے پیڑ جو ہوتے ہیں' ان میں جان ہوتی ہے' تکلیف اور راحت دونوں کو خوب محسوس کرتے ہیں اور تو اور محبت سے پھیرا ہاتھ ان کی نشو و نما پر اپنا اثر ڈالتا ہے۔ کوئی پودا سورج کی تیز گرمی چاہتا ہے تو کوئی سائے میں خوب پروان چڑھتا ہے' کسی کو نیم تاریکی پسند آتی ہے تو کوئی زیادہ پانی پینا چاہتا ہے تو کوئی کم۔ پیڑوں کو کاٹو یا تراش خراش کرو تو وہ آہیں بھی بھرتے ہیں۔ بعض میرے ایسے پودے بھی ہیں جو روٹھ جاتے ہیں۔ ان کو مناؤ لاڈ کرو تو پھر اپنا جھکا سر اٹھا لیتے ہیں۔ نچڑ مرے بے جان پتوں میں پھر دوبارہ تازگی اور جان پڑ جاتی ہے۔ سچ پوچھو تو کچھ پودے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو موسیقی بہت پسند ہوتی ہے۔ اب تم اس گملے کو دیکھ رہی ہو نا اس کے سارے پتے کیسے لٹک گئے ہیں۔ ابھی میں مالی کو بلا کر ریڈیو گرام کے پاس اندر رکھوا دوں گی۔ جب اگلے جمعہ کو آؤ گی تو دیکھنا یہی مرگلہ پودا کیسا لہلہا رہا ہو گا؟" یہ سب سن کر میں حیرت زدہ رہ گئی' ان کو غور سے دیکھ کر کہا "اس وقت ایک شاعرہ نثر میں شعر کہہ رہی ہیں۔ بھلا یہ کہاں ممکن ہے۔ "یقین تم کو نہیں آ رہا ہے' تو میں تم کو ان سب کی مختلف فطرتیں آنکھ سے دکھا دوں گی۔ بالکل کچھ اسی قسم کی باتیں پچاس برس بعد اپنی بہن ذکیہ اکبر سے بھی سنیں جو جدہ میں ایک فلیٹ میں رہ رہی تھیں اور باغ کی بڑی شوقین' اپنے فلیٹ اور بالکنی کو باغ میں تبدیل کر رکھا تھا اور اب ۵۴ سال بعد بالکل اسی طرح کی باتیں والدۂ زہرہ نگاہ اور بجیا ثریا سے سنیں اور ان کے پودوں کو دیکھا بھی۔

ہاں تو پھر اندر آ گئے۔ میں نے ان کو ایک ہفتے کی پوری روداد سنائی کہ کھیل کیا ہوتے ہیں۔ ایک اکھاڑے کا میدان گرم ہو جاتا ہے۔ جب زور سے ہنسیں تو پیٹ بھی گویا ہل ہل کر ہنستا ہوا لگ رہا تھا۔ بولیں "جب پورے دو مہینے گزار لو گی تو تم کو کارپ میڈل ملے گا

اور چار ماہ بعد تم کو سلور میڈل اور پھر چھ ماہ بعد گولڈ میڈل دیا جائے گا۔" میں نے کہا کہ یہ تینوں میڈل آپ سے چھ ماہ میں رکھوا لوں گی۔ کہنے لگیں کہ مولوی عبدالحق صاحب کی لیاقت، قابلیت اور لگن کو جو اُن کو اردو زبان کے ساتھ ہے، بہت قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہوں مگر ان کے مزاج کی گرمی کو بھی خوب جانتی ہوں۔ میں نے کہا کہ "آخر اختران کے ساتھ سوا سال سے کچھ زیادہ ہو گیا' رہ رہے ہیں تو میرے لیے کیا مشکل ہو گا؟" بات ساری یہ ہے کہ اختران سے بڑھ چڑھ کر مزاج دار اور خود سر ہے۔ اس کو مولوی صاحب خوب اچھی طرح سمجھ گئے ہیں۔ وہ بڑے جوہر شناس ہیں۔ اختر جیسا لڑکا ان کے ہاتھ لگ گیا ہے' ان کے عین مطلب کا' دُھن کا پکّا اور اس کم عمری میں کئی زبانوں کا ماہر اور علمیت میں ان سے دو رسوہ تو ایک سونے کی چڑیا کی طرح اختر کو اپنے جال میں پھنسائے رکھیں گے۔ اس وقت ان کی ڈکشنری آخری مراحل میں ہے۔ بے شمار لفظ سنسکرت کے' ہزار ہا ہندی کے اور اَن گِنت بنگلہ کے' گجراتی کے الفاظ جو اردو میں شامل ہو چکے ہیں۔ ان سب کی چھان پھٹک کرنے کے لیے ان کو ہندوستان بھر میں کوئی مل نہیں سکتا' مگر تمہارے وجود کو وہ کتنے دن برداشت کر سکیں گے اور تم کس حد تک چل سکو گی' یہ مجھے دیکھنا ہے۔"

میں دل میں سوچنے لگی یہ تو مجھے ہمارے مولوی صاحب سے ہوّے کی طرح ڈرا رہی ہیں جب کہ وہ نہایت شفیق اور ساتھ ہی بڑے معصوم سے انسان ہیں۔ ہاں اختر بڑے مزاج دار ہیں ان کے ساتھ اگر چھ ماہ کاٹ لے تو ساری عمر کٹ جائے گی۔ مگر میں کس طور ان کی دماغی سطح تک آسکوں گی؟ کاش مجھے ان کے ماضی کا اور پھر مل سکے تو کم از کم ان کو پوری طرح سمجھ ہی سکوں۔

مسز نائیڈو شاید میری طرف دیکھ رہی ہوں گی۔ کہنے لگیں یہ تم اس وقت کس غوطے میں چلی گئیں کہ تم کو یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ کیاری میں قدم رکھے چل رہی ہو۔ کتنے ڈھیر سارے میرے پودے تم نے بے دردی سے اپنی چپل تلے کچل ڈالے۔ سچ سچ بتانا کہ اس وقت کس خیال میں ایسی گم ہو گئی تھیں۔ میں نے سچ سچ ان کو بتا دیا کہ میں یہ سوچ رہی تھی کہ اختر جیسے مخلص کی ہم سفر کیسے بن سکوں گی۔ بڑے پیار سے میرا ہاتھ پکڑ کر بولیں

چن چن کر نظموں کی شکل میں ایک موتی کی لڑی پرونے میں دنوں بلکہ ہفتوں کے لیے کھو جاتی ہوں۔ نائیڈو سرجن ٹھہرے وہ انسانوں کی چیر پھاڑی میں تن من سے لگے رہتے ہیں۔ میں سیاست کے چٹخارے میں شہر شہر کے چکّر لگانے نکل جاتی ہوں۔ گھر سے ہفتوں غائب اور اگر ملک سے باہر گئی تو مہینوں بعد لوٹتی ہوں۔ ان کو خوب معلوم ہے کہ جب محفلوں میں اپنا کلام پڑھتی ہوں یا اسٹیج پر کھڑے ہو کر سیاسی تقریر کرتی ہوں تو کتنوں پر کس قسم کا اثر ہوا کرتا تھا۔ جب میں جوان تھی' اب کا ذکر نہیں۔ کتنوں نے عشق کے دعوے کیے اور کیسے کیسے مر مٹنے کی دھمکیاں بھی دیں۔ شہرت بھی ایک طرح کا نشہ ہوتی ہے۔ میں تم سے جھوٹ تو بولوں گی نہیں۔ کتنی بار ایسے مواقع آئے اور راہ میں ایسے لوگ ملے جو میرے نازک تصورات اور سوچ کی کسوٹی پر پورے اُترنے لگے۔ ایسے مَردوں نے مجھے ہلا ہلا سا دیا مگر پھر فوراً" ہی یہ خیال کہ نائیڈو کو کس قدر مجھ پر مان ہے کہ سروجنی جیسی ہستی کبھی ان کے دامن کو جھٹک کر بھٹک نہیں سکتی۔ لغزش میں شاید ضرور ہی کر جاتی مگر نائیڈو کے یقینِ کامل اور اعتبار نے مجھے ٹھوکر کھانے نہ دی۔ دماغی طور پر ہم دونوں آسمان اور زمین جیسا فرق رکھتے ہیں۔ مگر محبت وہ ترازو ہے جو اس فرق کو نہیں تولتی بلکہ وہ ایک دوسرے کے بھروسے اور سہارے کو تولتی ہے۔ حمیدہ میری بچی بہت بار اختر کی زندگی میں ایسے مواقع سامنے آسکتے ہیں کہ ان کے قدم ڈگمگا جائیں' لیکن اگر ان کو تمہارے اعتبار اور محبت پر یقین کامل رہا تو وہ پلٹ کر پا بجولاں تمہارے ہی پاس آئیں گے' یہی نہیں' بلکہ اس کیفیت میں تم سے ہمدردی کے خواہاں ہوں گے۔ دل پر زخم کھا کر آئیں گے اور مرہم تم سے رکھوائیں گے۔ محبت تو ایک ڈور ہے جیسے پتنگ کی' اس کو جو ڈھیل دے سکا اس کی کٹی نہیں کٹ سکتی۔" پھر خود ہی خوب ہنسیں کہ وہ کس قسم کا فلسفہ مجھ سے بیان کر رہی ہیں' پر میرے دل و دماغ پر ایک ایک حروف نقش ہوتا چلا گیا۔ میں نے صرف اتنا کہا۔ "شکریہ' مجھے تا عمر آپ کے الفاظ صرف یاد ہی نہ رہیں گے بلکہ ان پر عمل بھی کروں گی۔"

اچھا اب آپ میری بھی ایک بات سنیے۔ میرا بہت دل چاہتا ہے کہ کسی طور پر میں ان کے بچپن' لڑکپن اور ان کے خاندانی حالات جان سکوں۔ پھر مجھے ان کو سمجھنے میں آسانی ہوگی' مگر اختر ... کہ میں بھی اس

موضوع کو نہ چھیڑوں۔ میں اختر کی کھینچی لائن کو پار تو نہ کروں گی مگر زندگی کی ڈور کا سرا پکڑنے کے لیے کوشاں رہوں گی۔ اگر ان کے والوں کو ان سے نہ ملا سکی تو سمجھوں گی کہ میں فیل ہو گئی۔ اختر کے ایک ہی تو سگے بھائی ہیں۔ کبھی خطوں میں ان کا ذکر اس طور سے کیا۔ "مولوی صاحب کے اصرار اور پھر ضد پر میں کسی طور شمیم صاحب کو لاہور سے بلا لینے میں کامیاب ہو گیا۔ اورنگ آباد میں انجمن کے پریس کے حالات بہت دگرگوں تھے۔ مولوی صاحب نے پریس کا منیجر بنا کر ان کو وہاں بھیج دیا ہے۔ پھر یہ شادی میں کیوں نہ آئے؟ لیکن کل ان کا خط اختر کے نام آیا۔ پڑھ کر میز کے خانے میں ڈال دیا۔ مجھ سے ایک بڑی ناشائستہ حرکت ہوئی کہ لفافے کو نکال کر الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ پیچھے نام مظفر حسین شمیم لکھا تھا۔ لفافہ موٹا سا تھا۔ اب مجھے یہ تو معلوم ہو گیا کہ نام شمیم حسن نہیں بلکہ شمیم تخلص ہے۔ لفافے میں سے ان کا خط نکال کر پڑھنا چاہتی تھی تو اس میں سے ایک اور لفافہ اختر کے نام نکلا جو ناگپور سے شمیم بھائی کے پتے پر اورنگ آباد بھیجا گیا تھا' جس پر ان کا پورا نام اور پتہ درج تھا۔ حبیب الدین بینرجی یہ کیا مسلمان اور ہندو دو نام ملا کر ایک نام بنتا ہے! میرا یہ کہنا تھا کہ جیسے سروجنی نائیڈو کے کرنٹ کا جھٹکا سا لگا' میرا ہاتھ جس کو پیار سے پکڑے ہوئے آہستہ آہستہ چل رہی تھیں اس زور سے دبایا کہ لگا ہڈیاں چٹ چٹ ہو کر ٹوٹ جائیں گی۔ میں نے گھبرا کر پوچھا' "یہ آپ کو کیا ہوا؟ میرے ہاتھ کی ہڈیاں تو ٹوٹی جا رہی ہیں۔ انہوں نے اپنا ہاتھ ڈھیلا کر دیا اور پوچھا۔ "پھر تم نے وہ خط پڑھے؟" مجھے یہ بتاتے شرم آ رہی تھی کہ میں نے دونوں خط پڑھے۔ شمیم بھائی کی چند سطریں تھیں کہ وہ شادی پر یوں جا نہ سکے کہ اس وقت پریس کو چھوڑ نہ سکتے تھے۔ مبارکباد اور دعائیں تھیں اور یہ کہ ماموں کو تمہاری شادی کی اطلاع دی تھی۔ ان کا خط میرے پتے پر جو تمہارے نام آیا ہے بھیج رہا ہوں۔ "اور اس میں کیا لکھا تھا؟" "یہ انگریزی میں تھا۔ بڑی ہی پختہ اور خوب صورت لکھائی اور عبارت۔ مبارک باد دے کر یہ لکھا تھا کہ کاش آج تمہاری والدہ اور میری بہن ممتاز النساء زندہ ہوتیں تو کتنے چاؤ اور پیار سے برات لے کر جاتیں اور کس ٹھاٹ باٹ سے دلہن بیاہ کر لاتیں اور اپنی بہو کے کیسے کیسے لاڈ اور چونچلے کرتیں۔ سر سے پاؤں تک سونے روپے میں لاد دیتیں۔ کبھی ہنس کر مجھ سے ممتاز نے کہا تھا کہ "جب میں اپنی بہو کو اپنا آدھا زیور پہناؤں گی تو ان سے اس بوجھ سے

چلا بھی نہ جائے گا۔" مگر خدا بھلا کرے تمہارے والد صاحب کا اپنی بے پروائی میں ایک ٹرنک بھرا زیور سارا چوری کروا دیا مگر اختر یہ چیزیں آنی جانی ہیں۔ خدائے رحیم نے تم کو علم کے زیور سے نوازا ہے جس کو کوئی چرا نہیں سکتا۔ خدا کرے کہ جس لڑکی سے تم نے اپنی پسند کی شادی کی ہے۔ وہ تمہاری قدر کر سکے۔ آج مجھے دل سے دکھ ہو رہا ہے کہ میں نے ایک ماموں ہو کر تم دونوں کے ساتھ زیادتی کرنے کے علاوہ کیا کیا؟ میں اپنی جوانی کی ترنگ میں ایسا کھویا ہوا رہا کہ آج بھی بھٹک رہا ہوں۔ کاش میں نے تم دونوں بھائیوں کے سر پر ہاتھ رکھا ہوتا' اپنے زیرِ سایہ رکھتا۔ اکبر حسین نے تو دوسری شادی کر لی۔ اگر وہ تم دونوں سے بے تعلق ہوئے تو اس کی اصل ذمے دار تمہاری ماما "بڑی بی" تھیں جس نے سوتیلی ماں کو گھر میں قدم ہی رکھنے نہ دیا۔ بس اپنے پونے میں دبائے رہیں اور میری سوتیلی ماں نے میرے جا و بے جا ناز و نخرے اٹھائے جس کے سبب میں شاہی قسم کے ٹھاٹ باٹ میں سر پھرا ہو گیا۔ قدرت نے ہم دونوں ہی بہن بھائی کو اعلیٰ دماغ دیا تھا۔ تمہاری ماں اپنی والدہ کے پاس رہ کر کیا اعلیٰ خاتون بنیں اور میں نے اپنی تباہی اپنے ہاتھوں بلائی۔ زندگی بھر نہ کسی انسان کو گردانا نہ کسی ملازمت کو سوائے وہ چار سال جب انگریز گورنر کا پرائیوٹ سیکریٹری رہا۔ جب باپ کی کمائی اپنے حصے کی اڑا دی تو تم دو ننھے معصوم بچوں کا حصہ بھی اسی طور مٹایا اور اب عرصے سے دادا اور باپ کا ورثے میں دیا قانونی دماغ میرا ذریعۂ معاش ہے۔ کاش میں وکالت ہی پڑھ لیتا تو خود مقدمے لڑتا۔ اب تو میرا کام وکیلوں کو مشورے دینا ہے۔ کسی سے کیا کہہ سکتا ہوں۔ نہ شادی کی نہ اولاد۔ تم دو میری اولاد کی طرح تب ہی بنتے جب میں نے تمہارے سروں پر ہاتھ رکھا ہوتا۔ یہ میرا پہلا خط تمہارے نام ہے کس قدر پچھتاوے کے ساتھ کہہ رہا ہوں' معاف کر سکو تو مجھے معاف کر دینا۔ شمیم سے تو گاہے گاہے خط و کتابت ہوا کی اور ان سے تمہاری تعلیم' علمی مشاغل کا معلوم ہوتا اور دل خوش ہوتا اور ناز بھی کرتا۔ حمیدہ دلہن کو میری بے شمار دعائیں۔ دعا گو حبیب الدین (بینرجی)

میں اس خط کو پڑھ کر رو پڑی' کتنے دکھ سے لکھا ہے' تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر اختر کی سوتیلی ماں تھیں تو ان کی والدہ کی بھی سوتیلی ماں تھیں اور یہ ماموں ان کے پاس پلے بڑھے' ایک طرف یہ لکھتے ہیں کہ انہوں نے بے انتہا لاڈ پیار میں رکھا۔ میری تو کچھ سمجھ

میں آیا نہیں۔ گردن موڑ کر سروجنی نائیڈو کی طرف دیکھا تو وہ آنکھیں بند کیے بیٹھی تھیں اور بے حد اُداسی ان کے چہرے سے ٹپک رہی تھی۔ "آپ کچھ بولتی کیوں نہیں؟" گھبرا کر آنکھیں کھول کر اتنا کہا۔ "مجھے اپنے بہت پرانے خط نکال کر پڑھنا ہیں" پھر مجھے غور سے اُداسی کے ساتھ دیکھتی رہیں۔ لیکن اس وقت پرانے خطوں کے پڑھنے کے خیال سے آپ ایسا چپ چپ کیوں ہو گئیں؟ "ایسا بھی ہوتا ہے کہ کبھی اپنے پیاروں اور دوستوں کے خطوط بہت خوش کر دیتے ہیں اور کبھی بہت اداسی طاری ہو جاتی ہے۔ جاؤ تم بہت دیر ہو گئی۔ جب یہ دونوں مدراس سے واپس آجائیں گے اور تم میرے پاس آؤ گی تو بہت حیرت انگیز باتیں تم کو بتاؤں گی۔"

مجھے ایسا لگا کہ آج وہ مجھ سے کوسوں دور سے باتیں کر رہی ہیں۔ طبیعت پر ایک اُلجھن سی طاری ہونے لگی، چند گھونٹ کافی کے اور پی کر کھڑی ہو گئی۔ "اچھا جاؤ اختر کو میرے چناچٹ پیار ضرور کر دینا۔"

ان کو خدا حافظ کر کے بابا کے فلیٹ کی سیڑھیاں تھم تھم کر چڑھنے لگی۔ دروازے کے پاس آ کر ایک دو منٹ رکی کھڑی رہی۔ اختر نے ایک دم سے دروازہ کھولا۔ مجھے دیکھتے ہی گھبرا کر پوچھا۔ "خیر تو ہے آپ کچھ گھبرائی اور پریشان سی لگ رہی ہیں؟" مینا سے تو کہیں مڈبھیڑ نہیں ہو گئی۔ اس نے آپ کو پریشان کیا۔ "ارے بھئی کیسی مینا جو پریشان کر سکتی ہو۔" بڑے آہستہ سے کہا "بابا کے چھوٹے بھائی جن کا دماغی توازن صحیح نہیں ہے۔"

"جی نہیں نہ مجھے کوئی مینا ملی نہ طوطا" آپ نے یہ کیسے سمجھا کہ میں پریشان ہوں۔ "یونہی" اختر کو جانے کہاں سے ہر کسی کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے احساس ہو جاتا تھا۔ ہم دونوں نے کھانا کھایا جو بہت سادہ مگر خوب صورت طریقے سے سجا ہوا تھا۔ کچھ پرندوں اور جانوروں پر بات چیت چل نکلی، کافی پی کر گھر کے لیے روانہ ہو گئے۔ راستے میں اختر نے بتا دیا۔ اب چند روز ان کی مصروفیت کے ہوں گے۔ مدراس روانہ ہونے سے قبل "رسالہ اردو" کی پوری ایڈیٹنگ کو دیکھنا ہے۔ ان کو اپنا ایک افسانہ مکمل کر کے "ساقی" کے لیے شاہد احمد کو دہلی بھیجنا ہے۔ ڈکشنری کے بہت سے صفحات درست کر کے اورنگ آباد روانہ کرنا ہیں۔ یہ سب تو تفصیل سے بتایا مگر اس کا کوئی ذکر نہیں کہ آخر مجھے کدھر روانہ کر کے مدراس جائیں گے۔ میں نے بھی سوچ لیا کہ خود تو نہیں پوچھوں گی۔

منیر بانو

چار روز سخت مصروفیت کے تھے پھر بھی اتنا وقت ضرور نکال لیا جاتا کہ گھنٹہ آدھ گھنٹہ تاش یا پچیسی کھیل لیں اور لڑ بھڑ کر اس کو پھاڑ پھوڑ دیں۔ دوسرے روز اور آتی جائے گی۔ آج رات پچیسی کھیلتے کھیلتے مولوی صاحب ایک دم بولے "ہاں بھئی، جب ہم دونوں دس دن کے لیے مدراس جائیں گے تو تم کو منظور یار جنگ کے یہاں چھوڑ دیں گے۔ ان کی چھوٹی بیٹی منیر بانو تمہاری ہم عمر ہیں۔ ابھی وہ پڑھ رہی ہیں۔ میں بڑی مدھم آواز سے بولی کہ "مجھے تو آپ لوگ منظور جنگ کے ہاں چھوڑ دیں گے اور راجہ رانی کو کہاں چھوڑیں گے؟ کیا جنگل میں؟" حیران ہو کر پوچھا "کیسی رانی اور راجہ؟" شاید وہ اس کھیل کے چکر میں بھول گئے تھے۔ جب بتایا کہ بھئی وہی ہرن اور ہرنی۔ اچھا اچھا تو تم ان کا ذکر کر رہی ہو، کو تو یہیں رہنے دیں اور تمہاری رائے ہے تو جنگل میں بھی چھوڑے جا سکتے ہیں۔ میں نے جب کہا کہ "شکر ہے کہ مجھے جنگل میں چھوڑنے کا ارادہ نہیں۔" "خوب ہنسے اور جلدی جلدی چند کش حقے کے لیے اور کہا "بس کھیل ختم پیسہ ہضم"۔ اٹھتے اٹھتے اختر سے کہا کہ "اچھا ہوتا کہ حمیدہ کو ایک بار منظور یار جنگ کے ہاں لے جا کر سب سے ملوا دیتے۔ جمعہ آیا اور تم سیدھے بابا کے گھر۔ ٹھیک ہے کہ وہ تمہارا دوست ہے مگر منظور یار جنگ سے کوئی دشمنی تو نہیں، ایک تو وقت بھی اتنا نہیں رہا۔" بڑی پھرتی سے اُٹھ کر اپنے کمرے کا رخ کیا۔

اختر کپڑے بدل کر، رائٹنگ ٹیبل پر چند کتابیں رکھ کر کرسی پر بیٹھ گئے اور کاغذ سامنے رکھ کر کچھ لکھنے بیٹھ اور ان کتابوں پر تبصرہ لکھنا شروع کر دیا۔ یہ رسالہ اردو میں "ناخدا" کے نام سے لکھتے تھے۔ یہ کتابیں رات کو سونے سے پہلے چند روز سے ان کے زیر مطالعہ تھیں، جس میں جوش صاحب کے کلام کا ایک مجموعہ بھی تھا۔ اس کو میں نے دن میں بہت

مزے لے کر پڑھا تھا۔ سب سے پہلے اس کی ہی باری آئی۔ آج پہلی بار تھی کہ اختر ہمارے کمرے میں کچھ لکھنے بیٹھے تھے۔ میں اپنے پلنگ پر خاموش لیٹ کر ان کو دیکھ رہی تھی۔ کتاب ہاتھ میں اٹھائی کچھ ورق گردانی کی۔ قلم پکڑا تو پہلی بار میری نظر ان کے قلم اور انگلیوں پر پڑی۔ قلم کو انگوٹھے اور بیچ کی انگلی کی گرفت میں دیکھا۔ یعنی صرف دو کی گرفت سے اس زور کا چلتا ہے اگر تیسری انگلی کا سہارا ہوتا تو جانے قلم اور قیامت ہی ڈھا دیتا۔ ان کے پاس میز کا لیمپ جل رہا تھا' میرے پلنگ پر اندھیرا تو تھا اس کا میں پورا فائدہ اٹھا کر خوب مزے سے ان کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ کو دیکھ سکتی تھی۔ کتاب پر نظر ہے' ہلکا سا مسکرائے' ہونٹ کچھ اور موٹے لگے۔ کبھی تیوری پر بل سا آیا۔ کچھ دور پڑے کو پیچھے دیکھ رہے ہیں۔ اب قلم کاغذ پر چل رہا ہے۔ پھر ورق پلٹے کچھ نشانات لگے مقامات کو بغور پڑھا۔ پھر اپنی دو انگلیوں کی گرفت والے قلم کو تیزی سے کاغذ پر دوڑایا۔ اب پیشانی کشادہ ہو گئی دو بل غائب ہو گئے۔ پھر کتاب کی ورق گردانی' نشانات کی تلاش اور پھر قلم چلتا ہے اور پھر رک جاتا ہے۔ پھر مسکراہٹ کے ساتھ لکھ رہے ہیں۔ آدھ گھنٹہ لکھ کر کاغذ دہرا کر کے پیپر ویٹ کے نیچے دبا کر رکھ دیا۔ پوچھا۔ "کیا آپ ابھی جاگ رہی ہیں؟" "روشنی ناگوار تو نہیں لگ رہی" "ہاں جاگ رہی ہوں اور آپ کو اور آپ کے قلم کو دیکھ بھی رہی ہوں۔ مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔" بولے "شکر خدا کا آپ کو ناگوار خاطر نہ ہوا۔ یہ تو بڑے اطمینان کی بات ہے کہ ہمارے لکھنے پر آپ کو کوئی اعتراض نہیں۔" "مجھے اور آپ کے لکھنے پر اعتراض؟ ارے میں تو آپ کے افسانوں کو پڑھ کر ہی کبھی کبھی یہاں تک چلی آئی۔"

مولوی صاحب کے اس مذاق یا ناراضگی سے ڈر کر جانے کیسے میں خود بخود صبح سویرے اُٹھنے لگی تھی۔ دونوں کی سیر سے واپسی سے پہلے بستر سے اُٹھ' منہ ہاتھ دھو' باغ میں جا کھڑی ہوتی۔ پھولوں کی کیاریوں سے مرجھائے ہوئے پھول اور گل دانوں کے لیے کھلے ہوئے پھول قینچی سے کاٹتے ہوئے ہمیشہ مولوی صاحب کو دکھائی دیتی۔ کبھی کبھی خود بھی نیچے اتر آتے۔ آنکھیں چرا کر اِدھر اُدھر دیکھتے کہ اختر تو آس پاس نہیں۔ "میں نے بالکل ٹھیک کیا تھا کہ پہلے دن تم پر بوجھ لاد کر صبح اٹھنے کی عادت تو ڈال دی۔ تم کو پودوں اور پھولوں سے بڑی دلچسپی ہے۔" ایک دن جب میں نے مولوی صاحب کو سروجنی نائیڈو کی

باتیں پودوں کے متعلق سنائیں تو بجائے خوش ہونے کے تیوری پر بل ڈال کر بولے۔ "یہ شاعر لوگ بڑی ایران توران کی ہانکتے ہیں۔"

کمرے میں آئی تو اختر ہرنوں کی خیر خبر لینے گئے ہوئے تھے۔ ان کا رات کا لکھا ہوا تبصرہ جوش کی کتاب پر کیا تھا پڑھ ڈالا' ابھی وہ میرے ہاتھ ہی میں تھا کہ واپس آ گئے۔ جھپٹا مار کر مجھ سے چھین کر بولے "دیکھیے کبھی میرا کوئی مسودہ نہ پڑھیے گا جب چھپ کر آ جائے تو پڑھ لیں۔" "ٹھیک ہے' مگر اس کو تو اب پڑھ ہی لیا' اس لیے ایک بات پوچھوں۔ جوش ملیح آبادی جیسے بڑے شاعر پر آپ نے کتنے اعتراض کر ڈالے جب وہ پڑھیں گے تو کس قدر چراغ پا ہوں گے۔" "تو میں کیا کسی سے ڈرتا ہوں؟ ان کو برا لگتا ہے تو لگے۔ میرا قلم اور دماغ کسی کی بے جا تعریفوں کے پُل باندھنے کا عادی نہیں۔"

ان دونوں کے مدراس جانے کا دن آ گیا۔ مجھ سے کہہ دیا گیا تھا کہ دس روز کے لیے ایک بیگ میں کپڑے وغیرہ رکھ کر تیار رہوں۔ دوپہر کی ریل سے روانگی تھی۔ اس لیے مجھے دس بجے صبح مولوی صاحب اپنے ساتھ لے کر چلنے کو برآمدے میں آ گئے۔ میں ٹرین کے مسافر کی طرح سامان لیے تخت پر بیٹھی تھی۔ اختر کے دفتر کے کمرے سے ہو کر باہر جا سکتی تھی۔ کہاں یہ سوچ رہی تھی کہ اختر بھی ساتھ چلیں گے۔ موٹر کے پاس کھڑے ملیں گے۔ دیکھتی کیا ہوں کہ وہ تو کرسی پر ڈٹے بیٹھے ہیں۔ میز پر کاغذ پھیلے ہوئے سر جھکائے لکھ رہے ہیں۔ مجھے دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ "اچھا تو خدا حافظ' آپ کا دل اس گھر میں خوب لگے گا۔ وہاں ہر طرف آپ کو طرح طرح کی خواتین نظر آئیں گی۔" پھر کرسی پر بیٹھ کر لکھنا شروع کر دیا۔ میں نے دو قدم آگے بڑھ کر گردن موڑ کر دیکھا تو میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میری آنکھوں میں آنسو ڈب ڈب کر رہے تھے' جلدی سے سر جھکا کر لکھنے لگے۔ دل پر ایک گھونسا سا لگا کہ یہ کیا بات ہوئی کہ مجھے غیر لوگوں میں رہنے کے لیے بھیج رہے ہیں۔ خود وہاں تک ساتھ جانا تو کجا' موٹر تک بھی نہیں آ سکتے۔ ان کے لیے کام ضروری ہے میرا وجود بے معنی! مولوی صاحب کہہ رہے ہیں کہ جلدی بیٹھو موٹر میں بہت دیر ہو گئی ہے۔ اللہ اللہ ان کو اتنی جلدی ہے کہ جلد سے جلد جا کر سواری کسی کے ذریعہ اتار کر واپس آ جائیں۔ رونا اور غصہ دونوں ہی آیا' پر 'شکر ہے اپنے اوپر قابو رکھ سکی' موٹر میں بیٹھ گئی مگر خون کھول رہا تھا۔ مولوی صاحب میری کیفیت کو بھانپ کچھ کچھ سا گئے۔

بات کو انہی مذاق کا رنگ دینے کے لیے بولے۔ "دیکھا تم نے اختر کو ڈٹ کر کرسی پر بیٹھ گئے۔ ساتھ آنے کو بھی نہ کہا۔ میں تم سے برابر یہی کہتا ہوں کہ یہ بڑا ہی بے ڈھب اور بے پروا انسان ہے۔ اس سے ڈر کر رہا کرو' جانے کیا کر گزرے۔" "دیکھیے آپ ان کو یہ سب نہ کہا کیجیے۔ آپ کا ہی حکم ہوا ہو گا کہ تم آنے جانے میں وقت ضائع نہ کرو۔ میں چھوڑ آؤں گا۔" "اوہو' تو میجر کی طرف داری بھی کی جا رہی ہے۔" "میری ہنسی چھوٹ گئی۔ شاید اسی لیے یہ کہا ہو گا۔ پھر تو خود بھی ہنستے ہوئے بولے۔ "ان صاحب کے اور بھی بہت سے نام ہیں۔" "تو پھر اس وقت وہ بھی بتا دیں۔" "کیا سوچتے سوچتے سے تم کو اب خود ہی معلوم ہو جائیں گے۔ ابھی تو یہ سنو کہ جہاں تم جا رہی ہو وہ لوگ بہت سیدھے اور بڑے بھلے مانس لوگ ہیں۔ منظور یار جنگ مجھے بہت عزیز ہیں کہ ان کے والد میرے گہرے دوست تھے۔ ان کی سب سے چھوٹی بیٹی تمہاری عمر کی ہے۔ ابھی پڑھ رہی ہیں۔ دو بڑی لڑکیوں کی شادی ہو چکی ہے۔ ایک کی شادی نواب لوہارو کے گھرانے میں ہوئی جو واپس میکے میں آ گئیں۔ ان کی اپنی صرف ایک بہن تھی یہ بھی نواب لوہارو کے ہاں بیاہی گئی تھیں مگر دلی سے جلد ٹکٹ کٹا کر واپس یہاں بھیج دی گئیں۔ کچھ دماغ دار زیادہ ہی ہیں۔" میں نے کہا اس کا مطلب تو یہ کہ "لوہارو" بڑی خطرناک جگہ ہے جہاں کسی کو ٹکنے ہی نہیں دیا جاتا۔" مسکرانے لگے اور پھر بولے۔ منظور یار جنگ کا صرف ایک بیٹا بابر مرزا ہے' ان کی شادی مہاراجہ کرشن پرشاد کی مسلمان بیوی کی لڑکی سے ہوئی ہے۔ ایک بچہ ہے۔ کامران مرزا' خوب گول مٹول سا۔ ہاں اور یہ کہ منظور یار جنگ کی یہ دوسری بیوی ہیں جن کی ایک ہی بیٹی منیر بانو ہے۔ میں نے کہا مجھے تو آج یہ معلوم ہوا کہ آپ کی یادداشت لوگوں کے خاندانی حالات اس قدر تفصیل سے یاد رکھ سکتی ہے۔" یہ سب اتنی تفصیل سے یوں بتایا کہ میری بیٹی کو دس دن ان سب کے ساتھ رہنا ہے لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم جو بہت کچھ معلوم کرنے کی ٹوہ میں لگی رہتی ہو' پھر ایک بار بھی اختر یا مجھ سے کچھ بھی نہ پوچھا کہ آخر کن اور کیسے لوگوں میں تم کو اتنے دن رہنا ہو گا۔"

میں نے خاصا جل کر جواب دیا کہ ایک بکسے کو جسے یہاں وہاں چھوڑ دیا جائے' کچھ بھی پوچھنے کا حق ہی کیا ہے؟ اگلی بار جب آپ دونوں دورے پر جائیں تو کہیں اور پھینک کر چل پڑیں گے۔

میرے دل کے دکھ کو بھانپ گئے۔ پیار سے پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "تمہیں تو ہم سے کبھی کبھار جدا ہی ہوتا ہے۔ جب بھی ہم کہیں گے تو تم بس ان ہی کے ہاں رہا کرو گی۔ یہاں رہنے میں تم کو ایسا لگے گا جیسے "نیلی چھتری" میں آ گئی ہو۔ مگر یہ سن کر میں رو پڑی۔ سٹ پٹا گئے۔ "دیکھو یہ عام لڑکیوں کی سی حرکت نہ کرو۔ اختر کو معلوم ہو گا تو کیا سوچے گا۔ اس کو تو تم سے بہت اونچی توقعات ہیں۔" یہ سن کر میں خوش ہو گئی۔

اب ہم شہر کے بالکل باہر آ چکے تھے۔ آبادی ختم پر تھی۔ کہیں کہیں اکا دکا کوٹھیاں بے شک نظر آ جاتی تھیں۔ یہ سارا علاقہ اونچا نیچا تھا۔ چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی تھیں یا چکنے سپاٹ گول مٹول پتھر تلے اوپر رکھے نظر آ رہے تھے۔ میں نے پوچھا آخر ہم جا کہاں رہے ہیں۔ بس "حبشی گوڑہ" ایک ہی میل کا اور راستہ رہ گیا۔

کچھ ہی دیر میں موٹر ایک پہاڑی پر چڑھ رہی تھی۔ چاروں طرف گھنی سبز جھاڑیاں اس کو گھیرے میں لیے ہوئے' اوپر کو نظر کی تو ایسا لگا کہ اس کا سر کاٹ کر سپاٹ جگہ پر کوٹھی بنائی گئی ہے۔ فاصلے پر ایک کاٹیج۔ موٹر پورچ میں آ کر رک گئی۔ ایک بھاری بھرکم خاتون ساری پہنے' سر پر پلو ڈالے جیسے ہماری منتظر کھڑی تھیں۔ ان کا قد بہت اونچا' شہدی رنگ' آنکھیں غیر معمولی گول ابھار لیے' ناک ستواں اور ماتھا کشادہ' بھرے بھرے ہونٹ۔ آگے بڑھ کر مولوی صاحب کو کئی جھک جھک کر سلام کیے۔ مولوی صاحب نے کہا۔ "خوش رہو۔ یہ حمیدہ میری بہو ہے۔ تم جلدی اترو' مجھ سے کہا۔ ڈرائیور سے کہا۔ جلدی سوٹ کیس نیچے رکھو۔ میرے سر پر ہاتھ پھیر کر خدا حافظ کے ساتھ ہی۔ چلو' چلو نیرو!" موٹر روانہ ہو گئی۔

میں مڑ کر موٹر جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ مولوی صاحب نے ہاتھ نکال کر ہلایا اور دوسری طرف کو منہ کر لیا۔ میں سمجھ گئی کہ خود مولوی صاحب کو برا لگا اس طرح چھوڑ کر چلے جانے کا۔ برآمدے کے دروازے کی چق ہٹا کر میرا ہاتھ پکڑے اندر داخل ہوئیں تو کیا دیکھتی ہوں کہ بے عدد باندیاں قطار میں کھڑی ہیں۔ شکل و صورت اور لباس سے سب مدراسی معلوم ہو رہی تھیں۔ دو طرفہ جانے کتنے کمروں کے دروازے کھلے دیکھے' مگر وہ مجھے آگے اور آگے لیے چلی جا رہی تھیں۔ مڑ کر کسی لونڈی جس کا نام "ترنجی" ہو گا' آواز دے کر کہا۔ "سوٹ کیس دلہن پاشا کا کمرہ جو منیر پاشا کے کمرے کے برابر ہے' لے کر جاؤ۔"

کپڑے الماری میں لگا کر سنگھار میز کا سامان جگہ پر رکھو۔" یہ کہتی ہوئی سیدھے ہاتھ کے بہت بڑے کمرے میں لے کر آئیں۔ یہ ان کا بیڈ روم تھا۔ ایک تخت پر مجھے بٹھا کر پوچھا۔ "چائے پیوگی یا شربت؟" اس وقت تک مجھے شربت پینے کی عادت ہو چکی تھی۔ بتایا "شربت۔"

میں نے اب ادھر اُدھر اپنی نظر کو دوڑایا۔ چھپر کھٹ کے پائے خوب موٹے موٹے چاندی کے۔ نفیس بادامی پلنگ پوش سے بستر ڈھکا ہوا۔ تخت جس پر بیٹھی ہوئی تھی اس کی مسند اور گاؤ تکیے کارچوبی، پورے کمرے کی ناپ کا ایرانی قالین، ہلکے نیلے رنگ کا، جابجا جانوروں کی شکلیں چوکڑیاں بھرتے ہوئے چراگاہ کا نقشہ پیش کر رہی تھیں۔ تخت کے پاس ہی دو کرسیاں، ایک اس قدر بڑی جیسے کسی پہلوان کے نیم دراز ہونے کے لیے رکھی ہوئی ہے۔ ایک عام آرام دہ کرسی۔ دونوں پر نفاست کے ساتھ کٹاؤ دار کام کے نیلے رنگ کے کُشن۔ سامنے سنگھار میز، چاندی کے سامان اور سینٹ وغیرہ کی بوتلوں سے لدالد۔ مسہری کے پاس ایک نیچا سا اسٹول، جیسے مسہری پر لیٹنے کے لیے اس کو استعمال کرتے ہوں، کمرے کے ایک کونے میں چاندی کا خوب لمبا شمع دان۔ ایک طرف نہایت خوب صورت اخروٹ کی لکڑی کی لکھنے کی میز، خوب اونچے دو طرفہ کابک کے چھوٹے چھوٹے خانے، ان میں بڑے سلیقے سے کاغذات رکھے ہوئے۔ نیچے والی درازیں جو بند تھیں، مگر اس نازک اور حسین میز کے ساتھ کرسی اتنی بھاری بھرکم کہ بڑی بے جوڑ سی لگی۔ شربت لے کر بفاتن آگئی۔ قریب کی میز پر ایک چاندی کی چنگیری میں پھول ہار رکھے ہوئے جو کارچوبی خوان پوش سے ڈھکی ہوئی تھی۔ وہیں ٹرے رکھ دی۔ پاشا نے کہا تم شربت پی لو پہلے، تو میں ہار پھول پہناؤں گی۔ (حیدر آباد کی یہ رسم کہ بڑے اپنے چھوٹوں کو ہر موقع پر ہار پھول پہنا کر اپنے بڑے ہونے اور چھوٹوں کو پیار کرنے کی رسم ضرور ادا کرتے) میرا یہ پہلا موقع تھا کہ کسی نواب کی حویلی میں قدم رکھا تھا۔ ایک اور ماما اتنے میں وارد ہوئی۔ جھک جھک کر فرشی سلام کرکے پیچھے کو دو قدم کھڑی ہو کر مجھ سے دریافت کرتی ہے۔ "آپ کس وقت تناول نوش فرمائیں گی۔" "منیر پاشا تو ذرا دیر سے اسکول سے آتی ہیں۔ کوئی خاص قسم کھانے کی فرمائش کرنا ہو تو فرما دیں۔" میں دل میں سوچنے لگی یا تو پندرہ دن مجھے دن کا کھانا ہی نہ ملا تھا اور یہاں فرمائش پوچھی جا رہی ہے۔ میں نے کہا۔ "نہ مجھے

کھانے کی کوئی جلدی ہے اور نہ ہی کوئی خاص چیز۔ منیر بانو کے آنے پر ہی کھاؤں گی۔"

اب پاشا مجھ سے باتیں کرنے لگیں۔ ان کا بھی پہلا سوال یہی کہ بتاؤ "مولوی صاحب کے یہاں کیسی گذر رہی ہے؟" آخر ہر ایک مجھ سے پہلی بات یہی کیوں کرتے ہیں۔ جواب میں کہا۔ "شکر خدا کا بہت مزے میں وقت کٹ رہا ہے اور ہر طرح سے وہ اور اختر میرا خیال کرتے ہیں۔" "اچھا یہ تو بڑی اچھی خبر ہے۔ مجھے یقین ہے کہ منیر بانو سے تمہاری اچھی دوستی ہو جائے گی۔ اور بابر مرزا کی دلہن بھی پسند آئیں گی۔ بچہ ماشاء اللہ بالکل گڈے کی طرح ہے۔" "ہاں" "رجنی" نامی باندی تمہارے سب کام کرے گی۔ جس چیز کی بھی ضرورت ہو اس کو حکم کر دیا کرنا۔"

اتنے میں ایک اور نئے چہرے کی باندی ہاتھ میں ایک چاندی کی گول ٹرے لیے ہوئے جس پر اونچا سا سرپوش تھا داخل ہوئی۔ ہاتھ نیچا کرکے سرپوش اٹھا کر پاشا کو دکھا کر کہتی ہے۔ "یہ سب لوازمات منیر پاشا کے لیے درست ہیں؟" میں نے غور سے اُدھر دیکھا تو ایک طشتری میں انار کے یاقوتی رنگ کے دانے۔ دوسری طشتری میں سنترے کی پھانکوں سے نکال کر زیرہ رکھا ہوا، ایک میں تین طرح کے تین بسکٹ اور چوتھی میں چار کھجوریں اور ایک گلاس شربت کا۔ پاشا نے جھک کر دیکھا اور کہا "ہاں درست ہے۔" "میں تو حیران ہی رہ گئی کہ ان کو اسکول سے آکر کھانا، کھانا ہے۔ پھر یہ سب کیوں ہے؟ پھر پاشی نے مجھ سے کہا۔ "چلو تم کو اتنے میں گھر اور تمہارا کمرہ دکھا دوں۔ یوں منیر بانو کے کمرے میں ایک اور بھی پلنگ لگوا دیا ہے۔ اگر رات کو اکیلے سوتے ڈر لگے تو ان کے کمرے میں سو سکتی ہو۔

ڈائننگ روم میں بے تحاشہ بڑے بڑے صوفے اور کرسیاں دیکھ کر میں سوچ میں پڑ گئی کہ آخر ان کو اتنی چوڑی کرسیاں اور صوفے کیوں پسند ہیں؟ اتنے نفیس ایرانی قالینوں اور اعلیٰ سجاوٹ کی چیزوں کے ساتھ کیسے بے ڈھنگے لگ رہے ہیں۔ خاندانی بزرگوں کی پینٹنگ، عجیب قسم کے انگرکھے، اور پگڑ، چست پاجامے، کچھ مردانہ پینٹنگ گلے میں زیورات بھی پہنے ہوئے پگڑوں پر ہیرے موتی کی کلغی بھی لگائے ہوئے۔ دل میں ہنسی کہ رئیس لوگ کیسی سج دھج اپنی بناتے تھے۔ یہ سب پشتانی نواب جو ٹھہرے۔ سچ مچ میں نے پہلی بار جھاڑ فانوس بھی دیکھے ورنہ تو صرف کتابوں کی تصاویر میں دیکھے تھے۔ جگہ جگہ

چاندی اور بلور کا سامان، ہر چیز پر میں سرسری سی نگاہ ڈالتی۔ ان کے ساتھ کھانے کے کمرے میں آئی۔ چوبیس لوگوں کے لیے میز اور کرسیاں۔ میز کے سرے پر جو صاحب خانہ کی جگہ ہوتی ہے اس جگہ کی کرسی بے حد چوڑی اور بڑی۔ اب بات میری سمجھ میں آگئی کہ نواب صاحب خود پہلوان کے تن و توش والے ہوں گے۔ الماریوں میں بہترین برتن، اور چاندی کا ساز و سامان، یہاں بھی بس مَردوں کی تصاویر آویزاں تھیں۔ ہاتھ دھونے کا سامان ایک کونے میں، ایک چاندی کی چوکی پر بڑا سا چاندی کا آفتابہ اور چاندی کا لوٹا اور صابن دانی۔ چھت پر بڑے بڑے جھاڑ فانوس، کمرے کے چاروں کونوں میں اونچے چاندی کے شمع دان۔ یہ سب ساز و سامان دیکھ کر مجھے والدہ کے جملے یاد آگئے جو اکثر ہم لڑکیوں سے کہا کرتی تھیں کہ "اگر محل میں جاؤ تو دیدے پھٹ نہ پڑیں اور اگر جھونپڑی میں رہنا ہو تو ہرگز چہرے مہرے پر غم کے بادل نہ چھا جائیں۔ ٹھاٹ سے وہاں اٹھو بیٹھو کہ یوں ظاہر کرو جیسے ہمیشہ ہی اس میں رہا کرتی تھیں۔ کوئی بڑا سا کمرہ اسٹڈی تھا جس میں اونچی اونچی کتابوں کی الماریاں تھیں۔ نادر کتابیں جن کی جلد چمڑے کی، سنہری الفاظ میں ان کے نام لکھے ہوئے۔ میں ایک ایک الماری کے پاس کتابوں کے نام پڑھنے لگی اور دل میں خیال آیا۔ کاش یہ سب الماریاں کتابوں سمیت میرے مولوی صاحب کے دفتر والے کمرے میں پہنچ جائیں۔ بیچارے کی کتابیں کس قدر بوسیدہ پھٹے حال کی ہیں۔ کئی کمروں کی طرف اشارہ کیا کہ یہ مہمانوں کے ہیں اور بتایا کہ کوٹھی کی دائیں طرف ملا ہوا پھوپھی جان (میری نند) کی رہائش گاہ ہے۔ برآمدے سے اشارہ کیا وہ دور جو کاٹیج ہے وہ بابر مرزا کی ہے۔ شام کو نواب صاحب اور میں جب ملنے چلیں گے تو تم کو ساتھ لے جائیں گے۔ کاٹیج اور کوٹھی کے درمیان ایسا لگا جیسے کوئی چھوٹا سا ایئرپورٹ ہو۔ میں نے جب ان سے پوچھا "کیا یہاں پہلے کوئی ایئرپورٹ تھا؟" ہنس پڑیں اور بولیں "نہیں یہاں تو صرف باغات تھے۔ پھولوں کی کیاریاں اور بیلے چنبیلی کے جھنڈ اور بہت بڑا لان۔ بابر مرزا جب ولایت سے جہاز اُڑانا سیکھ کر آئے تو ان کو اپنا ذاتی جہاز لینے کا شوق ہوا۔ وہ کاٹیج فلائنگ کلب کے لیے بنوائی گئی۔ سارے باغات کاٹ کر چھوٹے جہاز کے لیے رن وے بنایا گیا۔ منیر بانو کے والد اپنے بیٹے کی ہر خوشی کو پورا کر کے نہال نہال ہوتے ہیں۔ جہاز اُڑانا سکھانا شروع کر دیا۔ اس جان جوکھوں کے مشغلے پر بہت ڈرے اور سہمے رہتے۔ پھر ترکیب یہ کی کہ بابر میاں کی

شادی کر کے کاٹیج میں دلہن کو رکھا تو کلب بند ہوا۔ پھر فلائنگ کا شوق بھی ختم ہوا اور ہم سب نے اطمینان کی سانس لی۔ مگر یہ سارا لان جو اُجڑا تو وہ پھر کبھی نہ بن سکا۔

اب وہ مجھے میرے کمرے میں لے آئیں جو ایسا لگتا تھا کہ بڑے پیار اور توجہ کے ساتھ آراستہ کیا گیا ہو۔ رجی جو کھڑی میرے کپڑے الماری میں رکھ رہی تھی۔ وہ قدم پیچھے کو ہو گئی۔ مجھ سے پوچھا "کیا آپ اس وقت غسل کریں گی یا شام کو؟ کون سا لباس پہننا پسند کریں گی؟" "میں نہا کر آئی ہوں۔ کل کوئی سا بھی جوڑا پہن لوں گی۔" اس کے چہرے پر صاف حیرت کے آثار نظر آئے۔ میں تو صرف چھے جوڑے لے کر آئی تھی۔ صبح شام ان کو تبدیل کرنے کا کیا سوال تھا۔ پاشی نے کہا تم کچھ دیر آرام کرو۔ صبح جلدی اٹھی ہو گی۔ منیر بانو جب اسکول سے آئیں گی تو میں خود تم کو ان سے ملاؤں گی۔

وہ کمرے سے باہر گئیں تو میں پلنگ پر لیٹ کر اپنے خیالات میں گم ہو گئی۔ پھر سرہانے کی چھوٹی میز سے ایک رسالہ "ساقی" کا اٹھا کر پڑھنے لگی۔ اتفاق سے اس میں اختر کا ایک افسانہ "مدھا بھکاری" نظر آیا۔ اس کو پڑھ کر بڑی اداسی دل پر چھا گئی۔ آنکھیں بند کر کے سوچنے لگی کہ آخر کس طور سے آنکھوں والے اختر اس گہرائی میں جا کر اندھوں کی کیفیات اور جزئیات کو ان الفاظ کی شکل میں ڈھال کر لکھتے چلے گئے۔ خدا اپنی قدرت سے کس طور پر لکھنے والوں کو نوازتا ہے۔

جمیل بھیا! یہ سطریں لکھتے ہوئے میرا دل خون کے آنسو بہا رہا ہے۔ اس وقت کیا خبر تھی کہ میرے اپنے اختر اتنی روشن آنکھوں والے ایک دن خود اندھوں کی قطار میں دس سال طویل عرصے کھڑے رہیں گے اور میں حسرت اور غم آگیں نظروں سے بے بس تخت کے کونے پر بیٹھی بس ان کی طرف دیکھا کروں گی۔ ان کو اپنی اس کیفیت کا نہ گلہ ہوا نہ شکوہ نہ ہی اپنی بیچارگی اور لاچاری کا اظہار کیا، سوائے اس جملے کے کہ "میری بینائی کچھ کمزور ہو گئی ہے۔" میں نے اس عرصے میں ہر جگہ کا آنا جانا چھوڑ دیا تھا کہ اختر کہیں کسی چیز سے ٹکرا نہ جائیں۔ کہیں گر نہ پڑیں۔ میں آنکھیں ہوتے ہوئے کئی بار گر کر ہڈیاں تڑواتی رہی۔ یہ کیوں بھول رہی ہوں "وہ تو اختر تھے جن کی جگہ مولا نے تو اور بہت اونچی آسمان پر دیکھنے کے لیے بنائی ہوئی ہے۔ سو اختر ہمیشہ دیکھتے چمکتے رہے اور انشاءاللہ ہمیشہ رہیں گے۔ وہ مولا کے پاس جا کر بھی زندہ ہیں اور میں جی کر بھی مُردہ ہوں۔

ضرور چلیں۔

میرا دل چاہا کہ کاش اس کی اجازت ہو اور سب چلیں تو میں ایک محل اور اس کے طور طریقے بھی دیکھ لوں۔ دونوں نے بے حد خوشی سے اس کی ہامی بھرلی۔ اس وقت میں کب یہ سوچ سکتی تھی کہ اختر کے ساتھ بے شمار محلوں کی محفلوں میں شریک ہو سکوں گی۔

پرسوں کا دن آگیا۔ شام کو ہم لوگ سوائے نواب صاحب کے جانے کی تیاری میں لگ گئے۔ رجی بار بار مجھ سے پوچھتی رہی۔ "دلہن پاشا آپ کون سا لباس زیب تن کریں گی؟" تاکہ میں اس پر استری کردوں۔ میں نے سروجنی نائیڈو والی ساری اور بلاؤز اس کے ہاتھ میں تھمادیا۔ اس پر استری کرلینا۔ وہ میرا منہ دیکھتی رہی۔ پھر جاکر پاشی کو بتایا۔ وہ چل کر میرے کمرے میں آئیں کہ کوئی بھاری ساری پہن لو' اور اگر ساتھ نہیں لائی ہو تو اسی بلاؤز سے میچ کرتی اپنی ساری نکال دوں۔ میں نے صاف انکار کردیا۔ پھر بولیں۔ "اچھا دکھاؤ زیور کیا پہنو گی؟" میں نے کہا بس یہی موتی کی لڑ۔ تھوڑی دیر مجھے دیکھتی رہیں اور پھر چلی گئیں۔

آج جمعہ کا روز تھا۔ منیر بانو کے غسل کا سماں دن کو دیکھ چکی تھی۔ میں نے تو اسی شام کو رجی سے کہہ دیا تھا۔ "دیکھو مجھ سے بھی غسل کرنے' مالش' اُبٹن لگوانے' سر دھلانے کی بات نہ کرنا۔ میرے اپنے ہاتھ ہیں۔ ان سے نہا دھولیتی ہوں' اور مالش' اُبٹن کروانے کی مجھے عادت نہیں۔" مگر منیر بانو کے نہانے کا اہتمام بڑی تفریح لے کر دیکھا کی۔ اُبٹن کا' مالش ہوئی۔ آدھ گھنٹے میں سر دھلا اور غسل ہوا۔ دو باندیاں مستعدی سے لگی رہیں۔ پھر بالوں پر تولیہ لپیٹے محترمہ باہر تشریف لائیں۔ پلنگ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئیں۔ ایک باندی نے ایک پیالے نما برتن' جس میں کوئلے جلے ہوئے رکھے تھے پاؤں کے سامنے رکھا۔ اس پر کچھ الابلا سے بنا ہوا' نرالہ سا ڈالا اور خوشبوؤں والا دھواں اُٹھنے لگا۔ اس کوئلے کے برتن پر بانس کی باریک کھپچیوں سے بنا ہوا اونچا سا سرپوش رکھا اور منیر بانو کے گز بھر لمبے بال سر سے نیچے لٹکا دیے گئے۔ یوں بال خوشبوؤں سے بسا کر خشک کیے گئے۔ میری زبان پر آتے آتے یہ جملہ رہ گیا۔ "منیر بانو کیا تم کچھ پاگل ہو جو یہ سب کرواتی ہو۔" شکر ہے زبان پر قابو رکھ سکی۔ سوچا آج رات گھر خط ضرور لکھوں گی کہ لکھنے کے لیے بہت کچھ ہاتھ آچکا ہے۔

دو موٹریں شام کو ہم سب کو لے کر مہاراجہ کرشن پرشاد کے محل روانہ ہو گئیں۔ بہت بڑا گیٹ' جس پر اِدھر اُدھر چار پہرے دار کھڑے تھے۔ ہماری موٹروں کو دیکھ کر انہوں نے فرشی سلام کیے۔ موٹریں آدھ میل لمبی سڑک جو بل کھاتی اندر کی طرف جارہی تھی' اس پر سے گزر رہی تھی۔ دونوں طرف شاہی باغات' اونچے لمبے سرو کے اور نہ جانے کس کس طرح کے پیڑ۔ گاڑیاں پورچ میں جاکر رکیں۔ چوب دار نے موٹر کے دروازے کھولے' پھر پیچھے پیٹھ موڑ کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ باندیاں رستہ دکھاتی ہوئی دو طرفہ چل رہی تھیں۔ پھر گیلری سے گزر کر ایک بہت بڑے کمرے میں داخل ہوئے۔ مجھے لگا کہ جیسے کسی عجائب گھر میں داخل ہو گئے۔ خواتین اس بڑے کمرے میں' مرد دوسرے میں۔ میرا ہاتھ منیر بانو پکڑے ہوئے خراماں خراماں آگے بڑھ رہی تھیں۔ صوفے کرسیاں اور تخت بھی تھا جس پر کارچوبی مسند اور گاؤ تکیہ۔ منیر نے پوچھا ادھر تخت پر بیٹھیں گی یا کرسی پر۔ میں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ منیر میری کرسی کے قریب اپنی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئیں۔ پاشی کو رانی صاحبہ (یہ ہندو تھیں) آگے کی طرف لے گئیں اور تخت پر بٹھا دیا۔ ان سے کچھ جیسے پوچھا۔ انہوں نے میری طرف اشارہ کیا۔ وہ مورنی جیسی چال کے انداز سے چلتی ہوئی آگے آرہی تھیں اور ان کے پیچھے خوان لیے ایک باندی' خوان پوش ہٹا کر مجھے ہار پھول پہنا کر بولیں۔ "بیٹی تم بڑی خوش بخت ہو کہ مولوی صاحب جیسی عظیم ہستی کی بہو ہو۔" ایک ڈبے کی طرف اشارہ کیا کہ یہ مہاراج کی طرف سے اور دوسرے کو کہا۔ یہ میری طرف سے ہے۔ کرسی کے پاس یہ ٹرے رکھوا کر باندی سے کہا کہ "جاتے وقت یہ موٹر میں رکھ دینا۔" میں نے ہاتھ اُٹھا کر آداب کیا اور شکریہ ادا کیا۔ منیر چپکے چپکے ٹھوکا دیے جائیں کہ پیٹ میں مُنڈی ڈالیے! میں ایسا کیسے کرسکتی تھی' اس حرکت کو بڑا مضحکہ خیز سمجھتی تھی۔ ہال میں بس پچیس تیس خواتین ہر عمر کی تھیں۔ ہم دونوں سے مہارانی صاحبہ نے کہا کہ ہم اب اندر والے برآمدے میں آجائیں کہ سالگرہ کا کیک کٹ جائے۔ بھابی تو پہلے ہی اپنے بھائی کے پاس اُدھر جا چکی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ کوئی چند سال کا بچہ ہو گا۔ برآمدہ بے حد چوڑا محرابوں والا تھا۔ اس کے آگے لق و دق صحن' چو طرفہ پھولوں کی کیاریاں ساتھ ہی جا بجا ہرے گھنے پیڑ۔ بیچ میں فوارہ بہت اونچا سا چل رہا تھا۔ پانی اونچائی سے گرتا ہوا خوش کن آواز پیدا کر رہا تھا۔ برآمدے میں میزیں طرح طرح کے لوازمات

سے لدالد سجی ہوئی تھیں۔ بہت بڑا ایک کیک بیچ میں رکھا ہوا تھا۔ اس کے مقابل کے حصے میں کمرے کی دیوار سے لگا ایک پلنگ نظر آیا۔ میری نگاہیں اس بچے کی تلاش میں تھیں لیکن ہر طرف سب بڑے ہی تھے۔ پلنگ کے پاس دو عدد نرسوں کو دیکھا تو نیچے جو نظر کی تو کیا دیکھتی ہوں کہ کوئی اٹھارہ یا بیس سال کا لڑکا چٹر مٹر سا سمٹا سمٹایا لیٹا تھا۔ جب مہارانی صاحبہ ایک تھالی ہاتھ میں لیے۔ جس میں تیل 'مونگ' ماش اور کچھ الابلاسی' مہارانی صاحبہ نے اس لڑکے پر سے وارنا شروع کی اور بھائی کو بڑے پیار سے اپنے بھیا کے سر پر ہاتھ پھیرتے دیکھا تو مجھے پتہ چلا کہ اس بیمار لاغر اور بے حس لڑکے کی سالگرہ ہے۔ سوچنے لگی کہ اس بیچارے کو جب کوئی حس ہی نہیں کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے تو اس تماشے کی ضرورت ہی کیا تھی؟

خیر تو کیک کاٹا گیا۔ اس کی صحت یابی کی دعائیں کی گئیں۔ میں جی کھڑی بس دیکھ رہی تھی کہ منیر نے ایک پلیٹ میں الم غلم اور ایک کیک کا پیس میرے لیے اور ایک میں اپنے لیے رکھ کر کہا چلیں اندر بیٹھ کر کھائیں گے۔ ہم دونوں آکر بیٹھ گئے۔ چائے کی پیالیاں وہیں ایک باندی ہمارے سامنے کی میز پر رکھ گئی۔ منیر نے کہا۔ "بھابی ذرا اوپر سر کرکے دیکھیں۔" "کیا؟" "دیکھیں تو" میں نے سر اونچا کرکے دیکھا تو پورے ہال کی چھت میں بے حد موٹے شیشے جو بڑے بڑے چوکور لوہے کے فریم میں جڑے ہوئے تھے۔ اس میں سے آسمان نظر آ رہا تھا۔ چاند کی تیسری چوتھی تاریخ تھی۔ وہ بھی دکھائی دیا۔ دل میں سوچا اچھا تو محل ایسے ہوتے ہیں۔ منیر بانو مجھے غور سے دیکھ رہی تھیں کہ جانے میں کیسی حیرت زدہ ہو جاؤں گی۔ مگر واہ میری والدہ کی دی ہوئی تربیت اور ان کی باتیں جو رگ رگ میں سمائی ہوئی تھیں۔ اوپر دیکھ کر ایسے نظریں نیچے کرلیں جیسے کہ میں ہمیشہ ہی ایسا دیکھا کرتی رہی ہوں۔ پھر منیر سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی۔ "اس لڑکے کو آخر ایسی کیا بیماری ہے۔ تم کہہ رہی تھیں آج اکیس سال کا ہوا ہے۔ پر یہ تو اتنا سوکھا ساکھا اور چھوٹا سا ہے۔ منیر نے کہا۔ "گھر جاکر بتاؤں گی کوئی سن نہ لے۔"

واپسی پر میں نے منیر سے پوچھا کہ مجھے پہلے کیوں نہ بتایا؟ ان کا جواب کہ کہیں آپ یہ سب سن کر آنے سے ہی انکار نہ کردیتیں۔ مہاراجہ صاحب کا بڑا اصرار ہوا کہ مولوی صاحب کی بہو کو ضرور ساتھ لائیں۔ مہاراجہ صاحب مولوی صاحب کا بے حد ادب کرتے ہیں۔ دونوں کی بہت ہی گہری دوستی ہے۔

دوسرے دن ایک تار اختر کا اور ایک مولوی صاحب کا آیا۔ جس سے یہ معلوم کرکے کہ دونوں کو میرے وجود کا شدت سے احساس ہے۔ دل میں بانسوں اچھلی۔ ان کی واپسی کے دن انگلیوں پر گنے۔ پانچ روز!

دوسرے دن پاشی مجھے ملانے پھوپھی جان کی طرف لے کر گئیں۔ ان بیچاری کو کیا خبر تھی کہ ادھر ایک ہنگامہ میرے سامنے برپا ہونے والا ہے۔ ان کی ایک حبشی لونڈی تھی۔ اس کے بچے کو گود لے لیا تھا۔ جیسا سامان بابر بھائی کے بیٹے کامران کے لیے لندن سے منگایا گیا تھا بس بالکل ویسا ہی اس کے لیے منگایا۔ دونوں بچوں کی عمریں بھی ایک سی ہی تھیں۔ یہ خود تو لاولد اور طلاق شدہ تھیں اس حبشی بچے کو گود میں لیے پھوپھی جان کھڑی تھیں۔ وہ بے تحاشا رو رہا تھا۔ ایک کونے میں اس کی حبشی ماں بیٹھی ہوئی تھی جس کے سر پر استرا پھرا ہوا تھا۔ ان کا درمیانہ قد "گدرا جسم" گورا رنگ، جو غصے میں تمتما کر سرخ ہو گیا تھا۔ پاشی نے منتری پیٹ میں ڈالنے کی کوشش کی۔ مگر کامیاب یوں نہ ہو سکیں کہ بچہ گود میں اوپر کے بجائے عین پیٹ پر تھا۔ مجھے ملانا چاہا مگر وہ تو گھور کر "زلیخا" سے کہہ رہی تھیں اٹھو اور بچے کو دودھ پلا" مگر وہ سر ہلا ہلا کر بس یہی کہے جائے تھی ماں "ابھی جی نہیں" یکبارگی زلیخا پر جھپٹ پڑیں۔ زبردستی بچے کو گود میں ٹھونسنے لگیں۔ تو اس نے بچہ ان کے ہاتھوں سے چھین کر گز بھر دور قالین پر اچھال دیا۔ میں ڈر کر پاشی سے چمٹ کر کھڑی ہوگئی۔ اب تو ان کا غصہ انتہا کو پہنچ گیا۔ لاتوں اور مکوں سے مارنا شروع کیا۔ پھر ہنٹر نما ایک چیز پکڑ کر اس کو بڑی بے دردی سے مارنے لگیں۔ اس کی چیخیں زمین آسمان کو ہلائے دے رہی تھیں۔ میں ان کی طرف بے سوچے سمجھے لپکی کہ ہنٹر ان کے ہاتھ سے چھین لوں مگر پاشی نے مجھے کھینچ کر دبوچ لیا اور کسی طور مجھے باہر لے کر آگئیں۔ میں صدمے اور غصے سے کانپ ہی نہ رہی تھی بلکہ موٹے موٹے آنسو بھی گر رہے تھے کہ ایسی بے دردی میں نے زندگی میں نہ دیکھی تھی۔ پاشی بیچاری سخت شرمسار اور کہے چلی جائیں کہ غصے میں ان کا دماغی توازن ایسا ہی ہو جاتا ہے۔ میں درحقیقت ہچکیوں سے اس طور سے رو رہی تھی کہ وہ غریب مجبور لڑکی کو اکثر اسی طرح سے پیٹا کرتی ہوں گی۔ اپنے کمرے میں اگر

یاد آنے لگے۔ دل کو دلاسا دوں کہ بس چار روز مجھے اس زنانے گھر میں اور کاٹنا ہیں مگر اس عرصے میں منیر بانو کی انسانیت اور خوبیاں مجھ پر ایسی عیاں ہوئیں کہ بڑی دوستی ہو گئی جو آج تک ہے۔ اس وقت میں کہاں یہ سوچ سکتی تھی کہ اتنی نخروں پلی' نازوں میں بگڑی سی لڑکی ایک عظیم اور بہادر ہستی کے طور پر ابھرے گی۔ ان کے میاں ہمارے مسعود بھائی جو ان کے چچا کے بیٹے تھے ان سے بیاہی گئیں۔ منیر بانو ایک بچے کی ماں بن چکی تھیں۔ پاکستان بنا تو بڑے عزم کے ساتھ' جذبے سے سرشار پاکستان کی خدمت کرنے سب کچھ چھوڑ چھاڑ' نوابی ٹھاٹ باٹ کو لات مار یہاں آگئے۔ باقی بچے ان کے پاکستان میں ہوئے۔ انہوں نے ڈگری آکسفورڈ سے میتھمیٹک آنرس میں لی۔ حیدر آباد دکن میں آتے ہی لکچرار لگے اور جلد ہی پروفیسر ہو گئے۔ یہاں آکر اس مملکتِ خداداد میں جو گل کھلتے دیکھے' لُوٹ کھسوٹ اور بے ایمانی کا بازار گرم دیکھا تو اس جذبۂ خدمت سے ان کے مخلص اور حساس دل پر کچھ ایسا اثر پڑا کہ جو جگہ ان کو کالج میں مل گئی تھی اس کو چھوڑ چھاڑ دنیا سے کنارہ کش ہو کر ایک درویش بن گئے۔ ناظم آباد پہلی چورنگی کے ایک ننھے سے گھر میں جو مسجد سے ملا ہوا تھا۔ ایک چٹائی برآمدے میں بچھا اس پر بیٹھ گئے۔ منہ کو چُپ لگ گئی۔ اسی پر بیٹھ کر کھا لیا۔ اسی پر نماز پڑھ لی اور اسی پر سو گئے۔ اخبار بے شک پڑھتے اور پھر اپنا سر گھٹنوں پر رکھ کر گھنٹوں بیٹھے رہتے۔ دنوں کسی سے بات تک نہ کرتے' مگر اس عظیم خاتون اور اپنی پیاری دوست کو میرا سلام کہ کس طور پر مردانہ وار حالات کا مقابلہ کیا۔ اسکول میں پڑھاتیں' گھر پر ٹیوشن لیتیں۔ شوہر کی سیوا الگ کرتیں۔ پانچ بچوں کی ماں اور ان کا باپ بھی بن کر بڑی خودداری مگر شاہانہ شان کے ساتھ سر اُٹھا کر زندگی کے اس رخ کی منزلیں ہنس ہنس کر طے کرتی رہیں۔ سب بچوں کو اعلیٰ تعلیم اور انسانیت کے جوہر سے آراستہ کرتی رہیں۔

ایک دن مولوی صاحب کا ایک خط ان کا ڈرائیور مجھے دے گیا جس میں انہوں نے منیر بانو کے پاکستان آنے کی خبر دی اور پتہ لکھا اور یہ بھی لکھا کہ ان کو خود یہ پتہ ایک دھوبی کے ذریعے ملا تاکید کی کہ میں فوراً جا کر ان سے ملوں۔

میں فوراً ہی ناظم آباد گئی۔ پہلے میں کیا دیکھ چکی تھی۔ آج کیا دیکھا؟ رونے لگی منیر بانو سے لپٹ کر' منیر بانو ہنس ہنس کر کہیں۔ "حمیدہ پاگل مت بنو۔ ذرا ان بچوں کو اپنے

پاؤں پر کھڑا ہو لینے دو۔ جب تمہاری سمجھ میں آئے گا اور شاید یہ سوچو کہ قدرت کو یہ سب اس لیے کرنا ہوا کہ اس کی منشا یہ تھی کہ سب بہترین انسان بنیں اور علم کی دولت سے آراستہ ہوں۔ تم غم اور فکر کیوں کرتی ہو۔ میں تنہا نہیں کہ آمنہ ممتاز جیسی ہستی ہاتھ میں علم کی شمع لیے میرے آگے آگے مجھے راستہ دکھاتی چل رہی ہیں۔ ان کی دکھائی علم کی روشنی ہر وقت میرے اور میرے بچوں کو گھیرے ہوئے ہے۔ ان کے پاؤں کی دُھول بھی' اگر یہ سب بن سکے تو ضرور کامیابیاں اور خوش بختی ان کے قدموں میں پڑی ہوگی۔"

میرے چہرے سے شاید ان کو اندازہ ہوا کہ آمنہ ممتاز کون ہیں؟ میں سمجھ نہیں سکی ہوں۔ "ارے بھئی یہ وہی تو ہیں تمہارے بہنوئی ذکاء اللہ خان کی چھوٹی بہن۔ اس بہن نے علم کا پرچم بلند کیا۔ اسی علاقے میں جہاں تاریکی ہی تاریکی تھی اِسکول کھول اپنی جوانی کی بھینٹ چڑھا دی۔ عذرا بٹ اور زہرہ سہگل اداکاری کی دنیا میں نام روشن کرتی رہیں اور بڑی آپا ہاجرہ احمد نے تو اپنی زندگی کمیونزم کے نام کر دی۔ بھئی واہ چچا ممتاز اللہ نے بھی کیا ایک سے ایک بڑھ کر بیٹیاں پائیں۔ بیٹے ملے تو بھائی ذکاء اللہ اور اکرام اللہ جیسے۔

—○—
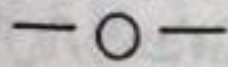
پریم بدادیوی

جمیل بھائی آپ کا واپس کردہ رجسٹر صاف کر رہی ہوں۔ صبح جب اخبار پر نظر پڑی کہ آپ کو "ہلالِ امتیاز" اور بھائی مشفق خواجہ کو "تمغۂ حسنِ کارکردگی" ملا ہے تو ایک دم اختر جیسے سامنے کھڑے مسکراتے نظر آئے کہ ان کے دو دوستوں کو جس اعزاز کے وہ حق دار تھے، ملنے پر وہاں سے خوش ہو رہے ہیں۔ پھر نیچے نظر پڑی کہ میرے بھانجے کامل ممتاز کو بھی "ستارہ امتیاز" ملا۔ میری بہن خدیجہ اور ذکن بھی اوپر سے خوش ہو رہے ہوں گے۔۔ہاں کامل ممتاز نے "اسلامک آرکی ٹیکچر پاکستان میں" پر جو کتاب لکھی ہے وہ ضرور دیکھیے گا، کس قدر اعلیٰ اور خوب صورت ہے۔ اس موضوع پر پاکستان میں یہ پہلی کتاب ہے۔ یوں تو ان کو کئی ایک آغا خاں ایوارڈ مل چکے ہیں۔ ساتھ ہی مجھے وہ دن بھی یاد آرہا ہے جب اختر کا نام "ستارۂ امتیاز" کے لیے اخبار میں چھپا تھا اور ہمارے لڑکے اپنے ابا سے یہ کہے جاتے "آپ ہرگز مارشل لا گورنمنٹ کا دیا ہوا ایوارڈ نہیں لیں گے۔" ہنس کر جواب دیا تم سب دو باتوں کو بھول کیوں جاتے ہو، حکومت اور ملک اور اس کے لوگ الگ چیز ہیں۔۔ نہ میں نے مانگا نہ واپس کروں گا۔ یہ مارشل لا حکومت کا دیا ہوا نہیں اس کے لیے ہمارے ملک کے دانشوروں نے انتخاب کیا ہے۔ مجھے تم سب یہ بتاؤ کہ اپنے ادیبوں کی کون کون سی کتابیں تم نے پڑھیں اور کس کس شاعر کا کلام؟" ان سب کی گردنیں شرم سے جھک گئیں۔۔

منیر بانو کے سب بچے علم اور انسانیت کے زیور سے ایسے آراستہ ہوئے کہ لوگ عش عش کرنے لگے۔ اگر ان کا ایک بیٹا ۲۸ سال کا شکیل جو اعلیٰ عہدے پر فائز تھا اور جس کی شادی جسٹس قدیر الدین اور میری دوست نور کی بیٹی عائشہ سے ہوئی تھی ہارٹ فیل ہو کر ایک منٹ کے اندر اندر اللہ کو پیارا نہ ہوتا تو منیر بانو دنیا کی سب سے خوش قسمت ماں ہوتیں۔ سب ذمے داریوں سے نمٹ کر ہر جگہ آنے جانے لگی تھیں۔ جب بھی ہمارے

گھر آجاتیں تو مجھ سے زیادہ اختر خوش ہوتے کہ منیر تم ہی تو میری ایک بہن ہو۔ ان کی مسکراہٹ ان کے چہرے کا ایک حصہ اور ہنسی اور قہقہے ان کی عادت جو پہلے دن میں نے دیکھی تھی وہی ہمیشہ دیکھی۔

جمیل بھائی! آپ کو کوفت ہو رہی ہوگی کہ میں کدھر کا ذکر کرنے بیٹھ گئی۔ پر میں اس عظیم ہستی کا ذکر کیسے نہ کرتی۔ انسان کی اصل کسوٹی یہ ہے کہ جب اس پر کڑا وقت پڑے تب سر اٹھا کر ہمیشہ حوصلے کے ساتھ ہنس ہنس کر اس کا مقابلہ کرے اور حوصلوں کو نہ کرنے چلا جائے۔ ایسے لوگ تو "روشن مینار" کہلانے کے مستحق ہوتے ہیں اور اختر نے چھٹی کھو جانے پر ایسا ہی کیا۔

اللہ اللہ کر کے یہ چار روز بھی گزر گئے۔ اسٹیشن سے سیدھے مجھے لینے اختر اور مولوی صاحب آگئے۔ میں تو صبح سے سوٹ کیس لیے بیٹھی تھی۔ مولوی صاحب موٹر میں بیٹھے کہہ رہے تھے۔ جلدی جلدی سوٹ کیس بعد میں آجائے گا۔ اختر نیچے اتر کر آگئے۔ ہاشمی کو بعد سلام کے ان کا شکریہ ادا کیا۔ معاف کیجیے کچھ دیر بیٹھ نہیں سکتے، مولوی صاحب کو گھر پہنچنے کی جلدی ہے۔ سفر سے تھک بہت گئے ہیں۔ ہاشمی مولوی صاحب کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھیں۔ ان کو ذرا برا نہ لگا۔ ان کو موٹر کے پاس آکر جھک کر آداب کیا اور مجھے گلے لگا کر خدا حافظ کہا۔ میں کس قدر خوش کہ شکر خدا کا اپنے گھر سیدھے سادے ماحول میں واپس جا رہی ہوں۔

مولوی صاحب کچھ دیر میں خود ہی ہنسنے لگے۔ جب پوچھا بات کیا ہوئی جو یوں ہنس رہے ہیں۔ بولے اس لیے کہ تمہارا دل بے شمار خواتین سے بھر تو گیا ہوگا۔ جواب دیے بغیر نہ رہ سکی کہ "شوق تو آپ کا اور اختر کا تھا کہ جلدی سے جا کر ایک پارسل کی طرح کسی کے گھر چھوڑ آئیں، پھر بھاگے بھاگے آکر اس کو بڑی عجلت میں لے بھی آئیں۔ آپ نے تو اترنے کی زحمت بھی نہ کی۔"

رستے میں پوچھا آپ دونوں کا سفر کیسا گزرا اور کانفرنس کیسی رہی؟ کچھ تو دنیا سفر اور کانفرنس کی باتوں کو، کچھ اپنا سناؤ، کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔ سب نے تمہارا خیال رکھا؟ منیر بانو بے دا اچھی لڑکی؟ ان سے دوستی تو ہو گئی ہوگی۔ اچھی بے شک ضرور ہیں پر ایک لڑکی ہو کر اپنی ظرافت بہت کراتی ہیں۔ بڑے نخرے اور ناز برداریاں کرواتی ہیں۔ "بھئی یہ

نہ بھولو کہ حیدر آباد ریاست ہے' یہاں کے رئیسوں اور نوابوں کے طور طریق ایسے ہی ہوتے ہیں۔" مجھے ایک دَم سے مہاراجہ کرشن پرشاد کے ہاں جانا یاد آ گیا۔ پوری تفصیل سے آنکھوں دیکھا حال سنایا تو مولوی صاحب نے اختر سے مخاطب ہو کر کہا۔ "بھئی پشاور جانا تو اپنی بیوی کو بازار قصّہ خوانی ضرور لے جانا اور کسی چوراہے کے کونے میں بٹھا کر زور کی آواز لگانا "آج ایک عورت قصّہ خواں آئی ہے۔ جس کو شوق ہو آ کر سن لے۔" اختر بے اختیار ہنس پڑے۔ میں جَل بھن گئی کہ "یہ خوب رہی پہلے تو سعادت مند بیٹے سے کہا کہ بیوی کو فلاں جگہ چھوڑ کر چلو میرے ساتھ اور بیٹے نے خود چھوڑ کر آنے کی بھی زحمت نہ کی بلکہ کسی اور کے ہاتھ چھڑوا دیا۔ اب آپ ارشاد فرما رہے ہیں کہ پشاور جا کر بازار قصہ خوانی میں چوراہے پر بٹھا کر قصہ گوئی کروانا اور کچھ بعید بھی نہیں کہ آپ کے فرماں بردار بیٹے ایسا کر ہی گزریں۔ اختر کچھ کھسیانے سے ہو گئے۔ شاید شرمندگی ہوئی اس روز مجھے چھوڑنے خود نہ آئے۔ مولوی صاحب بگڑ کر بولے "اب ہم سمجھ گئے کہ میں غیر ہوں۔" مجھے اپنے اس جملے پر افسوس ہوا کہ ایسا کیوں کہا' پر اب بات تو منہ سے نکل ہی چکی تھی۔ فوراً" ہی بات کو دوسری طرف گھما دیا کہ "وہ آپ کو یاد ہے نا کہ دس دن تو گزر گئے۔ قاضی صاحب سے اب کُتے کا بچّہ لیا جا سکتا ہے پر ان کی بیگم صاحبہ اس کو اپنے جُدا کیوں کرنے لگیں؟" تن کر جھٹ بیٹھ گئے۔ "وہ دیں گی کیسے نہیں؟ میں خود شام کو تم کو لے کر ان کے ہاں چلوں گا۔" میں نے بڑا سوکھا سا منہ بنا کر کہا ایک بڑی مشکل تو یہ ہے کہ فرض کیجیے وہ مان بھی جائیں مگر یہ آپ کے اختر تو راضی نہیں' ہم لا کیسے سکتے ہیں؟ اس بات پر ہم دونوں اس کو ضرور لائیں گے۔ اختر بولے۔ "دیکھیے میں برابر ان کو منع کرتا رہا ہوں۔ مجھے کتوں سے نفرت ہے اور آپ بھی اچھی طرح سُن لیں۔" "تمہاری بات ہم کیوں سن لیں؟ حمیدہ کی اور اپنی خوشی کیوں پوری نہ کریں۔" میں نے اور اختر نے خوب ایکٹروں والا پارٹ ادا کیا اور ہمارے بھولے سے مولوی صاحب کو ذرا شک بھی نہ ہوا۔

گھر آ کر دونوں نہا دھو کر یوں تازہ دَم ہو گئے جیسے کسی لمبے سفر سے آئے ہی نہ تھے۔ شربت پی کر مولوی صاحب نے چند کش پیچوان سے لگائے اور حکم صادر کیا کہ جاؤ اٹھو اپنے دفتر میں جاؤ اور میں بھی

میری طرف معذرت خواہ نظروں سے دیکھا۔ جق اٹھا کر اپنے دفتر میں چلے گئے۔ مولوی صاحب جھٹ سے اپنے کمرے میں گئے۔ دو ڈبّے ساریوں کے لیے مسکراتے ہوئے آئے کہ ایک تمہارا مچھلی پکانے کا انعام اور ایک دس دن وہاں رہنے کا۔ وہ دے کر چلتے چلتے ادھر نظر دوڑائی کہ اختر تو نہیں آ رہے' بولے۔ "اب تماشہ شام کو دیکھنا کہ باگڑ بِلا کیسا اُچھلے کُودے گا۔" میں کچھ نہ سمجھ سکی کہ آخر کون باگڑ بِلا یہاں شام کو آجائے گا اور اُچھلے کودے گا۔ "حد کرتی ہو اپنے میاں کو نہیں جانتیں؟" اچھا تو ایک نام اختر کا یہ بھی ہے۔ یہ کہہ کر خود باہر چلے گئے۔ میں نے کمرے میں آ کر دونوں ڈبّے کھولے' دونوں میں ساریاں۔ ایک چک کی کریم رنگ جس کا بارڈر پلّو اودے رنگ کا۔ دوسری بھی مدراسی ہلکے فیروزی رنگ کی' تیز فیروزی بارڈر اور پلّو۔ چوڑی ساری پر مور کی شکل کی چھوٹی چھوٹی بوٹیاں۔ دونوں کے ساتھ بلاؤز کا کپڑا۔ ایک ساری کے ڈبّے میں اس کے ساتھ کا بیگ بھی۔ میں خوش ہو کر سوچنے لگی کہ جانے اختر کیا لائے ہوں گے؟ مگر کیسی جلدی دفتر میں گھس گئے' پہلے تحفہ نہ دینے کا سوچا۔ چلوں پہلے کپڑے ان کے سوٹ کیس سے نکال دوں۔ میلے دھوبی والے ڈبّے میں ڈال دیے اور صاف خانے میں سوٹ ٹانگ دیے۔ سوٹ کیس میں سے ایک ڈبّہ بھی نکلا۔ یقیناً ساری ہی ہوگی کھول کر دیکھی تو نہیں۔ اس کو بھی اسی میز پر رکھ دیا جس پر مولوی صاحب والے ڈبّے رکھے ہوئے تھے۔ کافی دیر سوچ میں رہی کہ آخر یہ دو ڈبّے دے کر کیا کہا تھا کہ اب شام کو دیکھنا باگڑ بِلا کیسا اُچھلے کودے گا۔ سوچ سوچ کر آخر صحیح نتیجے پر پہنچ گئی کہ ضرور دوسری ساری مولوی صاحب اختر سے خفیہ منگا کر لائے ہیں۔ میں نے یہ کیا کہ وہ ڈبّے ساریوں کے جو مجھے تحفے میں ملے تھے۔ اختر کے ڈبے کے نیچے رکھ دیے۔ جیسے ہی شام کو اختر کمرے میں آئے ان کو بتا دیا کہ جب ہم تینوں چائے پی رہے ہوں تو وہ یہ تینوں ڈبے مجھے ان کے سامنے لا کر دیں۔ پھر مولوی صاحب کی کھسیاہٹ دیکھیں گے کہ ان کے اختر کو جلانے والے مذاق پر کیسا پانی سا پھر جائے گا اور یہی ہوا' چائے پیتے پیتے اختر کمرے میں اٹھ کر گئے اور تینوں ڈبّے لے کر آ گئے کہ "حمیدہ بیگم ذرا ان ساریوں کو کھول کر دیکھیں۔ آپ کو جانے پسند آتی ہیں یا نہیں؟" مولوی صاحب نے جھپٹا مار کر تینوں ڈبے ان کے ہاتھ سے چھین لیے اور جھنجھلا جھنجھلا جھٹ کھول کر دیکھنے لگے' وہ تحفے والی ساریاں بھی مدراسی سِلک کی تھیں۔

آنکھوں سے مجھے دیکھ کر بولے۔ "یہ تمہارا میاؤں بڑا دھوکے باز ہے۔ ہم دونوں تو ساتھ گئے تھے اور ایک ایک ساری خرید کر لائے تھے۔ اس نے یہ دو اور کیسے اور کب لے لیں۔" اختر نے کہا جس ذریعے سے آپ نے ایک اور منگائی' میں نے دو منگا لیں۔ بچوں جیسی اداسی ان کے چہرے پر چھا گئی۔ اختر ہنس ہنس کر کے جائیں مولانا کی پکی ہو گئی۔ ایسے موقعوں پر مجھ کو دونوں ہی معصوم چھوٹے بچے لگتے۔

چائے پی کر حکم صادر ہوا کہ آج صرف میں اور تم قاضی صاحب کے ہاں جائیں گے۔ اختر تم مدراس کی کانفرنس کی رپورٹ فوراً" لکھنا شروع کر دو تو "اردو" کے اسی پرچے میں چھپ جائے گی۔ اختر کو تو کام کرنے کا عشق سا تھا۔ وہ اپنے دفتر میں جا بیٹھے اور ہم دونوں قاضی صاحب کے ہاں گئے اور کتیا کا بچہ لے کر واپس آئے تو اختر نے آنکھ اٹھا کر بھی اس کو نہ دیکھا۔ ہاتھ سے یوں اشارہ کیا جیسے کہہ رہے ہوں ہٹاؤ ہٹاؤ اس کو۔ پہلی بار گھوڑا ماں سے جدا ہوا تھا' رستے بھر اور گھر آ کر چیاؤں چیاؤں کی سی آوازیں نکالتا رہا۔ مولوی صاحب گود میں بٹھائے اس کی شکل جھک جھک کر دیکھتے اور کہتے ذرا دیکھو تو کیسا بھولا ہے۔ سخت فکرمند کہ اگر برتن سے دودھ نہ پیا تو کیسا لاغر اور کمزور ہو جائے گا۔ گھر آتے ہی محبوب سے برتن میں دودھ ڈلوایا اس کو نیچے رکھا خود دور ہو بیٹھے اور مجھ سے بھی کہا کہ دور کھڑی ہو جاؤ۔ وہ ہلکے ہلکے رینگتا ہوا برتن تک جا کر برتن سے دودھ پینے لگا۔ بات یہ تھی کہ بچی نے اس کو کئی دن سے ماں سے علیحدہ کر رکھا تھا' برتن میں دودھ دینا شروع کر دیا تھا۔ بڑے خوش ہو کر کہا۔ "یہ بات ہوئی۔ ہے نا اچھی نسل کا فوراً" سمجھ گیا کہ اس کا گھر بدل گیا ہے' جلدی ہی ماں اور بہن بھائیوں کو بھول جائے گا۔ بالکل تمہاری طرح" اور جھٹ منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ پھر بولے تم برا تو نہیں مانیں' میرا مطلب یہ تھا کہ جب کسی کو جگہ بدلنی پڑ جاتی ہے تو اگر وہ سمجھ دار' ہوشیار ہے تو نئے ماحول میں اپنے کو ڈھال لیتا ہے۔ "شکر ہے آپ نے ایک جاہل کو سمجھ دار تو مان لیا اور رہا برا ماننے کی بات تو ساری مشکل یہ آن پڑی ہے کہ آپ دونوں کو یہ جو یقین ہو گیا ہے کہ یہ ٹھسری موٹی کھال کی' کسی بات کا برا مان ہی نہیں سکتی!"

اب رات کے کھانے کے بعد بچے کے نام کا مسئلہ زیر بحث رہا۔ بہت سے نام اختر تجویز کرتے جو ان کو پسند نہ آتے اور مولوی صاحب جو تجویز کرتے تو اختر کو نہ بھاتے۔ پھر

میں ایک دم بول پڑی کہ "نازی" کیسا رہے گا؟ دونوں نے فوراً" اس نام پر رضامندی کا اظہار کر دیا۔ مولوی صاحب بڑے خوش ہو کر بولے۔ اس کی میں ٹریننگ کروں گا کہ تم اس سے ڈر کر ایسے کانپ جایا کرو گے جیسے یورپ والے نازی کے نام سے کانپ اٹھتے ہیں۔ "اجی صاحب وہ کوئی اور کانپنے والے ہوں گے میں تو آپ سے نہ کانپا نہ ڈرا تو نازی سے کیا ڈروں گا اور میں تو اب آپ کی ضد پر سروجنی نائیڈو کی بلی کا بچہ لا کر ضرور ہی پالوں گا اور اس کی ٹریننگ ایسی کروں گا کہ بس آپ کے پاؤں اپنے پنجوں سے خوب نوچا کرے۔" مولوی صاحب نے جل کر کہا "مجھے تم سے اس سے زیادہ کی امید ہے۔ تمہارا بس چلے تو مجھ کو شیر کے پنجرے میں ڈال دو' مگر میں دروازہ کھول کر شیر کو تمہارے پیچھے دوڑا دوں گا۔" یوں دونوں کی گرماگرم بحث دیکھ کر میں نے بیچ بچاؤ کے لیے کہا "ذرا دیکھیے نازی کیسی کوشش آپ کے پاس آنے کی کر رہا ہے' مگر چکنے فرش پر اس کے پنجے پھسل جاتے ہیں اور وہ غریب چاروں خانے چت گر جاتا ہے۔" بڑے پیار سے آگے بڑھ کر اسے اٹھا لیا اور اپنی گود میں بٹھا کر سہلانے لگے۔

رات کو مولوی صاحب نے بتایا کہ "شام کو سروجنی نائیڈو کا ڈرائیور ان کے نام ایک پرچہ دے گیا تھا۔ انہوں نے تم کو کل لنچ پر بلایا ہے جس کے لیے مجھ سے اجازت طلب کی ہے۔۔ دیکھو کیسی چالاک ہیں کہ اختر سے نہیں کہا۔ ان کی موٹر کل گیارہ بجے لینے آئے گی۔ چلی جاؤ تو ٹھیک ہے اور نہ جانا چاہو تو موٹر واپس کر دینا۔" میں سوچنے لگی کہ یہ کیا بات ہوئی۔ ہم دونوں تو ہر جمعہ کو بابا کے ہاں جاتے ہیں اور ان سے بھی ملاقات ہوتی ہے۔ کیسی وضع دار ہیں۔ اختر سے نہ پوچھ کر مولوی صاحب کی اجازت چاہی کہ گھر کے بڑے وہ ہیں۔ پوچھا۔ "آپ کی اگر رائے ہو تو چلی جاؤں۔" خوشی سے اجازت دے کر بولے۔ "بھئی تمہاری زندگی کا ہر روز شام تک یوں گزرتا ہے۔ برآمدے سے کمرے میں یا کمرے سے برآمدے میں۔

منگل کی صبح گیارہ بجے موٹر مجھے لینے آئی۔ میں ان کے ہاں چلی گئی۔ وہ مجھے باغ میں گشت کرتی مل گئیں۔ اندر اپنی اسٹڈی میں بٹھایا اور بیرے سے کہا شربت کے دو گلاس دے جائے اور اگر کوئی ملنے آئے تو کہہ دینا میم صاحب گھر پر نہیں ہیں۔ صوفے کے ایک طرف اپنے پاؤں اوپر کر کے پھسکڑا مار کر بیٹھ گئیں۔ مجھے بھی صوفے پر اپنے نزدیک بٹھا کر

کہا۔ "ابھی تم بھی پاؤں اوپر کرکے آرام سے بیٹھ جاؤ۔" ان کے پاس کی میز پر ایک پھول
دان میں تازہ تازہ مختلف طرح کے پھول' چند ہری ہری ڈنڈیاں مع پتوں کے اور کچھ
سوکھی ٹہنیوں کی پتلی ڈنڈیاں' کچھ اونچی' کچھ ادھر کو جھونک کھاتی ہوئی جاپانی سی' لگی دیکھ
کر سوچا یہ آج انھوں نے خود سجایا ہے۔ ورنہ کسی مالی یا نوکر کے بس کی تو یہ سجاوٹ ہو
نہیں سکتی۔ بیرا شربت کی ٹرے لے آیا تو اس سے کہا۔ کمرے کا دروازہ بند کردے۔
پھول دان کے پاس بہت سے مخطوط انگریزی میں لکھے' جو خاصے پرانے لگ رہے تھے۔
روشنائی پھیکی پڑ چکی تھی۔ ان خطوں پر ہاتھ رکھ کر بولیں "حمیدہ آج میں بڑی عجیب سی کچی
کہانی سناتی ہوں۔ یہ کہاوت سچ معلوم ہوتی ہے کہ ڈھونڈنے والے کو خدا بھی مل جاتا
ہے۔ تم کو جس بات کے معلوم کرنے کی سخت جستجو تھی وہ آج تم کو معلوم ہو جائے گی تو لو
سنو۔

"تم کو تو یہ معلوم ہے کہ میری تعلیم آکسفورڈ یونیورسٹی میں ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ
لڑکیاں تو کجا لڑکے بھی بہت کم ہی ہندوستان سے انگلستان پڑھنے جاتے تھے۔ مجھے وہاں پہنچ
کر اپنے ملک اور گھر کی یاد بری طرح ستانے لگی۔ کلاس میں نہ کوئی ہندوستانی لڑکی تھی نہ
کوئی لڑکا۔ میری طرف ہر کسی کی نظریں یوں اٹھتیں جیسے میں کوئی عجوبہ شے ہوں' بڑا
ناگوار لگتا۔ ہوسٹل میں بھی بس ایک میں ہندوستانی لڑکی تھی۔ تیسرے دن ایسا ہوا کہ
ہمارے پروفیسر کے ساتھ ایک بنگالی لڑکی' دبلی پتلی' چمپئی رنگت' تیکھے ناک نقش' لمبا قد'
بڑا سا جوڑا باندھے' بندیا لگائے' پُروقار چال کے ساتھ ہمارے کلاس روم میں ان کے
ساتھ داخل ہوئی۔ سارے طلبہ کی نگاہیں ان پر ٹک سی گئیں۔ ہم سب کو یہ کہہ کر ملوایا
کہ یہ پریم بدا دیوی ہیں' بنگال سے تعلق رکھتی ہیں اور سروجنی کی طرح یہ بھی شاعرہ ہیں
اور سیاست سے بھی بہت گہرا لگاؤ ہے۔ پھر کیوں نہ ان کو سروجنی کے برابر والی کرسی دے
دی جائے۔ ایک لڑکے کو اٹھوا کر برابر کی کرسی ان کے لیے خالی کروا دی اور اپنی جگہ آکر
لیکچر دینا شروع کر دیا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو سر تا پاؤں دیکھنے کے بعد لیکچر سننا
شروع کر دیا۔

کمرے سے باہر نکل کر ہم یوں باتیں کرنے لگے جیسے ہمیشہ سے ایک دوسرے کو جانتے
ہوں۔ میرے کمرے میں ایک پلنگ خالی تھا۔ اس لیے پریم بدا کو اپنے کمرے میں رکھ لیا۔

کبھی ہم دونوں اپنے مضمون کی باتیں کرتے کبھی اپنے دیس کی۔ ہم دونوں ہی کو سیاست
سے گہری دلچسپی تھی' ملک کو آزاد کرانے کا جذبہ' انگریز سے نفرت بھی ساتھ ہی اس کی
خوبیاں بھی ہماری نظر میں تھیں کہ یہ اپنے ملک' اپنی قوم اور اپنی زبان پر کس قدر نازاں
ہیں۔ محنت' عزم اور علم کے بَل بُوتے پر آدھی دنیا پر حکومت کر رہے ہیں۔ پریم بدا کی
ذہانت اور قابلیت سے میں چند روز ہی میں مرعوب ہو گئی۔ میں تو صرف ایک شاعرہ تھی
اور یہ بڑے پائے کی ادیب بھی۔ ہر ہفتے دو چار بنگلہ کے اخباروں کے لیے مضمون لکھ کر
بھیجا کرتیں۔ مختلف رسالوں کے لیے نظمیں۔ یہ انگریزی اور بنگلہ دونوں زبانوں میں لکھا
کرتیں۔ مجھے دل میں بڑی شرم آتی کہ میں اب تک صرف انگریزی ہی میں لکھتی رہی
ہوں۔

پریم بدا اپنے ماں باپ' جو لکھ پتی تھے ان کی اکلوتی بیٹی ہونے کی وجہ سے بجائے کوئی غرور'
ٹھسّا' نخرہ یا اتراہٹ کے انداز لیے ہوئے محسوس ہوتیں۔ اس کے برعکس سادہ مزاج'
نفاست پسند' سادگی کے ساتھ لیے دیے' پُروقار شخصیت کی حامل تھیں اور میں ڈھیر سے
بہن بھائیوں اور درمیانہ طبقے سے تعلق رکھنے والی ان جیسی نہ تھی۔

ہم دونوں آکسفورڈ یونیورسٹی میں نمایاں جگہ اپنی تقاریر اور پوئٹری کی وجہ سے پا گئے۔
وہاں کے اسٹیج ڈراموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے اور مباحثوں کے موقع پر ہم دونوں کا
پلّہ بھاری رہتا۔ ہماری دوستی کی گہرائی کی کوئی حد نہ تھی۔ دو سگی بہنوں میں بھی ایسی محبت
شاید نہ ہو سکے جو ہم دونوں کے درمیان تھی۔ وہ پیار ہم دونوں میں آج تک اسی طرح
ہے۔ ہم دونوں نے نمایاں کامیابی سے بی۔ اے کر لیا۔ پریم بدا ہندوستان کے لیے اور میں
چار ماہ یورپ کی سیر کی نیت سے روانہ ہو گئی۔ اس چار ماہ کے دوران ہم دونوں کی خط و
کتابت نہ ہوئی۔ جب میں واپس گھر آئی تو پریم بدا کا ایک موٹا سا خط میرے نام آیا رکھا
ملا۔ جس میں لکھا تھا کہ دورانِ سفر ان کی ملاقات رائے بہادر تارا ناتھ بنرجی سے ہوئی اور
دونوں کو کسی مقناطیسی طاقت نے ایک دوسرے کی طرف کھینچ لیا۔

بنرجی نام پر میں چونک پڑی۔ اب بڑی توجہ سے ان کی کچی کہانی سننے لگی۔ وہ کچھ دیر
کے لیے خاموش ہو بیٹھیں۔ مجھ سے نہ رہا گیا پوچھا "ہاں تو پھر کیا ہوا؟" ان کی نگاہیں خلا
میں جیسے کچھ دیکھ رہی تھیں اور اداسی صاف نظر آ رہی تھی۔ ذرا چونک پڑیں اور مجھے

بتانے لگیں کہ پریم بدا نے مجھے لکھا کہ تارا ناتھ بنرجی خود بھی بیرسٹر ہیں اور اپنے والد بیرسٹر رائے بہادر سر آسوتوش بنرجی جو کافی عرصہ کلکتہ یونیورسٹی میں وائس چانسلر بھی رہ چکے ہیں، ان کی جمی ہوئی پریکٹس میں شامل ہو کر کام کرتے ہیں۔ یہ بھی اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے ہیں۔ چند بار ہم دونوں کی ملاقات ہوئی اور یہ فیصلہ کر لیا کہ شادی کریں گے۔ میں تو بہت چاہتی تھی کہ شادی تمہاری واپسی پر ہو، مگر تارا ناتھ بنرجی کو بہت عجلت تھی کہ شادی جلد سے جلد ہو جائے۔ میرے والدین نے یہ رشتہ خوشی خوشی منظور کر لیا۔ تین ماہ ہوئے ہم دونوں کی شادی ہو گئی۔ تم جلد کلکتہ آؤ، ان سے ملو تو یقیناً" میرے انتخاب کی داد دو گی۔ فی الحال تو میں تم سے اتنا ہی کہوں گی کہ ہم ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ ایک دوسرے کو پورے طور سے سمجھتے ہیں اور پورا بھروسہ رکھنے کی وجہ سے ہر ہر منٹ خوش اور مگن ہیں۔"

اس خط کو ایک طرف رکھ کر دوسرا خط ہاتھ میں اٹھا لیا۔

کچھ ہی ہفتوں بعد میں کلکتہ گئی۔ تارا ناتھ سے مل کر دل خوش ہی تو ہو گیا۔ بڑے خوش شکل، روشن دماغ، بامذاق شخصیت کے مالک، کانگریس کی میٹنگ میں شرکت کر کے واپس حیدرآباد آئی اور چند ماہ بعد میری بھی شادی ہو گئی۔

میری دوست اس خط میں اطلاع دیتی ہیں کہ خدا نے ان کو چاند سا بیٹا دیا ہے جس کا نام منوہر ناتھ بنرجی رکھا ہے۔ پھر بڑے اصرار سے مجھے کلکتہ آنے کو لکھا، مگر میں تو خود بچے کی ماں بننے والی تھی، کافی طبیعت خراب رہتی تھی۔ سفر کر ہی نہ سکتی تھی۔ پریم بدا دو ماہ کا پیارا گڈا سا بیٹا لے کر آئیں۔ ایک ہفتہ رہ کر واپس کلکتہ چلی گئیں۔ اس دوران انہوں نے مجھے بتایا کہ بنرجی صاحب آج کل اردو، فارسی بڑے زور شور اور شوق کے ساتھ سیکھ رہے ہیں۔ ان کو اپنے کیسوں کے سلسلے میں اکثر اردو سے واسطہ پڑتا ہے تو بہت شرمسار ہوتے ہیں کہ وہ اپنے دیس کی دوسری سب سے بڑی زبان سے بے بہرہ ہیں۔ فارسی ساتھ ہی ساتھ یوں شروع کر دی تاکہ اچھی قسم کی اردو پر مہارت حاصل کر سکیں۔ ان کا خود بھی ارادہ ہو رہا ہے کہ بس بچے ایک سال کا ہو لے تو وہ بھی اردو سیکھنا ضرور شروع کر دیں گی۔

یوں چند سال گزر گئے۔ ہم دونوں اپنی اپنی جگہ آزاد پنچھی تھیں۔ دونوں کو ہی شوہر

ایسے ملے کہ ان کو ہماری کسی بات پر کوئی اعتراض ہی نہ تھا۔ ہم دونوں کبھی دہلی کبھی بمبئی، گاہے مدراس، کبھی الہ آباد یا کلکتہ کی ہر کانگریس کی میٹنگس میں شرکت کرتے۔ یوں جلد جلد ایک دوسرے سے ملاقاتوں کا سلسلہ رہتا اور خط و کتابت تو ہوتی ہی رہتی۔ پریم بدا اپنی بنگالی کی نظموں کا گاہے گاہے انگریزی میں ترجمہ کر کے بھیج دیتیں۔ مجھے لوگ "بلبل ہند" کے نام سے پکارنے لگے تھے۔ میں یہی سوچا کرتی کہ پریم بدا کے سامنے تو کچھ بھی نہیں۔ پھر جب ان کو "سحر بنگالہ" کا خطاب دیا گیا تو میں پریم بدا سے زیادہ ہی خوش ہوئی۔

بابا کو تو تم نے دیکھ ہی لیا ہے جب یہ چھوٹا تھا۔ خوب گول مٹول، پیٹ بھر کالا۔ موٹے موٹے ہونٹ، پکوڑی سی ناک، مگر آنکھوں میں بلا کی ذہانت جگنو جیسی چمک، ہم دونوں جب یک جا ہو جاتے عجیب تضاد نظر آتا۔ منوہر ناتھ ایک نازک، تیکھے نقش و نگار کا گورا چٹا سا لڑکا تھا۔ یوں دو سال اور گزر گئے۔ دونوں لڑکے پڑھنے بٹھا دیے گئے۔ اس خط میں میری دوست نے لکھا ہے۔ سنٹرل انڈیا میں کوئی ایک ریاست "سکتی" ہے، وہاں کے راجہ کے اکلوتے بیٹے سے کسی کا خون ہو گیا۔ بندوق کسی اور کی اور وہ بھی بلا لائسنس تھی۔ انگریز کے اس دور میں انصاف ہر ایک کے لیے یکساں ہوا کرتا۔ ولی عہد پر مقدمہ دائر ہو گیا۔ بڑے بیرسٹر صاحب (سر آسوتوش بنرجی) کو کلکتہ سے مقدمے کی پیروی کے لیے راجہ صاحب نے لکھا تو انہوں نے یہ کہہ کر کہ وہ فی الحال چند بڑے مقدمات میں ایسے الجھے ہوئے ہیں کہ وہ یہ مقدمہ نہیں لے سکتے۔ ہاں ان کا بیٹا تارا ناتھ بنرجی جو بیرسٹر ہے، اگر ان کو راجہ صاحب وکالت کے لیے بلانا پسند کریں تو وہ آ سکتے ہیں۔ راجہ صاحب نے ہامی بھر لی اور میرے "تارا" کو چند ماہ کے لیے روانہ کر دیا۔

اب جو یہ خط آیا کہ "سروجنی اس خط کو پڑھ کر تم بھی ہنسی کے مارے لوٹ جاؤ گی، جس طرح "تارا" کا یہ خط پڑھ کر ہنسی ہوں۔ لکھا ہے یہ تو تم کو بتا چکا ہوں کہ راجہ صاحب کے محل کے احاطے میں ایک مہمان خانے میں میری رہائش کا بندوبست کیا گیا ہے۔ ایک سیاہ رنگ کا عربی گھوڑا سواری کو دیا گیا ہے۔ ابھی تک صبح کو میں ہواخوری کے لیے اس طرف کو جاتا رہا جس طرف آگے جا کر پہاڑیوں کا سلسلہ اور جنگلات شروع ہو جاتے ہیں لیکن اب چند دن سے دوسرا راستہ اختیار کیا ہے جدھر آبادی ختم ہو کر باغات

اور کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ کئی دن ہوئے کہ آبادی کے ختم ہونے پر ایک بہت بڑی حویلی نظر آئی۔ اس کے پاس آکر گھوڑا رک گیا۔ سوچا یہاں اس پر کوئی بیٹھ کر آتا ہوگا۔ ایڑ لگانے پر بھی جب اس نے جنبش نہ کی تو میں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ اوپر کی طرف میری نظر اٹھی تو کیا دیکھتا ہوں ایک سولہ سترہ سال کی لڑکی اپنے لمبے لمبے بال کھولے سُکھا رہی ہے۔ میں نے لگام کی ڈھیل کو کھینچ لیا اور اوپر کو دیکھتا رہا۔ یوں لگا جیسے کوئی پری کھڑی ہو۔ لگام کو ڈھیل دی' ایڑ لگائی گھوڑا آگے کو یہ سوچتا ہوا بڑھ گیا کہ اپنے دیس میں کیسی کیسی حسین عورتیں ہیں۔ ساتھ ہی تمہارا سُندر مکھڑا آنکھوں کے آگے آگیا۔ دوسرے دن صبح ادھر کا پھر رخ کیا' مگر یقین کامل تھا کہ وہ پری جمال آج کیوں چھت پر ہوگی۔ روز روز تو بال سُکھائے نہیں جاتے۔ آج بھی وہ نظر آئی' مگر ہاتھ میں دو کبوتر تھے۔ غور سے دیکھا تو ایک بڑا سا کابک تھا جس کے پاس ہی وہ کھڑی تھی۔ اپنے گالوں کو کچھ دیر ان کے پروں پر پھیر کر اور ہاتھوں کو اوپر کرکے اڑا دیا۔ دوسرے ہاتھ سے دوسرا کبوتر بھی اڑا دیا۔ گردن اونچی کیے کچھ دیر ان کی اُڑان کو دیکھ کر سیڑھی سے اتر کر نیچے چلی گئی اور میں ہوں کہ جب سے صبح کو سیر کے لیے ادھر ہی سے گزر رہا ہوں اور ایک عجیب سی کیفیت دل پر طاری ہو رہی ہے۔ میری "پریم" کہیں ایسا نہ ہو کہ میں کسی آزمائش میں پھنس جاؤں اور تم کو کوئی دکھ پہنچا دوں۔ مجھے ہنسی اس بات پر آئی کہ یہ تارا ناتھ ہندوستانی عاشقِ نامراد بن بیٹھنے سے کیسا ڈر رہے ہیں اور مجھے سمجھ رہے ہیں کہ میں جل اٹھوں گی۔ مجھے تو بڑی خوشی ہوئی کہ وہ حسن سے متاثر ہوئے۔ یہ تو ہر شخص کا پیدائشی حق ہے۔

پھر پریم کے پاس پندرہ دن بعد خط آتا ہے کہ وہ مقدمہ جیت گئے ہیں۔ راجہ صاحب اپنے قول کے مطابق فیس میں مجھے چاندی میں تولا جائے گا۔ دربار میں ایک جشن رکھنا چاہتے تھے' مگر میں نے شرکت کرنے سے انکار کردیا۔ اس پر راجہ یہ سمجھے کہ میں اس فیس کو کم گردان رہا ہوں۔ بڑا اصرار کیا' پھر آپ خود بتائیں کہ کیا فیس لینا چاہیں گے۔ جس کا جواب میں نے یہ دیا کہ میری منہ مانگی فیس وہ دے نہیں سکتے۔ بہت اصرار کرنے پر میں نے بتایا کہ فلاں حویلی میں ایک لڑکی اس صورت شکل کی رہتی ہے میری شادی اس سے کرادیں۔

راجہ صاحب حق حیران رہ گئے کہ وہ حویلی تو ان کے دیوان (پرائم منسٹر) نواب برہان الدین کی ہے اور وہ لڑکی ان کی اکلوتی بیٹی ہے۔ بھلا یہ کیوں کر ممکن ہے کہ ایک صاحبِ حیثیت مسلمان کسی ہندو سے شادی کردے۔ راجہ صاحب نے ان سے کہا کہ وہ اس بات کا جواب رات کو دیں گے۔ شام کو راجہ صاحب خود اٹھ کر نواب صاحب کی حویلی پر گئے۔ ان سے جو بھی کہا ہو' مگر نواب صاحب راجہ صاحب کی بات کا دو ٹوک جواب نہ دے کر بڑی خوبصورتی کے ساتھ جواب میں کہتے ہیں کہ ان کی صرف دو شرطیں ہیں اگر بیرسٹر صاحب ان کو مان لیں تو مجھے شادی کرنے پر اعتراض نہیں۔ اول یہ کہ وہ مسلمان ہو جائیں۔ دوئم یہ کہ وہ میری اکلوتی بیٹی ہے' میں گھر داماد بناؤں گا۔ شاید یہ سوچا ہوگا کہ وہ ایسا ہرگز کرنے پر راضی نہ ہوں گے کہ شادی شدہ ہیں۔ ایک بیٹے کے باپ اور خود اکلوتا ہونے کی وجہ سے اگر مذہب بدلتے ہیں تو اپنے باپ کی لاکھوں روپے کی جائداد سے محروم ہو جائیں گے' بیرسٹر صاحب دونوں شرطوں کو قبول کرلیتے ہیں۔ اب نواب صاحب کے پاس انکار کرنے کی کوئی گنجائش نہ رہ گئی۔

میں حق حیران ان کی طرف تکتی رہی کہ آخر یہ کیسی کہانی ہے' اس کا کوئی اور چھور بھی ہے۔ ان کی چمکتی آنکھیں جیسے کچھ مدھم سی پڑ گئیں۔ بولیں لو اب میرے بہت سے خط گڈمڈ ہو گئے ہیں۔ بیرا کھانا بھی لاتا ہوگا۔ باقی باتیں زبانی سناتی ہوں۔

تارا ناتھ نے اس دن ایک خط اپنے والد کو اور ایک پریم کو لکھا کہ ان کو اب پریم کی دوستی اور ظرف کا امتحان لینا ہے کہ وہ کس طور سے ان کو دوسری شادی کی اجازت دیتی ہیں؟ وہ جانے کس دل گردے اور کس ظرف کی خاتون تھیں کہ خوشی خوشی اجازت ہی نہیں دی بلکہ یقین دلایا کہ وہ مطلق فکر نہ کریں جو مقام ان کے لیے دل میں ہے وہ ہمیشہ رہے گا۔ دوستی کا تقاضا ہے کہ اپنے دوست کو اس کی کمزوریوں کے ساتھ قبول کیا جائے۔ وہ ان کے بیٹے کے باپ بھی ہیں۔ یہ کچھ کم تو نہیں اور تارا تو آسمان پر چمکا ہی کرے گا اور وہ اس کو دیکھا کریں گی!!! اور ساتھ یہ بھی لکھ کر بھیجا کہ وہ یہ نہ سمجھیں کہ شادی میں ان کا اپنا کوئی نہ ہوگا۔ وہ خود بری لے کر آئیں گی' بیٹا بھی ساتھ آئے گا۔ اصل میں پریم کو شاید اپنے ظرف اور دل کو بڑا ثابت کرنا مقصود ہوگا۔ دوسرے وہ اپنی آنکھ سے یہ دیکھنا چاہتی ہوں گی کہ وہ ایسی کیا حور پری ہے۔ جس کو دور سے چند بار دیکھ کر وہ ایسے لٹو

ہوئے کہ اپنا مذہب "اپنا بیٹا" اپنی بیوی اور لاکھوں کی جائداد اپنا شہر سب ہی چھوڑ دینے پر
تیار ہو گئے۔ مر آسودگی ملی تو اپنے آپ گھولا ہوئے کہ ساری جائداد بھو اور اس کے
بعد پوتے کے نام کر کے بیٹے کو عاق کر دیا۔ مجھے پریم بڑا نے لکھا کہ فلاں دن اور فلاں
تاریخ کو بھوپال اسٹیشن پر میں ان کو ملوں اور ان کے ہمراہ شادی میں شرکت کرنے
ریاست "سکتی" چلوں۔ پریم کی اس حماقت خیز حرکت پر میرا غصہ سے بُرا حال تھا۔ دل
کرتا تھا کہ ان کے تارا کا گلا گھونٹ دوں لیکن خود میرے اپنے دل میں عجیب سی کیفیت
تھی کہ اپنی دوست کا ظرف اور تارا ناتھ کی گراوٹ اور چھچھلاپن کو اور اس عجیب لڑکی کو اپنی
آنکھوں سے ذرا دیکھوں تو بھلا۔ دس دن بعد میں یہاں سے روانہ ہوئی۔ بھوپال پر پریم
اسی انداز سے آئیں جو ہمیشہ ان کا رہا تھا۔ مسکراتی' موہنی کی سی چال' سادگی کے ساتھ
بانکپن' بیٹے کی انگلی پکڑے ہوئے (منوہر اس وقت چھٹے سال کا تھا) چند ملازم اور آیا
ساتھ میں۔ ڈھیر سارے سوٹ کیس۔

دوسری ریل میں جب ہم بیٹھ گئے تو میں پریم سے لپٹ کر رو پڑی کہ آخر یہ حرکت
کرنے کا تمہارا مطلب کیا ہے؟ وہ بڑی زور سے قہقہہ لگا کر ہنسیں اور بولیں "سروجنی تم تو
بیوقوف نکلیں جب سوٹھ والے کھا لیے ہیں تو ایک کڑوا نس کر خوشی خوشی کھا لینے میں
بھی تو ایک مزا ہے اور اب ہم تم اپنے اپنے انداز سے کوئی بڑی نظم بھی لکھ سکیں گے۔"

ریل "سکتی" ریاست کے پلیٹ فارم پر رکی۔ تارا ناتھ کے ساتھ مہاراجہ صاحب اور
ان کے ولی عہد اور بھی بہت سے لوگ موجود تھے۔ جس دستور کو بیوی شوہر کے پاؤں کو
جھک کر ہاتھ لگائے' ہم دونوں نے کبھی نہ کیا تھا اور اس فعل کو بڑی حقارت کی نظر سے
دیکھتے تھے۔ آج پریم نے وہ بھی کر ڈالا۔ مجھے تو حیرت اس پر ہوئی کہ تارا ناتھ نہ تو شرمسار
تھے اور نہ ہی ان کے بانکپن میں کوئی فرق تھا۔ بیٹے کو گود میں لے کر خوب پیار کیے اور
بیوی سے بولے "تم نے بڑا اچھا کیا کہ سروجنی کو بھی ساتھ لے آئیں۔"

دوسرے دن تارا ناتھ ہمارے سامنے مسلمان ہوئے اور بدرالدین صاحب بن گئے!
اس کے بعد قاضی نے نکاح پڑھوایا پھر ہم دونوں نے دلہن کو دیکھا۔ کبھی ہم دلہن کو دیکھتے
اور کبھی ایک دوسرے کو۔ میں نے زندگی بھر اتنی خوبصورت لڑکی نہ دیکھی تھی۔

پریم نے ایک بڑا سا صندوقچہ پاس منگا کر دلہن کے سامنے زیورات کا ڈھیر

کر کے جس حد تک پہنا سکتی تھیں زیور سر سے پاؤں تک پہنائے۔ تین سوٹ کیسوں کی
طرف اشارہ کیا کہ ان میں ان کے لیے کپڑے ہیں۔ ایک چاندی کی تھالی جس میں مونگ'
ماش' تیل اور چند اشرفیاں تھیں۔ سر پر سے گھما کر صدقہ اتار کر نواب صاحب کی ملازمہ
کے ہاتھ میں دے کر کہا۔ "یہ تم لوگ لے لو" پھر بیٹے کو پاس بلا کر نمسکار کروا کر ان کے
پاؤں کو ہاتھ لگوا کر کہا "یہ آپ کا بڑا بیٹا ہے یقین ہے کہ یہ ہمیشہ آپ کا تابعدار رہے گا۔"

دوسرے ہی دن ہم دونوں حیدر آباد آ گئے۔ بھئی اب تو تم کچھ سمجھیں؟ یعنی ہم دونوں
اختر کی نانی اور نانا کی شادی رچا کر آ گئے۔ میری نظریں ان کے چہرے پر گڑی جا رہی
تھیں۔ پھر بولیں حبیب الدین ان دونوں کے بیٹے اور اختر کی والدہ ممتاز النساء ان کی بیٹی
تھیں۔ میں اب بول پڑی کہ پھر حبیب الدین بینرجی کیوں کر ہو گئے؟

بیرا ٹرالی پر کھانا لے آیا۔ اس کو باہر بھیج کر مجھے پلیٹ میں کھانا نکال کر دیا۔ پھر اپنی
پلیٹ میں ڈال کر بولنا شروع کر دیا۔ پریم اور تارا کی قربت اور دوستی میں کوئی فرق نہیں
آیا۔ ہر کام کرنے سے پہلے ان سے مشورہ لیا کرتیں۔ خط و کتابت برابر ہوتی۔ ہر نئی نظم
اور مضمون میاں کو پہلے بھیج کر دریافت کرتیں "کیا اس کو چھپنے کو دے دوں؟" تارا ناتھ
بلکہ یوں کہوں کہ بدرالدین صاحب پر میرے منہ سے ہمیشہ تارا ناتھ ہی نکلتا رہا تھا۔ وہ
سال میں چار پانچ بار کلکتہ کا پھیرا لگا آتے۔ مگر ان کے باپ نے کبھی بیٹے کی شکل نہ دیکھی
اور نہ ہی ادھر سے کوئی اصرار کیا گیا۔ پریم نے اپنے بیٹے منوہر کے دل میں باپ کے لیے
محبت کوٹ کوٹ کر بھر دی۔ باپ کا احترام اور عزت کرنی سکھائی۔

پریکٹس کی خاطر "سکتی" سے رہائش ناگپور میں اختیار کی تو نواب برہان الدین صاحب
نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور ناگپور آ گئے۔ تارا ناتھ بلکہ بدرالدین کی پریکٹس
خوب زوروں پر چلی۔ سال بھر بعد حبیب الدین پیدا ہوئے دو سال بعد اختر کی والدہ
ممتاز النساء۔

منوہر جب آٹھ سال کا ہو گیا تو میاں سے اجازت لے کر شیلانگ پرنس کالج کے اسکول
اور بورڈنگ میں داخل کر دیا۔ دوسرے سال میری دوست پریم پر قیامت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا
کہ منوہر نے چند دوستوں کے ساتھ مل کر آئس کریم کھائی۔ اس میں کسی ولی عہد کے
لیے زہر ملایا گیا تھا جن پانچ لڑکوں نے مل کر کھائی تھی سب ہی مر گئے۔ یوں بیچارا منوہر تو

سال کی عمر میں فوت ہو گیا۔ بدر الدین صاحب فوراً" کلکتہ پہنچے۔ پریم کی دلداری کرنے
میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ میں خود بھی اپنی دوست کے غم میں شریک ہونے کلکتہ آگئی
تھی۔ بھئی پریم بڑا ہی کیا ہستی تھی۔ اس عظیم غم کو دل پر کس انداز سے اٹھایا۔ نہ رونا
تھا نہ آنسو تھے اور نہ اظہار غم کے الفاظ۔ ہر موضوع پر اسی طرح مسکرا مسکرا کر بات
کرتی۔ بیٹے کا ذکر اشارے کنائے سے بھی نہ کرتیں۔ دل خون کے آنسو بہاتا ہو گا مگر وہ پھر
بھی ہنس ہنس کر باتیں کرتیں۔ بیرسٹر صاحب بار بار آبدیدہ ہو جاتے تو کہتیں "دیکھو تارا
ایک عام انسان والی کمزوری تو خدارا نہ دکھاؤ۔ دنیا میں ہر آنے والا دیر سویر جاتا ضرور
ہے۔

تین سال بعد پریم نے میاں کو لکھا اب تو خدا کے فضل سے تمہارے پاس ایک بیٹی
بھی آگئی ہے۔ اپنی دلہن بیگم سے پوچھو کیا وہ حبیب کو مجھے گود لینے کی اجازت دے سکتی
ہیں؟ تو اختر کی نانی صاحبہ نے اپنے والد سے مشورہ کیا اور بڑی خوشی خوشی اجازت دے
دی۔ وہ بڑی خوش قسمت خاتون ہوں گی کہ ایک اتنی عظیم اور نامور خاتون کے ہاتھوں ان کا بیٹا
پروان چڑھے اور پھر کروڑوں کا وارث بھی ہو۔ پریم خود اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھیں
جن کے بے شمار چائے کے باغات اور کلکتہ میں جائداد تھی۔ مجھے لکھا کہ میں ان کے
ساتھ ناگپور چلوں اور میں چل پڑی۔ گود لینے کی چند رسومات ادا کیں۔ یہ لکھ کر عہد نامہ
دیا کہ لڑکے کو پوری اسلامی تعلیم دلوائیں گی اور سال میں ایک بار ناگپور آئے گا۔ پریم کی
بھی ایک شرط ہوئی کہ حبیب الدین کے نام کے آگے خاندانی نام بنرجی لکھا جائے۔ اس پر
ان کو کوئی اعتراض نہ ہوا۔ اسی دوران میں پریم کے والدین انتقال کر چکے تھے اور وہ اپنی
جائداد کی واحد وارث ہو چکی تھیں۔ ہم دونوں چار دن ناگپور رہے اور بیگم صاحبہ کو اچھی
طرح دیکھا اور پرکھا۔ کتنی شائستہ، کس قدر روشن دماغ اور عالی ظرف۔ کیوں نہ ہو نواب
برہان الدین کی بیٹی جو تھیں۔ ان کے حسن میں نکھار اب اور دو چند ہو گیا تھا۔
پریم نے اپنے چہیتے بیٹے کو اتنا وقت اور توجہ نہ دی ہوگی نہ ایسی دیکھ ریکھ کی ہو گی۔
لڑکے کو کسی بھی اسکول یا بورڈنگ میں نہ بھیجنے کا عزم کر لیا تھا کہ کہیں اس کو بھی کوئی زہر نہ
دے دے۔ اس لیے انگلستان سے ایک ٹیوٹر بلوا کر تعلیم دلوانا شروع کی۔ "وہ جو تم نے
اس دن ان کا خط پڑھنے کے بعد مجھ سے کہا تھا کہ خط انگریزی میں تھا۔ بے حد اعلیٰ زبان

اور لکھائی تھی مجھے خوب یاد ہے کہ حبیب جب انگریزی بولتے تو درحقیقت کسی انگریز
ہونے کا شبہ ہوتا کیونکہ صورت شکل اور رنگت بے حد صاف۔ لباس ان کے انگلستان
سے آتے تھے۔ بھئی وہ تو جب نہاتے پانی کے بھرے ہوئے ٹب میں آدھی بوتل
کولون کی ڈلا کرتی تھی۔ کئی ملازم ان کی ذات کے لیے علیحدہ تھے۔ سواری کے لیے ایک
گھوڑا اور بگھی!! بنگلہ اور ہندی کے لیے ماسٹر اور اردو اور قرآن پڑھانے کو مولوی
آتے۔ کیسے کیسے ناز اور نخرے اٹھائے جاتے۔ وہ جو حبیب نے اختر کو خط میں لکھا کہ
سوتیلی ماں کے لاڈ اور دلار میں تباہ اور برباد ہو گئے۔ تو سچ ہی تو کہا۔ کلکتہ میں حبیب کو جو
کچھ پڑھایا جاتا اور سکھایا جاتا تھا بیگم صاحبہ اپنی بیٹی یعنی اختر کی والدہ کو سکھوانے کے جتن
کرتیں۔ ان کا بیٹا اور ہماری بیٹی جیسے کمپیٹیشن کے لیے تیار کیے جا رہے ہوں۔
اختر کی والدہ کو قدرت نے بھائی سے زیادہ ذہن عطا فرمایا تھا۔ اردو' ہندی اور انگریزی
میں کم عمری سے ہی مضامین لکھنا شروع کیے۔ انگریزی پڑھانے مشن کی دو گورنس مقرر کی گئی
تھیں۔ ہاں بنگلہ زبان پڑھانے والا زیادہ دن کے لیے میسر نہ ہوا۔ اس طرح بنگالی کی صرف
شُدبُد ہی ہو سکی۔ چند سال بعد نواب برہان الدین انتقال کر گئے۔ اختر کی والدہ کو اپنے نانا
سے بہت زیادہ لگاؤ تھا۔ پھر سال بھر بعد بدر الدین صاحب پینتالیس برس کی عمر میں پیچش
کے موذی مرض میں دو تین دن میں چٹ پٹ ہو گئے۔ بیچاری بچی ابھی دس ہی سال کی تھی
کہ بن باپ کی ہو گئی۔ پریم اپنے بیٹے حبیب کو لے کر فوراً" ناگپور آگئیں اور پورے سوا
مہینے وہاں رہیں۔ بیگم صاحبہ اور پریم میں بڑا قرب اور دوستانہ اس درمیان میں ہو گیا کہ
ہر معاملے میں پریم سے صلاح مشورہ کرتیں۔ ممتاز النساء کو بہت کچھ نانا کی طرف سے اور
بڑی جائداد والد کی طرف سے ملی اور عمر اس قدر کم۔ پریم کے مشورے سے سب کورٹ
آف وارڈ میں کروا دی گئی۔ اختر کی والدہ کا اس ذرا سی عمر میں ذہانت قابلیت اور نشست و
برخاست کا انداز حیرت انگیز تھا۔ پریم اس بچی کے لیے اپنے دل میں بہت سا پیار اور بہت
سی امیدیں لے کر واپس کلکتہ جاتے وقت چند روز کو میرے پاس آئیں۔
میں دم بخود یہ عجیب سی کہانی سنتی رہی۔ ہم دونوں ہی کھو سے گئے۔ میری نظر گھڑی پر
پڑی اور گھبرا کر کھڑی ہو گئی کہ دو بج چکے مجھے فوراً" گھر جانا چاہیے ورنہ مولوی صاحب اور
اختر مجھے پھر ان کے پاس آنے کی اجازت نہ دیں گے۔

جمیل بھیا' ایسا قصہ کہانیوں میں تو پڑھنے کو شاید مل جائے' پر سچ ایسا کیسے ممکن ہوا؟
پریم بدا دیوی تو حقیقت کی دیوی تھیں۔

میں گھر آکر لیٹ گئی۔ تصورات کے ایسے گورکھ دھندے میں پھنس گئی کہ شام کا آنا اس وقت تک معلوم ہی نہ ہوا جب تک اختر کی بھاری سی آواز نے مجھے چونکا نہ دیا۔ کھڑی ہو گئی مگر کچھ سہمی سہمی نظروں سے اختر کو دیکھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں نے کوئی چوری کی ہے۔ جس ماضی کو یہ خود تو قفل تالے میں بند کر چکے اور میں اس کو اس قدر قریب سے دیکھ آئی۔ پوچھا خیر تو ہے؟ مجھے اس قدر بھونچکا ہو کر کیوں دیکھ رہی ہیں۔ جیسے میرے دو سینگ نکل آئے ہوں۔ معلوم ہوتا ہے سروجنی نائیڈو نے بڑی فلسفیانہ اور شاعرانہ گفتگو کی ہے جو آپ سے ہضم نہیں ہو رہی ہے۔ چلیں چائے ٹھنڈی ہو جائے گی۔

— ○ —
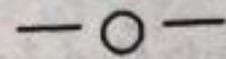
میرے والد

چائے کے وقت مولوی صاحب نے ہاتھ اٹھا کر کہا "آج ایک اہم اعلان ہوتا ہے۔" ہم دونوں حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔ آنکھوں میں بچوں والی شرارت کے لچھے سے نکل رہے تھے۔ میں نے ذرا سر کو جھکا کر کہا۔ "بندی ہمہ تن گوش ہے اعلیٰ حضرت کا اعلان سننے کے لیے۔" "یہ بات ہوئی نا قاعدے کی' تو سرکار جمعرات کی شام کو ایک شے جو ولیمہ کے نام سے منسوب کی جاتی ہے اس کو کرنے کا فیصلہ صادر کرتے ہیں جس میں شرکت بس خواتین کریں گی۔" میرے منہ سے نکل گیا۔ "الٰہی خیر۔ اب ولیمہ بھی مردانہ زنانہ ہونے لگا ہے۔ اختر بس مسکرا کر مولوی صاحب کی طرف دیکھتے رہے۔ سید ہاشمی فرید آبادی' مولوی صاحب کے ساتھ پندرہ بیس سال سے انجمن کے کاموں میں لگے ہوئے تھے۔ مولوی صاحب کو ان کی والدہ سے بہت عقیدت تھی۔ ایک آدھ چکّر مہینے میں ضرور لگا آیا کرتے۔ بڑی قدر اور عزّت ان کی کرتے تھے۔ اصل بات یہ تھی کہ یہ خاتون بڑی مہذّب اور سمجھ دار تھیں' جب باتیں کرتیں تو جیسے پھول منہ سے جھڑ رہے ہوں۔ بڑی بامحاورہ زبان تھی۔ نادانستہ جو الفاظ ان کی زبان سے نکلتے وہ جانے کتنے بٹور کر اپنے ساتھ لے آتے اور ڈکشنری میں شامل کر دیتے۔ ہاشمی صاحب کی والدہ نے کل والی ملاقات پر ان سے کہا۔ "میاں عبدالحق آپ نے تو حد کر دی کہ بہو بیاہ لائے اور ولیمہ آج کرتے ہیں نہ کل۔ گھر گھر لوگ اس دعوت کے منتظر ہیں۔" "اچھا تو ایسی بات ہے۔ مجھ سے آپ پہلے فرما دیتیں۔ خیر اب اسی جمعرات کو ولیمہ مگر زنانہ کر دیں گے۔"

ہاشمی صاحب کے ذمے کارڈ چھپوانا اور فہرست کے مطابق بٹوانا تھا اور چائے کا انتظام بھی۔ یہ سب کروا کر مولوی صاحب اور اختر اپنے اپنے کاموں میں جٹ گئے۔ جمعرات کو دفتر پورے دن کا ہوتا ہی تھا۔ ہوٹل والوں نے اندر کے باغ میں میزیں وغیرہ لگوانا شروع کر دیں' برتن وغیرہ لگ رہے تھے' کوئی چار بجے ہوں گے' بلاوا ساڑھے پانچ بجے کا تھا۔

بیگم قاضی عبد الغفار کچھ پہلے سے اس لیے آئیں کہ بچا ان کے سر تھے کہ بیگم تم ذرا کچھ پہلے سے چلی جاؤ۔ دیکھ لینا کہ حمیدہ ٹھیک سے تیار ہو' اور کچھ زیور ضرور پہن لے۔ ہزار ان کا انکار کہ وقت پر ہی جائیں گی پر بچا نے ان کو کھدیڑ کر بھیج ہی دیا۔ یہ ڈرتے ڈرتے پیچھے کے باغ سے داخل ہوئیں کہ سامنے کی طرف تو مولوی صاحب کے آفس کا کمرہ ہے۔ سب سے پہلے ان کی نظر میزوں اور برتنوں اور چائے کے سامان پر پڑی۔ میں برآمدے میں کھڑی بیروں کو کوئی تاکید کر رہی تھی۔ کھڑی کی کھڑی رہ گئیں اور بولیں۔ "بیٹی یہ کیا بلاوا تو سات بجے شام کھانے پر اور میں یہاں چائے کا انتظام دیکھ رہی ہوں۔" "میں نے کہا "چچی کھانے کی دعوت تو نہیں چائے کی ہے کہ مولوی صاحب کھانے کے یوں خلاف ہوئے کہ اس کی بو ہفتوں گھر میں بسی رہے گی۔ اپنا بٹوہ کھول کر دعوت نامہ دکھایا تو میری جیسے جان نکل سی گئی۔ حیران رہ گئی کہ واقعی کارڈ پر تو کھانے کی دعوت کا چھپا ہوا ہے۔ "چچی اب کیا ہو گا؟" "غلطی جس سے بھی ہوئی ہو یہ تو اب مولوی صاحب کی عزت کا سوال آن پڑا ہے۔ بس اب تم یہ کرو' اختر میاں کو بلا کر کارڈ دکھاؤ۔ وہی اب کچھ کر سکتے ہیں۔" یہ کہتی ہوئی کہ وہ اب رات کو آئیں گی' الٹے پاؤں بڑی تیزی سے باہر کے رخ چل دیں۔ چند منٹ میں گم سم کھڑی کارڈ کو دیکھا کی' پھر بڑی ہمت کر کے اختر کے دفتر کی چق ہٹا کر ان کو آواز دی۔ "جلدی ذرا اندر آیے۔" وہ ایسا چونک کر کچھ اچھل سے گئے جیسے پیچھے سے کسی نے بُلم سے بچھو کا مار دیا ہو۔

اختر اندر آئے ان کے ہاتھ میں کارڈ تھما دیا۔ کارڈ کو دیکھا' ایک منٹ کچھ سوچا اور بڑے فیصلہ کُن انداز سے نیچے اتر کر ہیڈ بیرے کو پاس بلا کر کہا "کارڈ کی چھپائی میں کچھ غلطی ہو گئی ہے۔ دعوت کھانے کی ہے' آپ چائے کے برتن اور سامان فوراً" یہاں سے اٹھوائیں اور کھانے کا بندوبست کریں۔ اتنے لوگوں کا کھانا اتنی جلدی آپ کے ہوٹل سے نہ ہو سکے گا تو کچھ دوسرے ہوٹلوں سے لے لیں' مینو بتا کر بڑے اطمینان سے اوپر چڑھے' چق اٹھا کر اپنی کرسی پر بیٹھ کر پھر کام کرنا شروع کر دیا۔ یہ بھی تو نہ کیا کہ مولوی صاحب کو جا کر پہلے بتا تو آتے۔

مولوی صاحب پانچ بجے اپنے کمرے میں گئے۔ نماز ہو کر اتنی تیزی سے سر جھکائے باہر چلے گئے کہ میں ان کی طرف بڑھی۔ مگر انہوں نے دیکھا ہی نہیں۔ باہر روش پر ٹہلنے لگے

کہ کچھ دیر میں مہمان آنا شروع ہوں گے۔ چھ بج گئے کوئی نہ آیا۔ رفتار بہت تیز ہو گی۔ اپنی چھڑی کو زمین پر زور زور سے مارتے اور اس پر قالین کی پر ٹھکنے سے الفاظ بلند ہو جاتے۔ میں ان کے کمرے کی دیوار سے لگی کھڑی یہ تماشا دیکھ کر اختر کے پاس آئی کہ خدا کے لیے آپ مولوی صاحب کو پوری بات تو بتا آئیں۔" "جواب ملتا ہے۔" "یہ آپ کا اور مولوی صاحب کا معاملہ ہے' آپ خود ہی جائیں اور ان کو بتائیں۔" "میں حیران کہ کیسے باہر چلی جاؤں اور ایسے بپھرے ہوئے شیر کا سامنا کیسے کروں؟ مگر پھر ہمت باندھ کر دفتر سے ہوتی ہوئی سامنے کے کمرے' پھر برآمدے سے ہو کر پورچ میں آئی' تو کیا دیکھا کہ لان کے بعد وہ جھاڑیاں تھیں اس میں سے بیگم ہاشمی نے صاحب کا سر نکلا نظر آیا اور ہاتھ سے اشارہ کریں کہ میں اندر چلی جاؤں۔ مولوی صاحب پھاٹک پر کھڑے نظر آئے۔ میں الٹے پاؤں یہ سوچ کر آگئی کہ ہاشمی صاحب جیسا ڈیل ڈول جسیم شخص ایسا دبکا ذرا سا چھپا ہوا کھڑے ہیں۔ شاید کوئی چھڑی ان پر پڑی ہو۔ اندر آ کر اختر سے کہا۔ "خدارا آپ مولوی صاحب کے پاس چلے تو جائیں۔" "اس کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ اب کیا تماشا رچائیں گے۔" میں نے پیچھے اتر کر پھر جھانک کر دیکھا' اب ساڑھے چھ بج رہے تھے' ایک موٹر آئی۔ مولوی صاحب نے ہونٹ پر چھڑی سے ٹھک ٹھک کر کے شاید یہی کہا ہو گا۔ "تشریف لے جائیں وقت گزر چکا۔"

موٹر فراٹے بھرتی نکل گئی اور وہاں ایک کے بعد ایک موٹر آرہی ہے' پھاٹک

لے شاید ۱۹۴۷ء کی بات ہے کہ میں تمام [illegible] کے آس پاس کسی کا گھر ڈھونڈ رہی تھی [illegible] رہ گیا تھا۔ اس سے موٹر [illegible] نیچے اتر آئی کہ سامنے والے مکان میں اندر جا کر معلوم کروں کہ شاید [illegible] رہیں۔ جب برآمدے میں آئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ ایک پلنگ پر ہاشمی صاحب بیٹھے ہیں۔ مجھے دیکھ کر حیران بھی ہوئے اور خوش بھی۔ کہا ذرا دیر بیٹھ جاؤ تو [illegible] [illegible] بلاؤں گا ہو شاید تم کو اب تک معلوم نہ ہو۔ "تو کہا۔ [illegible]" میں وہ سماں بھول سکتے ہیں۔" [illegible] مولوی صاحب [illegible] میں یہ سمجھتی کھڑی ہو گئی [illegible] معلوم ہوا [illegible] ناظرین کے لیے معافی چاہتی ہوں۔"

پر لمحہ بھر ہلکی ہو کر تیز زنا زن بھاگی جاتی نظر آ رہی تھی۔ گو کھانے کے دیگ آ چکے تھے۔ میزوں پر کھانے کے برتن لگ چکے تھے۔ مولوی صاحب آدھ گھنٹہ گیٹ پر کھڑے بیگمات کو ڈنڈے سے ہنکاتے رہے۔ پھر اندر آ کر اپنے کمرے میں داخل ہوئے۔ اختر نے با آواز بلند بیروں سے کہا۔ "آپ کھانے کے برتن اور میزیں کرسیاں وغیرہ لے جائیں۔ کل صبح اپنا بل چائے اور کھانے کا مولوی صاحب کو دے کر روپیہ لے جائیں۔" مولوی صاحب کپڑے بدل کر شیروانی اتار برآمدے میں کھانے کی میز پر براجمان ہو کر محبوب کو آواز دے کر کھانا لانے کو کہتے ہیں۔ اس نے جواب دیا۔ "آج تو دیگ کا کھانا ہے وہ لے آتا ہوں۔" وہ کھانا نکلوانے آیا تو اختر اس سے پہلے وہاں جا کر کھڑے ہو چکے تھے کہ آج کوئی کھانا نہیں کھائے گا' ان سب دیگوں کو آلٹ دو تاکہ کتے' بلّیاں پیٹ بھر کے کھالیں اور مولوی صاحب سے بڑے غصے میں بولے۔ جائیں آج بھوکے ہی سو جائیں کس نے فرمائش کی تھی کہ آپ ولیمہ کریں؟ آخر آپ کا خواتین کی ہتک کرنے کا مطلب کیا تھا؟ بلایا کھانے پر اور انتظام چائے کا کیا۔ آپ کی بات کو نبھانے کا میں نے بندوبست کر دیا تو مہمان چھڑی سے مار مار کر بھگا دیے۔ کسی کی لاج آپ کو نہ رکھنا تھی تو اس سفید داڑھی کی لاج رکھ لیتے۔ یہ رہا آپ کا بلاوے کا کارڈ۔ مولوی صاحب نے جلدی سے اس کو گھور گھور کر دیکھا پھر اختر کی طرف یوں دیکھنے لگے جیسے کوئی بچہ بڑی شرارت کر کے سہم کر دیکھے۔ پھر کارڈ پر نظر ڈالتے اور کبھی اختر پر۔ اختر کی نگاہیں واقعی بڑی قہر آلود تھیں۔ مجھے شرم اور غصہ اختر پر آیا کہ جانے کیا گول مول ہوا اور کس نے کیا۔ مولوی صاحب بیچارے قصور وار تو نہیں وہ کسی طرح کسی بے قاعدگی کو برداشت ہی نہ کر سکتے تھے۔ پہلے بیسیوں بار تو خود مجھ سے کہہ چکے تھے کہ کبھی مولوی صاحب کی بات کا برا نہ ماننا اور اس وقت خود کیسا شیر ببر بن کر کھڑے تھے۔ مولوی صاحب یہ کہتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے کہ "ایک رات کا کھانا نہ کھا کر مر تو نہ جاؤں گا۔"

اماں کا وہ جملہ مجھے ایک دم یاد آ گیا کہ بھوکا سید اور بھوکا شیر دونوں برابر ہو جاتے ہیں۔ اختر کو بھوک کی برداشت قطعی نہ تھی اور نہ زندگی بھر ہوئی۔ مجھے فوراً "کچھ کرنا چاہیے کہ مولوی صاحب کیسے بھوکے سو سکیں گے۔ ایک وقت صرف رات ہی کا کھانا تو کھاتے ہیں۔ برآمدے کے کھمبے کو ذرا دیر پکڑے کھڑی رہی۔ اختر نے پوچھا۔ کیا ہوا آپ کو؟" کیا

نہیں ہوا۔ بس کچھ چکر سا آ گیا" شاید بھوک کی وجہ سے "اگر اجازت ہو تو ایک پیالی چائے بنا کر پی لوں؟ وہیں پر بسکٹ کا ٹن بھی رکھا ہے" "ایک کھالوں۔ جس معصومیت کا منہ بنا کر پوچھا تو اختر ہنس پڑے' بولے "عورت نہ بھوک برداشت کر سکتی ہے' نہ غم' نہ ہی تکلیف۔ یہ سب تو مردوں کا حصہ ہے۔ جایئے چائے بنائیں "مگر جب وہ شیر ببر اپنے سلوار اور چائے کی پتی کو ہاتھ لگاتا دیکھ کر آپ پر جھپٹا لگائیں تو دہائی دیتی میرے پاس نہ آیئے گا۔" اختر پھر کمرے میں چلے گئے۔ کپڑے بدل "بستر پر لیٹ کر کوئی کتاب پڑھنے لگے۔

میں نے جب چائے دم کرلی تو چیچی بنا کر مولوی صاحب سے کہا۔ "آج میں نے بغیر اجازت چائے بنائی ہے' ذرا دیکھیے کہ ایک بد نیت (جیسا کہ انہوں نے پہلے دن کہہ دیا تھا) انسان کے ہاتھ کی بنائی چائے' ہے کیسی؟ ذرا سا جھانک کر ادھر ادھر دیکھا کہ اختر تو نہیں۔ پھر چپکے سے کمرے سے نکل کر کرسی پر آ بیٹھے۔ ہاتھ میں ایک پنیر کا ڈبہ تھا۔ میں نے کہا "ذرا پستہ بھی تو لے آئیں اپنی دونوں ٹھاٹ سے بسکٹ' پنیر اور پستہ اُڑائیں' گرم گرم چائے پئیں اور وہ آپ کے باگڑ بلا آج بھوکے ہی سو گئیں۔" ہنس پڑے۔ میں نے پہلے پنیر کاٹ کر دو دو بسکٹوں کے بیچ میں رکھا۔ تین پیالیوں میں چائے بنائی' دو بسکٹ پیالی کے ساتھ تشتری میں رکھے۔ مٹھی بھر پستے دوسرے ہاتھ میں داب کر اپنے کمرے میں جا کر میز پر رکھ یہ کہتی ہوئی کہ چائے ٹھنڈی نہ ہو جائے۔" خود واپس مولوی صاحب کے پاس آ کر بیٹھ کر ہنس پڑی۔ چائے پیتی جاؤں اور بسکٹ پنیر کھاتے میں ان سے کہا۔ "میں تو آج آپ دونوں کو مان گئی کہ ہر ادا نرالی' ہر بات عجوبہ' براتی اُترے تو لگا میراثی آ رہے ہیں۔ نکاح پر محفل شریفوں کی اور براتیوں کے انداز نرالے اور غیر مہذب اور پھر سفر کیا بھی تو انوکھا۔ پہلی صبح ہوئی تو ایک پردیسی دلہن پر منوں بوجھ لاد دیا گیا۔ وہ تو شکر کیجیے کہ ایک جاہل لڑکی کو بیاہ کر گھر لے آئے تھے ورنہ آپ دونوں بڑی مصیبت میں پڑ جاتے' اور اب یہ ولیمہ! بھلا کوئی کبھی بھولے گا؟" مجھے بے اختیار ہنسی آنے لگی۔ "واہ عالم لوگوں کے کیا کہنے۔ میرا تو یہ حال ہے "تک تک دیدم' دم نہ کشیدم" خود بھی ہنسنے لگے "تو جناب کو فارسی بھی آتی ہے۔" "کچھ تھوڑی سی کہ گلستاں' بوستاں ہمارے کورس میں تھی۔"

پیچھے سے آہٹ ہوئی۔ مڑ کر دیکھا تو اختر پیالی لیے آ رہے تھے' پوچھا ایک پیالی چائے اور مل سکتی ہے؟ بے اختیار منہ سے نکل گیا۔ "چائے ہی نہیں چاہ بھی مل سکتی ہے

بہرحال آپ یہاں بیٹھیں تو سہی۔" اس پر دونوں نے زور کا قہقہہ لگایا۔ کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔ ایک پیالی چائے اور دو بسکٹ پنیر کے ساتھ اور کھائے پھر کہنے لگے کہ "بمبئی کی کانفرنس میں ایجنڈے میں فلاں نکتے کو شامل کرنا چاہیے یا نہیں؟ خطبۂ صدارت جلد لکھ کر ختم کرنا چاہیے۔" یہ دونوں عظیم انسان دنیاداری کے جھمیلوں سے نکل کر اب اپنے میدان میں آ پہنچے تھے۔ مزے سے علمی گفتگو میں مشغول ہو گئے۔ ایک دوسرے سے کوئی گلہ یا شکوہ نہ رہا تھا۔ ولیمہ کا واقعہ کس قدر جلد بھولی بسری یادوں کی قطار میں شامل ہو کر اپنا وجود کھو بیٹھا تھا۔ میں کھسک آئی۔ مگن ہو کر کپڑے بدل تندیا پر پہنچ گئی۔

بمبئی کی کانفرنس کے لیے جو مسودہ مولوی صاحب نے لکھا، جب صاف ہو کر آگیا تو میرے پاس لائے کہ "ذرا اس پر ایک نظر ڈال لینا کہ زبان کی کوئی غلطی تو نہیں؟" میں ان کا منہ تک رہی تھی کہ اختر بول پڑے "کیوں آپ ان کا دماغ خراب کرنا چاہتے ہیں؟ یہ اب آپ کا مسودہ دیکھیں گی کہ زبان کی غلطی تو نہیں۔ خود یہ جو ہر چار جملوں کے اندر چار اُلٹے سیدھے لفظوں کا استعمال کرتی ہیں۔" "تم مانو یا نہ مانو، میں تو کہوں گا کہ تم بھی اپنا مسودہ ان کو دکھایا کرو تو فائدے میں رہو گے۔ علمیت قابلیت ایک چیز ہے اور زبان دوسری چیز۔ تم دونوں کو گنڈ مڈ کر دیتے ہو۔ زبان تو اصل میں بول چال والی ہی ہوتی ہے۔ اس میں موٹے موٹے وزن دار الفاظ کی بھرمار زبان کی خوب صورتی کو ملیامیٹ کر دیتی ہے۔"

"اچھا مجھے یہ تو بتائیں کہ اب کی جو آپ دونوں کانفرنس کا بہانہ کر کے سیر سپاٹے کو بمبئی جائیں گے تو اس بار میں کہاں رکھ دی جاؤں گی؟" "جہاں ہم مناسب سمجھیں گے۔" میں نے منت کر کے کہا۔ "اب کی میں سروجنی نائیڈو کے گھر پر کیوں نہ رہ جاؤں۔" مولوی صاحب نے تڑ سے کہا "تاکہ بیٹا تمہارا گلا گھونٹ دے۔ نہیں بھئی ہم کسی کی لڑکی کا خون اپنی گردن پر نہ لیں گے۔" "آخر یہ 'بیٹا' طوطا کون ہیں؟" ایک بار اختر نے بھی کچھ ایسا ہی کہا تھا۔" "تم کو سروجنی نائیڈو نے نہیں بتایا۔ ان کا یہ سب سے چھوٹا بیٹا طرح طرح کے نشے کر کے دیوانگی کی حد کو پہنچ چکا ہے۔ اس موذی شے کو حاصل کرنے کے لیے چوری تک کرتا ہے۔ گھر کا سامان بیچ دیتا ہے۔ عورتوں کے زیورات اُتار لیتا ہے۔ پدما اور لیلامنی بہنیں ہو کر اس سے دس کوس دور دور رہتی ہیں۔" "میں تو سچ ڈر گئی۔

میں نے ایک ہفتے بھر کے لیے کپڑے پھر سوٹ کیس میں رکھ لیے۔ کل رات کی گاڑی سے دونوں روانہ ہوں گے۔ ان دونوں کا سامان اب کی میں نے خود بند کیا۔ مولوی صاحب تو اس بات پر بہت خوش ہوئے، مگر اختر نے خاصی ناک بھوں چڑھا کر کہا۔ "اب تو آپ ایسا بغیر میری اجازت کے کر چکیں، مگر آیندہ نہ کیجیے گا۔ مجھے آپ کے رکھے کپڑوں میں سے کچھ پتہ ہی نہ چلے گا کہ کس طرف کیا ہے؟" یہ مجھے کچھ عجیب سی بات لگی۔ ان کی طرف ایک لمحہ دیکھ کر نظریں نیچی کر کے سوچنے لگی کہ الٰہی یہ کیسے انسان ہیں؟ بھئی ایک سوٹ کیس ہی تو ہے کوئی ہال کمرہ تو نہیں جس میں ان کو کونے کونے گھوم پھر کر کھوج لگانا ہو گی کہ قمیص کدھر ہے اور پتلون کہاں ہے؟ موزہ کس کونے کھدرے میں ہے۔ ٹائی کس کیل کھونٹی پر لٹک رہی ہے؟ کچھ ان کا لکھا میں پڑھ نہیں سکتی جب تک کہ وہ چھپ نہ جائے۔ کپڑے سوٹ کیس میں رکھ نہیں سکتی کہ پھر ان کو تلاش کرنے میں دقت پیش آئے گی۔" عمر بھر دو چار سو سفر ضرور کیے ہوں گے، مگر پھر کبھی میں نے ان کے سوٹ کیس میں سامان نہ رکھا، خود رکھا یا ابراہیم کو بتا کر بند کروایا۔ اختر کی عادت تھی کہ رات کو سوتے وقت کرتا پاجامہ پہنتے۔ ایک بار ابراہیم سب پاجاموں میں کمربند ڈال کر رکھنا بھول گیا۔ صرف ایک ہی میں کمربند ڈالا تھا۔ سری لنکا میں یونسکو کی کانفرنس تھی جس کا ہر انتظام اختر کی ذمّے داری تھی اس لیے کچھ پہلے سے ان کو وہاں جانا تھا۔ دنیا بھر سے نمائندے آ رہے تھے۔ وہاں کا سب سے بڑا ہوٹل پورا ایک کروالیا گیا تھا۔ سب ملا کر اختر کو دو ماہ وہاں قیام کرنا تھا۔ کمربند والا پاجامہ میلا ہوا اور دوسرے کو پہننے کے لیے نکالا تو اس میں کمربند ہی نہ تھا۔ اب سخت حیران و پریشان کہ اب کیا کریں، بہت دماغ پر زور ڈالا تو یہ سمجھ میں آیا کہ پاجامے کو کسی طرح سمیٹ سمٹا کر پتلون کی بیلٹ باندھ لیں۔ دو ماہ یہی کرتے رہے، مگر یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ میلے والے پاجامے کا کمربند گھسیٹ کر صاف میں اس کو ڈال لیتے۔ "مجھے پہلے آپ نے کیوں نہ بتا دیا کہ ایسا بھی کیا جا سکتا ہے۔"

دس بجے رات کے قریب مولوی صاحب کے کمرے سے زور سے کراہنے کی آوازیں آئیں اور اختر کو بلانے کی۔ اختر گئے اور مجھے آ کر بتایا۔ "غضب ہوا مولوی صاحب غسل خانے میں پھسل کر گر گئے۔ پاؤں میں سخت چوٹ آگئی۔ گھسٹ کر پلنگ تک آئے۔ بڑی مشکل سے میں نے پلنگ پر ان کو لٹایا ہے۔ ڈاکٹر کو بلواتا ہوں۔ خدا نہ کرے کہ ہڈی ٹوٹ

گئی ہو۔

ڈاکٹر کو فوراً" شیرو لے آیا۔ شکر کہ ہڈی ٹوٹی نہ تھی۔ پنجے اور ٹخنے کو ہلا جُلا کر بتایا کہ سخت قسم کی موچ تھی۔ الاسٹک بینڈیج باندھ دی۔ درد کے لیے گولیاں رکھ دیں۔ سنکائی کرنے کو کہا اور تین دن کھڑے ہونے سے منع کیا۔ پھر اس کے بعد بھی چند دن اور اس پاؤں پر زور کم سے کم ڈالیں۔ میں دل میں خوش کہ چلو اب تو یہ دونوں بمبئی نہ جا سکیں گے۔ مولوی صاحب نے اختر سے کہا کہ اس حالت میں اب تو وہ خود بمبئی جا ہی نہیں سکتے اس لیے ان کو جانا ہو گا اور مولوی صاحب کی طرف سے خطبۂ صدارت پڑھ دیں۔ اختر نے عذر پیش کیا۔ تو بولے "کب تک انگلی پکڑ کر تم کو میں چلاؤں گا۔ تم کو انجمن کو سنبھالنا ہے۔ میں ہمیشہ تو بیٹھا نہ رہوں گا۔ اختر نے بگڑ کر کہا۔ "یہ کیا خیالات آپ اپنے ذہن میں بٹھائے چلے جاتے ہیں کہ میں انجمن کو سنبھالوں گا۔ میں ایک آزاد سیلانی بندہ کسی کی پابندی کرنے کا اہل نہیں۔" "اچھا' اچھا نہیں ہو تو نہ سہی 'مگر اب اور کیا کیا جا سکتا ہے۔ جانا تو تم کو ہو گا۔" "یہ اور بات ہے کہ آپ سفر نہیں کر سکتے تو میں تار دے کر اس میٹنگ کو فی الحال ملتوی کروائے دیتا ہوں۔" مولوی صاحب نے کچھ پھیکی اداس سی نظروں سے میری طرف دیکھا جیسے کہ رہے ہوں۔ "دیکھا اور سنا تم نے۔" "ہاں میں اورنگ آباد پریس کے حالات دیکھنے چلا جاؤں گا۔"

کمرے میں آ کر مجھ سے کہا' یہ جو مولوی صاحب مجھ سے توقعات لگا رہے ہیں' وہ میں تو پوری کر نہیں سکتا۔ ڈکشنری کا کام مکمل ہو گا اور حسبِ وعدہ ان کو اجازت دینا پڑے گی کہ دلی جا کر وہاں سے میں اخبار نکالوں۔ تم ان کا بہت خیال رکھنا' دوا کھانے کے بڑے کچے ہیں۔ وقت پر دے دینا۔ واپسی پر تمہارے لیے کیا لاؤں؟" "بس اپنے آپ کو واپس لے آئیں۔"

دوسرے دن جب شام کو جانے لگے تو موٹر تک آئی۔ بولے "اس زحمت کی کوئی ضرورت نہ تھی۔" "لیکن یہ تو بہت ضروری تھا۔ جانے والے کو خدا حافظ کی جاتی ہے' اور سلامتی کی دعا کے ساتھ رخصت کیا جاتا ہے۔" "اچھا تو آپ یہ مجھ پر چوٹ کر رہی ہیں کہ اس بار میں موٹر تک نہیں آیا تھا۔ بھئی کچھ لکھنے میں ایسا منہمک تھا کہ یہ خیال ہی نہ آیا۔"

موٹر اسٹارٹ ہوئی اور میں اداس کمرے کی طرف لَوٹ آئی۔ مولوی صاحب نے آوازیں دے کر کمرے میں بلایا کہ آج چائے میں دَم کر کے ان کو پلاؤں۔ شاید مجھے معروف کر کے بہلانے کی کوشش کی تھی۔ رات کا کھانا ہم دونوں نے کھایا۔ وہ حقہ کے کش لگاتے جائیں اور یہ کہیں 'کیا ہوتا جو اختر بمبئی چلے جاتے۔ وہ شہر کیسا ہے۔ بتاتے ہوئے کہنے لگے۔ وہاں بے شمار ایکٹریسیں رہتی ہیں کیوں کہ وہ فلمی دنیا کا گڑھ ہے۔ ذرا ایک منٹ کو سوچو کہ اگر وہ وہاں جاتے اور کوئی ایکٹریس اختر کے گلے کا ہار بن جاتی تو تم کیا کر لیتیں؟' ایسے ڈراوے آپ کسی اور کو تو دے سکتے ہیں 'مگر مجھے نہیں۔ ہنستے ہوئے کہا۔ تم بڑی ڈھیٹ ہو۔" ڈھیٹ نہ ہوتی تو آپ جیسے دو انسانوں کے درمیان تین ماہ سے کس طرح ڈٹ کر بیٹھی رہتی؟" ایک دَم جانے کیسے خیال آیا۔ بڑی آہستگی سے پوچھا "مولوی صاحب! ایک بات پوچھوں؟ سچ سچ بتائیں گے؟" "کیا بات؟" "آپ نے شادی کیوں نہ کی؟" سچ بات تو یہ ہے کہ میں نے تو شادی نہ کی 'مگر کروائی گئی۔ والد صاحب نے کروائی۔ ان کی حکم عدولی تو کر نہ سکتا تھا۔ کسی جاہل رشتے کی لڑکی سے نکاح کے دو بول پڑھے تو گئے۔ رات کو میں کمرے کے دروازے سے داخل ہوا اور غسل خانے کے دروازے سے باہر نکل کر فرار ہو گیا۔ کئی سال تک تو کسی کو خبر ہی نہ ہو سکی۔ یہاں حیدر آباد آ گیا۔ انجمن مجھے ایک ڈبے میں ملی اس کو گود لے کر اس کی پرورش کرنا شروع کر دی۔ سالہا سال بعد گھر والوں کو پتہ چلا کہ میں یہاں ہوں۔

شکر ہے اختر کسی اسٹیشن پر اتر کے غائب نہ ہو گئے۔ غائب کیسے ہو جاتے' میں دونوں ٹانگیں نہ جھاڑ دیتا۔

ٹانگ کے لفظ پر ان کو میرے والد کی ٹانگ یاد آ گئی۔ پوچھتے ہیں' یہ تو بتاؤ تمہارے والد ظفر عمر صاحب اپنی ایک ٹانگ کہاں پھینک آئے؟ بھلا بھی کسی نے خود اپنا ہاتھ پاؤں پھینکا ہو گا؟ تو پھر آخر ہوا کیا۔ بھئی بات یہ ہوئی کہ جب میں صرف تین دن کی تھی یعنی ۱۹۱۸ء نومبر ۲۴ ء تاریخ تھی تو وہ شیر کے شکار پر گئے۔ "اِٹاوہ" شہر ہمالیہ کی ترائی کے قریب ہے' وہاں ان کی پوسٹنگ تھی۔ جب اس طرح کے ضلعوں میں وہ پوسٹ کیے جاتے تو وہ ایک ہاتھی بھی رکھا کرتے۔ شیر کے شکار پر عام طور پر پارٹی بنا کر جاتے۔ دو چار شکار کے شوقین جانے والے یار دوست مل کر جایا کرتے۔ اس دفعہ یوں اکیلے ہی چل پڑے سُنا کہ ایک

آدم خور شیر ترائی میں آیا ہوا ہے۔ بار بار آبادی کا رُخ کرتا ہے۔ یہ سن کر بڑے خوش ہوئے کہ اس کا مارنا تو بہت آسان ہے۔ اپنے فیل بان کے ساتھ شکار پر نکل پڑے۔ جنگل کے کنارے شیر نظر آیا تو دونوں نے اپنی اپنی رائفلیں لوڈ کرلیں۔ پاس ہی سے ایک نالہ گزرتا تھا۔ شیر جنگل میں گُھس کر نظروں سے غائب ہوگیا۔ ابا نے فیل بان سے کہا ہاتھی کو اُدھر چھوڑ کر نالہ پھلانگ کر کسی اونچے پیڑ پر چڑھ کر شیر کو دیکھ سکیں گے۔ ابا نے اپنی رائفل کے کارتوس نکال لیے پر وہ بدبخت فیل بان اپنی رائفل سے گولیاں نکالنا بھول گیا۔ نالہ پہلے والد صاحب پھلانگ کر سامنے ہی تو کھڑے تھے۔ اب جو فیل بان نالہ پھلانگتا ہے تو رائفل کا بٹ (دستہ) زمین پر لگا اور گولی چل گئی۔ اَبا کے ٹخنے پر گولی لگی اور وہ بھی شیر کو مارنے والی۔ ہڈی پاش پاش ہوگئی، خون کا ایک فوارہ سا بلند ہوتا دیکھ کر وہ ایسا حواس باختہ ہوا کہ جنگل میں بھاگ نکلا۔ اَبا زمین پر پڑے سوچا کیے کہ واہ کیسی موت ملے گی یا تو شیر چیر پھاڑ کر اپنا پیٹ بھرے گا، یا یہاں پڑے گل سڑ جائیں گے۔ بہتیرا فیل بان کو آوازیں دیں، مگر اس نے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ اسے اپنی جان پیاری تھی کہ ایک سپرنٹنڈنٹ پولیس کو اس کے ہاتھ سے گولی لگی ہے، وہ پکڑا جائے گا۔ یہ مرے تو وہ سولی پر چڑھا دیا جائے گا۔ اَبا کچھ دیر کو بے ہوش ہوگئے۔ جب ہوش پھر سے آیا تو دیکھا کہ ان کا ہاتھی نالا پار کرکے آچکا ہے اور ان کے چاروں طرف گھوم رہا ہے۔ اَبا بتاتے تھے کہ اب سوچا کہ لو اگر شیر نے نہ کھایا تو ہاتھی کے پاؤں تلے روندے جائیں گے۔ ایک دَم ہاتھی جنگل میں جدھر فیل بان بھاگا تھا اُدھر کو بھاگ گیا۔ خون ایسا بہہ رہا تھا کہ پھر غشی طاری ہوگئی۔ اب پھر جو ہوش آیا تو سوچا کہ ہاتھی نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔

جمیل بھائی یقین کرنے کی بات شاید آپ کو نہ لگے، پر یہ حقیقت ہے کہ ہاتھی واپس آرہا تھا اور اپنی سونڈ میں فیل بان کو جکڑے ہوئے اَبا کے پاس آکر اس نے اپنی سونڈ کا گھیرا کھول دیا۔ وہ پھر بھاگنے کی کوشش کرتا تو ہاتھی اس کا راستہ روک لیتا۔ ابا نے اس سے کہا۔ "رامو دیکھ یہ جانور ہوکر اپنے مالک کا کیسا وفادار ہے اور تو انسان ہوکر ایک انسان کی جان بچانے کے بجائے بھاگ نکلا۔ اب یہ تجھے بھاگنے تو دے گا نہیں کہ اس کی سمجھ میں یہ بات آچکی ہے کہ میرے مالک کو مدد کی ضرورت ہے تو اب جلدی سے اپنی پگڑی کے چار ٹکرے پھاڑ کر ایک ران پر کَس کے گرہ لگا۔ دوسرے کو گھٹنے کے اوپر اور

تیسرے کو پنڈلی پر اور چوتھے سے میرے پنجے پر پٹّی باندھ دے اور مجھے ہاتھی پر ڈال کر سیدھا اسٹیشن لے چل اور اسٹیشن کے پولیس والوں سے کہنا کہ وہ لوگ مجھے لکھنؤ لے جائیں۔ جیب سے ایک کاغذ نکالا، قلم کہیں گر چکا تھا۔ کہا خون میں ایک موٹا سا تنکا بھگو کر دے۔ میں اس پر یہ لکھ دیتا ہوں کہ بندوق میری تھی، میں اَن لوڈ کرنا بھول گیا، تو بے قصور ہے۔" اس کاغذ کو اپنے پاس احتیاط سے رکھنا اگر میں مرگیا تو سرکار تجھ کو مجرم قرار نہیں دے گی۔ ان کے کہنے کے مطابق رامو ابا کو اسٹیشن لایا جو چالیس میل دور تھا۔ ابا کبھی بے ہوش ہوجاتے گاہے ہوش میں آتے تو ان کے لیے یہ احساس حیران کُن ہوتا کہ انہوں نے کبھی ہاتھی کی یہ تیز رفتاری اور پھر قدم رکھنے کا یہ نبک انداز نہ دیکھا تھا کہ کسی جھٹکے کا احساس نہ ہوا۔ سگنل دے کر ہر آنے والی ریل کو پٹری سے ہٹا دیا گیا۔ انجن کے ساتھ صرف ایک ڈبّہ لگا کر ریلوے پولیس ان کو اور رامو کو لے کر لکھنؤ پہنچ گئی۔ جب پھر ہوش میں آئے تو میرے نانا خان بہادر سیّد جعفر حسین صاحب کا پتہ بتایا کہ ان کو فوراً اطلاع کی جائے۔

مولوی صاحب فوراً" اٹھ کر بیٹھ گئے کہ کیا کہا تم نے۔ سید جعفر حسین تمہارے نانا ہیں۔ یہ عظیم شخص تو علی گڑھ تحریک کا ایک خاموش مجاہد ہے۔ "ون روپی" فنڈ کا موجد۔ ان کا تن من دھن سب ہی مسلمانوں کی بیداری اور علی گڑھ یونیورسٹی کی ترقی اور بہبود میں صرف ہوا۔ بھئی وہ تمہاری شادی پر کیوں نہ آئے؟ علی گڑھ کالج کی انجینئرنگ بلڈنگ جو بنوا رہے تھے۔ بھلا وہ شادی کی شرکت کو اس کام سے کیوں کر ضروری سمجھ سکتے تھے۔ "اچھا پھر کیا ہوا تمہارے ابا کا؟" "اسپتال کے سرجن چاہتے تھے کہ ٹخنے کے اُوپر سے ہڈی کاٹ کر پنجے کو الگ کردیا جائے، مگر میرے نانا اور دادا کی ضد کہ علاج سے ٹھیک کیا جائے۔ اس چکّر میں دن گزرتے گئے۔ پھر زہر پھیلنے لگا۔ بخار ۱۰۵، اور ۱۰۶، رہتا اور بے ہوشی طاری رہتی۔ اَماں کو اس حادثے کی خبر یوں ہوئی۔ جب رات کو ہاتھی تنہا واپس آکر دیوانوں کی طرح سارے احاطے میں گھومتا چنگھاڑیں مارنے لگا اور خدا ہی بہتر جانے کس طور ابا کے عربی گھوڑے نے سمجھ لیا کہ اس کے مالک کو کچھ ہوگیا ہے تو اس نے بھی بے طرح ہنہنانا شروع کردیا۔ پھر ان جیسے شکاری کُتوں نے بے تحاشا بھونکنا شروع کیا۔ کسی کی مجال نہ پڑے کہ ہاتھی یا گھوڑے کے پاس جائے۔ شکر کہ کتے تو ایک گیراج میں بند رہے

تھے۔ اماں سخت پریشان کہ آخر ابا کہاں ہیں؟ کیا واردات بیتی۔ پولیس والے تلاش میں نکل پڑے۔ مولوی صاحب کی آنکھیں آب دیدہ ہو گئیں۔ بولے، دیکھا تم نے یہ جن کو جانور کہا جاتا ہے کتنے بڑے انسان اور وفادار ہوتے ہیں۔

رات کو نانا ابا کا تار اماں کو ملتا ہے۔ وہ پہلی گاڑی سے لکھنؤ روانہ ہو گئیں۔ میں صرف پانچ دن کی تھی۔ مجھے اپنی بہن بیگم سید اکبر حسین کے ہاں مع اور سب بچوں کے، چھوڑ کر خود اسپتال میں ابا کے پلنگ کی پٹی سے لگ کر جا بیٹھیں۔ کسے ہوش کہ ایک پانچ دن کی بچی گھر میں ہے۔ ایک سبزی والی ہماری خالہ کے گھر سبزی عرصے سے دیا کرتی تھی۔ اس کا بچہ ایک ماہ کا تھا اس کو مجھ پر ایسا ترس آیا کہ دن میں چار بار آ کر مجھے اپنا دودھ پلا جاتی۔ راتوں کو میری خالہ پانی اور دودھ چمچوں سے میرے حلق میں ڈالا کرتیں۔ ایک بار میں نے اپنی ممانی بیگم سید رفیق حسین (میرے ان ہی ماموں پر آپ نے "نیا دور" کا ایک نمبر نکالا تھا۔) ان کے جانوروں پر افسانے آئینۂ حیرت اور "گوری ہو گوری" "بے زبان" اس کتاب کا ہر نئے ایڈیشن پر جانے کس خوشی میں پبلشر نام بدلتے رہے) سے کہا، جانے کیا بات ہے کہ اگر سبزیاں اور پھل خود جا کر ایک دو ہفتے میں ڈھیر سارے خرید کر نہ لے آؤں تو یوں لگتا ہے کہ بیمار سی ہو گئی ہوں۔ بس ایک ہوک سی اٹھتی رہتی ہے۔ وہ ہنس کر بولیں۔ "بات یہ ہے کہ تم میں کنجڑن کا خون ہے" میں بگڑ گئی کہ "آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں، نوج جو مجھ میں کنجڑن کا خون ہو۔ تو بتایا کہ آج یہاں بیٹھی نظر آ رہی ہو تو اسی بیچاری کنجڑن کے رحم اور ترس کی وجہ سے۔

مولوی صاحب بے چین کہ قصہ جاری رہے۔ مجھے ایک دم ان کی وہ بات یاد آ گئی کہ جب بھی ہم پشاور جائیں تو "اختر مجھے بازار قصہ خوانی کے کسی چوراہے پر بٹھا کر آواز لگائیں کہ لوگو ایک عورت قصہ خواں سے آ کر قصہ سن لو۔ میں نے صاف اِنکار کر دیا کہ بس اب اور تو نہ سناؤں گی، پہلے چڑھاوا دے کر سنتے ہیں۔ پھر مجھے چوراہے پر بٹھوانے کی رائے دیتے ہیں۔ بولے "اچھا نہیں سناؤ گی تو یہ لو۔" جلدی جلدی اپنی پاؤں کی پٹی کو کھولنا شروع کر دیا۔ میں کہے جاؤں، ارے آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟ کس پھرتی سے پٹی کھول کھناک سے پلنگ سے نیچے کھڑے ہو گئے، جیسے موچ آئی ہی نہ ہو۔ میری گھبراہٹ دیکھ کر دو چار تالیاں بھی بجائیں میں تو سچ مچ ڈر گئی کہ خدا نہ کرے دماغ پر کچھ اثر تو نہیں

ہو گیا؟ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی اوپر دیکھوں اور کبھی نیچے تو اور بھی ہنسے کہ تم یہ سوچ رہی ہو کہ میں دیوانہ تو نہیں ہو گیا۔ ارے بچی تو تم خود ہو، یہ سمجھا ہی نہیں کہ میرے موچ ہی کب آئی تھی؟ میں غصے سے کھڑی ہو کر جانے والی ہی تھی کہ پلٹی ان کی طرف" اور دَر حقیقت بگڑ کر پوچھا پھر بتائیں اس ڈھونگ رچانے کا مطلب کیا تھا؟ اب جب کل سب کو معلوم ہوگا کہ آپ نے یہ سوانگ بھرا تو آپ کی کیا رہ جائے گی؟ سب آپ پر چھپ چھپ کر ہنسیں گے نا۔" "میں یہ معلوم ہی نہ ہونے دوں گا کسی کو۔ فوراً" پٹی لپیٹ کر پلنگ پر چت پڑ جاتا ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ عورت پیٹ کی بڑی ہلکی ہوتی ہے اور تم خود نوکروں کو بتا دو۔ بیٹھ کر پاؤں پر اوندھی پوندھی پٹی لپیٹنا شروع کر دی۔ میں نے کہا کل جب ڈاکٹر صاحب آپ کو دیکھنے آئیں گے اور یہ پھر پھر پٹی لپٹی دیکھیں گے تو وہ نہ پوچھیں گے کہ یہ پٹی کیوں کھولی؟" ہاں یہ تو ہے اب کیا کروں؟" لایئے اب میں پٹی سلیقے سے باندھ دوں۔ پہلے پٹی کو کس کر گول کر کے لپیٹا پھر پنجے کی انگلیوں سے شروع کر کے ٹخنے پر گھماتی ہوئی (FIGURE OF EIGHT) فگر آف ایٹھ سے کَس کر صفائی سے باندھی۔ بڑے حیران ہو کر دیکھتے رہے۔ بولے بھئی یہ تو بالکل ڈاکٹروں والی لگنے لگی۔ آخر، یہ تم کو کیسے آئی؟" اماں نے سکھائی کہ موچ آنے پر پٹی ایسے باندھتے ہیں۔ "یہ تمہاری اماں تو مجھے کوئی بقراط سقراط معلوم ہوتی ہیں۔ جانے کیا کیا تم کو بتا دیا ہے، مگر یہ تو بتاتی جاؤ کہ پھر تمہارے والد ٹھیک کیسے ہوئے؟

ہاں تو وہ ڈاکٹروں نے ایک دن کہہ دیا کہ ان کے دشمن ختم ہو گئے۔ ایک سفید چادر سر سے پاؤں تک اُڑھا دی۔ میرے چچا کفن دفن کے انتظام میں نکل گئے اور نانا ابا گھر پر اِطلاع کرنے اور لاش لے جانے کے انتظام میں چلے گئے۔ اب لے دے کر صرف میری ماں اور دادا ابا اسپتال میں لاش کے پاس رہ گئے۔ والدہ صاحبہ نہ رو رہی تھیں نہ منہ سے کچھ بول رہی تھیں۔ بس اپنی انگلی کی انگوٹھی کو گھمائے جا رہی تھیں۔ یہ انگوٹھی میرے ابا نے ان کو میری پیدائش پر، تحفے کے طور پر پہنائی تھی۔ جس میں ایک بڑا سا نیلم جَڑا تھا زندگی بھر میں ان کی پہلی فرمائش ابا سے ہوئی تھی کہ دل کرتا ہے کہ نیلم کی انگوٹھی پہنوں۔ وہ مطلق وہمی انسان نہ تھیں۔ جیسے ہی نیلم کے نگ پر نظر پڑی برآمدے میں نکل کر انگوٹھی اُتار دور کمپاؤنڈ میں اچھال دی۔

روزی اس وقت ابا کے ایک دوست سرجن حمید اپنے مطب جانے سے پہلے ان کو
دیکھنے آیا کرتے تھے۔ وہ داخل ہوئے "ابا کے سر سے پیر تک سفید چادر ڈھکی دیکھ کر کہہ
گئے "دوست اللہ کو پیارا ہو گیا۔" پٹی کے پاس بیٹھ کر سینے پر سر رکھ کر رونے لگے۔ ان کو
ایسے ہی دل کی خفیف سی حرکت محسوس ہوئی۔ کان کو اور دبا کر سینے پر رکھا۔ پھر اور رکھا۔
ایک جنونی کیفیت میں غسل خانے کی طرف بھاگے۔ وہاں سے نکل کر سرجیکل روم میں جا کر
ایک آری اور ہتھوڑی نما چیز اپنے ہاتھوں میں پیچھے کو چھپائے واپس کمرے میں داخل
ہو کر اماں اور دادا ابا سے کہا۔ بس پانچ منٹ کو آپ دونوں برآمدے میں چلے جائیں۔
وہ دروازے کی چٹخنی لگا کر مریض کے کھانے کی میز کا پایہ ران کے نیچے رکھ کر جیسے کوئی لکڑی
کاٹتا ہے "اسی طرح ٹانگ کو کاٹ کر جسم سے الگ کر دیا۔ دل پر کان لگا اور نبض کو پکڑ کر
بیٹھ گئے۔ ذرا سی دیر میں دل کی حرکت محسوس ہوئی اور پھر نبض کے چلنے کا احساس ہوا۔
دس منٹ اسی طرح بیٹھے رہے۔ جب یقین کامل ہو گیا کہ وہ زندہ ہیں تو باہر کمرے سے نکل
کر دیوانہ وار بھاگے اور اسپتال کا سرجن جو انگریز تھا اس کو بتایا کہ مجھ سے بے شک ایک
پیشہ ورانہ خطا تو سرزد ہوئی کہ باہر کا ڈاکٹر ہو کر میں نے آپ کے اسپتال کے مریض کے
معاملے میں دخل اندازی کی۔ میں اس کے لیے تیار ہوں کہ ڈاکٹری کی ڈگری چھن جائے
لیکن جب آپ ظفر عمر کو مردہ قرار دے ہی چکے تھے۔ میں نے اپنی اس حرکت سے مردے
میں پھر سے جان ڈال دی ہے۔ اب آپ لوگ فوراً جائیں اور آپریشن کا باقی ماندہ کام
انجام دیں۔

کئی سرجن اور ڈاکٹر کمرے میں بھاگے آئے۔ وہیں پلنگ پر اسی حال میں سوتے ہوئے
ٹانکے لگائے کہ اگر چند روز مریض بچ گزر جاتے ہیں تو پھر باقاعدہ آپریشن کریں گے۔
اسی طرح یہ خبر آگ کی طرح اڑ گئی کہ اسپتال میں ایک مردہ زندہ ہو گیا۔ ایک خلقت
اُمڈی چلی آتی تھی۔ چند دن بعد ایک آپریشن کر کے موٹی موٹی رگیں جوڑیں، ہڈی کی نال کر اور
پھر دوسرا آپریشن باریک رگیں نکال کر زخم کی تسلی بخش صفائی کر کے سی دیا گیا۔ بخار بیچ ہوتا
گیا پھر بالکل اُتر گیا مگر ابا ہوش میں کافی دن بعد آئے۔ پھر کافی دن بعد بولنے کے قابل
ہوئے اور پہلا جملہ یہ بولا۔ "میری لڑکی تو مر گئی ہوگی؟" ڈاکٹر نے اماں سے پوچھا کہ "یہ
کس کے متعلق فکر مند ہیں۔" "اس بچی کے لیے جو کوئی مجھ سے تین دن پہلے پیدا ہوئی

تھی۔" ڈاکٹروں کی رائے ہوئی کہ اس کو فوراً اسپتال بلوا کر ان کو دکھا دیں تاکہ کوئی
پریشان کن خیال دل و دماغ پر نہ رہے۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ اسپتال میری خالہ
کے گھر سے تین میل دور تھا۔ دسمبر کا مہینہ سردی قیامت کی کہ دانت سے دانت بجے۔ مگر
میرے چچا اسی وقت گھر آئے۔ اس وقت موٹریں کہاں کسی کے پاس ہوتی تھیں۔ کوئی اس
وقت سواری نہ ملی تو میری ایک پوٹلی سی باندھ کر سائیکل پر مجھے لے کر آئے۔ جیسے ہی ان
کی آنکھ کھلی تو ڈاکٹر نے ان کو یہ کہہ کر مجھے دکھایا۔ "یہ آپ کی خوش نصیب بچی ہے جس
پر خدا کی مہربانی سے آپ کو دوسری زندگی ملی ہے۔" ورنہ ساری عمر لوگ اس کو منحوس
کہتے۔ آہستہ سے کہا۔ "اس کو میرے سینے پر لٹا دو اور کچھ دیر کے لیے ڈاکٹر صاحب نے
مجھے ان کے سینے پر لٹا دیا۔

ابا نے دوست سرجن حمید کے روز ہی سر ہوتے کہ فیس نہیں لیتے تو کوئی تحفہ ہی اپنی
پسند کا مانگ لیں۔ "اچھا ظفر تم اپنا گھوڑا مجھے دے دو۔" ان کے دل میں یہ خیال کہ اب
سواری تو کبھی کر نہ سکیں گے اور نہ ہی اس کو اپنے سے جدا کریں گے، یوں ان کا اپنا دل
خراب تو ہو گا ہی، پر گھوڑے پر بھی بہت بری گزرے گی یا شاید وہ جانے کس کے پاس پہنچ
جائے۔ سرجن حمید کو گھوڑوں سے عشق تھا اور پھر یہ سفید براق عربی گھوڑا۔ ابا اماں
دونوں خوش ہو گئے کہ وہ اچھے ہاتھوں میں رہے گا۔

اچھے ہو گئے تو کہا گیا کہ گھوڑے کو لکھنؤ لایا جائے۔ تیسرے دن اس کو ریل سے لایا گیا۔
دیکھا تو وہ صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ آنکھوں کے نیچے زخم کہ وہ گھوڑا آنسو بہایا کرتا
تھا۔ دانہ بھی تھوڑا سا کھاتا تھا۔ سائیس کو بھی سواری نہ کرنے دی۔ نہ مالش اور نہلانے
کی اجازت دی۔ رنگ میلا اور کھال ہڈیوں سے چپکی ہوئی۔ ابا کا پلنگ کمرے سے
کھڑکیوں کے آگے کر کے برآمدے میں لا کر رکھا گیا۔ سب دیکھتے تھے کہ انہوں نے ایک عجیب و
غریب منظر اس وقت دیکھا کہ گھوڑا کس طور سے بھی ابا کے سرہانے آکر اپنا سر ان کے
سر پر رکھتا اور کبھی پیروں کی طرف جاتا جیسے وہ دیکھ رہا ہے۔ چند قدم پیچھے کو ہٹ کر پیچھے
پاؤں کی طرف بے حرکت کھڑا دیکھتا۔ پھر سرہانے آجاتا۔ آنکھوں سے آنسو گر رہے ہیں۔
ابا تو اس کی گردن پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔ گردن کو تھپکی دے کے چوم کے لب سے چمٹایا۔
ابا نے سرجن حمید کو اپنے پاس بلایا۔ ان کی طرف اشارہ کیا۔ گھوڑے سے دور جانے

کس زبان میں اور کس طور کیا کہا۔ پھر اپنی ٹانگ پر سے چادر ہٹا دی۔ ادھر اشارہ کیا۔ پھر سرجن حمید کی طرف اس نے اداس نظروں سے ان کی طرف دیکھا، پھر سرجن حمید کی طرف اور پھر سر نیچا کر کے کھڑا ہو گیا۔ جیسے وہ اپنی بے زبانی سے کہہ رہا ہو۔ "جو مرضی مالک آپ کی۔" ابا نے ان سے کہا کہ اب تم اس کی گردن پر ہاتھ پھیر سکتے ہو اور پھر پیٹھ پر۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ پھر لگام پکڑ کر ادھر سے اُدھر گئے۔ پھر گھوڑا ابا کے پاس لائے۔ اس نے سر جھکا دیا۔ ابا نے اس کی گردن پر ہاتھ پھیرا اور جو بھی اس سے کہا ہو۔ سائیس سے کہا اب اس پر زین کسو' اس نے اپنی گردن جھکا لی۔ اس واقعے کو دیکھنے والے چالیس پچاس لوگ جو دور دور کھڑے تھے سب ہی اشک بار تھے۔ "لو حمید اپنا گھوڑا' سوار ہو کر گھر لے جاؤ۔ اس نے پھر ایک بار مڑ کر اپنے مالک کو دیکھا' شاید خدا حافظ کہا ہو۔ جمیل بھیا! ذرا سوچیں کہ ابا کے خاموش آنسو بہہ رہے تھے' گھوڑا آنسو گرا رہا تھا اور ہر تماش بین اشک بار' خود ڈاکٹر صاحب آبدیدہ!!

ادھر اٹاوہ سے برابر اطلاع ملتی رہی کہ ہاتھی کسی کے بس کا نہیں تو لکھنؤ کے کسی سرکس والوں سے کہا گیا کہ وہ اٹاوہ جا کر مفت میں ہاتھی لے لیں۔ کتنے ایک کے بعد ایک سب ہی مر گئے۔ مولوی صاحب یہ سب سن کر بار بار اپنی گردن اِدھر سے اُدھر کرتے رہے۔ چہرے پر سخت اداسی طاری ہو گئی اور پھر بولے "کاش دنیا میں انسان کم اور جانور زیادہ ہو جائیں۔" "میں خدا حافظ کر کے جانے لگی تو پوچھا۔ "تم مجھ سے خفا نہیں ہونا؟" دیکھو جس طرح بچوں کی ٹریننگ کی جاتی ہے میں اسی طور اختر کی ٹریننگ کر رہا ہوں۔ جب دیکھا سیدھی اُنگلی گھی نہ نکلے گا تو انگلی ٹیڑھی کر لی کہ پاؤں میں موچ آگئی ہے۔ تو وہ بجائے بمبئی کے اورنگ آباد چل پڑے۔ میری تو دلی خواہش ہے کہ اختر زندگی میں بڑے بڑے کام خوش اُسلوبی سے انجام دے۔ اب دو چار دن ٹھاٹ سے بستر پر لیٹ کر آرام کروں گا اور دن کو پلنگ پر بیٹھ کر دفتری کام پر لگ جایا کروں گا۔ مگر تم کسی سے ہرگز کچھ نہ کہنا۔ "ایک شرط پر کہ آپ دونوں کسی کھیل میں ایک دوسرے سے لڑیں گے نہیں۔ اچھا خدا حافظ۔" لیکن سوچتی رہی کہ یہ کس قدر بھولے اور پھر اس قدر دانش مند بھی ہیں۔ اختر کو بھنک بھی لگ گئی یا شبہ بھی ہو گیا تو ہمارے شفیق مولوی صاحب کے سر ہو جائیں گے۔

اختر کا خاندان

دوسرے دن ابا کا خط مولوی صاحب کے پاس آیا۔ لکھا تھا کہ میری آپا جو بہت بیمار تھیں۔ ان کا انتقال ہو گیا۔ سب لوگ علی گڑھ واپس جا رہے ہیں۔ حمیدہ کو ایک ہفتے بعد وہاں بھیج دیں۔ مولوی صاحب نے دو دن بعد آہستہ سے کہا کہ تمہاری آپا کی طبیعت اچھی نہیں۔ ان کو لے کر تمہاری والدہ علی گڑھ ایک ہفتہ بعد جا رہی ہیں۔ ان کو خود بھی دہلی جانا ہے۔ اختر کا یہاں سے جانا ممکن نہیں کہ ڈکشنری کے کچھ حصے کو فوری نظر ثانی کر کے اورنگ آباد پہنچے جانا ہے۔ اختر مجھ سے بار بار کہیں کہ اگر آپ کا علی گڑھ جا کر اپنی آپا کو دیکھنے کو دل کر رہا ہو تو مولوی صاحب کے ساتھ جائیں اور اگر پندرہ دن رک سکیں تو میں آپ کو ساتھ لے کر چلوں گا۔ پر آپا کی نازک حالت کا سن کر دل تو یہ چاہتا کہ پر لگ جائیں اور میں اُڑ کر ان کے پاس جلد سے جلد پہنچ جاؤں۔ ہر بار یہی کہہ دیتی کہ میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔ مولوی صاحب کے ساتھ ہی چلی جاؤں گی۔ مگر آپ ان سے بس ایک وعدہ لے لیں کہ رستے میں نہ منہ ٹیڑھا کریں گے اور نہ ہولناک آوازیں نکالیں گے۔ اختر اس بات پر ہنس پڑے اور کہنے لگے "کوئی مولوی صاحب کی یہ عادت تو نہیں۔ اس وقت تو وہ آپ کی دل بستگی کا سامان کر رہے تھے۔" یوں وہ مجھے لے کر پہلے علی گڑھ آئے۔ چند گھنٹے قیام کر کے واپس دہلی چلے گئے۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ میری آپا اپنے سب پیاروں کو چھوڑ کر جا چکی ہیں۔ ان کے دو معصوم بیٹے خورشید عمر اور جمشید عمر اپنی بے خبری کے دور میں بن ماں کے ہو گئے۔ اب کی مولوی صاحب نے اندر بیٹھ کر زیادہ وقت والدہ صاحبہ سے باتیں کیں۔ شاید وہ گھر کے ماحول' اور سب سے واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہوں۔ یہ بھی معلوم کرنا مقصود ہوگا کہ میری اماں درحقیقت وہی شخصیت کی حامل ہیں جو انہوں نے مجھ سے کہانیوں کے طور سن سن کر اندازہ لگایا تھا۔ سچ مچ ان کی یادداشت میں ہر ایک بُھولا بُھرا یوں موجود تھا جیسے یہ ماشاء اللہ اتنے ڈھیر سے' چھوٹی بڑی پود سے' بخوبی واقف

ہیں۔ میں اور اماں حیران ہوئے جب انھوں نے جمشید کو یہ کہہ کر بلایا "بیٹے میرے قریب آکر اپنی ہرن والی آنکھیں دکھاؤ۔" وہ پاس گیا تو بولے "بھئی سچ ہی تو حمیدہ تمھاری خالہ نے کہا تھا۔ والدہ نے جب ان سے پوچھا کہ "ان کو امید تو حمیدہ سے یہ رہی کہ آپ کو شکایت کا موقع نہ دیا ہوگا۔ اب آپ مجھ کو خود بتائیں تو پورا اطمینان ہوگا۔" ہنس کر بولے۔ "سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے اور اختر نے اس کو شادی ہونے کے پچاسوں سوچ دیے مگر شاباش ہے اس کم عمر لڑکی نے نہ کبھی برا مانا نہ تیوری پر بل ڈالا۔ مجھے حیرت ہے کہ اس ماحول اور اس چہل پہل سے یہ لڑکی جانے ہمارے گھر کے ماحول میں کس طور اتنی خوش باش رہی۔ یہ آپ کی اعلیٰ صحیح قسم کی تربیت کا طفیل ہے۔ ہمارے گھر میں تو جیسے ایک تازہ ہوا کا جھونکا سا آگیا ہے۔"

جب اماں نے مجھے ان کی گفتگو خوش ہو کر بتائی تو میں بانسوں چڑھ گئی۔ مولوی صاحب ایک ہفتہ دلی رہ کر واپس حیدر آباد پہنچے تو اختر سے کہا کہ "ابھی گھر تو بسائیں بسائیں کرے گا تم اب چند روز بعد علی گڑھ جا کر وہاں چند روز قیام کر کے حمیدہ کو لے آؤ۔" دن کا گزرنا معلوم ہی نہ ہوا۔ اختر آئے چند دن "نیلی چھتری" میں رہے اور مجھے لے کر حیدر آباد آگئے۔ مولوی صاحب بچوں کی طرح خوش ہو کر بولے "اب بس تم سال بھر بعد جاؤ گی۔"

میری دلداری دونوں ہی اپنے اپنے انداز سے کرتے۔ ایک دن خود مجھے قاضی صاحب کے یہاں بھیج دیا اور ایک دن سروجنی نائیڈو کے ہاں تو اس دن انھوں نے وہ اختر والی کہانی مکمل کر دی۔

"اختر کی والدہ کی شادی سترہ برس کی عمر میں ہوگئی۔ بیگم برہان الدین نے سید اکبر حسین کا شجرہ لکھ کر پریم بدایونی کو بھیجا اور ان کی مرضی اس رشتے کے لیے دریافت کرتے ہوئے اجازت مانگی اور پہلے سے حبیب الدین کو لے کر آجانے کی خواہش کی۔ ایک خط ڈھونڈ کر نکالا اور مجھے سنایا ہی نہیں بلکہ کہا بہتر ہو کہ کاغذ پر لکھ لو۔ یہ رہا کاغذ اور قلم۔

خط میں لکھا تھا۔ "میر منصور شاہ شہنشاہ ہمایوں کے زمانے میں بیرم خاں کے ساتھ ایران سے آکر دلی میں مقیم ہوئے۔ پھر نواب مرشد علی خاں کے ساتھ آکر خاندان پٹنہ

(عظیم آباد) میں بس گیا۔ اس خاندان کے سربرآوردہ لوگ یہ تھے۔ (۱) سپاہ سالار میر مدن جو سراج الدولہ کے سالے بھی تھے۔ آخر وقت تک سراج الدولہ کا ساتھ دیتے رہے اور ۱۷۵۷ء میں انگریزوں کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ (۲) میر انصار علی (۳) میر وارث علی پٹنہ میں قیادت کرتے ہوئے شہید ہوئے۔ ایک بیٹا چھوڑا میر شجاعت علی، جن کو ایک وفادار نوکر لے کر ہمالیہ کی ترائیوں میں بھاگ گیا۔ عرصے تک روپوش رہ کر پٹنہ واپس آئے۔ سید شجاعت حسین کے نام سے۔ انگریزوں نے اس خاندان کی ساری جائیداد ضبط کر لی تھی۔ ان کے بیٹے سید اکبر حسین نے علی گڑھ سے میٹرک کیا۔ ۱۸۸۹ء میں "رڑکی" سے انجینئری ڈگری لی۔ سب سے پہلے سکھر بیراج پر چار سال کام کیا۔ پھر سی پی میں صاحبی پر نہری نظام سے متعلق انجینئر بن کر آگئے۔ لکھا تھا یہ سید اور معروف خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ بیگم صاحبہ کی یہی ایک دلی خواہش تھی کہ بیٹی ایسے ہی خاندان میں دیں۔ ۱۹۰۵ء میں ممتاز النساء کی شادی اکبر حسین سے ہونا طے پائی۔ پریم بدایونی بڑے پریم اور محبت کے ساتھ بہت سا زیور، ڈھیر سے کپڑے، بیروں چاندی کے برتن وغیرہ لے کر آئیں۔ ممتاز کی شادی پر دل کے ارمان نکالے اور مسلمانوں کی شادی کے کل طور طریقوں کو اچھی طرح بغور دیکھا کہ جب حبیب کا بیاہ وہ کریں تو کس طور کرنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی بھی خاندانی نوابی رسم و رواج میں کوئی کسر رہ جائے۔ بیگم صاحبہ نے وعدہ کیا کہ حبیب کے بیاہ پر کافی پہلے سے وہ کلکتہ آجائیں گی۔ اب یہ لوگ رائے پور یوں آگئے کہ ان کے کئی گاؤں اس جگہ سے قریب تھے اور اکبر حسین صاحب کو اپنی نہری رہائش گاہ سے آنے جانے میں بھی آسانی رہتی۔

اختر کی والدہ ممتاز النساء بڑی ذہین، بہت ہی سمجھ دار اور سوجھ بوجھ رکھنے والی خاتون تھیں۔ کورٹ آف وارڈز سے ان کے نام کی جائیداد چھوٹ چکی تھی جس کا وہ بڑی حسن و خوبی کے ساتھ انتظام کرنے لگیں۔ ایک سال بعد اختر کے بڑے بھائی مظفر حسین پیدا ہوئے۔ امور خانہ داری کے ساتھ ساتھ وہ مزید علم و ادب حاصل کرنے کے جتن کرتی رہیں۔ انگریزی ہندی اور اردو کی کتابیں بمبئی اور کلکتہ سے منگایا کرتیں۔ ساتھ ہی اخباروں اور رسالوں میں مضامین کا سلسلہ جاری رکھا۔ صبح کے وقت باقاعدہ دو گھنٹے لڑکیوں کو اردو اور انگریزی پڑھایا کرتیں۔ مظفر اور اختر کے نام بینک میں علیحدہ علیحدہ

پندرہ ہزار روپیہ جمع کروا دیا کہ اٹھارہ سال کی عمر پر لڑکوں کو بیرسٹری پڑھنے ولایت جاتے وقت ملے! دونوں لڑکوں کی نگہداشت ان کی ماما "بیرن بی" ساتھ ساتھ نانی، بیگم برہان الدین کرتیں۔ اختر ابھی دو سال کے تھے کہ نانی کا انتقال ہوگیا۔ والدہ کی موت نے ممتاز النساء کو ہلا کر رکھ دیا۔ اختر کے والد ہفتے میں ایک دن آتے اور پھر کام پر چلے جاتے۔ وہ ہزار کہتیں کہ جائیداد کا انتظام اپنے ہاتھ میں رکھیں مگر وہ یہ کہہ کر ٹال دیتے کہ جس طرح تم جائیداد کے امور حسن و خوبی سے سنبھال رہی ہو وہ اس کے اہل نہیں۔ بات شاید یہ تھی کہ اختر کی والدہ کی شخصیت اور سوجھ بوجھ اور خود اعتمادی ہر لحاظ سے ان سے زیادہ تھی۔ وہ ایسی دبنگ شخصیت بیوی کے آگے اپنے کو ہر لحاظ سے کم تر محسوس کرتے۔

ادھر کلکتہ میں اختر کے ماموں حبیب الدین بنرجی نے کیمبرج کا امتحان پاس کرلیا۔ ان کی ضد تھی اب ان کو فوراً ولایت جا کر بیرسٹری پڑھنے کی اجازت ملنا چاہیے۔ مگر پریم بدا کا کہنا تھا کہ وہ اتنا صبر کریں کہ عمر اکیس سال کی ہو جائے تاکہ وہ زیادہ تر جائیداد ان کے نام کردیں۔ موت اور زندگی کا کیا ٹھیک ہے۔ کافی رقم تو وہ بیٹے کے نام بینک میں جمع کر ہی چکی تھیں۔ اس بیٹے کی محبت نے ان کو جیسے اندھا سا کر دیا تھا۔

پریم بدا کے گھر ایک سے ایک بڑے لوگوں کا آنا جانا تھا۔ بڑے بڑے شاعر، ادیب، سیاست داں، امراء اور موسیقار آیا جایا کرتے۔ ساتھ ہی ان انگریزوں کا جو باذوق اور ہندوستانی محفلوں کا شوق رکھتے تھے گویا کہ ان کا گھر پیرس کی ان خواتین کی طرح تھا جو "سالون" (SALON) کہلایا جاتا تھا۔ ایک انگریز کرنل براؤن، ان کی بیوی اور بیٹی "ریٹا" کا بہت آنا جانا تھا۔ حبیب کی "ریٹا" سے بہت دوستی اور بے تکلفی ہوگئی۔ اسی زمانے میں کرنل صاحب کا ٹرانسفر بمبئی ہوگیا۔ پریم تو اپنی جگہ اڑی ہوئی تھیں کہ ایک سال بعد ہی ولایت بھیجوں گی۔ حبیب کو کوئی بہانہ چاہیے تھا۔ پریم سے ناراض ہو کر بغیر ان کو بتائے خاموشی سے کلکتہ چھوڑ کر بمبئی نکل پڑے۔ پریم کی پریشانی اور غم کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ان کو کرنل صاحب کے خط سے ایک ہفتے بعد معلوم ہوگیا کہ حبیب بمبئی میں ہیں۔ ان کی انا نے یہ اجازت نہ دی کہ حبیب کو خود خط لکھیں۔ کرنل صاحب کو خط لکھا کہ ان کے بیٹے کو سمجھا کر فوراً کلکتہ واپس بجھوائیں۔ ان پر تو عشق کا بھوت سوار تھا کیوں جاتے؟ آخر پھر مجھے (سروجنی نائیڈو) خط لکھا کہ فوراً بمبئی جا کر حبیب کو سمجھا بجھا کر

کلکتہ بھجواؤں۔ میں وہاں گئی۔ ہر اونچ نیچ سمجھائی کہ تم اپنی اس ماں کو ناراض کر کے تباہ ہو جاؤ گے۔ ساری جائیداد سے محروم ہو کر بیرسٹری کے خواب بھی دھرے رہ جائیں گے۔ رائے پور کی ساری جائیداد تمہاری بہن کے نام ہے، مگر ان پر کسی کی بات کا اثر نہ ہوا۔ بغاوت کا خون تو ان کی رگوں میں تھا ہی۔ پھر پریم خود بمبئی گئیں۔ حبیب کو بلوایا تو وہ ان سے ملنے بھی نہ آئے۔ اس کا ان کو بڑا قلق ہوا۔ دل شکستہ واپس آگئیں۔ طیش میں آکر اپنی جائیداد کا بڑا حصہ فلاحی اداروں کے نام کردیا۔ کلکتہ کا جو اس وقت سب سے بڑا پارک ہے وہ زمین پارک کے لیے دے دی اور ساتھ ہی کئی بچوں کے اسکولوں کے لیے ٹرسٹ بنا دیا۔ اس صدمے کا اثر پریم بدا پر یوں پڑا کہ شاعری اور ادب سے یک لخت کنارہ کشی اختیار کرلی۔ سالوں بعد پھر قلم اٹھایا۔ اختر کی والدہ نے بھائی کو سمجھانے کے لیے بہت خط لکھے تو ان کو جواب دیا کہ "تم اس قدر فکرمند کیوں ہو کہ میں جائیداد سے محروم کر دیا جاؤں گا۔ مجھے اس کی مطلق فکر اور پرواہ نہیں۔ آخر اس پر میرا کیا حق ہے؟ ہاں والد جو تمہارے نام چھوڑ گئے ہیں اس میں جو شرعی حصہ میرا ہے وہ تم میرے نام کردو۔ اختر کی والدہ نے بغیر اپنے شوہر سے مشورہ کیے، بڑی ایمان داری سے وہ حصے ان کے نام کردیے۔ شہر میں کئی مکانات اور دکانیں اور تین گاؤں ایک کے بعد ایک فروخت کر کے بمبئی میں عیش و عشرت میں لاابالی کی زندگی گزارتے رہے۔ اختر تین سال کے ہوئے تو والدہ کا انتقال ہوگیا۔ ایک ماہ پہلے نانی کا انتقال ہو ہی چکا تھا۔

اب یہ دو بچے ایک سات سال کا اور ایک تین سال کا گھر میں اکیلے بڑی بی ماما کے اور ڈیوڑھی پر ملازم بخشی میاں کی نگرانی میں تھے۔ اختر کی دادی پٹنہ میں ہنوز حیات تھیں۔ ان کا اصرار پیہم ہوا کہ اتنے چھوٹے بچے ہیں۔ اکبر حسین پٹنہ آئیں تاکہ وہ دوسرا نکاح کروادیں۔ سید اکبر حسین پٹنہ گئے۔ دوسری شادی ہوئی، وہ بیوی کو لے کر رائے پور آئے۔ جب گھر میں داخل ہونے لگے تو بڑی بی تن کر کھڑی ہو گئیں اور سوتیلی ماں کو گھر میں قدم بھی نہ رکھنے دیا، یہ کہہ کر کہ یہ بچوں کا اپنا گھر ہے ان کی ماں کی طرف سے، اس میں سوتیلی ماں نہیں رہ سکتی۔ اکبر حسین کچھ زیادہ ہی شریف اور غیور انسان تھے کہ بیوی کو لے کر اپنے کیمپ نربدا ندی کے کنارے لے آئے اور پھر چند ماہ بعد پٹنہ پہنچا دیا۔

یہ بات مجھے وحید الحق صدیقی جو اختر کے دور کے رشتے کے ماموں تھے اور ان کی بیوی

اختر کی والدہ کی دوست تھیں ان سے معلوم ہوئی۔ بڑی بی کسی دور کے رشتے دار کے ہاں بھی دونوں بچوں کو جانے نہ دیتی تھیں کہ کوئی ان کو جائیداد کی وجہ سے زہر نہ دے دے۔ والد کی طرف سے بھی تاکید تھی۔ حبیب الدین بزنس بمبئی سے آتے اور اپنے کو لڑکوں کا کاربھی ظاہر کرکے ایک کے بعد ایک مکان اور دکانیں فروخت کرتے رہے اور دور کے رشتے دار حبیب الدین کی طرف داری میں خاموش تماشائی بنے رہے۔ کوئی کچھ منہ سے نہ بولا۔

باپ اور لڑکوں کا فاصلہ بڑھتا رہا۔ وہ کھڑے کھڑے آتے اور چلے جاتے۔ ماں تھیں تو "بڑی بی" اتالیق تھیں تو جاہل بڑی بی' وہ محبت' شفقت تو ہر طرح سے دیتی رہیں' ہر طور سے بچوں کی سیوا ٹہل کرتی رہیں' مگر اپنے پیار میں اٹھتے بیٹھتے سوتیلی ماں کے خلاف ضرور دماغوں میں زہر گھولتی رہی ہوں گی۔ ایک بار جب والد بھی چھٹی لے کر پٹنہ جانے لگے اور لڑکوں کو پٹنہ لے جانے کو کہا تو "بڑی بی" کی یہ شرط ہوئی کہ جب تک ان کے بچے پٹنہ رہیں گے اس گھر میں سوتیلی ماں نہ رہیں گی اور وہ خود اپنے ہاتھ سے الگ لڑکوں کے لیے کھانا پکا کر کھلائیں گی۔

جمیل بھائی! اگر آپ پھر سے "گرد راہ" پڑھیں' تو اختر نے ایک ہی بار پٹنہ جانے کا ذکر بڑے دلچسپ انداز سے کیا ہے مگر وہاں سوتیلی ماں کا وجود نہیں ہے۔ اکبر حسین صاحب مرحوم کس قدر شریف' نیک اور دبی ہوئی شخصیت کے انسان نظر آتے ہیں۔ کوئی دوسرا ہوتا تو ایسی ملازمہ کی ایسی تیسی کرکے دھتا بتا دیتا۔

شمیم بھائی کو خود ان کے والد نے جاکر اسکول میں داخل کرایا تھا۔ وہ اسکول سے آکر ماسٹروں کی سختی اور پٹائی کی باتیں بڑی بی کو بتایا کرتے۔ بڑی بی نے دل میں سوچ لیا کہ "وہ اختر کو اس اسکول میں ہرگز نہ جانے دیں گی' بلکہ جو خاصا دور اسکول ہے اس میں داخل کرائیں گی۔ وہ اسکول ہندی کا تھا۔ یہ بڑی بی ہی کی ضد تھی جس کو ان کے والد کو ماننا پڑا۔ اس طرح اختر کی تعلیم شروع ہی سے ہندی میں ہونے لگی۔

سروجنی نائیڈو نے کہانی کے اختتام پر یہ بھی بتایا کہ جب پریم بدا کو معلوم ہوا کہ "یہ دو بچے اکیلے گھر میں نوکروں کے ہاتھوں پل رہے ہیں تو ان (سروجنی نائیڈو) سے مشورہ کیا کہ کیا وہ رائے پور جاکر سید اکبر حسین سے اجازت لے کر بچوں کو اپنے پاس کلکتہ لے

آئیں۔ تو انہوں نے بڑی سختی سے پریم بدا کو منع کیا کہ آپ ایسا غضب نہ کریں۔ کیا حبیب الدین کو پال پوس کر کوئی سبق حاصل نہ ہوا۔ ہر پودا اپنی ہی زمین میں نشو و نما پا سکتا ہے اور یہ کہ اگر حبیب الدین کو وہ گود نہ لیتیں تو شاید وہ بہتر انسان بنتے' جیسے کہ ان کی بہن ممتاز النساء یعنی اختر کی والدہ تھیں تمہارے بے جا لاڈ اور پیار نے ایک زندگی تباہ و برباد کردی۔ ان دو کو تو خدارا ان کے حال پر چھوڑ ہی نہ دیں بلکہ کسی بھی ذریعے سے ان کی خیر خبر بھی نہ لیا کریں۔ قدرت کو منظور ہوگا تو ان ہی حالات میں رہ کر یہ کچھ ضرور بن کر کھڑے ہو جائیں گے۔

اب یہ دو بچے خودرَو پودوں کی طرح نشو و نما پا رہے تھے۔ شمیم بھائی دس سال کی عمر میں شعر و شاعری کے چکر میں پڑ گئے۔ ان کے دوست اور' اختر کے دوست اور۔ اختر کا مزاج علم کی جستجو کی طرف تھا۔ بڑی بی کی زبانی جانے کس کس انداز میں بار بار کانوں میں یہ بات پڑتی رہی ہوگی کہ ماں بچوں کے لیے بڑی جائیداد اور ڈھیروں زیورات چھوڑ گئی ہیں اور یہ کہ جب مظفر پیدا ہوئے تو ان کے نام بنک میں پندرہ ہزار کی رقم جمع کرائی کہ میٹرک کے بعد بیرسٹری پڑھنے ولایت جائیں اور اسی طرح جب اختر پیدا ہوئے تو ان کے لیے بھی پندرہ ہزار روپے ولایت کی تعلیم کے لیے بنک میں جمع رکھے ہوئے ہیں (اس وقت کے پندرہ ہزار آج کے پندرہ لاکھ کے برابر تو ہوں گے)

شمیم بھائی اپنے والد کی طرح بے انتہا شریف اور سیدھے سادے انسان تھے۔ جب وہ میٹرک میں فیل ہوگئے تو والد صاحب نے کہا کہ وہ دونوں کلکتہ چلے جائیں اور وہاں جاکر پڑھیں تو انہوں نے ۔ کوئی بحث کی نہ تکرار کہ پہلے میٹرک تو رائے پور سے کرلیں بلکہ بڑی خوشی خوشی چل دیے۔

اختر بالکل ان سے مختلف تھے۔ نو دس سال کی عمر میں تقریریں کرتے۔ اسکول کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ اپنے اسکول کے میگزین میں مضامین لکھتے۔ سنسکرت کے مضمون میں ہندو لڑکوں سے بہتر نمبر لیتے۔ جس جگہ سے جیسی بھی کتابیں ہاتھ لگ جاتیں پڑھ ڈالتے۔ وہیں رائے پور میں ایک لوہار کی ایسی دکان تھی کہ اس نے ایک ننھی سی لائبریری بنا رکھی تھی۔ وہاں کی ساری کتابیں پڑھ ڈالیں۔ جب یہ ختم ہوگئیں تو لوہار نے مشورہ دیا کہ شہر کے باہر جنگلات کے شروع میں ایک مندر ہے اس میں بھی ایک

چھوٹی سی لائبریری ہے اب وہاں سے کتابیں لا کر پڑھنے لگے۔ خود "گردِ راہ" میں اس کا
ذکر بس ایک جملے میں یوں لکھا ہے کہ "جب میں نے اس کو اپنے ابا کا نام بتایا تو بیچاری
نے کہا کیوں نہیں تم کو یہ شوق وراثت میں ملا ہے۔" یہ نہیں لکھا کہ ابا تھے کون اور نام
کیا تھا۔ میں نے جب "گردِ راہ" کا مکمل مسودہ پڑھا تو جگہ جگہ پر بے اختیار میرا جی چاہا
کہ بہت کچھ جو یہ ان کہا چھوڑتے چلے گئے ہیں میں اس کو پُر کر دوں مگر میری کیا مجال تھی
کہ "اشارتاً" بھی کچھ کہہ سکتی۔ اس وقت مجھ کو کیا خبر تھی کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ
ہمارے جمیل بھائی کس خوب صورتی سے مجھ سے لکھوا لیں گے مگر میرا ضمیر مجھے ملامت
نہیں کر رہا کہ اختر نے تو مجھ سے یہی کہا تھا کہ کبھی ان سے خاندانی معاملات پر کوئی بات نہ
کروں۔ یہ تو نہیں کہا تھا کہ جمیل جالبی صاحب کو کچھ لکھ کر دے دینا۔

ہاں تو دس سال اور گزر گئے۔ ایک گھر تھا جس میں یہ دو لڑکے تھے۔ ایک سناٹے اور
ہو کا عالم، رنگ و بو کا نام و نشان نہیں۔ نہ کوئی آتا تھا، نہ کوئی جاتا تھا۔ صرف گھر کے اندر
ایک بڑی بی بچاری جن پر یقیناً یہ دونوں جا اور بے جا دھونس جمایا کرتے ہوں گے۔ جو
بھی من میں سماتا ہو گا کر گزرتے ہوں گے۔ جب من ہوا گھر آ گئے اور جب جی چاہا باہر
نکل پڑے۔ کس قسم کے دوستوں میں اٹھتے بیٹھتے ہیں، کیا پڑھتے ہیں۔ سڑکوں پر مٹرگشت
اور اس کی چہل پہل دل بستگی کا سامان ہوتی ہو گی۔ کیسی عید کیسی بقرعید؟ بچاری دُکھی
کے دن کیسے گزرتے ہوں۔ بڑی بی کھانا پکانے اور کام کاج میں دن بھر مصروف، ہاں
راتوں کو اپنے پوتے سے ضرور چمکار رکھتی ہوں گی۔ نہ دادی نہ نانی اور نہ ہی چچی، ممانی یا
خالہ اور بہنیں۔ ایک ماموں تھے جو بمبئی میں عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے تھے اور
اگر کبھی آئے تو کچھ نہ کچھ ان دونوں کے منھ کا [illegible] پھر واپس بمبئی چلے جاتے۔ اب
جب آتے مہمان کے طور پر۔ بڑی بی لڑکوں کی جا اور بے جا طرف داری کچھ اس انداز
سے کرتیں کہ گویا ان کو ڈانٹنے کا کوئی حق ہی نہیں۔ یہ نیک اور شریف ہستی اپنے کو بڑی
بی کے احسانات میں دبا ہوا محسوس کرتے کہ وہ جس شفقت اور پیار سے ان دونوں کو پال
رہی ہیں، وہ کوئی اور نہیں کر سکتا۔

جب اختر نے میٹرک کا امتحان پوزیشن سے پاس کر لیا تو بڑی بی نے ان کو پہلے ہی سے
کہہ سن رکھا تھا کہ "تم ہرگز مظفر کی طرح باپ کی باتوں میں نہ آ جانا۔ تم کو اب وہاں سے

جا کر اپنے ابا کی طرح بیرسٹری پڑھنا ہے۔ یہی تمہاری ماں کی خواہش تھی جس کے لیے
انھوں نے علیحدہ روپیہ بنک میں جمع کروا دیا تھا۔ اکبر حسین صاحب جب گھر آتے ہیں تو
اختر نے ان سے خوشی خوشی بتایا ہو گا اور آگے پڑھنے کی بات کی ہو گی۔ یقیناً" ضد اور
تکرار بھی کی ہو گی۔ ان کا تو مزاج ہی نہ تھا کہ ایسی ویسی کسی کی بات سے بھی متفق
ہو جائے۔ انھوں نے ہر بات کی تہہ تک پہنچنے والا دماغ پایا تھا۔ تو پھر ان کو والد نے صحیح
اور کھری بات بتا ہی دی کہ وہ اب مزید تعلیم کے سلسلے میں کچھ بھی نہیں کر سکتے کہ ایک
بزنس میں دونوں کا اور اپنا اثاثہ سب لگا دیا جو سارا کا سارا ڈوب گیا۔ جائیداد کا بیشتر حصہ
ماموں صاحب نے فروخت کر دیا۔ ماں کا زیور جس کا وزن من بھر کے اوپر تھا وہ بکس پورا
چوری ہو گیا۔ اگر کلکتہ جا کر پڑھنا چاہیں تو اس وقت وہ یہ دو سو روپیہ دے سکتے ہیں۔ بعد
میں خود کما کر اپنی پڑھائی جاری رکھیں اور ساتھ ہی کام بھی کرتے رہیں۔

اختر کے والد جب میری دس سال کی لگاتار کوشش کے بعد دہلی ہمارے پاس آئے، تو
آتے ہی یہ جملہ کہا تھا۔ "اختر میں تمہارے پاس نہیں بلکہ اس بچی کے پاس آیا ہوں۔ اس
کو دیکھنے کا ارمان تھا کہ جس طرح خاموشی سے اس کے خط میرے نام آتے رہے کہ کاش
آپ میری یہ تمنا پوری کر دیں اور ایک بار ہی آ جائیں، اگر بیٹے کے گھر نہیں آتے تو اپنی
بچی سے ملنے آ جائیں۔" ہر ہفتے ان کا ایک خط مجھے ملتا رہا اور میں نے کبھی جواب نہ دیا مگر
شاباش ہے اس لڑکی کو، کبھی یہ نہ لکھا کہ جواب کیوں نہیں دیا۔ اب کچھ میری صحت ایسی
خراب رہنے لگی تو سوچا ایک بار جا کر اس لڑکی سے مل آؤں، یوں تم کو بھی دیکھ لوں گا اور
تمہارے بچوں کو بھی۔"

وقت میں یہ بڑی خوبی ہے کہ بُرا اور اچھا یکساں نہیں رہتا۔ دل کے کاری زخموں پر
شکوے اور شکایات کے تودوں پر بڑے انداز سے مرہم بھی رکھتا رہتا ہے۔ گاہے ان کے
نشانات کو یکسر مٹا دیتا ہے۔ محبت اور پیار کے رشتوں کے بندھن سے بندھے لوگ اپنی انا
کی خاطر خواہ کتنی ہی دور پہنچ جائیں مگر وقت کا مرہم اپنا کام کچھ اس طور کیے جاتا ہے کہ
آمنا سامنا ہوتے ہی اس کے وجود کا احساس باقی نہیں رہ جاتا۔ جس وقت باپ بیٹے آمنے
سامنے آ گئے تو دونوں کی خوشی اور مسرت سے چھلکتی نظریں میں دیکھتی رہی۔ ایک بہت
لاغر، کمزور اور زندگی کی آخری منزل کا مسافر اور دوسرا گبھرو جوان، ہمت اور جوانی کی

طاقت سے تنا ہوا۔ اپنے چاروں اطراف علم کی روشنی کے لپکے سے بکھیرتا۔ سرخم کرکے جب والد صاحب سے لپٹ کر ملا تو ایسا لگا جیسے اختر کو دونوں جہان کی بادشاہت مل گئی۔ باپ اور بیٹا اشکبار تھے اور میری آنکھوں سے خوشی کے آنسوؤں کا دریا سا بہہ نکلا۔ اپنے مولا کا دل ہی دل میں شکرانہ ادا کرتی ہوئی سوچتی رہی کہ اب اماں یہ کہہ سکیں گی ہاں میں ان کی بیٹی ہوں۔ ان کے یہ جملے کہ کوشش کیے جاؤ تو بار آور ہو جاؤ گی۔

بڑی بی کی زبانی تو یہ ہمیشہ سنا کرتے کہ بہت جائیداد ہے۔ پڑھائی کے لیے روپیہ پیسہ' شادی کرو گے تو سیروں زیور ہے اور والد سے ۱۶ سال کی عمر میں سنتے ہیں بس یہ گھر اور گاؤں ہے۔ بہتر ہو کہ گاؤں کا انتظام سنبھال لو۔ تعلیم کا کوئی بندوبست اب وہ نہیں کر سکتے۔ بس سوچ لیا کہ شہر چھوڑ دو۔ یہ گھر بار چھوڑو۔ ہر رشتہ ناتا توڑو۔ علم حاصل کرنا ہے تو کنواں کھودو اور پانی پیو۔

گھر بڑی بی کو رہنے کے لیے دے کر کلکتہ روانہ ہو گئے۔ پریم بدا کا ذکر اختر نے یقیناً بڑی بی سے سنا ہو یا اپنے حبیب الدین ماموں سے کہ یہ جب بھی کچھ بیچنے رائے پور آتے تو اپنے دونوں بھانجوں سے ملتے ضرور تھے۔ اختر کے دل میں پریم بدا سے ملنے اور ان کو دیکھنے کی خواہش کچھ ایسی ہی ہوگی کہ کلکتہ پہنچتے ہی بنگلہ زبان پہلے سیکھ لیں اور ان کی شاعری اور نثر کی کتابیں پڑھ لیں تو پھر ان سے ملا جائے جو طریقہ اختر کا میں نے نئی زبان سیکھنے کا پیرس جاتے میں دیکھا اسی طور بنگلہ سیکھی ہوگی۔ ایک پاکٹ ڈکشنری فرنچ کی لے لی۔ ایک انگریزی کا اور ایک فرنچ کا روزنامہ۔ انگریزی کا اخبار پڑھ کر فرنچ کا روزنامہ کھول کر ڈکشنری کی مدد لیتے۔ ایک فرنچ میاں بیوی جو پہلے دن ہی مل گئے تھے۔ بلا تکلف ان سے دریافت کر لیتے۔ اکثر وہ پاس بیٹھ کر فرنچ کا تلفظ اور گرامر کے اصول بتاتے۔ پندرہ روز کے بعد جب فرانس کی سرزمین پر قدم رکھا تو اپنا مطلب سمجھا سکتے تھے' دوسرے کی بات سمجھ سکتے تھے۔ اسی طرح بنگلہ سیکھ لی ہوگی۔

جمیل بھیا! ذرا چلیں پھر حیدر آباد دیکھیں کہ اب وہاں کیا ہو رہا ہے۔ وہی کہ ہر شام بیڈ منٹن کھیلا جا رہا ہے اور ایک بلّا ٹوٹ ٹوٹ جاتا۔ کھانے کے بعد تاش یا پچیسی ہوتی۔ تاش کی گڈی پھٹ جاتی' پچیسی کی بساط پھاڑ ڈالی جاتی' کوڑیاں باغ میں اچھال دی جاتیں۔ جھٹ ایک دوسرے سے رُوٹھ جاتے اور پھٹ سے میل ملاپ ہو کر بڑی شگفتہ قسم کی

گفتگو ہونے لگتی' کبھی اس میں بھی گرما گرم بحث ہو جایا کرتی۔ میں بور ہو کر اُٹھنے لگتی تو مجھے بٹھا رکھنے کی یہ ترکیب کی جاتی کہ ایک نرالے قسم کی بیت بازی دونوں کے درمیان یکایک شروع ہو جاتی اور میں حیرت زدہ ہو کر پھر مونڈھے پر جم کر بیٹھ جاتی۔ میں نے تو ساری عمر بیت بازی میں اشعار کا پڑھا جانا سنا تھا مگر یہ کیا؟ اچھا آپ ہی بتائیں پہلے تو سن لیں۔

مولوی صاحب۔ "نوچو!" اختر۔ "بکوٹو" مولوی صاحب۔ "ٹوٹو۔" اختر۔ "کھسوٹو۔" مولوی صاحب۔ "ٹھیلو۔" اختر۔ "ڈھکیلو۔" مولوی صاحب۔ "جھاڑو۔" اختر۔ "بھوڑو۔" وغیرہ وغیرہ کم سے کم چالیس الفاظ۔

بحر بدل گئی۔ مولوی صاحب۔ "ناکا۔" اختر۔ "جھانکا۔" مولوی صاحب۔ "بھونکا۔" اختر۔ "ڈڑوکا۔" مولوی صاحب۔ "دھونکا۔" اختر۔ "جھونکا" وغیرہ وغیرہ۔

بحر پھر بدل گئی۔ مولوی صاحب۔ "جھڑا جھڑ۔" اختر۔ "تڑاتڑ۔" مولوی صاحب "فرافر۔" اختر۔ "پھڑ پھڑ۔" وغیرہ وغیرہ۔

بھئی جمیل بھائی اس کی نہیں رہی کہ آپ اس قدر ہنس کر لوٹ پوٹ ہوں۔ جانیے اب ہم بھی اور نہیں سنائیں گے مگر یہ بتا دیں کہ اس ڈیزائن کی کبھی کوئی بیت بازی سنی؟ نئی بحر کم سے کم بیس پچیس لفظ کے بعد آتی۔ کیسی پھرتی سے الفاظ پٹا پٹ بولتے چلے جاتے اور مزے کی بات یہ کہ دونوں بے حد سیریس رہتے۔ پہلی جب اس قسم کی بیت بازی سنی تو پوچھ بیٹھی کہ آخر یہ کیا شے ہے؟ اور اس کا موجد ہے کون؟ کہا "کون ہو سکتا ہے' ہم خود ہی ہیں۔ بھلا کوئی بات ہوئی کہ ایک ایک بالشت کے عشقیہ اشعار پڑھ رہے ہیں۔ میں ہنس پڑی "ذرا یہ سوچیے کہ اگر کوئی اور ان کو سن لے تو کیا آپ دونوں کا نام روشن کرتا پھرے۔" "کسی کی مجال ہے کہ ہمارے گھر کے اندر آئے اور سنے۔

ہم دونوں سروجنی نائیڈو کی سیامی بلی کا بچہ اس امید پر لے آئے کہ بڑھ کر اپنی ماں کی طرح خوب صورت نکلے گا۔ وہ تو جوں جوں بڑھتا گیا بدصورتی کا پوٹ "کالا بجنگ ہوتا جاتا۔ اختر نے اس کا نام لامار رکھا۔ اور نازی کے مقابلے میں اس کے زیادہ لاڈ کرتے۔ اس بات پر مولوی صاحب جل جاتے اور نازی کی ہر طرح طرف داری کرنے لگتے۔

مولوی صاحب نے ایک دن مجھ سے پوچھا۔ حمیدہ یہ بڑی عجیب سی بات ہے کہ نہ تم

کبھی بازار گئیں اور نہ ہی کچھ خریدا۔ جاؤ کسی دن سروجنی کے ساتھ اور جو دل کرے خرید لو۔ میں نے کہا "کیسے خرید لوں؟" پوچھا کہ کیا اختر تم کو کچھ روپیہ نہیں دیتے؟ وہ دیتے ضرور ہیں مگر سب گھر میں خرچ ہو جاتے ہیں۔ آخر مہینے میں تو مجھے لفافے سے قرض لینا پڑتا ہے۔ پھر پہلی آتے ہی سب سے پہلے تو لفافے کا قرضہ واپس کرتی ہوں۔ وہ بھونچکا سے ہو گئے۔ "یہ کیا کہا تم نے کہ لفافے سے قرض لیتی ہو، پھر لفافے کا قرض چکاتی ہو، میں کچھ سمجھا نہیں۔" بات یوں ہے کہ اماں نے شادی سے پہلے ایک بات یہ بھی کہی تھی کہ دو لفافے سادے لے کر ایک پر لکھنا "برائے قرض" دوسرے پر "برائے اشد ضروری" اور جو روپے تم کو گھر چلانے کے لیے دیے جائیں تو کچھ ایک میں اور کچھ دوسرے میں رکھ دینا اور جو بھی روپے آخر ماہ پر بچ جائیں ان کو بھی آدھا آدھا کر کے لفافوں میں رکھ دیا کرنا۔ اگر کبھی گھر کا خرچ کم پڑ جائے تو قرض لفافے سے قرض لے لیا کرنا، مگر پہلی کے بعد پہلے لفافے کا قرضہ چکا دیا کرنا۔ اشد ضرورت والے کو جبھی ہاتھ لگانا جب در حقیقت کچھ وقت بے وقت برات رات کوئی خدا نہ کرے ڈاکٹر، دوا یا اسپتال جانے کی ضرورت پڑ جائے۔ ایسا کرتی رہو گی تو کبھی کسی کے سامنے شرمساری اٹھانا نہ پڑے گی۔ میں نے خود ساری زندگی ایسا کیا۔" جب پہلے مہینے آپ نے گھر کا خرچہ دیا تو ایسا ہی کیا کہ ان دو لفافوں میں بے گنے تھوڑے تھوڑے روپے رکھ دیے۔ جب آپ کے دیے ختم ہو جاتے تو آخر والے خرچ کرتی۔ وہ بھی ختم ہو کر مہینے کے چند دن باقی رہ جاتے تو مجبوراً "لفافے سے قرض لے لیتی۔ جو لفافے کا قرض واپس کرنا پڑتا۔ یوں ایک چکر سا چلتا رہتا ہے۔ مولوی صاحب یہ سن کر ہنسی کے مارے بے حال ہو گئے۔ میں حیرت زدہ کہ اس میں ہنسی کی کیا بات ہے۔ پھر انہوں نے اختر کو پکار کر بلایا اور پوچھا کہ میاں تم کو کچھ قرض چاہیے؟ اختر کچھ اچھے موڈ میں تھے، کہا ہاں ضرور چاہیے۔ اگر آپ سب کو قرض دینے پر تلے ہوئے ہیں۔" کہا "تو جاؤ لفافے سے قرض لے لو۔" "بھئی یہ لفافے خاں صاحب کون ہیں اور کدھر ہیں؟" مولوی صاحب نے اختر کو بتایا کہ تمہاری بیوی ہر ماہ کے آخر میں لفافے سے قرض لے کر کام چلاتی ہیں، پھر پہلی کو لفافے کا قرض ادا کرتی ہیں اور ہاں ایک "اشد ضروری" لفافہ اور بھی بنا رکھا ہے۔" "یہ کیوں ایسا کرتی ہیں؟" "بھئی ان کی اماں بڑی توپ انسان ہیں۔ مجھ سے تو پہلی ملاقات پر ایک جملہ کہا تھا۔ "براہ مہربانی آپ اور اختر میاں

حمیدہ سے اتنا ہی مذاق روا رکھیے گا جس قدر اس سیدھی سادھی لڑکی کا کچا دماغ سمجھ سکے اور خدا جانے کیا اس سیدھی سادھی لڑکی کے دماغ میں بھر کر اس کو ایک چکر میں ڈال دیا ہے اور یہ ہیں کہ اتنے فاصلے پر بیٹھ کر بس وہی کرے گی جو اماں نے کہہ دیا تھا۔" "اب تو دونوں نے میری چڑھ سی بنالی تھی۔ کئی دن بعد کہا تم نے مجھے پہلے ہی کیوں نہ بتا دیا تھا، میں خود دونوں لفافوں کا حصہ الگ سے رکھ دیتا، بلاوجہ اپنے کو پریشان رکھا۔ اصل میں تمہاری اماں ہیں بہت سمجھ دار اور تم حد درجے کی بدھو ہو کہ ہر وہ بات ضرور کرو گی جو انہوں نے تم کو پٹی پڑھا دی۔

باتوں باتوں میں کبھی مجھ سے پوچھا تھا کہ یہ بتانا کہ تمہارے گھر عید، بقرعید کیسے منائی جاتی ہے؟ میں نے ان کو بتایا کہ "پندرہ دن پہلے اماں دو تھان لٹھے کے جو چالیس گز کے ہوتے اور دو تھان ململ کے منگا کر ہم بہنوں کے آگے ڈال دیتیں کہ لو اب اس میں سے عید کے جوڑے سب کے اور اپنے سی لو۔ پہلے تو جناب ہم سارے نوکروں اور ان کے بچوں، اور بیویوں کے سیتے۔ پھر اپنے بھائیوں کے بہنوں کے پھر اپنی باری آتی۔ اتنی ڈھیروں سلائیاں شاموں اور راتوں کو کرتے۔ اماں کو ہم پر ترس تو نہ آتا، مگر ترس کھا کر ہمارے بھائی لوگ مشین پر سے ہم کو ہٹا کر خود سیدھی والی سلائیوں پر مشین چلانے لگتے۔ عید، بقرعید میں ہمارے ململ کے چنے ہوئے دوپٹوں پر بس ایک پتلا سا گوٹا ٹنک جاتا اور وہی لٹھے کا غرارہ یا تنگ پاجامہ اور ململ کے کرتے، بس ہو گئے عید کے جوڑے۔ ہمارے اندر کا برآمدہ بے تحاشہ چوڑا تھا اس میں بیچم بیچ تخت کا چوکا بے حد بڑا سا۔ ایک طرف دیوار سے لگا ہوا اور تین طرف سے کھلا ہوا۔ ہم کو تو سب کے لیے کمربند تک سینا ہوتے۔ سلائی سے ایک دو بجے رات کو فرصت پا کر جھٹا جھٹ اِستری کر کے سب کے پاجاموں میں کمربند ڈال کر تھکے ہارے لمبی لمبی سانس لیتے کہ اللہ کا شکر سب کام ختم ہوا۔ تخت پر بس کپڑے ہی تو حساب سے جما کر رکھنا ہیں پہلے ابا پھر اماں کی ساری، پھر عمر کے لحاظ سے باقی سب کے جوڑے۔ ابا اور لڑکوں کے جوڑوں پر نماز کی ٹوپیاں، موزے اور رومال۔ ہر ایک کے جوڑے کے سامنے اس کے جوتے اور چپلیں۔ جو بھی لڑکے اور لڑکیاں، کزن اور دوستوں کے بچے ہوتے ان سب کے جوڑے بھی۔ صبح سویرے ہر ایک اپنا اپنا جوڑا اٹھا لیتا۔ مرد اور لڑکے پہلے نہا کر کالی شیروانیاں پہن کر عید گاہ کے لیے روانہ
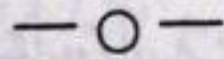
ہوتے۔ ہم جلدی جلدی پہلے اندر اور باہر کے کھانوں کی میزوں پر طرح طرح کی نمکین اور میٹھی چیزیں لگاکر آخر میں سوئیوں کے ڈونگے رکھ کر جلدی جلدی نہادھو کر نیا جوڑا پہن تیار ہوجاتے۔ اب ابا اور سب بھائی لوگ عید گاہ سے واپس آکر عید ملتے۔ پھر ابا ہم سب کو عیدی دیتے۔ دو دو روپے اور اگر دادا ابا آئے ہوتے تو وہ چار آنے دیتے۔ کوئی ایک بن عطر کی شیشی لے کر سب کے عطر لگادیتی۔ اگر بقر عید ہے تو ابا اور بھائی باہر جاکر قربانی کرتے۔ جب کلیجی گرماگرم بُھن کر میز پر آجاتی تو ناشتہ کرتے۔" سب تفصیل سن کر بولے۔ ہمارے گھر میں بھی بس اسی طرح بقر عید ہوگی۔ میں سوچ میں پڑگئی تو پھر بقرعید کیوں کرمنائی جائے گی۔ رات کو کہہ دیا تھا کہ صبح سویرے اُٹھنا ہے سب کو یعنی مجھے۔ خود اور اختر پانچ بجے اُٹھ کر سیر کرنے جایا ہی کرتے تھے۔

صبح چھے بجے اُٹھ کر برآمدے میں آئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ تخت پر پہلے مولوی صاحب کا جوڑا رکھا ہوا' نیچے جُوتے' پھر اختر کا مع رومال اور موزے' نیچے جوتا پھر میرے لیے بہت خوب صورت ساری اور سلا ہوا بلاؤز' نیچے چپّل اور ساری پر چُوڑیاں۔ (یہ مولوی صاحب نے سروجنی نائیڈو سے کہہ کر تیار کروایا تھا۔ ان کا درزی میرے بلاؤز سی چکا تھا) اور خود برآمدے میں چائے بنانے کی تیاری کررہے تھے۔ ساتھ ہی میز پر کچھ کھانے کی چیزیں پہلے سے محبوب رکھ چکا تھا۔ میری آنکھوں میں خوشی سے آنسو آگئے کہ یہ سب کس طور خفیہ کروایا۔ اپنے آنسو چھپانے کو باغ کی طرف دیکھنے لگی تو کیا عجب تماشا دیکھا کہ نیچے سامنے والی جن کیاریوں میں پرسوں ہی میں نے پھولوں کی پنیری' جو صرف انگل انگل بھر کی تھی' لگائی تھی۔ ان سب میں پھول کس طرح نکل آئے اور وہ بھی "پٹونیا" کی پنیری میں "کینے" کے بڑے بڑے پھول۔ حیرت کے مارے میری بری حالت۔ دیکھ کر ہنسے اور کہا۔ "پودے بھی اپنی عید منانے کے لیے وقت سے پہلے پھول اگر دیدیں تو ہرج ہی کیا ہے؟" میں بھاگ کر نیچے کیاریوں کے پاس گئی تو دیکھا بالشت بالشت نکموں میں ایک ایک کینا کا پھول ٹھونس کر پنیری کے پاس مٹی میں ٹھونس دیے ہیں! اپنی اس شرارت پر کیسے نازاں ہوکر برآمدے میں کھڑے مسکرا رہے تھے۔ مجھے اوپر کی طرف آتا دیکھ کر جلدی سے کمرے میں چلے گئے۔ دونوں تیار ہوکر نکلے' تو کہا اچھا اب ہم دونوں عید گاہ جارہے ہیں۔ پیدل ہی جائیں گے یہاں سے دور نہیں۔ شادی کے بعد یہ پہلی عید میری

اپنے گھر میں ہوئی۔ مولوی صاحب کے اس خیال اور پیار کے تصوّر سے آنکھوں میں آنسو آگئے۔ دونوں عید گاہ سے واپس آئے۔ گلے لگاکر عید مبارک کہنے کے بعد ایک اشرفی جیب سے نکال کر مجھے دی اور ایک اختر کو۔ اختر نے مجھے بڑے خوب صورت دست بند دیے۔

— ○ —

جہاں نما

جمیل بھائی! آپ سب نے بابائے اردو کو اور طرح دیکھا ہے یعنی ایک عالم، مفکر، ناقد، معظم، ادیب اور اردو زبان کے کھیون ہار، مگر میں اور اختر خوش نصیب ہستی ہیں جنھوں نے بابائے اردو کو بہت ہی عظیم انسان کی حیثیت سے دیکھا کہ وہ کیسی محبت، شفقت، دلداریوں کا بہتا سمندر تھے۔ علمیت اور اردو کے عشق نے ان کو ایک ایسا سپاہی بنائے رکھا جو چوبیں گھنٹے محاذ پر کھڑا ہو۔ کسی نے کبھی سوچا ہی نہ ہوگا کہ وہ کتنے تھک جاتے ہوں گے جو شخص 'انسانوں کا ایک انبوہ لیے مشعل دکھاتا' راہ بجھاتا ہراول دستے کا راہی ہے کس قدر اندر سے تنہا اور چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے اپنے آپ کو محروم رکھتا رہا ہے۔

تین چار روز بعد مولوی صاحب اور اختر پندرہ روز کے لمبی ٹور پر نکلے۔ پہلے کلکتہ پھر دلی اور پھر ہاپوڑ۔ میں پھر نواب منظور یار جنگ کے ہاں پہنچ گئی۔ بہت اچھا وقت گزرا۔ منیر بانو کی چھٹیاں جو تھیں۔ واپسی پر دونوں ہی میرے لیے طرح طرح کی سوغاتیں لائے۔ اس طرح ایک سال گزر گیا۔ دسمبر کے آخر میں مولوی صاحب نے فرمایا کہ بھئی شادی کی سالگرہ اگر دھوم دھام سے کریں تو کیسا رہے گا؟ میں نے اس کا جواب دیا میں آپ کے ہاتھ جوڑتی ہوں، مجھ پر رحم کریں کہ پھر دیکھیے والا حشر نہ ہو جائے۔ ہنسنے لگے۔ "اگر تم نہیں چاہتی ہو تو نہ سہی۔ بس ایک تحفے پر ٹرخادوں گا مگر اتنا سن لو کہ ناخوشگوار بات کو یادداشت میں ٹانک کر رکھ چھوڑنا نہیں چاہیے۔ دل دماغ پر اگر بُری باتوں کے تختے چڑھ جائیں تو وہ کسی کام کا نہیں رہتا۔"

اختر نے پاکٹ ڈکشنری بھی تیار کر دی۔ مجھے کچھ ایسا لگتا کہ اختر کچھ پریشان سے ہیں، اداس اداس سے۔ مولوی صاحب کو بھی اس کا احساس ہوا۔ مجھ سے پوچھتے کہ کوئی بات ہے، ضرور تم نے اختر سے لڑائی کی ہے۔ بڑا چُپ چُپ سا اور کچھ کھویا کھویا لگتا ہے۔ کئی دن سے کوئی لڑائی جھگڑا بھی نہیں کیا۔ پہلی بار اس جمعہ کو گھر پر رہے۔ اپنے جگری دوست

بے سوریا نائیڈو کے گھر بھی نہ گئے۔ کہا کہ میں تو یہ سمجھ رہی تھی آپ ہی سے کوئی گمبھیر قسم کی کوئی جھگڑالو بات ہوئی ہوگی۔ آپ پوچھیں نا ان سے کہ آخر بات کیا ہے؟

رات کو میں ہمت کر کے پوچھ ہی بیٹھی کہ یہ تو بتائیں کہ چند روز سے آپ اتنے کھوئے کھوئے اور چپ چپ سے کیوں ہیں۔ آج مولوی صاحب مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ جب صبح میں نے اختر کو جھگڑالو خاں کہا تو کچھ ایسی چپ لگی ہوئی تھی کہ شاید وہ میرا نام جھگڑو خاں بھول گئے تھے، بس خاموش رہے۔' اختر کچھ گھبرائے کہ اچھا مولوی صاحب کو یہ احساس پریشان کر رہا ہے کہ میں چُپ چُپ سا کیوں ہوں؟ چند منٹ کی خاموشی کے بعد بولے۔ "حمیدہ مجھ کو اس بات کا دکھ ہے کہ جب ہم مولوی صاحب سے جدا ہوں گے تو ان کو بڑا صدمہ ہوگا۔ اسی سوچ بچار میں رہتا ہوں کہ مولوی صاحب سے کہوں تو کیسے کہوں؟ میں گھبرا کر اُٹھ بیٹھی کہ۔ "آپ آخر کیا کہہ رہے ہیں۔ بھلا ہم مولوی صاحب سے جدا کب ہو رہے ہیں؟ بات ذرا کھول کر کہیے۔ بولے اب میرا کام ختم ہو گیا۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم یہاں سے دلی چلے جائیں اور وہاں سے ایک ہفتہ وار اخبار نکالیں۔ اسی وعدے پر میں علی گڑھ سے مولوی صاحب کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ پورے ڈھائی سال پتّا مارا اور جم کر بیٹھ کر ہر طرح کا کام انجام دیتا رہا۔

سچ تو یہ ہے کہ یہ سن کر مجھے ایک جھٹکا سا لگا کہ۔ یہ کیسے ممکن ہے ہم دونوں مولوی صاحب کو یہاں چھوڑ دیں اور خود ہم دلی چلے جائیں۔ میری خاموشی اور وحشت کو دیکھ کر اختر کہنے لگے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ خبر مولوی صاحب کو کن الفاظ میں سناؤں۔ جانتا ہوں کہ وہ یہ سن کر کس قدر آزردہ ہوں گے، ہمارے بغیر ان کو یہ گھر کس قدر بُرا لگے گا۔ جب کہ ان کو یقین کامل ہے کہ اب ہم دونوں ہمیشہ ان کے پاس ہوں گے۔ گو میں نے بارہا ان سے کہا کہ وہ اس خیال کو اپنے دل سے نکال دیں کہ میں ان کی انجمن کو تاعمر گود میں بٹھا کر ان کی طرح پالنے کی صلاحیت اور شوق رکھتا ہوں، مسئلہ تو اب ان سے اس بارے میں بات کرنے کا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو پہلے میں ان کو بتا دوں، جو بھی دھکا ان کو لگے گا اور یہ خبر سن کر جو بھی اشتعال ان کو آئے گا آپ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھنے سے بچ جائیں گے۔ پھر بعد میں آپ ان سے بات کر لیجیے گا۔

مجھے ایسا لگا کہ ایک بڑا بوجھ میں نے ان پر سے ہٹا دیا ہے۔ بولے "ہاں، یہ ٹھیک ہے۔

جواب تھا کہ اختر اگر جانا چاہتے ہیں تو ظاہر ہے مجھے بھی جانا ہی ہوگا۔ گو مجھے آپ سے جدا
ہونے کے خیال ہی سے بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔ "حمیدہ بس اب تم یہ کرو کہ اختر سے
کہہ دو کہ جب تک مولوی صاحب دلی نہیں جاتے میں حیدر آباد ہی میں رہوں گی۔ تب
شاید اختر اپنا ارادہ بدل دے۔ مولوی صاحب بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ اختر چلے جائیں اور
میں ساتھ ان کے نہ جاؤں۔ آپ ہی ہمیشہ مجھ سے کہا کرتے کہ ضدی 'ہٹی' ہے' جو من میں
سما جائے گی وہ کر گزرے گی۔ خود تو اپنی بات دوسروں سے منوالے گا پر خود کبھی جھکے گا
نہیں اور یہ کہ حمیدہ تم ہمیشہ اس بات کا خیال رکھنا یہ تو کوہالات بن جائے گا۔ ہمیشہ اس کی
بات ہنسی خوشی مان لیا کرنا۔" اب تو وہ جھنجھلا پڑے۔ کہنے لگے "میں نے ظفر سے
تمہارا رشتہ مانگا تو وہ اختر سے تمہاری شادی کرنے پر رضامند ہوئے۔ اس لیے میرے اوپر
تو بڑی ذمے داری ہے کہ تم کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ دنیا مافیہا کی خبر تم کو تو ہے نہیں۔ اختر
اخبار نکالیں گے اس میں انگریزوں کے خلاف لکھیں گے۔ پکڑے جائیں گے اور جیل پہنچ
جائیں گے۔ پھر کیا ہوگا؟——"میرا سر فخر سے اونچا ہو جائے گا کہ کسی عظیم مقصد کے
لیے میرا شوہر جیل گیا ہے۔ میں ان کے کام کو جاری رکھوں گی۔" "پھر تو بڑی خوش فہمی تم
کو اپنے متعلق ہو گئی ہے۔" "آپ اور اخبار کا کام!" بڑی کمزوری سی مسکراہٹ ان کے
چہرے سے عیاں ہو رہی تھی۔ بولے۔ "تم کو جانے سے انکار کرنا ہی ہوگا۔ تب ہی اختر
مجبور ہو کر رک سکتے ہیں۔" خدارا آپ ایسی کوئی بات نہ کہیں جو میں کر ہی نہیں سکتی۔
مولوی صاحب کا منہ لٹک سا گیا۔ آنکھوں میں گہری اداسی چھا گئی۔ مجھے بہت گھور کر
دیکھا۔ ان نظروں میں اس وقت غصہ بھی تھا' محبت بھی اور رحم بھی۔ صرف اتنا کہا "غلطی
تو میری ہی تھی جو یہ سمجھ بیٹھا کہ تم دونوں زندگی بھر میرے پاس رہو گے۔"

تین دن میں ہمارا سامان سمٹ سمٹا کر بند ہو گیا۔ آج یکم مارچ ۱۹۴۳ء ہے۔ شام کی
گاڑی سے ہم کو روانہ ہونا ہے۔ ناشتے کے وقت مولوی صاحب اپنے کمرے سے نکل کر
نہ آئے' اندر سے دروازہ بند کر لیا تھا۔ میری نظر پیالیوں کی طرف گئی۔ ایک پیالی کم تھی۔
سماوار کو ہاتھ لگایا تو وہ گرم تھا یعنی آج بہت ہی سویرے اٹھ کر چائے صرف اپنے لیے
بنا کر' پیالی میں ڈال کر کمرے میں جا چٹخنی لگالی۔ ہم دونوں نے بہت آوازیں دیں کہ آپ
ناشتہ تو ہمیں مل کر کریں' مگر کواڑ نہ کھولا' بس یہی جواب ملتا کہ سر میں بہت درد ہے۔'

بھوک قطعی نہیں۔ نہ ہی آج شربت پیا نہ حقے کے لیے دروازہ کھولا۔ میں اختر کے سر ہو کر
آپ جا کر دروازہ کھلوائیں۔ آخر کیسے ہم ان کو خدا حافظ کہے بنا جا سکتے ہیں۔ اختر نے
بڑے اداس لہجے میں کہا۔ میں ان کو خوب سمجھتا ہوں وہ ضدی ہیں۔ ہرگز دروازہ نہ
کھولیں گے۔ دروازے کے پاس جا کر ہم دونوں نے خدا حافظ کہا۔ اختر نے یہ بھی کہا کہ
جلد دورہ نکال کر دلی آئیں۔ ہمارے پاس ٹھہریں۔ میں ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ ایسا لگ
رہا تھا' جیسے میکے سے سسرال کے لیے سوار ہو رہی ہوں۔ اس گھر میں کیسی خوشی خوشی
داخل ہوئی تھی اور آج کتنی اداس اور بے کل سی جا رہی تھی۔ جب ہم موٹر میں بیٹھ گئے
تو دیکھا کہ کھڑکی کا پردہ ذرا سا ہٹا ہوا ہے اور ان کا اداس چہرہ نظر آ رہا ہے۔ ہاتھوں سے
منہ کو چھپا کر بے اختیار روتی چلی گئی۔ اختر نے تو اپنا چہرہ دوسری طرف جلدی سے کر لیا
تھا۔ "کمبخت "نازی" کو مولوی صاحب کی ضد اور حکم پر ہم کو اپنے ساتھ دلی لے جانا
پڑا۔ نازی کی موجودگی ان کو ہماری یاد دلائے گی اور دلی میں ایک چھوٹے سے فلیٹ میں
ہم کو تنگ کرے گا تو ان کو یہ خیال خوش کرے گا۔

شاہد احمد دہلوی (ساقی والے) کو اختر نے لکھ دیا تھا کہ دو بیڈ روم کا ایک فلیٹ دریا گنج
میں ہمارے لیے طے کر رکھیں۔ انہوں نے نہ صرف فلیٹ کا انتظام کیا بلکہ ضرورت بھر کا
کرائے کا فرنیچر بھی لے کر رکھوایا۔ کھانے کی میز پر ڈبل روٹی' مکھن' چائے کی پتی کا ڈبہ'
شکر اور انڈے بھی رکھے ہوئے تھے۔ باورچی خانے میں ہر طرح کی دالیں' مصالحہ' نمک'
گھی اور آٹا تک لا کر رکھ دیا تھا۔ اپنے گھر سے چند پتیلیاں' کفگیر' تسلا اور کچھ کھانا کھانے
اور چائے کے برتن! یہ سب یوں کیا کہ ان کو دوستوں سے معلوم ہو چکا تھا کہ مولوی
صاحب نے میرے جہیز کا سارا سامان "الم غلم اور کاٹ کباڑ" کہہ کر ساتھ کچھ بھی جانے
نہ دیا تھا۔ نازی کو دیکھ کر بڑی ناک بھوں چڑھائی کہ ایک عدد کتا لانے کی کیا تک تھی۔ ہم
کو اپنے گھر لے گئے' رات وہاں گزار کر ہم فلیٹ پر صبح صبح آ گئے' فلیٹ ہوادار اور روشن
تھا۔ پہلا کام یہ کیا کہ اماں کو خط لکھا کہ فوراً "ابراہیم کے ساتھ بستر' برتن وغیرہ سب بھیج
دیں۔ تیسرے دن ابراہیم آ گیا سامان کے ساتھ اور اپنے والد کو بھی لے آیا جسے ہمارے
پاس باورچی کا کام کرنا تھا۔ چند دن میں فلیٹ رہائش کے قابل کر لیا۔ کھانا گھر میں پکنے لگا۔
نازی نے بے حد اودھم مچا رکھا تھا۔ وہ غریب بولایا ہوا تھا کہ کہاں مولوی صاحب کی لق

ذق کوٹھی اور باغ' کہاں یہ فلیٹ کی زندگی اور اس کی پابندیاں! بولایا ہوا ایک کمرے سے
دوسرے کمرے میں بھاگا بھاگا پھرتا۔ کبھی اختر کو کبھی مجھے بڑی اداس نظروں سے دیکھ کر
گردن اونچی کرکے بڑی ہی کرب والی آواز سے 'ہو' کرتا۔ جیسے مولوی صاحب کو نہ پاکر
اپنے صدمے اور غم کا اظہار کر رہا ہو اور ہم سے معلوم کرنا چاہتا ہو کہ وہ کہاں ہیں؟! اختر
اس کو گود میں اٹھا لیتے اور جانے کس زبان میں اس کو سمجھانے کی کوشش کرتے۔ آخر کار
اس کی سمجھ میں کسی طور آ ہی گیا اور صبر کر لیا۔ اختر کو مولوی صاحب پر کبھی غصہ آجاتا کہ
اس بدبخت کو ہمارے سر منڈھ کر ان کو کیا مل گیا؟

اختر تیسرے دن سے قلم اور کاغذ لے بیٹھے۔ سب سے پہلے "جہاں نما" کے نام سے
ایک ہفتہ وار اخبار نکالنے کے لیے ڈکلریشن کے لیے درخواست روانہ کرکے' مختلف
لوگوں کو خطوط مضامین کے لیے لکھ کر سپرد ڈاک کیے اور خود مضامین لکھنے پر لگ گئے۔
بہت سے اچھے اور نفیس قسم کے مضامین کے تراجم بھی کر ڈالے۔ مولوی صاحب کو خط تو
ریل سے اترتے ہی آدھا لکھ لیا تھا۔ آدھا فلیٹ پہنچ کر خط مکمل کرکے نیچے ٹہلتے ہوئے گئے
اور پوسٹ کے ڈبے میں ڈال کر اخبار لے کر آگئے تھے۔ میں نے اطمینان سے رات کو
بیٹھ کر خط لکھا جس میں سفر کی ساری تفصیل کہ کس کس طرح نازی اچھل کود کرکے
بھونک بھونک کر ان کو یاد کرتا ہے پھر فلیٹ کا پورا نقشہ کھینچا۔ نیچے سڑک سے جو بھی اور
جس قسم کی آوازیں اور صدا لگاتے پھیری والے گزرتے ان سب کو بھی قلم بند کیا۔ نازی
کی بے چارگی' آہ و زاری کہ کس کس انداز سے اپنے مالک کو بلا رہا ہے۔ آنکھوں سے
آنسو ریل میں بہاتا رہا اور یہاں آکر بھی بہا رہا ہے۔ کھاتا کچھ نہیں رہا۔ نقاہت سے نڈھال
ہو کر جب پست پڑ جاتا ہے' تب آپ کے بازو بلا اطمینان کی سانس لے پاتے ہیں (میں نے
بھی کیسے جھوٹ موٹ بڑے ہی دردناک سین کھینچے کہ پڑھتے وقت ان کو یہ لگے کہ وہ مجھ
سے کوئی کہانی سن رہے ہیں) وہ تو ان دیکھے جانوروں کا دکھ سن کر تڑپ اُٹھتے تھے جب
اپنے لاڈلے نازی کا سنیں گے کہ ایسا دگرگوں حال ہے تو جلد سے جلد دہلی آنے کا کریں
گے۔ میں ہر دوسرے دن مزے دار تفصیلی خط لکھ کر سپرد ڈاک کرتی رہی کہ وہ پڑھتے
وقت بھی مسکرائیں اور کبھی لگے کہ ہم ان سے دور آکر بھی تو ان ہی کے آس پاس ہیں۔
اختر نے بھی ایک اور خط لکھا کہ تار سے آنے کی تاریخ بتائیں۔ ان کو اس نکتے سے بلا

فلیٹ میں وہ آرام تو نہ مل سکے گا' مگر ان کو بیٹے اور بیٹی کا پیار ملے گا جو ایک مدت کو بھی
ان کی شفقت اور محبت بھول نہیں سکتے۔ ان خطوط سے ان کو ضرور خوشی ہوگی ہوگی۔
فوراً جواب دیا کہ دو ہفتے بعد وہ دہلی فلاں ٹرین سے آئیں گے اور ساتھ ہی یہ خبر بھی دی
کہ پنجرے کے چاروں دروازے کھلے رہ گئے سب چڑیاں اُڑ گئیں۔ راجہ اور رانی کو زو
(Zoo) والوں کے سپرد کر دیا۔ دونوں وہاں مزے میں ہیں۔

خط پڑھ کر اختر بولے۔ "خود ہی مولوی صاحب نے دروازہ کھول کر چھڑی پنجرے پر مار
مار کر چڑیاں اُڑا دی ہوں گی۔ راجہ اور رانی کو دیکھ کر ہم دونوں یاد آتے ہوں گے تو ان
بچاروں کو بھی چلتا کیا اور نازی کو زبردستی ہمارے ساتھ کرکے اپنی یاد دلانے کا سامان کیا۔
ان کو آنے دیجیے' میں بھی نازی کو ان کے ساتھ نہ کروں تو میرا نام اختر نہیں۔"

دس بارہ روز کے بعد سے خطوط کے جواب آنا شروع ہو گئے۔ بعض کے ساتھ
مضامین بھی آگئے۔ سندر لال جی کا "ہندو مسلم اتحاد" پریم چند کا غیر مطبوعہ افسانہ' منٹو کا
افسانہ' جوش صاحب اور اقبال اور مجاز کی نظمیں اور بھی بہت سے لوگوں کی تحریریں۔
اختر کو جلدی تھی کہ مولوی صاحب کے آنے سے پہلے چند پرچوں کا جگاڑ ترتیب دے کر
اس کی شکل نکل آئے تاکہ مولوی صاحب دیکھ کر اپنی رائے دے سکیں۔ اختر سب ہی کچھ
دانستہ یا نادانستہ مجھے پڑھنے کو دینے لگے اور سب کچھ بتانے لگے کہ رسالے کی ترتیب کس
طرح ہوگی۔ میں دل میں پھولے نہ سماتی کہ اللہ کا شکر ہے کہ مجھے اس قابل تو گردانا۔
رات کو اختر بہت دیر تک کام کرتے۔ میں بھی چائے کی پیالی ان کے سامنے خاموشی سے
رکھ جاتی' کبھی کافی کی۔ کسی دن کوئی مضمون دے دیتے کہ اس کو ذرا شمارہ نمبر تین کے
رجسٹر پر اُتار دیں۔ مجھے ایسا لگتا کہ اب میری زندگی کا بھی مقصد ہے۔ اختر کے کسی کام میں
ہاتھ بٹا کر بڑی عجیب سی مسرت محسوس کرتی۔

حسبِ وعدہ چند روز بعد مولوی صاحب دہلی تشریف لائے اور ہمارے ساتھ قیام کیا۔
نازی ان کو دیکھ کر پاگل پنے پر اُتر آیا۔ کبھی گود میں چڑھ بیٹھے' کبھی پاؤں میں لوٹن کبوتری
بن جائے' کبھی منہ کو چاٹنا چاہے' تو ان کی داڑھی درمیان میں حائل ہو کر اس کے اظہار
محبت کا مزا کرکرا کر دے تو سر اٹھا کر خوشی کی آوازیں نکالنے پر اکتفا کرتا۔ مولوی صاحب کو
اس بے ساختگی سے اظہار محبت پر غصہ اور جھنجلاہٹ ہونے لگی ایک بارگی ایدا ام کے

ابا کو یوں کہہ کر آواز دی۔ "کڑک مرغی، کڑک مرغی تم ادھر آؤ۔" ہم دونوں حیران کہ
الٰہی یہ کڑک مرغی کون ہے؟ مگر بڈھن بھاگتے ہوئے سامنے آکھڑے ہوئے اور کہا "جی
سرکار" سامنے آیا تو ہم کو پہلی بار یہ احساس ہوا کہ واقعی بڈھن اپنے چھوٹے سے قد اور
اس پر ڈھیلا ڈھالا پھیلا ہوا گوشت، پتلی سی داڑھی، مرغی کی سی چال، جیسے سچ مچ کڑک
مرغی ہو۔ ہم دونوں کے ساتھ خود بھی ہنسنے لگے، مگر پھر بھی بڑی کڑک دار آواز سے کہا
"لے جاؤ اس کتے کو اور جا کر کہیں چھوڑ آؤ۔ اس نے ناک میں دم کر دیا۔" خانساماں اس
کا کان پکڑ کر دوسرے کمرے میں سیڑھیوں سے اتار کر لے گیا۔ اس کی ہم تینوں کو خبر نہ
ہوئی۔ شام کو چائے کے وقت جب نازی کو بسکٹ دینے کے لیے آواز دی اور وہ نہ آیا تو
پکار کر کہا "کڑک مرغی! اب تو اس بچارے کو کھول دے۔" تو اس نے سامنے آکر کہا
"میرے سرکار! آپ کے حکم پر میں تو اس کو جامع مسجد کی سیڑھیوں کے پاس چھوڑ آیا تھا۔
مولوی صاحب گھبرا کر کھڑے ہو گئے، چائے اسی طرح پیالی میں چھوڑ دی۔ "چلو چلو اختر
جلدی چلو نازی کو ڈھونڈ کر لانا ہے۔" دونوں کئی گھنٹے بعد کھانے کے وقت واپس آگئے۔
اختر اداس تو بہت تھے مگر پھر بھی ہنس ہنس کر مجھے بتانے لگے "بھلا مجھے کون پہچانتا، مگر
مولوی صاحب کے جاننے والے دسیوں ملتے رہے۔ وہ لپک کر مولانا صاحب کہتے ہوئے
ان کی طرف بڑھتے اور یہ "نازی، نازی۔" کہتے ہوئے کبھی دائیں کبھی بائیں تیز تیز مڑ
جاتے یا لپکتے ہوئے آگے ہو جاتے۔ دیکھ لینا کل یہ خبر اخباروں میں چھپ جائے گی۔
میرا خیال تھا کہ نازی بھٹکتا بھٹکتا ضرور واپس آجائے گا۔

صبح اختر کو اپنے حصے کا تھیلا لینے بھیج دیا تو میرے ہاتھ میں ایک موٹا سا لفافہ لے پاس
آکر فرمایا "سنو اسے رکھ لو۔" "اس میں کیا آپ کا مضمون "جہاں نما" کے لیے ہے۔" بولے
"اس میں کچھ روپے ہیں، یہ تمہارے میرے پاس رکھے ہوئے تھے۔" "کبھی وہ کیسے؟" "جو
فرنیچر اور قالین میں نے تمہارے لیے خریدے تھے۔ دوسرے ہی دن تمہارے روانہ
ہونے کے بعد میں نے اسی دکان دار کو بلا کر واپس دے دیے تھے۔ جو بھی اس نے روپے
دیے وہ اس لفافے میں ہیں۔ میں نے کہا۔ "نہیں۔ نہیں۔ مولوی صاحب میں یہ کیسے
لے لوں۔ اختر کو معلوم ہوگا تو مجھ پر بری طرح بگڑ جائیں گے۔" "ہاں تم ٹھیک کہتی ہو۔ چلو
تم نہ رکھو۔ ان دونوں لفافوں "برائے قرض" اور "اشد ضروری" کو آدھے آدھے دے

دو۔" پھر تو تم نے نہ لیے اور نہ ہی وہ لفافے اختر سے جا کر بتائیں گے۔ ان کے چہرے پر جو
دکھ بھری مسکراہٹ تھی اس کو دیکھ کر میں انکار نہ کر سکی۔ لفافہ ہاتھ میں پکڑ لیا مگر آنکھوں
میں آنسو بھر آئے۔ پھر بولے "ہاں حمیدہ یہ ہمیشہ یاد رکھنا کہ کبھی کوئی ضرورت ہو تو مجھے
لکھ دیا کرنا۔ پھر سال سوا سال میں انجمن دہلی منتقل ہو ہی جائے گی تو پھر ہم تینوں یک جا
ہو جائیں گے۔"

دوسرے دن مولوی صاحب اختر کو لے گئے جو سب سے اچھا اور قیمتی کاغذ تھا اس کو
"جہاں نما" کے لیے پسند کیا۔ گھر واپس آکر تین شماروں کا مواد رجسٹروں پر لکھا جا چکا تھا۔
اس پر نظر ڈالی اور بہت خوش ہو کر کہا "جہاں نما" اپنی قسم کا ایک ہی رسالہ ہوگا۔ دو صفحے
آخر کے انجمن کی مطبوعات کے اشتہار کے لیے رکھنا۔ اختر کے کھلے ہوئے چہرے کو دیکھ
کر میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ اب دونوں کے دل بوجھل نہیں رہے۔

تیسرے دن مولوی صاحب واپس تشریف لے گئے۔ اختر تمام وقت لکھنے میں مصروف۔
ڈاک آتی۔ خطوط کے جواب بڑے ہی ہمت افزا آتے رہے۔ رسالے کے لیے مواد
خوب جمع ہو رہا تھا۔ دو ماہ گزرنے والے ہیں۔ اب کسی دن بھی اخبار کے لیے ڈکلریشن کا
خط بس آتا ہی ہوگا، تو وہ خط آیا اور یہ خبر لایا کہ گورنمنٹ اخبار نکالنے کی اجازت یوں
نہیں دے سکتی کہ اختر کا ریکارڈ کلکتہ علی گڑھ اور حیدر آباد کا گورنمنٹ کی نظر میں درست
نہیں ہے۔ اختر نے پڑھ کر خط میرے ہاتھ میں دے دیا۔ کہا "مجھے تو خود بارہا یہ خیال آیا
مگر آپ سے اس لیے نہ کہا کہ آپ تڑ سے وہی جملہ کہہ دیں گی کہ آخر تاریک پہلو کیوں
نظر میں رکھیں۔ بات یہ ہے کہ آپ نے تو اب تک زندگی کے صرف روشن اور خوش
کن پہلو دیکھے ہیں۔ بالکونی میں جا کھڑے ہوئے۔ سڑک کی چہل پہل کو کافی دیر دیکھا
کیے۔ پھر دفتر والے کمرے میں آکر ان مضامین کو یکجا کیا جو اب تک "جہاں نما" کے لیے
موصول ہوئے تھے۔ میرے ہاتھ میں دے کہ آپ ان سب کو شکریے کے خط کے ساتھ
صرف اتنا لکھ کر کہ ڈکلریشن نہیں ملا، اس لیے میں آپ کی امانت لوٹا رہی ہوں۔ اپنے
بچے کو کفنانے کی فی الحال مجھ میں ہمت نہیں۔ ہم کو دہلی جلد سے جلد چھوڑنا ضروری
ہے۔ آگے کیا کرنا اور کہاں جانا ہے اس کے لیے مجھے چند روز درکار ہوں گے۔

میں نے اختر کے چہرے کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا کیوں کہ میرے دل میں اس کی

طاقت نہ تھی۔ ان کے ہاتھ سے سب کاغذات لے کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ بڑے لفافے میں پہلے مضمون رکھتی۔ چند سطری خط رکھ کر پتہ لکھ کر ایک طرف کو رکھتی جاتی۔ مجھے وقت کے گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ رات کے آٹھ بج گئے' نہ ہی اختر کمرے میں آئے۔ عبداللہ نے مجھے آکر چونکا دیا۔ جب اس نے کہا۔ "بیٹا اب تو رات کے آٹھ بجے ہیں' اختر صاحب چار بجے جو سیر کو نکلے تو اب تک نہ آئے۔ آپ نے چائے بھی نہیں پی۔ کیا بات ہے۔ سب خیرت تو ہے؟ آخر آج آپ بجائے اختر صاحب کے لکھ کیوں رہی ہیں۔ عبداللہ کو سر سے پاؤں تک دیکھا مولوی صاحب کا دیا خطاب "کڑک مرغی" کا خیال آتے ہی ہنسی آگئی۔ "جاؤ عبداللہ تم کھانا تو تیار رکھو۔ صاحب کو آج کوئی ضروری کام تھا' بس آتے ہی ہوں گے۔" اختر گیارہ بجے رات کو واپس آئے۔ نہ میں نے پوچھا کہ کدھر تھے اور نہ انہوں نے ظاہر کیا کہ اتنی دیر ہو چکی ہے "کھانا آپ نے اب تک کیوں نہیں کھایا؟" بس بھوک ہی نہ تھی۔ "تو چائے بنائیں دونوں پئیں گے۔ چائے پیتے میں سگریٹ کے گہرے گہرے کش لیتے رہے' کوئی اخبار ہاتھ میں تھا اسے پڑھتے رہے۔ پھر ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے کہ سونے جا رہے ہیں۔ میں نے آنکھ اٹھا کر ان کی طرف دیکھا تو مجھے ایسا لگا جیسے اختر کئی سال عمر میں بڑے ہو گئے ہیں۔ وہ تو غافل سو گئے۔ میرا دماغ جانے کیا کیا سوچنے لگا کہ اب میں اختر کو کیا رائے دوں۔ یہ جوان کے سارے سپنے بکھر گئے اس کا کیا اثر ان کی شخصیت پر پڑے گا۔ ان کے دماغ کا بوجھ اور دل کے صدمے میں کسی طور شریک ہو سکتی ہوں۔ اختر اتنے قریب ہو کر کس طرح اتنے دور ہو جاتے ہیں؟ ان کی شاید بچپن کے حالات نے یہ عادت بنا دی ہے کہ اپنے غم و فکر میں اپنی شریک حیات کو بھی شریک کرنے کو آمادہ نہیں۔ جس ننھی سی جان نے ہر فکر اور پریشانی کو تنہا ہی اٹھایا۔ کم عمری ہی میں خود کنواں کھودا خود پانی پیا۔ اپنی اتالیقی خود کی۔ اپنی راہ کو خود تلاش کیا۔ مجھے جانے کیوں یکایک خیال آیا کہ فی الحال کسی طرح میں اختر کو کسی خوب صورت اور اچھی آب و ہوا کے مقام پر لے جا سکوں تو ان کی طبیعت بہل جائے گی۔ اختر کے ایک بڑے عزیز دوست حبیب اللہ اپنی بہن کے پاس "کوٹ گڑھ" جو شملہ سے ساٹھ میل آگے تھا وہاں گئے ہوئے تھے ان کے بہنوئی فارسٹ آفیسر لگے ہوئے تھے۔ دوسرے دن میں نے ایک تفصیلی تار ان کو دیا اور جواب تار ہی سے دینے کو کہا۔ میں نے ان کو بتایا

اخبار کے لیے اجازت نہیں ملی۔ اختر کو وہ تار دیں کہ ایک دو ماہ کو ہم وہاں آجائیں اور میرے تار کا ہرگز ذکر نہ کریں۔

حبیب اللہ' اختر کے ساتھ علی گڑھ میں پڑھتے تھے۔ گو دونوں کے مزاجوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ان کو لکھنے پڑھنے سے کوئی سروکار نہ تھا۔ ڈگری لینے کے لیے رٹ رٹا کر پاس ہو گئے تھے۔ بہت ہی اللہ والے' نماز' روزے کے پابند' مگر دونوں کی دوستی اس قدر پرخلوص تھی کہ بیان نہیں کر سکتی۔

شملہ سے کوٹ گڑھ جانے کے لیے کوئی سڑک نہ تھی۔ اس لیے بس یا موٹر کا کیا سوال تھا۔ پگڈنڈی پر پیدل یا گھوڑے پر وہ بھی جو ٹٹو کی نسل کا ہو۔ دوسرے دن حبیب اللہ کا تار اختر کے نام آیا جس میں بڑا اصرار کیا کہ اس حسین مقام پر آکر ایک دو ماہ گزاریں۔ تار مجھے دے کر بولے "بھلا دیکھیں تو وہاں بیٹھے بیٹھے حبیب کو کیا سوجھی کہ ہم کو اس شدّومد سے بلا رہے ہیں جب کہ ان کو یہ معلوم تھا کہ میں اس وقت کس قدر مصروف ہوں گا کہ اخبار کی اشاعت شروع ہونے والی ہے' مجھے ادھر ادھر جانے کی فرصت کہاں ہو سکتی ہے۔ میں نے سوکھا سا منہ بنا کر کہا۔ "بات یہ ہے کہ یہ جو اللہ والے لوگ ہوتے ہیں ان کے دل کو غیبی طاقت باخبر کر دیتی ہے جس کو وہ اپنے دل کے قریب رکھتے ہیں۔ جب ان سے ملاقات ہو گی تو آپ ان سے پوچھ لیجے گا۔" "تو آپ کو یہ یقین ہے کہ میں چلا جاؤں گا؟" ہاں' کچھ تھوڑی تھوڑی میں بھی تو اللہ والی ہوں۔ مجھے جانے کیسے معلوم ہو جاتا ہے کہ آپ کیا کریں گے اور کیا نہیں کریں گے۔ بتائیں اس میں حرج ہی کیا ہے جو ہم دونوں وہاں چلے چلیں۔ ایمان لگتی کہیں کہ ہم دونوں شادی کے بعد ایک دن کو بھی کہیں سیر کے خیال سے گئے؟ حیدر آباد پہنچتے ہی دوسرے دن سے آپ قلم کاغذ لے کر بیٹھ گئے تھے اور ظلم تو یہ ہے کہ خود آپ مولوی صاحب کے ساتھ سیر سپاٹے کو نکل جاتے۔ ہفتہ دو ہفتے کے بعد واپس آتے۔ میں اپنے خیالوں میں سوچتی رہتی کہ کاش کبھی مجھے بھی اپنے ساتھ لے جاتے۔ یہ سن کر اختر مسکرانے لگے اور کہا "پھر چلتے ہیں آپ کے دل کا ارمان پورا ہو جائے گا اور آگے کا پروگرام بنانے کا وقت بھی مل جائے گا۔"

میں نے خوش ہو کر کہا تو بس میں فوراً سامان بند کرتی ہوں۔ آپ ایک تار حبیب اللہ کو دے دیں۔ پہلے علی گڑھ جا کر سامان وہاں رکھ دیں گے۔ مولوی صاحب اور والد

صاحب کو ایک ایک خط لکھ کر اپنا پروگرام بتا دیا۔ آج کل والد کی پوسٹنگ "ہردوئی" شہر میں تھی۔ گرمیوں کی چُھٹّیاں شروع ہو گئی تھیں۔ اماں سب کو لے کر دوسرے دن روانہ ہونے والی تھیں۔ ان کو بتایا کہ ہم سامان رکھنے آئے ہیں کل ہی کوٹ گڑھ ہم دونوں جا رہے ہیں۔

عزیز عمر کو اختر بہت ہی پسند کرتے تھے۔ عمران کی اس وقت دس گیارہ سال تھی مگر جانے کیوں دونوں میں بڑھی گاڑھی چھنتی تھی۔ عزیز عمر کو بچپن سے پڑھنے کا بڑا شوق تھا۔ بے شمار کتابیں پڑھ ڈالی تھیں۔ بڑے ثقیل قسم کے ہزاروں شعر یاد کر رکھے تھے' چاہے سمجھ میں آئے ہوں یا نہیں۔ ایک ستار خود ہی بنا لیا تھا جس کو متو جمعدار سے چھپ کر سیکھا کرتے۔ میرے سارے ہی بھائی شکار کے دیوانے تھے مگر عزیز کو شکار سے نفرت تھی۔ ان کا اختر سے کہنا "بھلا دیکھیے کہ یہ کوئی بات ہوئی کہ ایسے خوب صورت جانور جو کسی کا کچھ نہیں بگاڑتے' کسی سے کچھ مانگتے نہیں اپنے جنگل میں اُچھل کود کر رہے ہیں اور لوگ جا کر ان کو گولی سے مار کر ان کے رینگ دیواروں پر لٹکاتے ہیں' کھال کھینچ کر اپنے ڈرائنگ روم کو سجاتے ہیں۔" بس ان کی یہ بات اختر کو ایسی بھائی کہ عزیز کو اپنا ڈپٹی بنا لیا۔ عزیز نے ضد کی کہ وہ بھی ہمارے ساتھ کوٹ گڑھ جائیں گے۔ اختر نے بڑی زوردار سفارش کر کے اماں کو راضی کر لیا۔ دوسرے دن سب "ہردوئی" اور ہم دہلی روانہ ہوئے۔ وہاں سے شملہ' شملہ پہنچے تو دیکھا حبیب اللہ اسٹیشن پر کھڑے ہوئے ہیں۔ اختر ان کو دیکھ کر خوش ہو گئے۔ شملہ سے روانگی کے لیے دو ٹٹو اور سامان کے لیے چار خچر اور قلی کا انتظام کر رکھا تھا۔ دن کا کھانا اسٹیشن پر کھا کر ہم سب کی روانگی شروع ہوئی۔ چھ بجے شام کو پڑاؤ کرنا تھا۔ اس کا انتظام بھی انہوں نے کسی پہاڑی کے گھر کیا ہوا تھا۔ بیس میل یوں طے کیے کہ زیادہ وقت میں اور عزیز ٹٹو پر اور کچھ دیر کو حبیب اور اختر کی باری آتی۔ پھر ہم دونوں سواری کرتے اور وہ دونوں پیدل چلتے' جوں جوں چڑھائی چڑھتے پہاڑوں کا حُسن بڑھتا ہوا محسوس ہوتا۔ دیو قامت پائین اور دیودار کے گھنے جنگلوں میں ہرنوں کے غول پگڈنڈی کے قریب ملتے کہ وہ سورج کے غروب کے وقت اس کی طرف منہ اُٹھائے گویا لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ چڑیوں کی چہچہاہٹ اپنے پورے عروج پر کہ اب وہ بسیرا کرنے جا رہی ہیں۔ حدِ نظر پر ہمالیہ کی برف پوش چوٹیاں سفید سے گلابی اور پھر

سرخی مائل ہو گئیں۔ سورج اپنی پوری آب و تاب دکھا کر غروب ہونے لگا۔ میری نظریں کبھی قدرت کے حُسن کو دیکھ رہی ہوتیں تو کبھی اختر کے چہرے کے تغیرات کا جائزہ لیتیں اور دل کو سکون ملتا کہ اختر کے چہرے پر بشاشی ہے۔ دوست سے ہنس بول رہے ہیں۔ علی گڑھ کی باتیں ہو رہی ہیں' کبھی قہقہے لگا رہے ہیں۔ چشموں کا برف جیسا ٹھنڈا پانی پیتے ہی تھکاوٹ اُتر جاتی۔

اب چھے بجنے والے تھے۔ آج کا بیس میل کا سفر طے کر لیا۔ پڑاؤ کرنے کی جگہ آ گئی۔ اختر پگڈنڈی کے کنارے ملائم ہری کچوک گھاس پر لمبے لمبے لیٹ گئے اور ساتھ ہی عزیز کو لٹا کر اس سے پہاڑوں اور جانوروں کی باتیں کرنے لگے۔ سامان قُلیوں نے اُتار کر سرائے میں رکھا۔ چشموں کے پانی سے ہاتھ منہ دھویا۔ گرم گرم چائے پی کر اختر اور عزیز نے سرائے کے باہر گانا شروع کیا۔ پھر عزیز نے اپنی بانسری تھیلے میں سے نکال کر بجانا شروع کر دی۔ میں مولا کا شُکر دل ہی دل میں ادا کرتی رہی کہ اختر کے دل و دماغ سے "جہاں نما" کا صدمہ دور ہو گیا۔ رات کو جلد کھانا کھا کر سو گئے۔ صبح پانچ بجے ہم روانہ ہو کر چھے بجے شام کو گھر پہنچ گئے۔ تھک کر چُور چُور تھے۔ گرم گرم پانی سے نہا کر تھکن کم ہوئی۔ جلد ہی کھانا کھا کر سو گئے اور ایسا سوئے کہ دس بجے دن کو اختر نے اُٹھایا اور بتایا کہ وہ تو پانچ بجے ہی اُٹھ گئے تھے اور سیر کو نکل گئے اور اب واپس لوٹے ہیں۔ پہاڑی نالوں' چشموں اور جھرنوں' چڑیوں کا سورج طلوع ہونے سے پہلے ہی چہچہانا۔ اس کا مزہ تو صبح سویرے ہی آتا ہے۔ سوچتا رہا وہ کون سی موسیقی ہے' جس کے سُر تال اس سے مقابلہ کر سکیں گے۔!

رات کو ہم تینوں برج ضرور کھیلتے۔ اختر اور حبیب اللہ کی لڑائیاں اور جھگڑے بھی ہوتے مگر میں اپنے خیالوں میں حیدر آباد مولوی صاحب کے پاس پہنچ جاتی۔ وہ بیچارے پلنگ پر لیٹے کچھ پڑھتے نظر آتے۔ کبھی ایسا زور کا رونا آتا کہ یہ بہانہ کر کے آپ دونوں لڑتے ہیں میں نہیں کھیلوں گی' میں اُٹھ جاتی۔

تیسری دوپہر ہم تینوں کو لے کر حبیب اللہ ایک پہاڑی میلہ جو گھر سے تین میل پر تھا' دکھانے لے گئے۔ ایک عجیب سماں دیکھنے میں آیا۔ ایک جگہ جو کافی ہموار سی تھی اس کے تین طرف اُونچی نیچی پہاڑیاں اور پشت پر ہر طرف بہت اونچے پہاڑ جن کی چوٹیوں پر برف جمی ہوئی تھی۔ مختلف قبیلوں کے لوگ رنگا رنگ لباسوں میں اپنے اپنے قبیلے کے بُت ایک

چوکور تختے پر بٹھائے، تختے کے باہر نکلے ہوئے چار بانس کاندھوں پر رکھے اونچائی سے اس میدان کی طرف مختلف پگڈنڈیوں سے اُترے چلے آ رہے ہیں۔ ہر ہر قبیلے کے ساتھ ان کی بیویاں، لڑکیاں اور ہر سائز کے بچے اپنے مَردوں کے ہمراہ اِدھر اُدھر ہر طرف سے رنگا رنگ لباسوں میں آئے ہوئے یوں لگ رہا تھا جیسے ہولی کے رنگوں کی پچکاریاں انسانی شکل بدل کر ہر طرف سے پھوٹ رہی ہیں۔ میدان میں پہنچ کر سب جمع ہو رہے تھے کہ سامنے والی پگڈنڈی سے جو مورتی تختے پر اپنی پتھرائی ہوئی آنکھیں پھاڑے، گلے میں گیندے کے ہار ڈالے اور تِلک لگائے بیٹھی تھی، اس کے ساتھ ساتھ چار لڑکیاں اس کو کاندھے پر اٹھائے ہوئے، قد اور جسم برابر کے اُن کے پہاڑی لباس سب سے زیادہ خوش رنگ، جیسے قوس قزح، زمین کی طرف رخ کیے ہوئے ہے۔ ان کا حُسن وہ حُسن تھا جو نہ کبھی دیکھا تھا اور نہ اس دن کے بعد دیکھنے میں آیا۔ وہ چاروں جو بھجن گا رہی تھیں اس کے سُر تال جیسے پہاڑوں سے ٹکرا کر پھر واپس آتے اور پوری فضا میں بکھر جاتے۔ ہماری نظریں ان پر جمی کی جمی رہیں۔ ہمارے دماغ کچھ بھی نہیں سوچ رہے تھے کہ آنکھیں ان پر یوں جمی ہوئی تھیں جیسے ہم بھی پتھر کے بن چکے ہیں۔ کچھ رسومات کے بعد سب کی واپسی شروع ہوئی اور ساتھ ہی ان چار پریوں اور ان کے قبیلے کی۔ ہم نے ایک دوسرے سے ایک حرف بھی تو نہ کہا بس ان کے پیچھے یوں چل پڑے جیسے کوئی مقناطیسی طاقت ہم کو کھینچے لیے چلی جا رہی ہو۔ ایک میل کی چڑھائی کے بعد وہ دو پہاڑیوں کے درمیان مڑ گئیں۔

سامنے ایک حیرت انگیز عمارت تھی جس کی بناوٹ فرانسیسی "شاتو" (امرا کے محل) نما تھی۔ اب حبیب اللہ نے بتایا کہ یہ ایک پادری اسٹاک نامی کی ہے۔ آریہ سماج مذہب اختیار کرکے ایک حسین و جمیل پہاڑن سے شادی کرکے یہاں رہ پڑے اور یہ محل نما عمارت بنوائی۔ سیبوں اور ٹمبر کی بزنس کرنے لگے اور یہ لڑکیاں انھیں کی ہیں۔ شاہی گیٹ پر پہنچ کر قبیلے کے لوگ پلٹنا شروع ہو گئے اور ہم تینوں پھاٹک پر ٹھٹک کر کھڑے رہے۔ ایک لڑکی نے گردن موڑ کر بہت اچھی انگریزی میں کہا۔ "جب آپ لوگ یہاں تک آ ہی گئے ہیں تو آیئے اندر آیئے اور ہمارے والد سے ملاقات کر لیجے۔ ان سے مِل کر آپ خوش ہوں گے۔

کئی فرلانگ کے سامنے والے باغ سے گزر کر ہم سیڑھیاں چڑھ کر برآمدے میں آئے۔ ایک بہن نے اندر جا کر پردیسیوں کے آنے کی اطلاع دی۔ مسٹر اسٹاک باہر نکل کر آ گئے۔ بڑی خندہ پیشانی اور تپاک سے ملے، اندر لے گئے۔ داخل ہوتے ہی عین نگاہوں کے سامنے ایک پہاڑن لڑکی کی قد آور پینٹنگ لگی ہوئی تھی جو اُن چار لڑکیوں سے زیادہ حسین تھی۔ خدا جانے کیوں مجھے ایک دم اختر کی نانی کا خیال آ گیا۔ شاید اس لیے کہ سوچ رہی تھی کہ یہ عشق کا چکّر انسانوں سے کیا کچھ نہیں کروا لیتا۔ مذہب، ملک اپنے رشتے ناتے سب کو طاق میں رکھ کر کسی کے ہو لیتے ہیں۔ ان کی لائبریری پچاس فٹ لمبی اور تیس فٹ چوڑی! الماریاں بے حد اونچی۔ کتابوں سے بھری ہوئی۔ میں نے کبھی کسی کی پرائیویٹ لائبریری اس قدر بڑی نہ دیکھی تھی۔ اختر کا چہرہ کِھل اٹھا۔ درمیان میں کئی لمبی مگر پتلی میزوں پر کسی پر صرف اخبارات تو کسی پر رسالے۔ اس محل میں دنیا کا ہر ماڈرن سامان موجود تھا، مگر اس کے مکین پہاڑی لباس میں ملبوس تھے۔

اختر مسٹر اسٹاک سے مِل کر اور وہ اختر سے مِل کر بے حد خوش ہوئے، کچھ دیر میں چائے آ گئی۔ بیٹھنے کے کمرے میں بلا کر بٹھایا۔ مختلف موضوع پر باتیں کرتے رہے، کہا کہ جب اور جس وقت جی چاہے آئیں اور لائبریری سے جو بھی کتاب چاہیں پڑھنے کو لے جا سکتے ہیں۔ اختر کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا خوشی کی بات ہو سکتی تھی۔ چند کتابیں ان سے لے کر جلد آنے کا وعدہ کرکے ہم اٹھ کھڑے ہوئے کہ اندھیرا ہونے سے پہلے نیچے اُتر جائیں۔

—○—

پاسپورٹ حاصل کر لیے

کوٹ گڑھ سات ہزار فٹ کی بلندی پر ہے۔ سربلند پہاڑ ہر طرف پائین کے سبز لبادے اوڑھے ہوئے جابجا چشمے اور جھرنے زور شور سے بہتے ہوئے جہلم ندی سے جا ملنے کی خوشی میں سر اور ساز بجاتے ایک عجیب سی کیفیت پیدا کرتے بہے چلے جاتے' اور اوپر نظر کرو تو برف پوش ہمالیہ کی چوٹیاں۔ اختر ہر روز عزیز کو ساتھ لے کر میلوں سیر کو نکل جاتے۔ کبھی کبھی عزیز عمر سے کہتے "میاں آج اپنی بانسری ساتھ لے چلو یا ستار۔ بھئی یہ ستار بھی خوب تھا۔ ایک لکڑی کے ٹکڑے کو ستار کی شکل کاٹ پیٹ کر اس پر تار لگائے گئے تھے! مگر جو بھی ہو' اس کو وہ بڑے مزے سے بجاتے۔ اگر اس ستار کو آنکھوں سے نہ دیکھو' دور سے سنو تو لگتا سچ مچ کا ستار بجایا جا رہا ہے۔ اختر استاد کی جگہ لے کر عزیز کو اس کی باریکیاں سمجھاتے' کبھی دونوں مل کر گانے بھی لگتے اور میں سوچا کرتی کہ اب آگے کیا ہو گا؟ اختر کیا کریں گے۔ حیدر آباد مولوی صاحب کے پاس واپس تو ہرگز نہ جائیں گے۔ نہ ہی گورنمنٹ ملازمت کریں گے۔ مختلف اخباروں کے لیے لکھیں گے؟ نہیں زیادہ امکان تو یہ نظر آتا ہے کہ یہ جو تازہ گھاؤ ان کے دل پر لگا ہے کہ اپنا اخبار نہ نکال سکے' تو دوسروں کے اخباروں کے لیے ان کا قلم فی الحال نہ چلے گا۔ پھر مجھے ان کو کیا رائے دینا چاہیے گو اس کا بھی یقین کامل تھا کہ وہ مجھ سے ایسے وقت میں کوئی رائے کب لیں گے۔ کوٹ گڑھ کے حُسن اور آب و ہوا نے ان پر بڑا اچھا اثر ڈالا' مگر ایک ماہ جلد گزر جائے گا—— اور پھر؟

رات کے تین بجے تھے میں جاگ رہی تھی کہ دور پہاڑوں پر سے کسی پرندے کی آواز ایسے سنائی دی جیسے گھنٹیاں بج رہی ہوں اور پھر یہ آوازیں ہر پہاڑ سے آتی سنائی دیں۔ ساری فضا میں بکھر کر پھر جیسے پہاڑوں سے ٹکرا کر اس موسیقی کو تیز تر کر دیتیں۔ میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اختر کو اٹھایا کہ ذرا یہ تو سنیں۔ کچھ دیر بستر پر بیٹھے سُنا کیے پھر بھاگ کر باہر کھڑے

جا کھڑے ہوئے' میں بھی باہر آ گئی۔ ہم دونوں مبہوت ہو کر سنا کیے۔ آدھ گھنٹے کے بعد یہ آوازیں ہلکی اور ہلکی پھر آہستہ اور آہستہ ہوتی گئیں' پھر صرف اس کی گونج پہاڑوں سے جیسے ٹکرا کر سَر دُھن رہی ہو۔ زندگی بھر ملکوں ملکوں پھرتے اور رہتے رہے۔ وہاں پہاڑ بھی تھے ان کا حسن بھی' اور ہزارہا قسم کے پرندے بھی۔ مگر ساری عمر اُن پرندوں کی سی آواز سُننے میں نہ آئی۔ صبح اختر نے فرمایا کہ جیسے ہی میں رات کو جب یہ آواز سنوں تو ان کو بیدار کر دیا کروں۔ تو کیا رات بھر میں روز ہی جاگا کروں گی۔ دوسری رات میں پھر جاگ رہی تھی۔ خیالات کا تانا بانا مجھے سونے ہی نہ دے کہ آخر کس طور میں اختر کو دماغی اور دلی پریشانی سے بچا سکتی ہوں؟ ایک دَم جانے کہاں سے خیال آیا کہ اگر اختر ولایت جا کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے لیں تو کسی بھی یونیورسٹی میں پروفیسر لگ سکتے ہیں اور ساتھ ہی باہر کی دنیا بھی دیکھنے کے مواقع ملیں گے۔

جس تیزی سے یہ خیال آیا اسی پھرتی سے میں نے اختر کو اٹھا دیا۔ وہ سمجھے کہ پرندے چہچہا رہے ہیں۔ حیرانی سے پوچھا مگر وہ پرندے کِدھر ہیں؟ میری بات تو سنیں یا ہمیشہ پرندوں کو ہی سنا کریں گے۔ بات کیا ہے۔ آپ اس وقت کیا کہنا چاہتی ہیں۔ صرف یہ کہنا ہے کہ کوٹ گڑھ سے واپسی کے بعد ہم دونوں ولایت چلیں۔ وہاں سے آپ ڈاکٹریٹ کی ڈگری لیں پھر تو بہت ساری راہیں کُھل جائیں گی۔ اختر بے تحاشا ہنسے۔ بولے آپ کو کچھ ہو تو نہیں گیا۔ بھلا ہم کیسے جا سکتے ہیں۔ اول تو مجھے پاسپورٹ ہی گورنمنٹ نہ دے گی اور دوئم یہ کہ اتنے روپے کہاں سے آئیں گے۔ میں نے بڑے اطمینان سے کہا' پاسپورٹ ابا بنوا دیں گے اور رہا روپیوں کا سوال وہ آپ کا قلم مہیا کرے گا۔ بس فیصلہ ہو گیا۔ اختر یہ کہتے ہوئے لیٹ گئے کہ "شیخ چلّی والی باتیں تو نہ کریں۔ بس سو جایئے۔"

صبح کو اختر نے خوب مذاق اُڑایا کہ رات کو آپ خواب میں ایران تُوران کی باتیں کر رہی تھیں' مگر میں نے دل میں اٹل ارادہ کر لیا تھا۔ ایک تار ابا کے نام لکھا کہ وہ فوراً "دو پاسپورٹ کے لیے درخواست کے فارم بھیج دیں۔ حبیب اللہ کو دیا کہ ابھی ابھی ڈاک گھر جا کر تار روانہ کر دیں اور تفصیلی خط بھی ساتھ ساتھ ابا کو لکھ دیا۔ ایک ہفتے میں پاسپورٹ کے فارم میرے ہاتھ میں تھے۔ جب اختر کو بھرنے کے لیے دیے تو مجھے جواب یہ ملتا ہے "اکثر مجھے آپ کی نا سمجھی پر ہنسی آتی ہے کہ بے سوچے سمجھے بات کہہ بیٹھتی ہیں

اور جو من میں سما جائے وہ کر بیٹھتی ہیں۔ اس وقت میں در حقیقت بگڑ گئی۔ اختر نے پہلی بار مجھے اس رنگ میں دیکھا تو میرا منہ دیکھنے لگے۔ میں ہر بات ہمیشہ آپ کی مان لیتی ہوں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہ لیں کہ میں کبھی اپنی بات منوانے کا حق ہی نہیں رکھتی۔ کچھ اچھے موڈ میں تھے "اچھا بگڑیں مت ایک بار میں آپ کی بات مان کر فارم بھرے دیتا ہوں۔ نتیجہ آپ کے سامنے آہی جائے گا کہ گورنمنٹ مجھے پاسپورٹ ہرگز نہ دے گی۔ فارم بھر دیے۔ اسی دن واپسی ڈاک ابا کو بھیج دیے' ساتھ یہ بھی لکھ دیا کہ یہاں پاسپورٹ کے لیے تصویر کھنچوانے کا کوئی طریقہ نہیں وہ خود ہی بڑی تصویروں سے جیسے تیسے چھوٹا کروا کر نتھیاں کر دیں!!

ہم دونوں اور عزیزی عمر نے یہاں ایک ماہ رہ کر دل بھر کے سیریں کیں۔ اختر کو پڑھنے کے لیے ایک سے ایک بہتر کتاب مسٹر اسٹاک کی لائبریری سے ملتی رہیں۔ شکر کہ اختر کی آنکھوں کی چمک دمک واپس آچکی تھی۔ "جہاں نما" کو صبر کر کے قرار حاصل کر لیا تھا۔ سکا پانچ بجے ہم تینوں حبیب اللہ کے ساتھ روانہ ہوئے۔ اتنے پرسکون اور حسین مقام کو چھوڑنے کی ایک طرف اگر تکلیف سی تھی تو دوسری طرف اس خیال سے کہ جب ہردوئی پہنچیں گے تو پاسپورٹ آچکے ہوں گے اور ہم دونوں ولایت چل پڑیں گے۔ دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی۔ اختر نے فارم بھرنے کے بعد خود اس موضوع پر کسی قسم کی کوئی بات کی ہی نہیں اور نہ میں نے ذکر کیا۔

دہلی میں ریل تبدیل کر کے ہم ہردوئی پہنچ گئے۔ سب سے ملنے جلنے کے بعد جب ابا اپنے کمرے میں اکیلے بیٹھے تھے تو دبے پاؤں جا کر ان کی کرسی کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔ کچھ دیر بعد پوچھا کہ ہمارے پاسپورٹ آگئے۔ وہ چپ رہے۔ میز کی ایک دراز کھول ایک لفافہ نکال کر میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ یہ خط پنڈت پنتھ' جو اس وقت یوپی گورنمنٹ کے چیف منسٹر تھے' ان کا تھا۔ خط میں بہت افسوس کے ساتھ لکھا تھا کہ باوجود ان کی پوری کوشش کے دہلی سے انکار کر دیا گیا ہے۔ اس وقت یہی طریقہ تھا کہ پاسپورٹ صوبائی حکومت جاری کر سکتی تھی جب دہلی سے وائسرائے کے سکریٹریٹ سے اجازت مل جائے۔

میرے پاؤں تلے کی زمین نکل سی گئی۔ کچھ دیر میں بار بار خط پڑھتی رہی۔ نہ میں کچھ بولی نہ ہی وہ کچھ بولے۔ پھر کہا کہ ادھر آؤ' میرے سامنے بیٹھ جاؤ۔ جب میں سامنے آکر

بیٹھ گئی تو بولے۔ "اس قدر بدحواس کیوں ہو رہی ہو۔ بندہ کوشش تو بہت سی باتوں کے لیے کرتا ہے۔ ضروری نہیں کہ کامیابی ہی ہو۔ اسی کا نام زندگی ہے۔ آگے چل کر ایک ایسا وقت ضرور آئے گا کہ اختر جیسے شخص کو بلا تامل پاسپورٹ مل جایا کرے گا۔ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے عمر پڑی ہوئی ہے۔ تم خود ہی یہ خط اختر کو دکھا دینا۔ ان کو رنج ضرور ہوگا پر اس کو بانٹ لینا تمہارا کام ہے۔ میں صرف یہ کہتی ہوئی وہاں سے اٹھ گئی۔ "یہ خوب رہی کہ اختر کو اخبار نکالنے کی اجازت مل نہیں سکتی۔ اختر کو پاسپورٹ مل نہیں سکتا۔ مشکل سے اپنے آنسو ضبط کیے۔ ان کے کمرے سے نکل آئی اور اپنے کمرے میں آکر دروازہ بند کر لیا۔ اختر برآمدے میں موڑھے لے کر میری چھوٹی سی بہن ذکیہ کو کہانیاں سنا رہے تھے اور اس کے معصوم قہقہے گونج رہے تھے۔ اب میں ان سے کیا کہوں۔ کیسے کہوں۔ پر بتانا تو پڑے گا۔

کھانے کے بعد وہ اخبار لے کر پلنگ پر لیٹ کر پڑھنے لگے۔ میں ان کے پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گئی اور ان کے ہاتھ میں پنتھ جی کا خط دے دیا۔ خط پر ان کے دفتر کی مہر تھی۔ بلا پڑھے کہا' تو ہوا وہی جو میں نے آپ سے کہا تھا کہ پاسپورٹ نہیں ملے گا۔ آپ کو خوش فہمی تھی اس لیے آپ کو رنج ہو رہا ہے۔ آپ کی ضد تھی میں نے فارم تو بھر دیے تھے مگر مجھے مطلق غم یا افسوس نہیں ہوا کہ مجھے یقین کامل تھا کہ انکار کر دیا جائے گا۔ بس اب آپ بھی اس کو بھول جائیں۔ خط کو لفافے سے نکال کر پڑھا اور پھر لفافے میں رکھ کر میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میں نے پہلے سے سوچ لیا تھا کہ چند دن یہاں رک کر واردھا نکلتے ہوئے' وہ چار دن کو حیدرآباد چلا جاؤں گا۔ مولوی صاحب سے مل کر ترجمے کا کام لے کر بمبئی چلا جاؤں گا۔ وہاں اگر میری مرضی کا کام نہ ملا تو کلکتہ میں ٹول چند اگروال کے اخبار میں تو ہمیشہ میرے لیے جگہ ہے ہی۔"

میں حیران رہ گئی کہ تو یہ اپنے دماغ میں پہلے سے نقشہ جمائے ہوئے تھے۔ جب ہی ان کو رنج نہیں ہوا۔ میں نے پوچھا کہ "آخر آپ واردھا کیوں رکیں گے؟" جواب یہ تھا کہ آج کل سروجنی نائیڈو وہاں ہیں۔ ذرا آشرم بھی دیکھ لوں گا' اور گاندھی جی سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔ آپ کوئی فکر نہ کریں۔ کچھ نہ کچھ کر ہی لوں گا۔ اختر نے ابا سے اس موضوع پر کوئی بات نہ کی اور نہ ہی انھوں نے کچھ پوچھا کہ اب آگے کیا کرنے کا ارادہ

ہے؟

بمبئی میں تین دن قیام کرنے کے بعد جب اختر روانہ ہو گئے تو میں ابا کے کمرے میں جا کر ان کے شانے پر سر رکھ کر رونے لگی "میں کچھ نہیں سنوں گی۔ آپ سوچ کر کوئی راستہ ایسا نکالیں کہ اختر کو پاسپورٹ مل جائے۔ آپ کی کوشش ناکام ہو گئی۔ کیا میں خود ہی کچھ بھی نہیں کر سکتی۔" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد بولے۔ "ہاں تم خود بھی کوشش کر دیکھو۔ ہمت نہ ہارنا بڑی اچھی بات ہے۔ میں اسی وقت تار دے کر پنتھ جی کو اطلاع دے دیتا ہوں کہ میری بیٹی حمیدہ ان سے ملنے آ رہی ہے۔ تم آج رات کی گاڑی سے لکھنؤ چلی جاؤ۔ ریل صبح وہاں پہنچ جائے گی۔ تم اسٹیشن سے سیدھی چیف منسٹر ہاؤس جانا اور بس ان کے دفتر کے کمرے میں بیٹھ جانا اور کہہ دینا کہ جب تک وہ پاسپورٹ دلوا نہ دیں گے تم وہیں بیٹھی رہو گی۔ کیا خبر کہ پھر وہ مجبور ہو کر کوئی طریقہ نکال ہی لیں لیکن میری ایک بات یاد رکھنا کہ پھر بھی کچھ نہ ہو سکا تو تم کوئی غم نہ کرو گی کہ ہر کوشش کر لی گئی۔

دوسرے دن تین جوڑے کپڑے ایک اٹیچی کیس میں ڈال کر رات کی گاڑی سے لکھنؤ روانہ ہو گئی۔ اماں نے چلتے وقت اتنا کہا "انسان کو ہر کوشش کر لینی چاہیے اور پھر نتیجہ اللہ کے ہاتھ چھوڑ کر راضی بہ رضا رہنے پر تیار رہنا چاہیے۔"

ریل آٹھ بجے صبح لکھنؤ پہنچ گئی۔ ابا نے ایک انسپکٹر پولیس کو ساتھ کر دیا تھا وہ برابر والے ڈبے میں تھے۔ ہر اسٹیشن پر خیر خبر پوچھنے آتے اور کہتے بی بی آپ سو جائیں، مگر میں ٹیک لگائے سیٹ پر پاؤں پھیلائے بیٹھی رہی۔ زندگی کا یہ پہلا سفر تھا جو میں اکیلی خود کر رہی تھی اور ساتھ ہی کیسے مشن پر جا رہی تھی۔ سوچوں کہ ابا نے مجھے کچھ تو بتا دیا ہوتا کہ پنڈت جی سے خطاب کس طرح کروں اور کیا کہوں؟ پھر سوچوں کہ زندگی کا سفر انسان خود ہی تو طے کرتے کرتے آخر اپنی منزل پر جا لگتا ہے، اپنی راہ خود ہی تو ہموار کرنی پڑتی ہے۔ پھر یوں بھی سوچوں کہ اماں ابا کو مجھ پر بھروسہ ہو گا جو انہوں نے تربیت دی ہے، اس بنا پر مجھ میں اتنی صلاحیت ضرور ہونا چاہیے کہ موقع محل کو سمجھ کر بات کر سکوں گی۔ دوسری طرف میرا شاید یہ ایک بچکانہ یقین کامل تھا کہ مولوی عبدالحق، ظفر عمر اور اختر حسین رائے پوری کو سارا ملک جانتا ہے۔ بھلا ان تین انسانوں سے اور کون عظیم تر ہو سکتا ہے اور میں ایک کی بہو، ایک بیٹی اور ایک کی بیوی ہوں۔

رات کے شاید تین چار بجے ہوں گے کہ میں سو گئی۔ صبح انسپکٹر صاحب نے جانے کس قدر آوازیں دی ہوں گی جب آنکھ کھلی اور رینگتی ہوئی ریل سے ہاتھ پکڑ کر مجھے اتارا۔ اٹیچی کیس کو میں نے پہلے نیچے اچھال دیا تھا۔ ویٹنگ روم میں جا کر تیار ہوئی، ناشتہ کیا۔ انسپکٹر صاحب بضد تھے کہ میرے ساتھ چیف منسٹر ہاؤس تک چلیں، مگر میرا دل بس خود اکیلے جانے کا خواہش مند تھا کہ میں خود ہی آئی ہوں۔ تانگہ منگوا کر بیٹھنے سے پہلے ان سے کہا کہ آپ میرا انتظار ویٹنگ روم کے پاس کریں۔ شاید دو یا تین دن لگیں۔ انہوں نے نمبر تانگے کا نوٹ کر کے اس کو تاکید کی کہ جب بی بی گیٹ کے اندر چلی جائیں تو یہاں واپس آ کر ان کو بتا دے۔ اپنی سوچوں میں کچھ ایسی گم تھی کہ جب تانگے سے اتری تو مجھے احساس ہوا کہ پاؤں کی ایک چپل راستے میں گر گئی اور مجھے خبر بھی نہ ہوئی، مگر میں بے جھجک تن کر چلنے لگی۔ گیٹ پر پہرے داروں نے کچھ کہا۔ میں نے ہاتھ سے ان کو پرے ہٹ جانے کا اشارہ کیا کہ میرا پنڈت جی سے ملاقات کا وقت مقرر ہے۔ اسی طرح پورچ میں کھڑے پہرے داروں نے روکنے کی کوشش کی، میں نے بگڑ کر کہا جاؤ پنڈت جی سے معلوم کرو اور آگے برآمدے سے گیلری میں چق اٹھا کر داخل ہو گئی۔

یہاں پر پہلے ان کے پرائیویٹ سکریٹری کا کمرہ تھا۔ وہ کچھ کہہ رہے ہیں اور میں بڑے اعتماد سے پوچھ رہی ہوں کہ پنڈت جی کا آفس کون سا ہے۔ ان کے ساتھ ملاقات کے لیے میرا وقت مقرر ہے۔ "اچھا آپ ظفر عمر صاحب کی صاحبزادی ہیں۔" "جی" "تو چلیے میرے ساتھ۔" وہ مجھے ایک بڑے سے کمرے میں لے کر داخل ہوئے۔ میری نظروں نے سرسری سا کمرے کا جائزہ لیا۔ ایک بہت بڑا اعلیٰ قسم کا قالین ہے۔ اس پر کچھ حصے میں کھدر کی بڑی سی جاذم بچھی ہوئی ہے دیوار سے لگا کر ایک بڑی سی سیتل پاٹی بچھی ہوئی، پشت پر سفید گاؤ تکیہ جس سے لگے کوئی صاحب بالکل ہندو لالہ سے لگے۔ سفید دھوتی، سفید کھدر کا کرتا، ماتھے پر تلک، ایک جنیو گلے میں پڑا، گول مٹول جسم ڈھیلا ڈھالا، جھکے کچھ لکھ رہے تھے۔ ان کے سامنے جو ایک نیچی سی ڈیسک نما میز تھی اس پر فائلوں کا ایک طرف ڈھیر لگا ہوا تھا۔ جھک کر سکریٹری نے آہستہ سے کچھ کہا۔ چہرہ اوپر اٹھایا۔ گول پھولا پھولا چہرہ، آنکھیں بڑی بڑی گول گول سی ابھار لیے ہوئے، خوب چوڑا ماتھا کہ بال بہت گر چکے تھے۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر آداب کیا۔ انہوں نے نمسکار کے بجائے آداب عرض کیا

"بیٹا آپ کیوں آ گئیں؟ بیٹھیے۔" میں نے بیٹھتے ہی پہلی بات ان سے یہ کہی۔ "مہربانی سے پہلے تو آپ ایک چپل مجھے بازار سے منگا دیجیے۔ یہاں آتے وقت تانگے پر ایسی کھوئی کھوئی سی اپنی سوچ میں گم بیٹھی تھی کہ پیر سے چپل کا گرنا معلوم ہی نہ ہوا۔ لیجیے یہ رہے پانچ روپے اور ادھر ناپ کی چپل پڑی ہے۔" وہ بیچارے حیرت زدہ ہو کر میری طرف دیکھنے لگے، پھر مسکرا دیے۔ ہونٹ خاصے موٹے اور بھینچے ہوئے۔ میں نے سکریٹری کی طرف دیکھ کر کہا۔ بس اسی ناپ کی چپل چپراسی کو بھیج کر منگوا دیں۔

اب میں پنڈت جی سے متوجہ ہوئی کہ والد صاحب کو آپ کا خط مل گیا تھا، مگر میں خود ہی طے کر کے آئی ہوں کہ آپ سے پاسپورٹ حاصل کر کے ہی جاؤں گی۔

"بیٹا آپ کو معلوم ہی ہو چکا ہو گا مختصر عمر صاحب کی زبانی کہ پاسپورٹ جاری کرنا صوبائی حکومت کے ہاتھ نہیں بلکہ یہ وائسرائے کی سکریٹریٹ سے اجازت مل جانے کے بعد ہی جاری کیا جا سکتا ہے ورنہ مجھے تو اختر حسین رائے پوری اور آپ کو پاسپورٹ دے کر مسرت ہوتی۔"

"میں تو یہ سوچ کر آئی کہ اس صوبے میں ہندوستانیوں کی حکومت ہے۔ انگریز نے عارضی اختیارات آپ کے ہاتھ میں دیے ہیں کہ آیا ہم ہندوستانی ملک چلانے کی صلاحیت رکھتے ہیں یا نہیں؟ اگر اتنی چھوٹی سی بات پر ان کی نہیں کو بے چوں و چرا مان لیا تو کل وہ ہمیں آزادی دینے میں جتنی بھی پس و پیش کریں وہ کم ہے۔ اگر صوبے کی حکومت کسی شخص کو پاسپورٹ دینے کے حق میں ہو تو ان کا اس میں انکار کرنا تو یہی معنی رکھتا ہے کہ صرف نام کو صوبے کی حکومت ہندوستانیوں کے ہاتھ میں دی گئی ہے۔ اصل میں ان کا ہی فیصلہ اٹل اور آخری ہے۔ پنڈت جی یہ آپ کے لیے ایک چیلنج ہے آپ آخر اوپر سے انکار پر [illegible] مرضی سرکار آپ کی۔ چپ ہو کر کیوں بیٹھ گئے؟ اس کا مطلب تو میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ جانے صوبے کے معاملات میں سارا کنٹرول وہ اپنے ہاتھ میں رکھے ہوئے ہیں۔ اگر ایسی صورت ہے، انگریز دخل انداز ہیں تو پھر کل بھی ہم کو آزادی! انگریز یوں ہی [illegible] بیٹھے رہیں گے۔ آپ کو جس ذمے داری کا حق دیا گیا ہے یا تو ڈھنگ طریقے سے اپنے فیصلے کو صحیح سمجھ کر اس پر اصرار کریں اور ہر قدم پر [illegible] رہیں یا پھر اس ذمے داری سے کنارہ کشی کر لیں۔ [illegible] یہ کوئی انصاف ہے کہ اختر حسین کو ایک اخبار نکالنے کا ڈکلریشن نہ دیا

جائے، مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے پاسپورٹ نہ مل سکے۔ کوئی قتل نہیں کیا، کسی کیس میں ملوث نہیں، بس ایک قلم ہاتھ میں ہے کوئی توپ اور بندوق تو نہیں۔ علم حاصل کرنے کو جانا چاہتے ہیں یہ گناہ تو نہیں؟ آپ کچھ بولتے کیوں نہیں؟ کچھ تھوڑے سے ہونٹ کھل گئے، ان کے کچھ مٹیالے سے دانت نظر آنے لگے۔ میں نے سوچا کہ کبھی بے حد سگریٹ پیتے ہوں گے۔ وہ مجھے کچھ دیر غور سے دیکھ کر بولے۔ "بیٹا اگر میرے بس میں ہوتا تو آپ کو خود آنے کی زحمت نہ کرنی پڑتی۔" "----- ٹھیک ہے آپ نے اپنی بے بسی کا صاف صاف اظہار کر دیا، مگر میں ناامید نہیں۔ اب میں خود ہی اپنی سی کوشش کرتی ہوں۔ بتایئے کہ سروجنی نائیڈو ابھی واردھا ہی میں ہیں؟ اور جواہر لال جی بھی وہیں ہیں۔

پنتھ جی نے اپنی گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں دونوں ابھی باپو جی (گاندھی جی) کے پاس ہیں۔ کیوں آپ یہ کیوں پوچھ رہی ہیں۔" "بس آپ مہربانی سے اتنا کیجیے کہ میری بات فون پر سروجنی نائیڈو سے کروا دیجیے۔ اب تو مجھے خود ہی کوئی راستہ نکالنے کی ترکیب کرنی ہے۔" انہوں نے اپنے سکریٹری سے کہا "واردھا میں سروجنی جی کو فون ملاؤ، بی بی ان سے بات کریں۔ فون ملایا گیا۔ پہلے میں نے ان کی خیریت پوچھی۔ پھر معلوم کیا کہ اختر ابھی وہاں ہیں؟ بتایا کہ ایک دن رک کر مولانا کے پاس حیدرآباد چلے گئے۔ اب میں نے پوچھا کہ کیا آپ کو اختر نے بتایا کہ اب پاسپورٹ بھی ان کو دینے سے انکار کر دیا۔ "نہیں، اختر نے اس کا ذکر ہی نہیں کیا۔ کیوں بات کیا ہے؟ میں نے ان کو بتایا۔ "میں اس وقت پنڈت پنتھ جی کے دفتر میں ان کے کمرے میں بیٹھی ہوئی ہوں اور آپ سے بات کر رہی ہوں۔ پنتھ جی کہتے ہیں کہ یہ معاملہ صوبائی حکومت کے ہاتھ میں نہیں اس لیے وہ مجبور ہیں۔ بس آپ یہ کیجیے کہ ایک تار وائسرائے کو خود اپنی طرف سے دیجیے اور ایک جواہر لال جی اور باپو جی سے دلوائیں کہ آپ تینوں کی خواہش ہے کہ اختر اور مجھے پاسپورٹ دینے کی اجازت پنتھ جی کو دیں۔ مجھے پوری امید ہے کہ پھر وہ ضرور اجازت دے دیں گے۔ میں آپ کو بتائے دے رہی ہوں کہ میں ان کے دفتر سے بغیر پاسپورٹ لیے نہ جاؤں گی۔" ادھر سے ان کے زور کے قہقہے کی آواز سنائی دی۔ "تم نے ٹھیک سوچا۔ بس وہاں ہی بیٹھی رہو۔ ہم سب ابھی تار دیتے ہیں۔ اس کا اثر ضرور ہو گا، اور پاسپورٹ دو تین دن میں ضرور مل جائیں گے، مگر ایک شرط ہے کہ تم واردھا رکتی ہوئی حیدرآباد جانا ورنہ

میری ملاقات تم سے نہ ہو سکے گی۔"

میری ساری گفتگو کو وہ حیران ہو کر سنتے رہے۔ "تو آپ سروجنی جی، جواہر لال جی اور گاندھی کو اتنی اچھی طرح جانتی ہیں۔" میں نے بڑے اعتماد کے لہجے میں کہا۔ "اختر حسین رائے پوری کو ہر پڑھا لکھا انسان جانتا ہے اور میں ان کی ہی بیوی ہوں۔ سروجنی جی نے تو مجھے بیٹی بنایا ہوا ہے۔" "اچھا تو اب آپ کو اطمینان ہو گیا۔ دو روز بعد پھر آیئے گا۔"

"اے لیجیے! میں یہاں سے جا ہی نہیں رہی۔ میں تو آپ کے اسی دفتر میں بیٹھی رہوں گی۔ آپ اب اپنا کام کریں۔ میں ادھر بیٹھ کر اخبار پڑھتی رہوں گی۔"

صوفے اور تمام کرسیاں دیواروں سے لگی رکھی ہوئی تھیں، میں صوفے سے ٹیک لگا کر بڑے اطمینان سے اخبار پڑھنے لگی۔ پنتھ جی کی ملاقات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ساتھ ہی کچھ فائلوں پر سرسری نگاہ ڈالتے اور دستخط کرتے۔ ایک افسر اس کو آگے سرکا کر دوسرا سامنے کھول دیتا۔ کسی آنے والے سے دو چار باتیں کرتے کسی کا دیا ہوا کاغذ ہاتھ میں لے کر سکریٹری کو تھما دیتے، کسی سے کچھ تفصیلی گفتگو کرتے۔

ڈیڑھ بجے کمرہ لوگوں سے خالی ہو گیا۔ مجھ سے کہا۔ "آیے بی بی اندر چلیں، کھانا کھا لیجیے۔" "آپ اندر تشریف لے جائیں کھانا کھایے، مجھے تو تھال میں کھانا پرسوا کر یہیں دے جائے گا۔ وہ ایک لمحہ کھڑے مجھے یوں دیکھتے رہے کہ کس قدر ڈھیٹ لڑکی ہے، پھر اندر چلے گئے۔ میرا کھانا دفتر میں آ گیا۔

شام سات بجے پنڈت جی دفتر ختم کر کے اندر جانے لگے تو مجھ سے کہا "بیٹا میرے دو دفتر ہیں ایک یہ اور ایک اندر گھر میں۔ یہی تو آپ کا کہنا ہے کہ دفتر میں بیٹھی رہیں گی تو چلیے اندر گھر کے اس دفتر میں بیٹھیے اور وہیں سویے۔ یہ بات میری سمجھ میں آ گئی۔ اندر آئی۔ اپنی بیگم صاحبہ اور بیٹی سے ملایا۔ دونوں ہی سادی سوتی ساریاں پہنے تھیں، بھولی بھالی شکلیں۔ بہت دیر باتیں کرتی رہیں۔ میری ہمت اور ضد کی داد بھی دی کہ "حق یوں ہی ملتا ہے۔ اس کو حاصل کرنے کے لیے زور، زبردستی کرنا پڑتی ہے۔ سروجنی جی تم کو معلوم ہوتا ہے بہت چاہتی ہیں۔ کچھ دیر پہلے فون پر مجھ سے بات کی تھی کہ ان کی بیٹی کا میں بہت خیال رکھوں اور کہہ رہی تھیں کہ چند روز بعد حیدر آباد جاتے میں تم واردھا رکو گی ان سے ملنے کے لیے۔ میرا بہت بہت سلام کہہ دینا۔"

دوسرے روز پنڈت جی نے بتایا کہ دہلی سے پاسپورٹ دینے کا تار آ گیا۔ شام تک تیار ہو کر آ جائیں گے تاکہ میں آج رات کی ٹرین سے واپس ہردوئی جا سکوں۔

جمیل بھائی! میں آپ کو اپنی خوشی کا عالم بتا نہیں سکتی۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ سوچا جب میں اختر کے ہاتھ میں دوں گی تو وہ کس قدر خوش ہوں گے۔ پنتھ جی کی بیگم صاحبہ نے چلتے وقت ایک صندل کی ڈبیا دی، اس میں سیندور تھا کہا کہ "اس کو استعمال تو نہ کرو گی مگر اپنے پاس سہاگ کی نشانی سمجھ کر رکھے رہنا اور ہاں تم کو اکیلا سفر نہیں کرنے دیں گے۔ ایک افسر ہردوئی تک تمہارے ساتھ جائے گا۔ میں نے بتایا کہ والد صاحب نے ایک صاحب کو ساتھ بھیجا تھا وہ مجھے اسٹیشن پر موجود ملیں گے۔

اسٹیشن پر وہ مجھے پہنچانے آئیں۔ انسپکٹر صاحب سے ملوایا۔ ہنس کر کہا۔ "تم پولیس کی حفاظت میں جا رہی ہو۔" ایسی گہری نیند سوئی کہ جب ریل ہردوئی پر رکی۔ ہڑبڑا کر اٹھی، اٹیچی کیس ہاتھ میں پکڑے نیچے اتر آئی۔ جیسی کوئی دلہن، تانگے پر گھر آئی، بھاگتی ہوئی ابا کے کمرے میں جا کر ان سے لپٹ گئی اور ان کے ہاتھ میں دونوں پاسپورٹ تھما دیے۔ دیکھ کر مسکرائے۔ میرے سر پر ہاتھ پھیرنے میں کئی بار کہا ـــــ شاباش ـــــ "ابا میں اب کل ہی روانہ ہو جانا چاہتی ہوں۔ مگر راستے میں واردھا ضرور رکوں گی۔ یہ تو سروجنی نائیڈو کی کوشش سے پاسپورٹ ملے ہیں۔ انہوں نے اسی شرط پر دلوائے کہ میں وہاں رک کر ان سے مل کر حیدر آباد جاؤں۔ ابھی آپ میری سیٹ بک کرا کر اختر کو تار دیجیے، مگر ابا، اختر کہیں ناراض تو نہ ہوں گے کہ بغیر ان کی اجازت کے میں واردھا کیوں رکی؟" "اگر اجازت نہ دی تو، منع بھی تو نہ کیا تھا۔ میرے خیال میں مضائقہ نہیں۔ میں سیٹ بک کروا کر مولانا کو تار دے دیتا ہوں۔"

اماں نے بڑے فخر بھرے انداز سے دیکھ کر کہا کہ "جس کی ہمت ٹوٹ جاتی ہے وہ زندگی کی دوڑ میں ہمیشہ پیچھے رہ جاتا ہے۔"

میں نے خوشی خوشی سامان بند کیا۔ جو کوٹ گرم کپڑے لے گئی تھی وہ رکھ لیے۔ کل رات روانہ ہونا تھا۔ ابا نے مجھے اپنے کمرے میں بلا کر کہا "حمیدہ تم کو شاید ایک بات یہ معلوم نہیں کہ کوئی لڑکی باہر کے کسی ملک میں جاتی ہے تو اس کے والدین اس کو اس کا جیب خرچ پھر سے دینا شروع کر دیتے ہیں اور ٹکٹ بھی ان کے ذمے ہو جاتا ہے۔ یہ لو

اپنے چھٹے ماہ کا جیب خرچ ایک ہزار دو سو اور یہ ہزار روپے ٹکٹ کے۔ چھ ماہ پیچھے میں یہ سویر ہو سکتی ہے۔ اس لیے چھٹے ماہ والا حساب ٹھیک رہے گا۔ میں نے کہا اگر ایسا ہی ہے تو مجھے لینا ہی پڑیں گے ورنہ تو اختر کو بہت برا لگتا ہے۔ خدا کے فضل سے ان کے پاس اتنے پیسے ہیں کہ ٹکٹ وغیرہ خرید لیں اور پھر انجمن کا کام کر کے وہاں سے پیچھے یہ چھ ماہ روپے آتے رہیں گے اور اختر خوال چند اگروال جی کے اخبار کے لیے کالم بھی لکھ کر بھیجا کریں گے۔"

میں کس قدر سادہ مزاج تھی کہ یہ قطعی نہ سمجھی کس قدر خوب صورتی کے ساتھ انھوں نے یہ بات بنا کر کہی۔ ان کو یقین ضرور ہوگا کہ یہ لڑکی روپے لینے پر تیار نہ ہوگی اور یہ بھی ہے کہ اگر مجھے شک بھی ہو جاتا تو ہرگز ٹکٹ لینے پر راضی نہ ہوتی۔

پاسپورٹ کیا ملے تھے کہ مجھے لگا کہ دنیا کی بادشاہت مل گئی۔ سب سے ایک لمبے عرصے کے لیے جدائی سے نہ وحشت نہ افسوس۔ رات کو آٹھ بجے گاڑی روانہ ہو کر دوسرے دن بارہ بجے واردھا پہنچ گئی۔ اسٹیشن پر سروجنی نائیڈو اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ کھدر کی موٹی سی سرخی رنگ کی ساری باندھے۔ ڈھیلا ڈھالا جوڑا اپنے ہاتھ سے بار بار اونچا کرتی اور بڑی سی بندیا لگائے' سیندور سے مانگ بھری ہوئی کھڑی تھیں۔ مجھے کھینچ کر گلے لگا کر پیار کیا اور کہا۔ "یہ بات ہوئی نا کہ میری بچی بڑی ہمت والی اور نڈر ہے۔"

بڑا ہی چھوٹا سا اسٹیشن تھا۔ تانگہ' اکّا اور بیل گاڑیاں اور صرف ایک ٹیکسی کھڑی تھی۔ پوچھا ٹیکسی میں چلوگی یا تانگے میں؟ میں نے کہا کہ بیل گاڑی میں کہ اس پر بیٹھنے کا کبھی موقع ہی نہ ملا اور یہ بڑا سا کیبن ٹرنک اس میں آسانی سے آجائے گا۔ ہنسنے لگیں۔ "راستہ دو میل سے زیادہ ہوگا کوئی دو گھنٹے لگ جائیں گے۔" "ہم کو جلدی ہی کون سی ہے؟ جواہرلال جی چلے تو نہیں گئے؟" "ان کو صبح چلا تو جانا تھا مگر میں نے ان کو روک لیا کہ میری ایک بچی سے آپ ابھی تک ملے نہیں ہیں' بغیر ملے جا نہیں سکتے۔ آج شام کو تم ان سے ملوگی اور کل صبح وہ جا رہے ہیں۔" بیل گاڑی کچی پکی سڑک پر کھیتوں کے درمیان میں سے گزر رہی تھی۔ کہیں کہیں کھیتوں اور امرودوں کے باغات تھے۔ مسز نائیڈو نے کہا۔ "پہلے مجھے لکھنؤ میں پنڈت جی کے پاس جانے اور رہنے کا حال سناؤ اور یہ کہ تم کو مجھے فون

کرنے کا خیال کیسے آیا؟" میں نے جیسے ہی پنڈت جی کے ماتھے کا تلک دیکھا تو آپ کی بندیا کا خیال آگیا۔ جب میں ان کو چپّل گر جانے اور جاتے ہی پنچھی جی کو پانچ روپے ہاتھ میں دے کر چپّل منگوانے کا قصہ سنایا تو ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔ ان کی ہنسی کے ساتھ ساتھ ان کا پیٹ بھی ہنستا ہوا لگتا تھا۔ سب حال سننے کے بعد بولیں۔ "تم بھی خوب ہی مزے کی چیز ہو جو سوچ رہی ہوتی ہو وہ بول جاتی ہو۔ اس میں اس قدر سادگی اور بھول پن ہوتا ہے کہ کوئی برا مان ہی نہیں سکتا' پر دل بات کا اثر ضرور قبول کر لیتا ہے۔"

"آپ تو یہ بتائیں کہ جب میں پاسپورٹ اختر کے ہاتھ میں دوں گی تو کتنا خوش ہوں گے۔ ان کو یقین نہ آئے گا۔" "میری بات یاد رکھنا کہ اختر کچھ بھی خوشی کا اظہار نہ کریں گے۔ بس صرف اتنا کہیں گے کہ یہ بہت اچھا ہوا کہ پاسپورٹ مل گئے۔ یہ ہم مفکر لوگ ایک طرح سے بڑے خراب ہوتے ہیں۔ دوسرے کے کچھ کرنے کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتے۔ میں یہ اپنے تجربے کی بنا پر کہہ رہی ہوں کہ یہ بارہا ہوا کہ نائیڈو صاحب نے میرے کسی لمبے سفر پر جانے کے بعد یہ سوچ کر گھر میں بڑی بڑی تبدیلیاں کرائیں کہ میں دیکھ کر نہال نہال ہو جاؤں گی' بڑی تعریف کروں گی اور میں واپسی پر بس ایک اچٹتی نظر ڈال کر بغیر خوشی کا اظہار کیے ہوئے بھدے سے صوفے پر بیٹھ کر اپنے سفر کی روداد سنانے لگی۔ چند دن بعد مجھے احساس ضرور ہوا کہ آخر میں نے کسی خوشی کا اظہار کیوں نہ کیا۔ کوئی تعریف کیوں نہ کی' مگر ہم جیسوں کو وقت پر یہ چیزیں اور باتیں سوجھ ہی نہیں سکتیں۔ ہاں دو چار سال بعد خیال آئے اور کچھ اس کے متعلق کہیں۔ بس اب کھانا کھا کر لیٹ جاؤ پھر میں تم کو آشرم دکھاؤں گی۔

شام کو وہ اپنے ساتھ لے کر باہر آئیں۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پچاسوں چھوٹے چھوٹے پھونس کے چھپر کے چھت والے کمرے' سامنے چھوٹا سا برآمدہ۔ بیس پچیس کمروں کے بعد ایک ہال۔ بتایا کہ یہ کھانا کھانے کے لیے ہیں' اس کے پیچھے رسوئی ہے۔ باقی سب مہمانوں کے رہائش کے لیے ہیں۔ یہ کمرے لائن میں نہ تھے بلکہ دائرے میں تھے۔ بیچ بیچ ایک خاصی بڑی جگہ صاف لپی پتی سی اور اس کے بیچ میں اسی طرح کا ذرا کشادہ کمرہ' دیواریں اینٹوں کی یا پلاسٹر کی ہوئی نہ تھیں بلکہ مٹی اور گوبر سے لپی ہوئی۔ ان جھونپڑیوں نما کمروں کے درمیان ادھر ادھر کچھ زیادہ تر نیم کے گھنے پیڑ۔ بیچ والی ہٹ گاندھی

جی کی تھی اور ادھر ادھر دو چار گائیں بھی گھوم پھر رہی تھیں۔ تین تین کمروں کے بعد پتلی پتلی پگڈنڈی نما سڑکیں پیچھے کی سمت جا رہی تھیں۔ ہر برآمدے میں چند مونڈھے پڑے تھے۔ دور بیچ والی ہٹ کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ وہ دیکھو سامنے جو سڑک پر جھاڑو لگا رہے ہیں وہ جواہر لال جی ہیں۔ میں تو ہکا بکا رہ گئی۔ الٰہی یہ کیوں؟ سب ہی کو صبح شام جھاڑو دے کر گوبر بھی اٹھانا پڑتا ہے بھئی دیکھو یہ تو آشرم ہے۔ ہر ایک کو خود سب کام کرنا ہوتا ہے۔ برتن دھونا، کپڑے دھونا، کھانا پکانا۔ آخر ہمارے ملک کی بیشتر آبادی خود ہی تو سب کچھ انجام دیتی ہے نا۔ باپو جی قوم کو بہت کچھ بتاتے رہے ہیں وہاں ایک عام انسان کو زندگی کی طرح رہنے کا درس بھی دیتے ہیں۔ یہاں سے جانے کتنے لڑکے، لڑکیاں اور بڑی عمر والے بھی اپنے نفس کو مار کر دوسروں کی خدمت کا جذبہ لے کر ہر سال ملک کے ہر ہر خطے میں جا کر آشرم کھول کر زندگی سادگی سے گزارنے کا درس دیتے ہیں۔"

مغرب کے بعد مجھے جواہر لال جی کی کمرہ نما جھونپڑی میں لے کر چلیں تو وہ برآمدے میں بیٹھے ہوئے کچھ کاغذات الٹ پلٹ کر رہے تھے۔ مجھے ملایا کہ "یہ حمیدہ اختر حسین رائے پوری کی بیوی ہیں۔ ہم سب نے جو وائسرائے کو تار دیے تھے تو ان کو پاسپورٹ مل ہی گئے۔ یہاں رکی ہیں تاکہ ہم تینوں کا شکریہ ادا کریں۔" اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ میرے آداب کے جواب میں نمسکار کی اور بیٹھنے کو کہا۔ اچھی مردانہ خوب صورتی، شخصیت، نرم اور دوہرے کے ساتھ چہرے پر انسانیت اور ملائمیت بھی رکھتے تھے۔ اسے قریب سے ان کو دیکھ کر میں تو کچھ نہ بول سکی تو خود انہوں نے بڑے صاف لہجے میں کہا "میں جب بھی آپ کے شوہر سے ملا اور جو بھی ان کا لکھا ہندی اور اردو میں پڑھا بہت ہی متاثر ہوا۔ وہ صرف لیاقت اور قابلیت ہی نہیں رکھتے بلکہ ان کی نظر بہت دور تک دیکھ بھی سکتی ہے۔ مجھے پوری امید ہے کہ ان کا قلم ملک اور انسانیت کے لیے بہت کچھ کرے گا۔ ہاں یہ تو بتائیں کہ کس موضوع پر ڈاکٹریٹ کرنے کا ارادہ ہے۔" ان کا خاص مضمون سنسکرت اور ہسٹری ہے۔ ضرور اسی میں ڈاکٹریٹ کریں گے۔" مسز نائیڈو نے ان کو چٹکی والا قصہ سنا دیا۔ بے حد ہنسے۔ ہنستے ہوئے وہ اور بھی اچھے لگے۔ گھڑی دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ رات کو الٰہ آباد روانہ ہونا ہے اور باپو جی سے کچھ ضروری ہدایات بھی لینی ہیں۔"

رات کا کھانا چٹائی پر بیٹھ کر تھال میں کھایا۔ دال اور پالک آلو کی بھجی، دو چپاتی

تھے۔ اپنے اپنے برتن دھو کر جگہ پر رکھ کر ہم ہال سے باہر آ گئے۔ کھانے کے بعد بہت دیر تک چہل قدمی کرتے رہے۔ زیادہ وقت سروجنی نائیڈو مجھ سے کرید کرید کر مالی حالات کی باتیں کرتی رہیں۔ میں بڑے وثوق سے ان کو بتاتی رہی کہ کوئی فکر کی بات نہیں۔ اختر کا قلم ہر مرحلے کو طے کرواتا رہے گا اور جیسا کہ ہوتا ہے کہ جب کوئی لڑکی ملک سے باہر جاتی ہے تو پاکٹ منی اتنی ملتی رہے گی کہ میرا خرچہ پورا ہو جایا کرے گا' ساتھ ٹکٹ کے بھی روپے ملتے ہیں۔ "کیسی پاکٹ منی اور کون یہ دے گا؟" جب میں نے ابا کی باتیں دہرائیں تو قہقہہ مار کر ہنسیں اور صرف یہ کہا "مظفر عمر لیس والے' جاسوسی کے ناول نگار ہیں۔" "آپ کا کیا مطلب؟" "کچھ نہیں۔"

—○—

گاندھی جی کا آشرم

صبح تڑکے انہوں نے مجھے اٹھایا کہ جھٹ پٹ منہ ہاتھ دھو کر باہر چلو' بعد میں ناشتہ کرنے چلیں گے۔ باہر آ کر تماشا دیکھا کہ ہر طرف ادھر ادھر لوگ جھاڑو لگا رہے ہیں' کچھ خواتین بھی۔ پیچھے کی طرف لڑکے لڑکیاں تھیں جو بڑی پھرتی سے جھاڑو لگانے گوبر اٹھانے میں مصروف تھے۔ بتایا یہ لڑکے لڑکیاں یہاں آشرم ہی میں رہتے ہیں۔ یہ کہہ کر نیچے اتریں' برآمدے کے نیچے رکھی جھاڑو اٹھا کر گز دو گز ادھر اُدھر دو چار مار کر ہنستی ہوئی اوپر پھر برآمدے میں آگئیں۔ دور کی طرف اشارہ کیا وہ دیکھو سیٹھ برلا جھاڑو لگا رہے ہیں۔
"توبہ توبہ یہ سب کیا ڈھونگ ہے۔" میں نے کہا۔ "تم یہ کیوں نہیں سمجھتیں کہ یہ برابری کا درس ہے۔ دیکھو میں تم کو باپو جی کے پاس ایک شرط پر لے جاؤں گی کہ ہرگز ایسی اوٹ پٹانگ باتیں نہیں کرو گی۔ دوسرے یہ کہ ان کو گاندھی جی نہیں بلکہ باپو جی کہو گی"۔۔۔۔"بہت بہتر۔"

ناشتے میں ایک اسٹیل کے گلاس میں دودھ اور ایک پھلکا ملا۔ وہ تو نہانے چلی گئیں۔ میں کھڑکی سے لگ کر باہر کا تماشا دیکھنے لگی۔ کچھ لڑکے لڑکیاں بالٹی اور گگریاں لیے پانی بھرنے کنوئیں پر جا رہے تھے' کچھ پانی بھر کر لوٹ رہے تھے۔ کسی نے ایک بالٹی پانی کی ہمارے برآمدے میں بھی رکھ دی۔ مسز نائیڈو تیار ہو کر باہر آئیں تو کہا پانی کی بالٹی غسل خانے میں لے جاؤ۔ تیار ہو کر آؤ۔ میں اتنے میں ذرا اخبار پڑھ لوں۔

میں نکلی تو وہ مجھے لے کر جو بیچ میں ہٹ بنی ہوئی تھی اس طرف کو چلیں۔ اپنا سر پلو سے ڈھانک کر کہا۔ "تم بھی سر ڈھانک لو۔" برآمدے میں اینی بیسنٹ ایک انگریز خاتون کھڑی ملیں۔ بے بلاؤز کی ساری کا پلو کس کر سر پر سے ہوتا ہوا کمر پر کھونس رکھا تھا۔ ذرا سا پلو سر پر سے کھسکا تو نظر آیا کہ سر منڈا ہوا ہے۔ یہ عرصے سے گاندھی جی کی چیلی بنی ہوئی ان کی سیوا اور ٹہل خدمت کے کام انجام دے رہی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک تھال تھا

جس میں ایک کٹوری میں کدوکش کی ہوئی گاجر' ایک میں چقندر تھا اور ایک طرف کچھ پتے مولی کے۔ سروجنی نائیڈو نے ان سے اندر جانے کی اجازت لی اور مجھے لے کر اندر آئیں اور جھک کر نمسکار کر کے گاندھی جی کے پاؤں ہاتھ لگا کر چھوئے اور ان کا آشیرباد لے کر مجھے بھی اشارہ کیا کہ میں بھی ایسا کچھ کروں۔ میں نے تو صرف جھک کر آداب کیا۔ مجھے ملایا کہ یہ حمیدہ' اختر حسین رائے پوری کی بیوی ہیں۔ آپ کا شکریہ ادا کرنے یہاں آئی ہیں۔ "بیٹھیے بیٹھیے آپ دونوں۔" کمرے کے بیچ فرش پر ایک بڑی سی چٹائی بچھی ہوئی تھی' پیچھے گاؤ تکیہ اور سامنے ایک تختے سے ڈیسک نما نیچی سی میز پر قلم اور کاغذ رکھے تھے۔ اب میں نے ہمت کر کے ان کی طرف دیکھا۔ موٹے کھدر کی دھوتی اس انداز سے بندھی ہوئی تھی کہ پتلی سوکھی ٹانگیں' ران تک ننگی۔ نہ بنیان نہ کرتا۔ ایک ایک پسلی یوں نمایاں کہ بڑی آسانی سے گن لو۔ لمبا سا جنیو گلے میں پڑا ہوا۔ ماتھے پر تلک' سر کے بال برائے نام' ابھرا ہوا بے حد چوڑا ماتھا' پتلے پتلے ہونٹ ایک دوسرے سے بھینچے ہوئے' ناک موٹی سی اور موٹی موٹی بھنویں' عجیب قسم کی آنکھیں' نہ تو بہت بڑی نہ چھوٹی مگر ان میں برقی روشنی سی' جیسے مقابل والے کا ایکسرے لے رہی ہوں۔ دھنسے ہوئے گال' جبڑے کی ہڈیاں ابھار لیے ہوئے' گندمی رنگ اور سامنے کے چار دانت غائب' مٹھی بھر وزن' مگر جانے ان میں کون سی طاقت تھی' مجھے یوں لگا کہ انہوں نے مجھے اندر تک پڑھ لیا ہے۔ ان کے آگے یا تو انسان کی آنکھیں جھکی کی جھکی رہ جائیں یا اگر ان کی طرف دیکھ لے تو نگاہیں تکی کی تکی رہ جائیں۔ سروجنی نائیڈو پلو ڈھالے بڑی مودب بیٹھی تھیں نظریں نیچے کیے ہوئے اور میں گاندھی جی کی طرف دیکھے ہی جا رہی تھی۔ مسکرا کر بولے۔ "آپ کو ہم یہ کہے ہے کہ بڑا قسمت والی ہے کہ پتی اختر حسین رائے پوری ملا ہے۔ اگر ایسا لوگ اور بھی ذرا ہو تو خوب اچھا ہو۔ وہ کابل بہت سا ہے اور بہت سارا اینڈر' بے باک ہے' ناگپور کانفرنس میں زبان کے بارے میں بولا تو ہم سمجھ لیا کہ اس کو ہلا سکتا نہیں۔ ہم جانتا کہ مسلمان بھائی لوگ بھی ساہتیہ النکار کی ڈگری بنارس یونیورسٹی سے نہیں لے سکتا۔ اس کو ہندو بھائی لوگ کٹھن سے لے سکتا۔ ہندوستان کو ایسا ہی لوگ کا ضرورت ہے جو ہندی اردو ایک موافق سا جانے۔ جب یہاں آیا تو اس وکت پاسپورٹ کا بات کچھ کسی سے نہیں بولا۔" میں نے کہا "وہ بہت خوددار ہیں۔ اپنے لیے کسی سے کچھ نہیں کہتے۔

میں آپ کی بہت شکرگزار ہوں کہ وائسرائے کو تار بھیجا۔

"کوئی شکریے کی بات نہیں۔ بی بی سوچو اگر آپ بھی ان کے ساتھ جاتا ہے' پڑھائی آدھی نہ ہو جائے۔ ایسا بھی تو آپ کر سکتا۔ یہاں آشرم میں رہ کر کچھ سیکھے۔ کوئی بڑا آدمی جو ملک کا سیوا کرے اس کی پتنی میں بھی حوصلہ' ہمت اور دیس کی سیوا کا شوک اگر ہو گا تو پھر پتی دل لگا کر دیس کی سیوا کرتا ہے۔ بولے آپ کہ اس آشرم میں اگر وہ جائے تو کیسا لگے۔" "باپو جی مجھے اپنے شوہر سے دور رہنا ذرا اچھا نہ لگے اور پھر یہاں کی بہت سی باتیں پسند نہیں۔" سروجنی نائیڈو نے گھبرا کر میری طرف دیکھا۔ "کون سا بات؟"

آپ برا نہ مانیے گا سچ بات یہ ہے کہ مجھے تو یہ سب تماشا لگا کہ لوگ جھاڑو دے رہے ہیں' پانی بھر کر لا رہے ہیں' گوبر اٹھا رہے ہیں۔ جب کہ یہی لوگ اپنے اپنے گھروں میں واپس جا کر صاحب بہادر اور میم صاحب بن جاتے ہیں۔ آج صبح میں نے سروجنی جی کو جھاڑو دیتے دیکھا۔ یہ تو اپنے گھر میں کبھی خود ایک گلاس پانی بھی اٹھ کر نہیں پیتیں۔ یہ بیٹھی تو ہیں۔ آپ ان سے پوچھ لیں۔ بات تو جب ہے کہ آپ کی سکھائی پڑھائی باتوں کو آپ کے سامنے سے ہٹ جانے کے بعد یاد رکھ کر اس پر عمل کریں۔ سروجنی جی نے گھبرا کر میری طرف دیکھا۔

اب گاندھی جی نے اپنی عینک کو سرکا کر بالکل ناک کی نوک پر کر کے اوپر کی طرف سے مجھے گھور کر دیکھا۔ میں ان کی نظروں کی تاب نہ لا سکی اور پھر نیچے دیکھنے لگی۔

گاندھی جی نے ٹھہر ٹھہر کر یوں جواب دیا۔ "بات ایسا ہوتا ہے ماں باپ جب بچوں سے ایک ہی بات کو بار بار کہتا جاتا ہے ایسا کرنا ہے ویسا کرنا ہے کتنا سال نکل جاتا ہے تب فردہ اس بات کا تھوڑا سا جان جاتا ہے' کچھ سنتا ہے' کچھ نہیں مانتا۔"

"جی یہ بات ٹھیک ہے' مگر یہ سب بچے تو نہیں ہیں۔ بڑے لوگ تو عقل سمجھ والے ہوتے ہیں۔ ان کو تو آپ کی بات فوراً" مان لینا چاہیے۔ اینی بیسنٹ نے آ کر کہا۔ "فلاں صاحب کی ملاقات کا وقت ہو گیا تو گاندھی جی نے کہا کہ دیں ابھی ان کے پاس ملاقات کا وقت نہیں۔ سروجنی نائیڈو تو اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ میں نے اٹھنا چاہا تو "حکماً" کہا۔ "ابھی آپ بیٹھے۔" میں پھر بیٹھ گئی۔

آپ بولے کہ "جب ہم سارا ہندوستانی لوگ ایک ہی دھرتی ماتا کا رہنے والا' پھر یہ

ہندو اور مسلمان الگ الگ کیسا ہو سکتا ہے۔ مل جُل کر کیوں نہیں رہنے سکتا۔ ملک کی آزادی کے لیے ایک موافق کام کیوں نہیں کرنے سکتا؟"

"میں خود آپ سے یہ بات پوچھنے کو تھی کہ اگر آپ یہ بات دل سے چاہتے ہیں تو اگر ایک مسلمان کسی ہندو لڑکی سے شادی کر لے تو ہرج ہی کیا ہے؟ آپ کی نظر میں جب ہندو مسلمان ایک ہے تو آپ کو سب سے بڑھ کر اعتراض کیوں ہو۔ بیچاری لکشمی پنڈت نے جب سید حُسین صاحب سے شادی کر لی تو آپ ہی نے بہانے سے سیّد حُسین صاحب کو ولایت بھیج کر لکشمی جی کو کئی ماہ نظر بند رکھا' جب تک ان کے پھیرے نہ ڈلوا لیے۔ میں ٹھیک بات کہہ رہی ہوں نا' اس کا کیا جواب ہے آپ کے پاس؟"

عینک کو اور نیچا ناک پر کر کے ذرا تھم کر بولے۔ "بات یہ ہے کہ مسلمان اور ہندو بہن بھائی تو پھر بہن بھائی کی شادی کیسے ہوتا۔ اس جواب پر مجھے ہنسی تو بڑے زور سے آئی۔ مشکل سے ضبط کر کے کہا" ہندو بھی تو آپس میں بہن بھائی ہوتے ہیں پھر تو کوئی شادی مت ہونے دیں۔ کتنی اچھی طرح بڑھتی ہوئی آبادی کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ یہ سن کر وہ ہنسے تو سامنے کے دانت نمایاں ہو گئے۔ مجھے کھڑکی کا خیال آیا۔ اب انہوں نے بات کا رخ بڑی ہوشیاری سے یوں موڑا۔ آپ سامنے وہ بکسے کو دیکھتا ہے؟ اس پر کیا لکھا ہے؟" ہندی میں کانگریس فنڈ لکھا ہوا تھا۔ تھوڑی سی ہندی شادی سے پہلے شُدبُد تک جان گئی تھی۔ میرے بتانے پر کہ فنڈ لکھا ہوا ہے خوش ہو کر بولے "خوب خوب آپ ہندی پڑھ لیتا ہے۔ یہاں جو بھی عورت آتی ہے وہ اپنا زیور اتار کر اس میں ڈال دیتی ہے۔ مرد لوگ جیب کا روپیہ ڈال دیتا ہے۔ تب کانگریس کا کام چلتا ہے۔ آپ بارہ سونے کی چوڑیاں پہنے ہیں۔ ان کو ڈبے میں ڈال دیں۔ جس ملک میں آدمی لوگ کے پاس بدن ڈھانپنے کو کپڑا نہ ہو' پیٹ بھرنے کو کھانا نہ مل سکے وہاں پر سونا پہننا شرم کی بات ہے نا۔"

بات تو آپ ٹھیک فرما رہے ہیں مگر یہ چوڑیاں میری اماں نے مجھے تحفے میں دی تھیں اور میرے ہاتھ میں پہناتے وقت یہ کہہ رہی تھیں خدا تمہارے سہاگ کو ہمیشہ قائم رکھے۔ ایک تو یہ ماں کا تحفہ اور سب سے بڑی دعا جو کسی بیٹی کے لیے ہو سکتی ہے وہ ان چوڑیوں کے ساتھ شامل ہے۔ پھر آپ ہی بتائیں کہ کیا میں ایسا تحفہ اُتار سکتی ہوں؟ ہاں جب انشاء اللہ اختر کی کمائی والی چوڑیاں پہن کر آپ کے درشن کرنے آؤں گی تو اندر قدم

رکھتے ہی پہلا کام یہ کروں گی کہ ان کو پہلے فنڈ کے ڈبّے میں ڈال دوں گی۔ "آپ تو ہماری بات کوئی سا بھی نہیں مانتا۔ اچھا ایسا بات ہونا چاہیے کہ جانے سے پہلے سروجنی جی کو یہ بتا کر جانا کہ آشرم میں رہے گا اور مولانا عبدالحق شاہب کو میرا سلام دینا۔ وہ تو ہم سے بہت بگڑ گیا ہے اردو' ہندی دونوں زبان ان کا بھی ہمارا بھی' پھر وہ بس اُردو' اُردو کیوں کہتا ہیں؟"

اتنے میں "اینی بیسنٹ" ایک بکری کو رسّی کے ٹکڑے سے پکڑے ہوئے چٹائی پر آئیں تو میں اُچھل کر کھڑی ہو گئی۔ وہ بڑی پھرتی سے بکری کے تھنوں کو اس طرح دبا رہی تھیں کہ گاندھی جی کے کھلے ہوئے منہ میں دودھ کی دھاریں سیدھی جاتیں اور وہ غٹ غٹ کرکے پی رہے ہیں۔ جھک کر آداب کیا اور وہاں سے نکل کر برآمدے میں آئی تو دیکھا کہ سروجنی جی کھڑی میرا انتظار کر رہی تھیں۔ بڑے رُوکھے انداز سے بولیں "حمیدہ تم بھی خوب ہو۔ بھلا کبھی باپو جی سے کسی نے ایسی باتوں کی ہوں گی" "تو وہ مجھ سے آخر یہ کیوں کہہ رہے تھے کہ میں آشرم میں رہ جاؤں اور اختر چلے جائیں ولایت۔" "یہ تو میں نے ان سے پہلے سے کہہ دیا تھا کہ اگر وہ آشرم میں رہنے کو خود کہیں گے تو شاید تم مان لوگی تاکہ اختر کی پڑھائی مکمل ہو سکے۔ یوں میں مدراس میں جو "پرلانزسٹ" ہے اسکالرشپ دلانے کی پوری کوشش کروں گی۔" "اگر مل جائے تو کیا ہی کہنے اور نہ ملے تو آپ ذرا فکر نہ کریں۔ اللہ اختر کے قلم کو سلامت رکھے' ہم دونوں آسانی سے گزر کرلیں گے اور پھر میری پاکٹ منی بھی تو ہے۔ وہ میرے چہرے کو غور سے دیکھ کر چپ ہو گئیں۔ پھر مجھے اس طرف لے گئیں جہاں پر مختلف قسم کا کام لڑکے اور لڑکیاں کر رہے ہیں۔ سلائی ہو رہی تھی' جوتے چپل بن رہے تھے۔ گیلی مٹی چاک پر سراسر گھوم کر کیا کیا برتنوں' کوزوں' صراحی اور گگری کی شکل اختیار کرتے جاتے۔ کسی طرف چھوٹی چھوٹی بھٹیوں میں سے پگھلا ہوا لوہا سنسی سے اُٹھا کر نہوئی پر ڈال کر ہتھوڑے سے پٹنے کے بعد چھری' چاقو اور بھی بے شمار چیزوں کی شکل اختیار کرلیتے۔ سامنے کھیتوں میں کام ہو رہا تھا۔ ٹوکروں میں سبزیاں توڑ کر رکھی ہوئی' امرود کے بھرے ہوئے ٹوکرے اور سنگتروں کی ڈھیریاں زمین پر یوں رکھی ہوئی تھیں کہ گن کر حساب سے بھر کر ریل کے ذریعے بمبئی شہر کے لیے روانہ ہوں گی۔ مجھے یہ والا منظر سب سے اچھا لگا۔

دن کا کھانا کھا کر ہم دونوں سو گئے۔ شام کو بہت دُور تک ایک نہر کے کنارے کنارے سیر کر آئے۔ سرِ شام کھانا کھایا۔ نو بجے کی گاڑی سے مجھے روانہ ہونا ہے۔ سروجنی جی نے اسٹیشن پر ایک بار پھر بڑے اِصرار سے پوچھا تم مجھے سچ سچ بتا دو اگر روپیوں کی ضرورت ہو تو مجھ سے تکلّف نہ کرنا۔ ان کو اطمینان دلایا کہ اختر اور شمیم بھائی کا ایک گاؤں رہ گیا تھا۔ اس کو ہم نے بیچ کر نیلام کروا دیا تھا۔ آدھے ان کے حصّے کے دے کر خاصی رقم بچ جائے گی۔ اب آپ کسی قسم کی فکر نہ کیجیے گا۔

نو بجے رات کو حیدر آباد کے لیے روانہ ہوئی۔ اس خیال سے بے حد مگن کہ اسٹیشن پر مولوی صاحب اور اختر کھڑے ملیں گے۔ گاڑی رُکی' اُتری' دیکھا کہ صرف مولوی صاحب ہیں۔ آداب کے بعد پوچھا اختر کہاں ہیں۔ بتایا کہ ظفر عمر صاحب کا تار آنے سے پہلے وہ اورنگ آباد شمیم سے ملنے جا چکے تھے۔ آج رات واپس آجائیں گے۔ مولوی صاحب کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ ہم اِدھر اُدھر گھوم پھر کر ان کے پاس واپس آگئے۔ گھر آئے دیکھا کہ تین ماہ میں باغ سوکھ چکا ہے چڑیوں کا پنجرہ خالی پڑا ہے۔ اندر کی طرف کا باغ بھی ویرانے کے روپ میں ہو چکا تھا۔ مولوی صاحب ہنوز اسی چھوٹے کمرے میں تھے۔ ہمارے بند کمرے کو اختر کے آنے پر کھولا گیا تھا اور ایک چارپائی پر اختر کے لیے بستر لگا ہوا تھا۔ خوش ہو کر چائے دَم کی۔ بے وقت حقّے کی فرمائش کی اور لمبے لمبے کش لگانا شروع کیے۔ ساری باتیں معلوم کیں۔ کوٹ گڑھ کا حال سُن کر کہا کہ اگلے سال وہ کوٹ گڑھ ضرور جائیں گے اور ان عجوبہ چڑیوں کا گانا سُنیں گے اور مسز اسٹاک کی لائبریری دیکھیں گے۔ میں سمجھی تھی کہ ابا نے پاسپورٹ کا ذکر تار میں کر دیا ہو گا' مگر ایسا کچھ نہ لکھا تھا اور نہ اختر نے خود کوئی ذکر اس کے نہ ملنے کا کیا تو میں نے پوری تفصیل سے ان کو بتایا کہ کس طرح میں لکھنؤ گئی اور کیا باتیں پنتھ جی سے کیں اور چپّل والی بات پر تو وہ قہقہہ لگا کر ہنسے اور جب ان کو گاندھی جی سے ملاقات پر ساری باتیں بتائیں۔ خوش ہو کر بولے "تم نے بہت اچھا کیا سیّد حسین اور لکشمی پنڈت والی بات کا ذکر کیا۔ دیکھو بڈّھا کیسا چالاک ہے' بالکل لومڑی جیسا بکری کے تھن سے تازہ دودھ پینے کے طریقے کو سُن کر کہا "میں تمہاری جگہ ہوتا تو اپنا بھی منہ کھول کر بیٹھ جاتا اور یوں شاید اپنے حصّے میں بھی کچھ آجاتا۔

ایک دم مجھے خیال آیا کہ لاما کدھر ہے؟ بتایا اس کا داخلہ گھر میں قطعی ممنوع ہے' وہ صرف باغ کے پیڑوں پر چڑھ کر ہو حق کرتا ہے۔ تو سچ مچ تم دونوں یورپ چلے جاؤ گے؟ پہلے یہ بتاؤ کہ روپے کا کیا بندوبست کیا؟ اس کی کوئی فکر آپ نہ کریں کہ سب بندوبست ہے۔ مجھے ٹکٹ کے لیے روپے ابا نے دے دیے ہیں اور مجھے چھ ماہ کی پاکٹ منی بھی پیشگی دی ہے۔ بھئی یہ دستور بڑا اچھا ہے کہ جہاں کوئی لڑکی باہر کے ملک جائے تو والدین کا فرض بن جاتا ہے کہ کرایہ دیں اور پاکٹ منی بھی۔ ہنس کر پوچھا یہ کس نے بتایا؟ "ابا نے۔" پولیس والا تو پولیس والا ہی ہوتا ہے۔ آپ کا کیا مطلب "کچھ نہیں۔"

اچھا وہ لفافے "برائے قرض" "برائے اشد ضرورت" تمہارے پاس ہیں نا؟ جی۔ تو لاؤ مجھے دو کہ ان کے پونڈ کروادوں۔ ورنہ تمہارے لیے یہ وہاں بیکار ہوں گے۔ میں نے دونوں لفافے ان کو نکال کر دے دیے۔ وہ دفتر میں اُٹھ کر گئے اور کسی کو بینک بھیج دیا۔ شام کو واپس دے دیے۔ اب یہ پونڈ کی شکل میں تھے۔ کمرے میں گئے۔ جیسے اپنی کیبنٹ میں کچھ اُلٹ پلٹ کرنے کی آواز آتی رہی۔ باہر آئے' ہاتھ میں کچھ دبا ہوا تھا۔ بولے "یہ بیس پونڈ برائے اشد ضروری" میں رکھ لو۔ جانے یہ کیوں اور کب سے خانے میں پڑے تھے۔ یہاں میرے لیے تو بیکار ہیں' وہاں شاید تمہارے کام آجائیں' نہ کام آئیں تو پھر واپسی پر مجھے واپس ضرور کردینا! کس خوبصورتی سے بات ایسے بناکر کی کہ یوں میں ان کو لفافے میں رکھ ہی لوں گی۔

شام کو جب اختر واپس آئے اور مجھے بیٹھا دیکھا تو دنگ رہ گئے۔ "آخر آپ یہاں کیوں آگئیں؟" "یہ پاسپورٹ آپ کو دینے۔" ان کے ہاتھ میں دونوں رکھ دیے۔ بس صرف یہ کہا "یہ تو بہت اچھا ہوا۔" الٹ پلٹ کر دیکھنے میں مسکراتے رہے۔ ذرا بھی نہ پوچھا کہ یہ کیوں کر مل گئے۔ اختر تو اورنگ آباد شمیم بھائی سے ملنے اور ان کا حصّہ جو گاؤں کے بکنے پر ملا تھا دینے گئے تھے۔ انہوں نے کہا "فی الحال تم اپنے پاس رکھو' جب ضرورت پڑے گی لے لیں گے ورنہ ان کے پاس سے واہی تباہی میں خرچ ہوجائیں گے۔ وہ بھی کیا ہی بے نیاز انسان تھے۔ جب بھی جیب میں جو بھی روپے ہوئے جس نے مانگے دے دیے۔ ان کی دیانت داری اور انجمن کا ایک پیسہ بھی ضائع نہ ہونے پائے۔ اس کے لیے جس طور پر عملے پر سختی کرتے کہ ہمارے مولوی صاحب تنگ آکر کہہ اُٹھتے کہ جب سارے عملے کو

برسہا برس میں جو عادتیں پڑگئی ہیں وہ ان کی اتنی روک ٹوک کام میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ پریس کی کوئی نہ کوئی چیز خراب کردی جاتی ہے۔ جہاں وہ ایک آنہ بچاتے ہیں وہاں دس روپے زیادہ خرچ ہوجاتے ہیں۔

تیسرے دن ہم پھر اپنے مشفق اور چاہنے والے مولوی صاحب کو اداس چھوڑ کر روانہ ہوگئے۔ ریل میں بیٹھ کر اختر سے کہا۔ "بھلا یہ کیا بات ہوئی کہ پاسپورٹ ہاتھ میں لے کر صرف یہ کہہ دیا کہ یہ بہت اچھا ہوا۔ ارے صاحب کچھ تو پوچھا ہوتا کہ صاف انکار ہوجانے کے بعد یہ ملے کیسے؟ اچھا تو اب آپ خود بتادیں کہ یہ کیوں کر مل گئے؟ میں نے اختر کو لکھنؤ جانے اور پنڈت پنتھ جی سے اپنی گفتگو کا سب حال سنایا اور جو سروجنی نائیڈو سے فون پر گفتگو ہوئی اور چپل والی بات بھی بتادی تو خوب ہی ہنسے اور کہا "حمیدہ بیگم آپ تو کبھی کبھی بس حد ہی کردیتی ہیں۔" پھر جب میں نے اپنا وردھا جانے کا حال بھی سنایا کہ یہ باتیں گاندھی جی سے ہوئیں۔ کہا گاندھی جی سے ایسی باتیں کرتے وقت آپ نے یہ نہ سوچا کہ آپ ہیں کس سے مخاطب؟" دیکھیے بھئی میں تین آدمیوں سے بات بہت سوچ سمجھ کر کرتی ہوں کیوں کہ ان کا رعب مجھ پر چھایا رہتا ہے۔"

"ذرا مجھے بھی بتادیں کہ وہ تین کون سے خوش بخت لوگ ہیں؟" "آپ تو ایسے بھولے بن رہے ہیں جیسے آپ ان کو جانتے ہی نہیں۔ ایک مولوی صاحب' ایک ابا' اور ایک آپ جناب۔ سچی بات بتاؤں۔ درحقیقت ان تین کے علاوہ میری نظر میں کوئی نہیں۔ پھر تو یہ خبر آپ نے اچھی دی کہ آپ پر میرا رعب ہے۔ ابا آپ کے ٹھہرے پولیس والے' ان سے تو ڈرنا چاہیے کہ جانے کب کسی کو پکڑوادیں' بند کروادیں اور رہے مولوی صاحب میں نے تو ہمیشہ یہی دیکھا کہ آپ ان کی بات کا تڑ تڑ جواب دے دیا کرتی ہیں' بعض وقت تو وہ لاجواب ہوجاتے ہیں۔

"وہ تو ایک طرح کا دوستانہ جو اُن سے ہے مگر رعب تو ان کا مجھ پر بہت ہے۔" "اچھا اب یہ بتائیں کہ سوچا کیا آپ نے؟ آکسفورڈ یونیورسٹی سے یا کیمبرج سے' آپ ڈگری لیں گے؟" نہ مجھے آکسفورڈ جانا نہ کیمبرج سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لینی"

"تو پھر کہاں سے کریں گے۔ کیا کوئی اور بھی یونیورسٹی ہے؟"

مجھے انگلستان جانا ہی نہیں ہے۔ وہاں کی فضا میں مجھے گھٹن محسوس ہوگی کہ احساس

غلامی ہوتا رہے گا۔ میں تو فرانس جاؤں گا سوربون یونیورسٹی سے انشاء اللہ ڈگری لوں گا۔
میں تو سوچ میں پڑ گئی کہ فرنچ تو ان کو بہت اچھی آنی چاہیے۔ اس میں سال تو لگ ہی
جائے گا۔ پوچھا آپ چپ کیوں ہو گئیں۔ کیا پیرس جانے کی آپ کو خوشی نہیں ہوئی۔
خوشی تو بہت ہوئی مگر میں سوچ رہی تھی کہ اس طرح ایک سال زیادہ لگ جائے گا۔ "بس
حد ہی کر دی آپ نے کہ فرنچ سیکھنے میں سال لگ جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ دو تین ماہ۔"
یہ سن کر میں چپ ہو گئی تو خود ہی کہنے لگے۔ جب میں کلکتہ پہنچا تو مجھے بنگلہ زبان جلد سے
جلد سیکھنے کی خواہش ہوئی کہ بسنت میرے دوست نے ایک آدھ بار مجھے کسی بنگلہ زبان
کے رسالے سے بنگلہ کی ایک شاعرہ "پریم بداوروی" کی نظم سنا کر اس کا ترجمہ کر کے بتایا جو
مجھے بہت پسند آئی۔ کبھی نذر الاسلام کی نظم کو بنگلہ سے ترجمہ کر کے بتایا۔ دل میں سوچ لیا
کہ موقع ملنے پر اس زبان کو سیکھ کر ان دونوں سے ضرور ملوں گا۔ پہلے ان کا پورا کلام پڑھ
کر۔

آپ کے وہی بسنت دوست جن کے ساتھ میٹرک کرنے کے بعد آپ دونوں پہاڑوں
میں سادھوؤں کے ساتھ رہنے چلے گئے تھے۔ "ہاں وہی" کلکتہ پہنچ کر ایک بنگلہ کی پاکٹ
ڈکشنری خریدی اور ایک انگریزی اور ایک بنگلہ کا روزنامہ لے لیا۔ کسی پارک میں جا
بیٹھا۔ پہلے انگریزی کے اخبار کی سرخیاں دیکھیں۔ خاص خاص خبریں پڑھ کر بنگلہ اخبار اٹھا
کر پڑھنے کی کوشش شروع کی۔ یہ زبان ہندی کی رسم الخط سے ملتی جلتی تو تھی ہی۔ اس
کے الف ب پ سے واقفیت بسنت کی صحبت میں ہو چکی تھی۔ اس کام میں اس طرح محو
ہو گیا کہ جب سورج ڈوبنے لگا تو احساس ہوا کہ دن کے کھانے کا وقت گزر گیا اور مجھے خبر
تک نہ ہوئی۔ واپسی پر شمیم صاحب نے بگڑ کر کہا۔ تم سارا دن کدھر تھے؟ میں تو سمجھا تھا
کہ تم رستہ بھول گئے۔ اب میں ڈھونڈنے کے لیے نکل ہی رہا تھا۔

جب ان کو بتایا کہ قریب کے پارک میں بنچ پر بیٹھا بنگلہ سیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔
بڑے غصے سے بولے۔ تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ پارک میں بنگلہ زبان کیسے سیکھ
رہے تھے۔ میں نے سیکھنے کا طریقہ بتایا تو ہنس پڑے اور کہا کہ وہ دو سال سے کلکتہ میں رہ
رہے ہیں اور ابھی تک ان کو یہ زبان یوں نہیں آئی۔ ہر زبان باقاعدہ بغیر پڑھے نہیں
آسکتی۔ "مگر میں صبح اٹھ کر شہر گھومنے نکل جاتا" کچھ ادھر ادھر پھر پھرا کر پارک کی بنچ پر بیٹھ

کر ڈکشنری کی مدد سے اور گاہے گاہے چلتے پھرتے لوگوں سے روک کر مشکل لفظ اور اس کا تلفظ
پوچھ لینے میں عار نہ سمجھتا۔ دو ماہ میں پورا شہر دیکھ بھی لیا اور بنگلہ زبان آسانی سے پڑھ کر
پورا مطلب سمجھ لینے میں ذرا بھی قباحت محسوس نہ ہوئی۔ جانے کتنی کتابیں بھی پڑھ
ڈالیں' اچھی خاصی بنگلہ بھی بولنے لگا۔ پھر میں نے کتابوں کی دکانوں سے پریم بداوروی کی جو بھی
کتاب مل سکی خرید کر پڑھ ڈالی۔ ان کے شعری مجموعے بہت ہی پسند آئے' بڑا لطف
اندوز ہوا۔

پریم بداوروی کا نام سن کر ایک عجیب سی کیفیت مجھ پر طاری ہو گئی۔ اپنے کو خوب
سنبھال کر بیٹھ گئی کہ کہیں میری زبان سے ایسا ویسا لفظ ------ نہ نکل جائے کہ میں پریم
بداوروی کے اصل روپ سے کس قدر واقف ہو چکی ہوں۔ بلکہ ابھی یہ خود بتائیں اس کو
انجان بن کر بس سن لوں۔ بولے "ایک دن خیال آیا کہ چل کر اس مشہور شاعرہ سے مل
آؤں۔ ایک کتاب کی دکان سے ان کا پتہ معلوم کر کے وہاں پہنچ گیا۔ ملازم کو اپنا نام پرچے
پر لکھ کر دیا کہ دیوی جی کو یہ دے آؤ۔ انہوں نے فوراً" مجھے کمرے میں بلا لیا۔ بڑے
تپاک سے ملیں اور بٹھا کر بے تکلف باتیں کرنے لگیں کہ میں یہاں کب سے ہوں اور کیا
کر رہا ہوں؟ جب ان کو بتایا کہ کلکتہ آئے دو ماہ ہوئے ہیں اور صرف کلکتہ کی سیر کر رہا
ہوں اور اپنے کو بنگلہ زبان پڑھاتا رہا۔ اب آپ کے مجموعے پڑھ کر آپ سے ملنے آیا" تو
سخت حیرانی سے میری طرف دیکھا جیسے ان کو یقین نہ آیا ہو۔ "آگے کیا کرنے کا ارادہ
ہے؟" پہلے تو کچھ کام کرنا شروع کروں گا' پھر کالج میں داخلہ لے لوں گا"۔ "کس قسم کا
کام؟" جواب دیا" کسی ہندی کے اخبار میں جو بھی کام مل جائے۔"

اس پر وہ خاصی حیران ہو گئیں کہ میں ہندی جانتا ہوں۔ جب ان کو بتایا کہ سنسکرت میرا
مضمون خصوصی تھا تو وہ بہت دیر خاموش مجھے دیکھتی رہیں۔ میں نے بس اتنا پوچھا۔ ان کی
شخصیت اور صورت شکل کیسی تھی۔ بولے پچاس سال کے اوپر ضرور ہوں گی' مگر اس
وقت بھی ان کو خوب صورت کہا جا سکتا تھا۔ ناک نقش بڑے ستواں اور لمبا قد' دبلی پتلی
اور صاف رنگ' بڑا سا جوڑا' بھی جوانی میں بڑی حسین رہی ہوں گی۔ جس کمرے میں ہم
بیٹھے تھے وہ سادگی اور نفاست کی وجہ سے ان کے مزاج کی سادگی کا پتہ دیتا تھا۔ [illegible]
ادھر ادھر لگی ہوئی تھیں اور چند نازک سی الماریوں میں پڑھنے کی جلد والی بنگلہ اور

انگریزی کی کتابیں نظر آ رہی تھیں۔ دل چاہتا کہ قریب جا کر ان کو دیکھوں، مگر اتنی بے تکلفی برتنے کی میری عادت نہیں۔ بیرا چائے کی ٹرالی ان کے سامنے رکھ کر چلا گیا۔ اپنے اور میرے لیے چائے بنائی۔ چائے پیتے میں میں نے ان کے کلام کے بارے میں باتیں کرنا شروع کیں۔ چند ایک اشعار پر جہاں مجھے لگا تھا کہ یہ دو مختلف کیفیات ایک ہی نظم میں بے جوڑ ہیں۔ بغیر کسی جھجک کے ان سے دریافت کیا "تمہارا دماغ منطقی ہے۔ جو بہت اچھی بات ہے۔ تم نے جن جن اشعار پر اعتراض کیا وہ میں کھلے دل سے اعتراف کرتی ہوں کہ قاعدے کی رو سے ایسا نہیں ہونا چاہیے مگر اشعار کے معاملے میں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی خاص دلی اور دماغی کیفیت میں شروع کیا۔ ایک بیٹھک میں ختم نہ ہو پائی، کئی دن بیت گئے۔ اب پھر جب اس کو مکمل کرنے بیٹھو تو دل و دماغ پر وہ پہلی والی کیفیت رہ نہ گئی۔ اس حال میں جب یہ نظم تکمیل کو پہنچائی جائے گی تو پھر شاعر پہلے والی کیفیت اپنے اوپر طاری کر کے اس کو مکمل کرتا ہے۔ اگر کسی کی نظر بہت گہری ہے تو محسوس کر سکتا ہے کہ جوڑ لگایا گیا ہے۔ مجھے بہت خوشی ہوئی کہ تم نے اس فرق کو صرف محسوس ہی نہ کیا بلکہ بے دھڑک پہلی ملاقات پر اس پر تنقید کرنے سے گریز نہ کیا۔ میری یہ مخلصانہ رائے ہے کہ اپنے دماغ کو اسی طرح کھلا رکھنا۔ تنقید کے وصف سے ہمارے ادیب اور شعرا بہت دور جا چکے ہیں۔ یہ بڑی بدقسمتی ہے۔ جب ان سے جانے کی اجازت لی تو میرے ساتھ باہر آئیں۔ باغ کے ایک طرف کاٹیج تھا، جس کو لائبریری بنا دیا تھا۔ مجھے لے جا کر دکھایا اور بولیں "اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو اس میں آ کر رہیں اور جو بھی کام کرنا چاہیں کرتے رہیں۔ کتابوں سے بھی فیض اٹھائیں۔ میں شکریہ کہہ کر جب واپس ہوٹل گیا اور عظیم صاحب کو بتایا کہ آج میں پریم بداویوی سے مل کر آ رہا ہوں اور انہوں نے یہ بھی کہا کہ جس کاٹیج میں ان کی لائبریری ہے اس میں رہ بھی سکتا ہوں تو خدا جانے عظیم بھائی کو اس قدر ناگوار لگا، مجھے نوٹس دے دیا کہ اگر آئندہ کبھی وہاں گیا تو وہ میری شکل تاحیات نہ دیکھیں گے اور یہ بھی کہا کہ مسز بنگالہ کو ابھی تم کچھ جانتے نہیں اور ہاں ہم کو کل اس ہوٹل کا کمرہ خالی کرنا ہے" کسی اور ہوٹل میں کمرہ لے کر وہاں سے شفٹ ہو گئے۔ اس کے بعد ادھر کا رخ نہ کیا۔

میرے دل میں کس قدر کرید پیدا ہوئی کہ یہ کیسے پوچھوں کہ کیا پریم بداویوی کو اس

بات کا احساس ہو گیا تھا کہ آپ حبیب الدین بیرجی کے بھانجے ہیں۔ یا یہ کہ کیا ان کو معلوم تھا کہ یہ دیوی جی کون ہیں۔ دل نے پیچھے خود ہی جواب دیا کہ معلوم دونوں کو اپنی اپنی جگہ ضرور ہو گیا ہو گا مگر یقیناً ایک دوسرے پر ظاہر نہیں کیا ہو گا۔

دوسرے روز ہم بمبئی پہنچ گئے۔ اختر سعادت حسن منٹو کو تار دے چکے تھے۔ وہ اسٹیشن پر ملے۔ ان کے گھر سامان اور مجھے چھوڑ کر منٹو کے ساتھ ٹکٹ لینے چلے گئے۔ "وکٹوریہ" نامی جہاز سے ہم تیسرے دن فرانس کے لیے روانہ بھی ہو گئے۔

وہ بھی کیا اچھا زمانہ تھا۔ نہ کوئی ویزا نہ ہیلتھ سرٹیفکیٹ اور نہ یہ پوچھا جاتا کہ مسافر کتنی رقم ساتھ لے جا رہا ہے۔ سیکنڈ کلاس کا مع واپسی کل چھ سو روپے کرایہ تھا۔ ٹامس کک نامی بینک میں جس کی شاخیں دنیا بھر میں تھیں۔ حساب کھلوا دیا تھا کہ یورپ پہنچتے ہی ان کا حساب کھلا ملے۔ ہر طالب علم جو بھی باہر پڑھنے جاتا وہ ٹامس کک ہی میں اپنا حساب رکھتا۔ اس بینک کی یہ خوبی کمال کی تھی کہ جو طالب علم کی حیثیت سے ہوتے۔ بینکر صاحب کے سامنے وہ چیک ضرور جاتا، اور خاصی ان کی کڑی نظر رہتی کہ کوئی طالب علم زیادہ رقم اپنے حساب سے نہ نکال سکے۔ ذرا جس نے بھی کچھ زیادہ رقم لینا چاہی تو پوچھ گچھ کی جاتی۔ ایک طرح بینکر صاحب طالب علم کے گارجین کا رول ادا کرتے رہتے۔ میرے اپنے دونوں لفافے جن کو مولوی صاحب نے پونڈ کی شکل میں تبدیل کروا دیا تھا میرے ٹرنک کی زینت بنے رکھے رہے۔

ہمارے بمبئی آنے کے دوسرے دن عظیم بھائی تشریف لے آئے اور پہلی بار میری ملاقات ان سے ہوئی۔ جس کی مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ دونوں بھائیوں میں کس قدر فرق۔ عظیم بھائی بے حد دُبلے پتلے، قد درمیانے سے بھی کم، گہری گندمی رنگت، بڑے بڑے بالوں میں اچھا خاصا تیل کا استعمال، کرتا، پاجامہ اور شیروانی پہنے، جناح ٹوپی، پاؤں میں پشاوری چپل اور چھوٹے بھائی صاحب یعنی اختر حسین رائے پوری کچھ یوں کہ قد میں نہ لمبے نہ ٹھگنے، مگر دکھاوٹ میں لمبے لگتے، صاف رنگ، ناک نقش میں یہ خاص بات کہ ہونٹ خاصے موٹے، مگر آنکھوں کی ذہانت شاید ہونٹوں کی موٹائی کی پردہ داری کر گئی۔ دیکھنے والے کی نظریں ان کی کشادہ پیشانی، آنکھوں کی ذہانت اور گہرائی کی طرف متوجہ رہ جاتیں۔ سر پر گھنے بال، ٹوپی کا استعمال نہیں۔ سوٹ بوٹ یوں ڈاٹ کر چلنے کا انداز کہ

دوسرے کو ان پر صاحبیت کا شبہ سا ہو۔ چہرہ اور انداز میں خاص بات جس سے ہر شخص کو اندازہ ہو جاتا کہ نہ خود بے تکلف ہوں گے اور نہ دوسرے کو اس کی اجازت دیں گے۔

جمیل بھائی! میں نے اختر کی جوانی کا نقشہ آپ کو پورا پورا کھینچ کر بتا دیا۔ اب ذرا منٹ بھر کو آنکھ بند کر کے سوچیں تو وہ راۓ پوری صاحب آپ کی نظروں کے سامنے آکھڑے ہوں گے جن کو آپ نے اس دور میں یوں نہ دیکھا کہ آپ اس وقت چھوٹے تھے اور پھر فاصلہ بھی درمیان میں حائل تھا۔

سرِشام اختر اور منو کے بہت سارے دوست جمع ہو گئے اور رات گئے تک محفل جمی رہی۔ اونچے اونچے قہقہے لگتے رہے۔ میں دل ہی دل میں خوش ہوتی رہی۔ اختر جب ٹکٹ خریدنے گئے تھے تو ایک فرنچ کی پاکٹ ڈکشنری اور دو ایک کتابیں خرید لائے تھے۔ جمیم بھائی نے اپنے پیار میں ایک ایسا کام کیا جو ہم دونوں کے سفر میں بڑا بھاری مسئلہ بن گیا۔ کوئی چار سیر بھنا گوشت اور تین درجن شیرمالیں اور دو عدد لحاف ساتھ کر دیے۔ ہم کو یوں کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ جب قلی کیبن میں سامان لے کر جانے لگے تو ان کو تھما دیا۔ ہم دونوں سب سے بات چیت میں لگے ہوئے تھے' یہ سب جہاز پر چڑھنے سے پہلے خدا حافظ کرنے آئے تھے۔

وکٹوریہ جہاز نے ایک مخصوص قسم کی زوردار گھوں گھوں کی کافی دیر آوازیں نکالیں۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ آنکھوں میں آنسو آ رہے تھے کہ اب ہم ایک اور ہی نئی دنیا کی طرف اپنے ملک اور پیاروں کو چھوڑ کر روانہ ہو رہے ہیں۔ جس بچگانے انداز سے اتنا بڑا قدم اختر کے قلم کے آسرے پر اٹھالیا اور جانے کیسے اختر بھی بے سوچے سمجھے تیار ہو گئے' اس کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب ہم دونوں جہاز کے ڈیک کی ریلنگ تھامے کھڑے تھے۔ کن انکھیوں سے اختر کی طرف دیکھا جو جانے کس کیفیت اور کن خیالات کے زیرِ اثر بالکل ایک پتھر کے مجسمے کا چہرہ اوپر کو اٹھائے دور افق کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ہم دونوں قریب قریب ایک گھنٹہ اپنے اپنے انداز سے خیالات میں گم سم ریلنگ تھامے کھڑے رہے۔ جہاز پہلے آہستہ آہستہ پھر تیزی پکڑتا ہوا ہندوستان کے کنارے سے دور اور دور ہوتا چلا جا رہا تھا اور ہمارا ملک اپنی جگہ کھڑا ہوا تھا۔ یہ میری تسکین کا باعث تھا۔ جانے اختر کیا سوچ رہے تھے اور ان کو فضا میں کیا نظر آ رہا تھا۔ ایک

دم مڑے یہ کہتے ہوئے کہ چلیں ذرا اپنی کیبن کو دیکھ آئیں۔ کافی ادھر اُدھر گھومنے کے بعد نیچے جانے کی سیڑھیاں ملیں اور ہم اپنے ۲۷ نمبر کی کیبن میں آگئے۔ اختر کوٹ کو ٹانگ کر بستر پر لیٹ گئے اور کچھ دیر آنکھیں بند کیے لیٹے رہے اور میں ان کے پاس پاؤں لٹکائے بیٹھی رہی۔ اس وقت میرا بے اختیار دل چاہ رہا تھا کہ کاش قدرت نے انسان کو یہ طاقت ودیعت کی ہوتی کہ دوسرے کے دماغ میں چپ چاپ داخل ہو کر پڑھ سکے کہ یہ کیا سوچ رہا ہے۔ ایک دم بولے۔ آپ اس وقت یہ تو نہیں سوچ رہیں کہ میرے خیالات میں کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ بالکل یہی اس وقت سوچ رہی تھی۔

میں اس وقت کچھ عجیب سی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ ہم دونوں ایک نئی دنیا کے لمبے سفر پر بے سروسامانی کی حالت میں آخر کیوں چل پڑے؟ دیکھیں اب آگے کیا ہوتا ہے۔ اچھا چلیں اُوپر' یہاں تو بڑی گھٹن سی ہو رہی ہے۔ بے پایاں اور کھلے آسمان کو دیکھیں۔ یہ کہہ کر اُٹھ بیٹھے۔ اٹیچی کیس سے فرنچ کتاب اور ڈکشنری نکال کر ہاتھ میں پکڑ دوسرے ہاتھ سے میرا ہاتھ پکڑے ہوئے اوپر ڈیک پر آ گئے۔

اب ہندوستان کا کنارا ہماری نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ چاروں طرف نیلا سمندر اور اوپر نیلا آسمان۔ ڈگ مگ کرتا جہاز' سفید جھاگ دار بڑی بڑی لہریں اپنے گرد بناتا ہوا' آگے اور آگے رَواں دَواں چلا جا رہا تھا۔ اختر پھر ایک ایسی جگہ پر بیٹھ گئے جہاں لوگوں کی آمدورفت کم تھی۔ اختر تو کتاب اور ڈکشنری کی ورق گردانی کرنے میں محو ہو گئے۔ میں کچھ پڑھنے کو لائی نہ تھی۔ اُٹھ کر جہاز پر گھومنے لگی۔ ایک گھنٹہ بعد آ کر پھر کرسی پر بیٹھ گئی اور ان کو نہ میرے جانے کی خبر ہوئی نہ واپس آ کر بیٹھ جانے کا احساس ہوا۔

"یہ خوب رہی کہ اکیلے اکیلے فرنچ سیکھ رہے ہیں' مجھ سے جھوٹوں نہ پوچھا کہ چلو تم بھی بسم اللہ کرو۔ کریں تو ادھر کتاب اور مجھے بھی بتائیں" بالکل چونک پڑے "اچھا آپ اپنی کرسی قریب کھینچ لیجئے۔ یہ جو انگریزی کے ABCD ہیں ان کو فرنچ میں آ با سا دا وغیرہ وغیرہ پڑھا جائے گا۔ اسی طرح Z تک پڑھوا کر کہا۔ اب آپ خود پڑھیں۔" میں کیسے ایک بار کے بتا دینے پر Z تک کے لفظ پڑھ سکوں گی۔ اصل میں مجھے یہ یقین نہیں کہ آپ دل سے بتا کر حرفوں کی آوازیں تو بدل نہیں رہے ہیں۔ جھٹ اپنی کرسی دُور کھسکا کر مصروف ہو گئے۔

شکر کہ کھانے کی گھنٹی بج گئی۔ سب ہی لوگ نیچے کھانے کے ہال کی طرف چل پڑے۔ کوئی پچاس ساٹھ چھوٹی چھوٹی میزیں چار چار لوگوں کے لیے فاصلے پر لگی ہوئی تھیں۔ ہر پلیٹ کے آگے سب کے نام کا کارڈ لگا ہوا تھا۔ سارے لوگ گھوم پھر کر اپنے نام والی جگہ پر بیٹھ رہے تھے۔ جس میز پر ہم دونوں کی جگہ تھی' اسی پر "موسیو اور مادام لکریک" کا نام لکھا تھا۔ وہ دونوں کچھ دیر میں آ کر بیٹھ گئے اور اپنا تعارف کرایا۔ یہ دونوں فرانسیسی تھے۔ ایک سال سے سیاحت پر نکلے ہوئے تھے۔ اب جاپان' چین' ہانگ کانگ اور ہندوستان ہوتے ہوئے واپس اپنے ملک جا رہے تھے۔ بہت اچھی انگریزی بول سکتے تھے۔ اختر کا چہرہ کھل اُٹھا۔ ان کو جب بتایا کہ ہم دونوں پیرس جا رہے ہیں اور وہاں "سوربون یونیورسٹی" سے ڈاکٹریٹ کریں گے۔ ان کا پہلا سوال یہ تھا کہ پھر تو آپ فرنچ ضرور جانتے ہوں گے۔ جب اختر نے بتایا کہ آج ہی سے فرنچ شروع کی ہے۔ کتاب اور ڈکشنری دکھائی تو دونوں مسکرانے لگے۔

کھانے کے بعد ایک روزنامہ انگریزی اور ایک فرنچ کا لے کر ڈیک پر خاموشی سے جگہ تلاش کر کے بیٹھ گئے۔ میں جہاز کے مختلف حصے دیکھنے کے لیے چل پڑی۔ چل پھر کر خوب جہاز کی دنیا کو دیکھا۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد واپس آئی تو دیکھا کہ اختر کے پاس ڈاکٹر لکریک بیٹھے ہوئے ہیں اور فرنچ کی کتاب کھلی ہوئی ہے' دونوں کا سر جھکا ہوا ہے' آہستہ آہستہ اختر پڑھ رہے ہیں اور گاہے گاہے وہ کچھ بتا رہے ہیں۔ ان کی بیوی کچھ فاصلے پر ڈیک کی ریلنگ پکڑے سمندر کا نظارہ کر رہی تھیں۔ میں بھی ان کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ ہم دونوں باتیں کرتے رہے۔ ان کو ہندوستان کے جو جو شہر بہت پسند آئے تھے۔ اس کے متعلق بتاتی رہیں۔

یہ پندرہ روز خوب ہی مزے سے کٹ گئے۔ سچ تو یہ ہے کہ سفر تو پانی کے جہاز سے ہی کر کے آپ کو احساس ہوتا ہے کہ کتنی دور ہم جا رہے ہیں اور کتنے مختلف ملکوں کے ساحلوں پر چند گھنٹے اُترنے کے بعد اندازہ بھی ہوتا جاتا ہے کہ یہ کس کس قسم کے ہیں۔ بہترین کھانا' تفریح کے کیا کیا سامان جہاز میں مہیا ہوتے ہیں اور اب کا سفر کہ یہاں سے اُڑے اور دوسرے ملک پہنچ گئے۔ کھچا کھچ جہاز میں لوگ شانہ بشانہ' گھٹنے دوسرے کی سیٹ سے بھڑے ہوئے' جیسے آپ منزل مقصود پر پہنچ گئے۔

اختر اور ڈاکٹر لکریک گھنٹوں سیاست' ادب اور شاعری کے موضوع پر گفتگو کرتے۔ پڑھائی کا سلسلہ بھی چلتا جاتا۔ میں اور مادام جہاز کی سیر یا تاش کھیل لیا کرتے۔

پورٹ سعید پر جہاز کے بیشتر مسافر اُتر کر موٹروں سے قاہرہ چلے گئے کہ اہرام مصر اور میوزیم وغیرہ کی سیر کر کے رات کو آگے والے پورٹ پر پھر جہاز میں سوار ہو جائیں۔ ڈاکٹر لکریک اور ان کی بیگم صاحبہ سال بھر پہلے جب سفر پر روانہ ہوئے تھے تو دیکھ چکے تھے۔ اختر یوں نہ اُترے کہ ایک سارا دن ضائع ہو جائے گا۔ کہا واپسی کے وقت دیکھ لیں گے! اس طرح میں بھی محروم رہ گئی۔ اختر تو پڑھائی کے چکر میں رہے۔ آگے جا کر نیپلز جب اٹلی کے اس کنارے کے قریب جہاز لنگر انداز ہوا تو پھر بیشتر لوگ "پوپیائی" کے اس شہر کے کھنڈرات کو جو آتش فشاں پہاڑ پھٹنے سے زیر زمین تو ہو گیا تھا پر کھدائی کے بعد اسی طرح برآمد ہوا۔ جو شخص جہاں اور جس انداز میں تھا اسی طرح یوں بھسم ہوا کہ پگھلے ہوئے لاوے نے اس کو پتھر کا بنا کر آنے والی نسلوں کے لیے مقام عبرت بنا کر ہمیشہ کے لیے دائم اور قائم کر دیا۔ اسی طور وہاں کی بیشتر عمارات اپنے کرّوفر کے ساتھ قائم رہ گئیں۔ اس کے متعلق پڑھا بھی تھا اور سنا بھی تھا۔ کیوں کہ اختر نہ اُترنے اور سارا دن ضائع کرنے پر تیار نہ ہوئے تو میں بھی محروم رہ گئی۔

—○—

پیرس اور خالدہ ادیب خانم

فرانس کے "مار سئی" کے پورٹ پر اُترے۔ اس سرزمین پر قدم رکھا تو میرے جسم میں پھریری سی ہوئی۔ دل میں دعا کی کہ "مولا کامیاب اور بامراد واپس لے جانا" تیرا اور اختر کے قلم کا سہارا لے کر ہم آ گئے ہیں۔" ہم دونوں کو ڈاکٹر کلرک اور مادام نے خوب سیر کرائی۔ رات کو ریل پیرس کے لیے روانہ ہوئی۔ ہم چاروں کو ایک ہی ڈبے میں سونے کی سیٹیں مل گئیں۔ اختر نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ وہ مجھے پانچ بجے صبح اُٹھا دیں تاکہ ہم دونوں مل کر فرانس کے طلوعِ آفتاب کا نظارہ کر سکیں۔ کل سے ہماری زندگی کا ایک اور نیا دور شروع ہو گا۔

صبح کھڑکی سے باہر کی طرف ہم ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے خاموش کھڑے اس نئی دنیا اور طلوعِ آفتاب کا نظارہ کرتے رہے۔ میں پھر دل ہی دل میں دعا کرنے لگی کہ "الٰہی ہماری واپسی ساتھ کامیابی کے ہو۔" سورج پہلے دھند کے پردے کو پھر نارنجی اور بھی تیز نارنجی رنگوں کی طناب کو پھاڑتا، چیرتا آہستہ آہستہ نمودار ہوتا جاتا اور دھند کا پیچھے کو لوٹ کر غائب ہوتے ہوئے سرکتا گیا اور سورج نمودار ہو گیا۔ ہلکی ذرا تیز اور پھر خوب چمکیلی دھکتی روشنی ہر طرف پھیلنے لگی۔ آنکھوں کے سامنے کیسا دلکش نظارہ تھا۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ، اونچے اونچے پیڑوں کے جھنڈ، چمک ہرے ہرے، چھوٹے چھوٹے گاؤں اور بستیوں کو جیسے اپنی گود میں لیے ان کی پہرہ داری کر رہے ہوں۔ مکانات دُور سے گڑیا کے گھر معلوم ہو رہے تھے۔ چھتیں بیشتر کی سرخ اور کچھ کی سلیٹی۔ سفید چمک دیواریں، ہر ایک مکان کے آگے ننھا سا باغ جس میں چند پھلوں کے درخت ضرور تھے۔ پتلی پتلی چکنی سڑکیں جن کے دو طرفہ پیڑ جیسے گلے میں ہاتھ ڈالے قطار در قطار کھڑے ہوں۔ ہر طرف پھول ہی پھول، سبزہ زار میں رنگا رنگ کے "اپنا سر نکالے جھانک رہے تھے" جیسے بہار دلہن کھیل گئی ہو۔ میں تو دست ہی خوش ہو کر اس نظارے کو دیکھ رہی تھی مگر دن

موڑ کر جو اختر کی طرف دیکھا تو ان کے چہرے پر اداسی کا احساس ہوا۔

پوچھنے پر بولے "اس وقت میری آنکھوں کے سامنے فرانس کے ان گاؤں اور قصبوں کے ساتھ ساتھ اپنے ملک کے ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے، وہاں انسانوں کے نیم عریاں جسم، مریل جانور، جھلسے ہوئے میدان اور چرمرے بھی نظر کے سامنے ہیں۔ قدرت نے اگر ان ممالک کو فیاضی سے نوازا ہے تو باشندوں نے اس کو سنوارا ہے، مگر غربت اور جہالت زدہ ممالک کو لوٹ کھسوٹ کر اس کو بنانے سنوارنے کے لیے دولت اکٹھی کی گئی ہے۔

گیارہ بجے دن کو ہم پیرس کے اسٹیشن "گار دی ایسٹ" پر اُترے۔ ڈاکٹر کلرک اور ان کی بیوی نے یونیورسٹی ایریا کے ایک درمیانے ہوٹل میں ہم کو پہنچا کر خدا حافظ کہا۔ اپنا پتہ اور فون نمبر تو وہ دے ہی چکے تھے۔ ان سے اکثر ملاقاتیں بعد میں ہوتی رہیں۔

سروجنی نائیڈو اور مولوی صاحب نے ایک ایک خط خالدہ ادیب خانم کے نام دیے تھے اور مولوی صاحب کا ایک خط عبداللہ چغتائی کے نام ان کے پتے اور فون نمبر کے ساتھ پوسٹ کر دیے۔ تیسرے دن عبداللہ چغتائی خود ہم سے ملنے آ گئے۔ اپنے ساتھ لے کر ہم کو فلیٹ پر لائے جو پرانے شہر میں ایک معمولی سے علاقے میں واقع تھا۔ اپنے ہاتھ سے کھانا پکا کر کھلایا۔ کڑھی اور بھنا قیمہ۔ کڑھی کی پھلکیاں ایسی سخت کہ جیسے ثابت چھالیہ منہ میں رکھ لی ہو اور کھڑ کھڑ منہ میں گھوم پھر رہی ہو، پھر بھی اتنے دن بعد اپنا کھانا کھا کر بڑا لطف آیا۔ کیا بات ہے اپنے کھانے اپنے گانے اور اپنی زبان کی۔

چوتھے دن خالدہ ادیب خانم کے شوہر عدنان بے کا فون آیا۔ ہم دونوں کو چائے پر بلایا۔ یہ دونوں یونیورسٹی ایریا میں ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتے تھے۔ عدنان بے یونیورسٹی میں ترکی زبان کے پروفیسر تھے۔ دروازہ انہوں نے کھولا۔ دُبلے پتلے، لمبا قد، ان کا چہرہ کسی یونانی مجسمے کے نقش و نگار لیے ہوئے معلوم دیتا تھا۔ چند ہی منٹ بعد خالدہ خانم کمرے میں داخل ہوئیں۔ درمیانہ قد، چھریرا جسم، سنہرے بال، کشادہ ماتھا، بڑی بڑی آنکھیں جس میں چمک دمک کے ساتھ سمندر جیسی گہرائی کا احساس ہوا۔ عدنان بے نے ہم کو بتلایا کہ یہ ان کی بیگم خالدہ ادیب ہیں۔ دعا سلام کے بعد جب ہم بیٹھ گئے تو انہوں نے مجھے بتایا کہ میرے والد صاحب کا خط بھی ان کو مل گیا ہے۔

جب خالدہ خانم پچھلے ماہ کے لیے ہندوستان آئی تھیں تو ان سے ملاقات کئی بار ہوئی۔

ایک بار ہمارے گھر کھانے پر بھی آئیں' جو ان کو بڑی تفصیل سے یاد تھا کہ کون کون اس رات کھانے پر تھا۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا کہ اتنے دنوں بعد ان کو سب کے نام کیسے یاد رہ گئے؟ بتایا کہ ان کا ہمیشہ یہ دستور رہا کہ جہاں بھی گئی جن سے بھی ملی' رات کو سونے سے پہلے اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیا کرتی کہ جب وہ کبھی کتاب لکھیں اور کسی کا ذکر اگر کرنا ہو تو قلم سے کوئی بھول چوک نہ ہو جائے۔ ان کی کٹورا جیسی آنکھوں سے محبت اور شفقت کا احساس ہو رہا تھا۔

اختر سے مل کر دونوں ہی بہت متاثر ہوئے۔ وہ تو جوہر شناس تھیں۔ زیادہ وقت وہی اختر سے سیاست اور ادب پر باتیں کرتی رہیں۔ ہمارے اُٹھنے سے پہلے انہوں نے کہا کہ ان کی ایک فرانسیسی دوست ہیں' جو طالب علم اپنے گھر میں رکھتی ہیں۔ ان کی رائے میں اگر ہم دونوں کسی ایسے فرانسیسی کے یہاں قیام کریں جو ایک حرف انگریزی نہ جانتا ہو تو زبان جلد آجائے گی۔ ان کے دوست کے ہاں ایک کمرہ اس وقت خالی ہے۔ یہ خود بیوہ ہیں اور ادبی ذوق رکھتی ہیں۔ اگر ہم چاہیں تو ان سے بات کر لیں ہمارے لیے۔ اختر نے خوشی خوشی ان کو اجازت دی کہ وہ ضرور بات کر کے طے کرا دیں اور پھر فون پر بتا دیں۔

ہم دونوں دو گھنٹے وہاں بیٹھ کر جب آنے لگے تو بڑے پیار سے کہا کہ ہم دونوں ان کے گھر کو اپنا ہی گھر سمجھ کر جب بھی دل چاہے شام کو ان کے ہاں آجایا کریں۔ اس وقت مجھے کیا پتہ تھا کہ واقعی ان کی شفقت اور محبت ایک ماں کی طرح ہم کو ملتی رہے گی۔

دوسرے ہی دن ان کا فون آیا کہ مادام مارتاں سے بات کر لی ہے۔ ہم آج ہی ان کے ہاں منتقل ہو جائیں۔ یہ جگہ ان کے اپنے فلیٹ اور یونیورسٹی سے قریب بھی ہے۔ ہم اپنا سامان لے کر ان کے بتائے پتے پر پہنچ گئے۔ اختر کو فرنچ بڑی تیزی سے آرہی تھی۔ میں کبھی حیران ہو کر سوچتی کہ اللہ میاں نے اختر کو کیسا دماغ عطا کیا ہے جو ہر لفظ اور بات کو اس طرح سے محفوظ کر لیتا ہے اور میں جہاں کھڑی ہوں وہیں کھڑی کی کھڑی رہوں گی۔ خدا ہی جانے فرنچ سیکھنے اور بولنے میں کتنے سال درکار ہوں گے۔

ہم دونوں راتوں کو اس دلہن جیسے شہر کی سڑکوں پر اکثر گھوما کرتے۔ رنگا رنگ کی چکا چوند کرنے والی روشنیاں' جگہ جگہ سربلند اُبلتے ہوئے فوارے' چوڑے چوڑے فٹ پاتھوں پر رنگ رنگ کے کیفے' کھچا کھچ بھرے ہوئے' انسانوں کے چمکتے دمکتے چہرے' کبھی

اِدھر کبھی اُدھر کے کیفے میں بیٹھ کر کافی پیتے۔ اختر کے چہرے کی دمک مجھے ان روشنیوں سے زیادہ بھلی لگتی۔ جب میں کہتی کہ کل ہم کسی میوزیم کو دیکھنے چلیں تو کہتے ٹھہر جائیں ہم سب کچھ ہی دیکھیں گے مگر ہفتے دو ہفتے بعد۔ پوری فرنچ تو آجائے تب ہی اصل مزا آئے گا۔ واپسی پر انجمن کا کام گھنٹے دو گھنٹے بیٹھ کر بڑی یکسوئی سے کرتے۔ اختر کا قلم ترجمہ کرتے وقت کس تیزی سے چلتا۔ ایک پیراگراف کو ایک بار پڑھ کر کتاب رکھ کر تیز رفتاری سے قلم کاغذ پر چل پڑتا صرف ایک شہادت کی انگلی اور انگوٹھے کے درمیان دبا ہوا۔ دو ہفتے بعد یونیورسٹی کھل گئی۔ داخلہ لیا اور وہاں کی لائبریری میں اڈا جما کر بیٹھنے لگے۔

چندرہ دن بعد جب اپنے پروفیسر موسیو رینے سے پھر ملے اور اپنے مضمون کے سلسلے کی وہ کتابیں جو پڑھ ڈالی تھیں ان کے نام بتائے تو حیرت زدہ رہ گئے۔ مجھے ہنس کر بتایا کہ جانے ان کو اس قدر حیرت کیوں ہوئی۔ بھئی اس درمیان میں میری فرنچ ہی تو ذرا بہتر ہو گئی' کوئی میرے دو سینگ تو نکل نہیں آئے۔

اختر صبح سے رات تک اپنی پڑھائی اور لکھائی میں مصروف ہو گئے۔ خالدہ ادیب خانم کی طرف جانے کا خیال بھی نہ آیا۔ آخر ان کا خود ہی فون آیا کہ پانچ منٹ بعد میں ان کو نیچے ملوں وہ مجھے لے کر کہیں جائیں گی۔ پہلے دن ایک قریب کے خوبصورت پارک میں لے جا کر ایک بنچ پر بیٹھ گئیں۔ بڑی اپنائیت سے پوچھا کہ میں دن بھر کمرے میں اکیلے کیا کرتی رہتی ہوں؟ آخر کبھی اٹھ کر ان کے پاس کیوں نہ چلی آئی؟ زیادہ وقت ہندوستان کی باتیں کرتی رہیں۔ مجھے یوں لگا کہ ان کے ساتھ میں اپنے ملک کے شہروں میں گھوم پھر رہی ہوں۔ گھر کی یاد ستانے لگی۔ وہ اس قدر ذہین تھیں کہ سمجھ گئیں اور باتوں کا رخ موڑ دیا کہ پیرس میں بڑے بڑے باغات اور حسین پارک ہیں۔ ان سب کو وہ خود ہی مجھے اپنے ساتھ لے جا کر دکھائیں گی کہ اختر ابھی ایک دو ماہ تک ضرور کتابوں کی دنیا میں اس قدر غرق رہیں گے کہ سیر کے لیے ان کے پاس وقت نہ ہو گا۔ میں نے پوچھا آپ کو یہ کیسے خیال آیا "علم کے رسیا لوگ جب کسی زبان کو سیکھنے پر تل جاتے ہیں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ میں خود جب فرنچ سیکھ رہی تھی تو دیوانہ وار سر جھکائے پڑھتی رہتی۔ جب دل کو ذرا اطمینان ہوا تو دائیں بائیں کی خبر ہوئی۔"

کافی پی کر ہم واپس آرہے تھے تو میں نے دیکھا کہ زمین پر جھک کر انہوں نے ایک سگریٹ کا ٹکڑا اٹھالیا۔ اپنے بٹوے میں سے ایک کاغذ نکال کر اس کو لپیٹ لیا اور ہاتھ میں پکڑے رہیں۔ جب ہم سڑک کے کنارے لگے ہوئے کوڑے کے ڈبے کے پاس سے گزرنے کو تھے' تو ہاتھ بڑھا کر وہ کاغذ اس میں ڈال دیا۔ اب میں نے ان سے دریافت کہ کیا آخر انہوں نے زمین پر سے اس سگریٹ کی ٹرّی کو کیوں اٹھالیا تھا؟ مسکرا کر کہا" یہ ٹرکش سگریٹ تھی اس پر ہمارے ملک کے پرچم کا چاند بنا ہوا تھا۔ کسی کا پیر اس پر پڑ جاتا تو بے حرمتی ہوتی" میں نے ان کے ساتھ گھومنے پھرنے میں ہمیشہ یہ عمل دیکھا۔ پھر تو میری بھی یہ عادت سی بن گئی تھی۔ میری ان سے بے تکلفی بڑھتی گئی اور ان کی شفقت کا احساس بھی۔ میرے دل میں اکثر خیال آتا کہ یہ دونوں ترکی سے دور کیوں رہتے ہیں اور ان کے دونوں بیٹے حسن اور حسین جن کا ذکر کسی نہ کسی طور ہر ملاقات میں ضرور کرتیں اور ان کی آنکھیں دھندلا سی جاتیں۔ آخر یہ ان سے یا وہ دونوں ان سے دور کیوں ہیں؟

ایک دن ان سے پوچھ ہی لیا کچھ دیر خاموش رہ کر بولیں۔ یہ لمبی کہانی ہے۔ میں جب ابھی لڑکپن ہی میں تھی۔ تب ہی سے مجھے سیاست اور ادب کا شوق دیوانگی کی حد تک تھا اور کافی کم عمری سے لکھنا بھی شروع کر دیا تھا۔ تعلیم ختم ہوتے ہی والدین نے میری شادی ترکی کے ایک اعلیٰ خاندان کے شخص سے جو وہاں کے بڑے رئیسوں میں شمار کیے جاتے تھے اور عمر میں مجھ سے بہت بڑے تھے' کرادی۔ اس وقت ہمارے ملک میں بھی ہندوستان کی طرح لڑکی کو وہی رشتہ کرنا پڑتا جو والدین پسند کریں اور سچ تو یہ ہے کہ میں نے کچھ بھی تو اس بات کی طرف دھیان نہ دیا کہ عمر کا اتنا بڑا فرق اور رئیسانہ مزاج میں کیوں کر برداشت کر سکوں گی؟ میں تو اپنی علمی' ادبی اور سیاست کی دنیا میں کھوئی رہتی تھی۔ ہم دونوں کے مزاجوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ ان کی دنیا عیش و عشرت کی' میری دنیا قلم اور کتابوں کی۔ ترکی ہر لحاظ سے انحطاط کی طرف تیزی سے جا رہا تھا۔ لوٹ کھسوٹ' عیش و عشرت اور بے حسی کا بازار گرم تھا۔ میرا دل و دماغ اس زبوں حالی کو دیکھ دیکھ کر اپنے متعلق کچھ سوچ ہی نہ سکتا تھا۔ ایک ہی ہتھیار میرے پاس تھا وہ قلم تھا۔ جس قدر لکھ سکتی تھی لکھا کی۔ جہاں بھی موقع ہاتھ لگتا تھا تقریریں کرتی۔ پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء میں شروع ہوئی جس کے اثرات ہمارے ملک پر طرح طرح سے پڑے۔ ۱۹۱۸ء میں کئی ممالک نے مل

کر ترکی پر حملے شروع کر دیے تاکہ اس کے حصے بخرے کر کے آپس میں بانٹ لیں۔ میں اپنے کرب کی کیفیت بیان نہیں کر سکتی۔ دو بیٹوں حسن اور حسین کی ماں بن چکی تھی۔ شوہر کا انتقال ہو چکا تھا۔ ایک ہمارا فوجی افسر مصطفیٰ کمال کس دلیری' عزم اور ہمت کے ساتھ لٹی پٹی فوجوں میں عزم اور جذبۂ جہاد پیدا کرتا ہوا ان کو یک جا کر رہا تھا۔ میں بھی مردانہ وار' زنانہ کپڑے پھینک' فوجی وردی چڑھا کر ہراول دستے میں شامل ہو گئی اور مصطفیٰ کمال کے ساتھ ہر محاذ پر شانہ بشانہ جنگ میں شریک رہنے لگی۔ ۱۹۲۲ء کو جنگ سکاریہ (BATTLE OF SAKARYA) میں یونان کے خلاف ہم اپنی سرزمین سے دشمنوں کو نکالنے میں یوں کامیاب ہوئے کہ اب ترکی کا ہر فرد ملک کی آزادی کے نشے میں سرشار ہو چکا تھا' ہماری پوری قوم بیدار ہو چکی تھی۔ اس کا سہرا صرف مصطفیٰ کمال کے سر نہیں بلکہ پوری ترک قوم کے سر ہے۔ اس طویل عرصے میں مصطفےٰ کمال سے بڑی بے تکلفی اور دوستانہ ہو گیا۔ اتنا کہہ کر مسکرانے لگیں۔ آنکھیں کہیں بہت دور جیسے میدان جنگ میں اپنی فوج کو آگے بڑھتا دیکھ رہی ہوں۔ ان کی اس وقت کی چمک دار کٹورا سی آنکھیں آج اس وقت بھی میری نظروں کے سامنے ہیں۔ میں نے آہستہ سے پوچھا۔ "تو پھر کیا ہوا؟" چونک کر بولیں "ہم آٹھ دس لوگ مصطفےٰ کمال کے بہت ہی معتبر ساتھیوں میں تھے جن سے وہ ہر محاذ پر نکلنے سے پہلے صلاح و مشورہ کرتے اور مجھے تو یقین کامل کے ساتھ ایسا سمجھنے لگے تھے کہ ان کی ہر کامیابی میری موجودگی سے ہوئی ہے۔ دو بار جب میں اپنی بیماری کی وجہ سے محاذ پر نہ جا سکی تو دونوں بار ہماری فوج کو پیچھے ہٹنا پڑا تھا۔ اوروں پر ان کا عجیب رعب تھا' مگر میں ان کے اس جادو کے طلسم سے ہمیشہ باہر رہی۔ ان سے بحث بھی کرتی۔ غلط اور صحیح کی تمیز بتاتے وقت مجھے کبھی جھجک نہ ہوئی۔ کبھی کبھی تو وہ اس پر تلملا اٹھتے۔

فرسودہ رسم و رواج کے لبادے کو قوم کے جسم پر سے کھینچ کر اتار پھینکنا ہے۔ فوج کو نئے سرے سے منظم کرنا ہے اور حکومت کو نئے انداز سے گامزن کرنا ہے۔ ہم سب ہی کی رائے ان سب باتوں کی موافقت میں تھی۔ اسی پر وہ قدم بہ قدم عمل پیرا تھے' مگر میں یہ محسوس کر رہی تھی کہ ہلکے ہلکے وہ پوری حکومت پر اپنا اثر و رسوخ زیادہ سے زیادہ کرکے آگے چل کر شاید ایک ڈکٹیٹر کی طرح مسلط نہ ہو جائیں۔

ایک بار جب مصطفیٰ کمال نے مشاورت کمیٹی کی میٹنگ میں اس خیال کا اظہار کیا کہ ہم کو جلد سے جلد اپنا رسم الخط بدل کر ترکی زبان سے سارے عربی فارسی کے الفاظ نکال پھینکنا چاہئیں تو میرا خون کھولنے لگا اور بڑی سخت اس کی مخالفت کی کہ زبان اور رسم الخط کو بدلنا ہماری سب سے بڑی شکست ہوگی۔ مُسلم دنیا سے دُوری اختیار کرکے اپنا بیش بہا ادب اور کلچر اپنے ہاتھوں دفن کرکے کیا یورپ والے ہم کو یورپ میں شمار تو نہ کرلیں گے؟ یوں ہم اپنا ادب' اپنا مذہب' اپنا کلچر سب ہی تو کھو بیٹھیں گے۔ کیا آزادی لاکھوں جانیں قربان کرکے اس لیے حاصل کی ہے۔ میں جس قدر بحث کرتی مصطفیٰ کا پارہ چڑھتا جاتا۔ آخر میں انتہائی غصّے میں وہاں سے اُٹھ کر گھر آگئی۔ کئی دن کمرہ بند کرکے اپنی سوچوں میں کھوئی رہی۔ جب باہر نکلی تو سنا کہ مصطفےٰ کے اس اعلان پر کہ جو بھی مُلا اور مفتی حج کرنا چاہے وہ حکومت کی طرف سے فلاں جہاز سے بے ٹکٹ جاسکتا ہے اور حکومت دس روز کے سارے اخراجات کی ذمّے دار ہوگی۔ وہ جہاز جس میں دو ہزار مولوی حج کے لیے روانہ ہوئے وہ بیچ سمندر میں ڈوب گیا۔ مجھے جانے کیوں ایک دم یہ خیال آیا کہ یہ کسی حادثے میں نہیں غرق ہوا بلکہ ڈبویا گیا۔ کس نے؟ مصطفیٰ کمال کے حکم پر؟ جلدی جلدی لباس تبدیل کرکے میں دندناتی ہوئی ان کی قیام گاہ پر پہنچی۔ اپنے دفتر میں بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ میں نے سلام دعا کچھ بھی نہ کیا' ایک دم بڑے غصّے میں پوچھا کہ "مصطفےٰ مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے مولویوں کے جہاز کو ڈبوایا ہے؟ اُٹھ کر ایک دم کھڑے ہوگئے اور کہا "تم پاگل تو نہیں ہوگئی ہو؟ پیٹھ موڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگے۔ میں نے کئی بار کہا۔ میری طرف دیکھو اور جواب دو۔ مگر انہوں نے اپنی جگہ سے جُنبش نہ کی۔ مجھے جیسے یقین کامل ہوگیا۔ تیزی سے کمرے کا دروازہ زور سے بند کرتی ہوئی نکل آئی۔ عدنان بے سے چند سال قبل میں نے نکاح کرلیا تھا۔ انہوں نے میڈیسن میں ڈاکٹری کی ڈگری لینے کے بعد میری خاطر لٹریچر میں ڈاکٹریٹ کی تھی۔ وہ بار بار دریافت کرتے کہ تم کو آخر اس قدر پریشانی کیا ہے' آخر ہوا کیا ہے مگر میں نے اپنے منہ سے ایک لفظ بھی مصطفیٰ کے بدلتے ہوئے رویے اور اپنے اس شک کا کہ شاید جہاز مصطفےٰ کی سازش سے ڈبویا گیا ہے' کچھ بھی نہ کہا۔

چند دن بعد ہم دونوں کو کھانے پر مدعو کیا اور بھی چند سو لوگ قصرِ شاہی میں بُلائے گئے

تھے۔ گو میرا دل نہ چاہتا تھا کہ وہاں جاؤں' مگر صرف یہ سوچ کر چلی گئی کہ مصطفےٰ کمال نے اگر آج رات مجھ سے آنکھیں چار کرکے بات نہ کی تو میرا شک حقیقت کے روپ میں تبدیل ہوجائے گا یا دل سے یہ شک نکل جائے گا۔ ہم دونوں وہاں گئے' پورا محل جگمگ کررہا تھا مگر باغات کی روشنیاں آج وہاں جل نہ رہی تھیں بس ملگجی سی چاندنی تھی۔ خاصی دیر لوگ ایک دوسرے سے باتوں میں مصروف رہے۔ میں ہال کے اس دروازے کے قریب کھڑی تھی جو باغ کی طرف تھا اور ہال میں داخل ہونے کے دروازے سے اس طرح بہت دُور تھی۔ بیرے نے میرے قریب آکر شربت کا گلاس دیتے وقت مجھ پر گرا دیا۔ معافی مانگتے ہوئے گلاس کے ٹوٹے ٹکڑے اُٹھانے لگا اور میں نیچے جھک کر اپنے لباس اور جوتے پر سے شربت کو رومال سے پونچھنے لگی تو بیرے نے آہستہ سے کہا۔ خانم آپ فوراً" باغ میں جاکر مشرقی دروازے سے باہر جائیں عدنان آفندی بھی آپ کو وہاں مل جائیں گے۔ جو خاتون باہر آپ کو ملیں وہ جیسا کہیں فوراً" کرلیں ورنہ آج رات آپ کو گولی سے اڑا دیا جائے گا۔

میں نکل کر باغ کے اس دروازے پر آئی جو بہت چھوٹا سا تھا۔ یہ مالیوں وغیرہ کی آمدورفت کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ وہاں ایک خاتون باہر دبکی ہوئی کھڑی ملیں۔ ایک ویٹرس کا سفید لباس دیا جو میں نے اپنی فراک پر پہن لیا۔ سفید ٹوپی سر پر رکھ لی۔ عدنان بے آگئے تو ان کو بیرے کا کوٹ پہنا دیا۔ پتلون بیروں کی بھی کالی تھی اور ان کی پتلون بھی کالی تھی۔ ہم کو لے کر تیزی سے ایک پاس کی اندھیری سی پتلی سڑک پر لے کر کچھ دور گئیں تو ایک گاڑی تیار تھی۔ ہم اس میں بیٹھ گئے اور گاڑی ہم کو سمندر کے کنارے لے گئی۔ وہاں پر ایک چھوٹی سی کشتی کے ذریعے ان خاتون نے ہم کو آگے سمندر میں جو جہاز کھڑا تھا سوار ہونے کو کہا تو اب بات پوری طرح سمجھ میں آگئی۔ میں اپنے دونوں لڑکوں کو ساتھ لے جانے کے لیے تڑپ اٹھی تو ان خاتون نے کہا کہ لڑکوں کو کوئی کچھ ضرر نہ پہنچائے گا۔ جلد ہی دونوں کو ہمارے پاس کسی نہ کسی طرح فرانس بھیج دیا جائے گا۔ اسی رات چار اور مصطفےٰ کے ساتھی لاپتہ ہوگئے۔ خدا بہتر جانے کہ ان کا کیا حشر ہوا؟ ان کی گمشدگی کا سُراغ پھر نہ ملا۔ اس طرح ہم دونوں پیرس پہنچ گئے۔ حکومت ترکی نے حسن اور حسین کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ ہمارے گھر پر قفل لگا دیا گیا۔ میرے بیٹے اور میں

آج تک ایک دوسرے کی راہ تک رہے ہیں۔

ان کے چند آنسو گال پر بہنے لگے اور میں بھی رو پڑی۔ وہ فوراً ہی تو واپس اپنی اصل شخصیت کے روپ میں آگئیں۔ "مجھے گلے سے لگا کر پیار کرکے کہا۔ "شکرپارے" (ترکی زبان میں لاڈ سے بیٹی کو کہا جاتا ہے) اب تو تم میرے پاس ہو' اختر کو جب دیکھتی ہوں تو بس یہ لگتا ہے حسین میرے پاس ہے۔" ان کی باحوصلہ شخصیت اور آواز کی کپکپاہٹ یکسر غائب' ہنس کر کہا "حمیدہ اس تمام طویل عرصے میں یہ حالات مجھ سے کسی نے نہیں سنے اور نہ ہی میرے قلم نے اس واقعے کے متعلق ایک حرف لکھا' نہ ہی کبھی کوئی تقریر کی' نہ ہی کوئی انٹرویو دیا۔ ایک فرد کی حقیقت اپنے ملک کے آگے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ حمیدہ مجھے پورا یقین ہے کہ تم کبھی کسی سے میری آج کی بتائی باتوں کا ذکر نہیں کرو گی۔ یہ راز سب میرے ساتھ دفن ہو جائیں گے۔

جمیل بھائی! یہ لکھتے وقت مجھے بار بار خیال آ رہا ہے کہ جانے کس طور آپ نے کہا اور کیوں میں نے وعدہ آپ سے کرلیا۔ آپ نے میرے ہاتھ میں قلم پکڑا کر کیسی کیسی باتیں مجھ سے اگلوالیں! دماغ کہتا ہے ایسا نہ کرنا چاہیے تھا' پر جب دل یہ کہہ کر دلاسا دیتا ہے کہ کہا تو صرف یہ گیا تھا کہ کسی سے بھی کہنا نہیں تو میں نے اختر تک سے نہ کہا۔ یہ تو خالدہ خانم نے نہ کہا تھا کہ کبھی لکھنا نہیں۔ بلکہ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ میں نے لکھ کر ان کی محبت اور شفقت کا کچھ اس طور قرض اتارا ہے۔ بھلی یہ کیا بات ہوئی کہ آپ کچھ بھی تو میری تسکین کے لیے کہتے نہیں؟ اس وقت مجھے اختر کا وہ جملہ یاد آ رہا ہے "میں دنیا کو رازداں بنانا پسند نہیں کرتا۔" آپ مجھے ہلکا سا مسکراتے اور آنکھیں چمکا کر یہ سوچتے دکھائی دے رہے ہیں کہ "کس مزے سے میں نے ہر راز کو عیاں کروا کر مشتہر کرا دیا۔" پھر وہ بھی ہو میرا ضمیر مجھے ملامت نہیں کر رہا۔

مصطفےٰ کمال کے لیے میری زبان سے جب بھی کوئی ایسا ویسا لفظ نکل جاتا تو خالدہ خانم میری اس جسارت پر اپنی بڑی ہی ناگواری کا اظہار کرتیں۔ میرے ذہن نشین کراتیں کہ کسی فرد کی ملک کے آگے کوئی حقیقت نہیں۔ اپنے ملک کا محسن کوئی کمزوری دکھا بیٹھے تو آخر وہ بھی تو ایک انسان ہی ہے۔ دیکھنا تو یہ چاہیے کہ اس نے ملک کے لیے کیا کیا عظیم کارنامے انجام دیے۔ میری زبان اور میرا قلم وہاں بیٹھ کر خاموش ہرگز نہ رہتے۔ شاید

میری ذات ملک کی ترقی اور امن کی راہ میں ایک رکاوٹ مصطفےٰ کو نظر آئی ہو۔ وقتی طور پر اشتعال آجانا حیرت کی کوئی بات نہیں۔ پھر پاور کا ایک نشہ بھی تو ہوتا ہے۔ مجھ سے اس قدر عداوت پیدا ہو جانے کے باوجود انہوں نے میرے دونوں لڑکوں کی بہترین تربیت اور تعلیم کا انتظام بھی کیا۔ ہر ماہ ہم کو خاصی اچھی پنشن حکومت کی طرف سے بھیجی جاتی اور ہم اس کو ہر ماہ واپس کر دیتے۔ ملک کی آزادی کی قیمت ہماری جلاوطنی اور اولاد سے دوری میری نگاہ میں کوئی معنی نہیں رکھتی۔ ہاں جب میری دوست جلیے خانم نے اپنے کو گولی مار کر خودکشی کرلی تو مجھے بڑا غم ہوا۔ عجیب بات ہے کہ عظیم لوگ شاذ و نادر ہی اپنی بیویوں کی دلداری اور قدردانی کر سکے ہوں گے۔

اس طرح تین ماہ گزر گئے تو باغات کی سیر کے بعد مجھے اپنے فلیٹ پر لے آتیں۔ چائے پی کر میں ان کے مضامین ٹائپ کرتی۔ شروع میں میری رفتار بہت سست تھی' مگر وقت کے ساتھ بہتر ہوتی گئی۔ اختر لائبریری سے سیدھے ان کے فلیٹ پر آتے۔ کچھ دیر ان دونوں کے ساتھ وقت گزار کر ہم دونوں اپنے فلیٹ پر آجاتے۔ اخبار کے لیے کالم لکھ کر انجمن کا کام کرکے کھانے کے بعد ہم دونوں سیر کو نکل جاتے۔ واپسی کے بعد کوئی فرنچ کا ناول یا فرنچ میں ہسٹری کی کتاب یا تنقید کی کوئی کتاب کبھی فرانسیسی شاعر کے کلام کی کتابیں ان کے زیر مطالعہ رہتیں۔ گاہے گاہے کسی نہ کسی فرانسیسی دوست کے ساتھ شام گزار کے آتے۔ ہفتہ' اتوار کو چھٹی کے دن کوئی میوزیم دیکھنے نکل جاتے۔ وہاں بڑے بڑے باغات میں ادھر ادھر تیز تیز رنگوں کی کینوس کی چھتریوں کے نیچے چھوٹے چھوٹے کینفے ہوتے' جگہ جگہ رنگین کرسیاں' ان کو ٹکٹ لے کر استعمال کر سکتے تھے۔ لکڑی کی بنچوں پر وہاں مفت بیٹھا جا سکتا تھا تو ہم ان پر بیٹھ جاتے۔ سامنے نگاہ کے وہاں کے تندرست گول مٹول بچے رنگا رنگ کپڑوں میں ملبوس کھیلتے کودتے' یوں لگتا جیسے تتلیاں بڑی ہو کر بجائے اڑنے کے گھاس پر بھاگ دوڑ رہی ہیں اس میں بڑے بڑے لوگوں کے' درمیانہ طبقے سے تعلق رکھنے والے اور نچلے درجے کے لوگوں کے بچے بڑے اور بوڑھے ہوتے مگر مجال ہے جو آپ کسی طرح بھی تمیز کر سکیں۔ ایسے موقعوں پر اختر ایک لمبی سانس بھر کر کہہ اٹھتے کہ "ہائے افسوس ہمارے ہاں بیشتر بچے' جوان اور بوڑھے کس حال میں ہیں۔ میں ایسے موقعوں پر ان کے چہرے کی طرف یوں نہ دیکھتی کہ مجھے کرب کا احساس لیے چہرہ دیکھنا

برداشت نہ ہوتا۔ ایک دن ڈاک کے خطوں کے ساتھ ایک موٹی سی پارسل بھی تھی۔ سمجھ گئی ضرور یہ اردو انگریزی ڈکشنری' جو انجمن ترقی اردو نے تیار کی' وہ ہے۔ اختر نے بڑی خوشی خوشی شوق کے ساتھ کھولی اور پیش لفظ پڑھنے لگے۔ میں بھی کرسی سے اُٹھ کر ان کی پشت پر کھڑی ہو گئی اور پیش لفظ خود بھی جھک کر پڑھنے لگی۔ مولوی صاحب نے ہر اس شخص کا جس نے کسی بھی حیثیت سے کام کیا تھا بڑی فراخ دلی سے ذکر فرمایا تھا۔ سوائے ایک اختر کے' جس نے تن من لگا کر رات دن ایک کر کے ہر ہر لفظ کی چھان پھٹک کی تھی۔ میں نے دیکھا' پہلے اختر نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بڑی مضبوطی سے ڈکشنری کو دونوں طرف سے دبا کر پکڑے رکھا۔ پھر جیسے ان کے ہاتھ کانپ سے گئے۔ گرفت ڈھیلی پڑی اور ڈکشنری ان کے قدموں کے قریب جا گری۔ میں گھبرا کر سامنے کے رُخ آ کھڑی ہوئی۔ چہرہ زرد' ہونٹ بھینچے ہوئے' منہ سے ایک لفظ نہ بولے' مگر ان کے صدمے کی پوری کیفیت مجھ پر عیاں ہو رہی تھی۔ میری اپنی خود عجیب سی حالت تھی۔ یقین نہیں آتا تھا کہ ہمارے اپنے مولوی صاحب جیسے عظیم اور شفیق انسان کے قلم نے یہ ظلم کیسے کیا اور کیوں کیا؟ ایک ایرمیل کا لفافہ اور قلم ایک کتاب پر رکھ کر اختر کے سامنے کر دیا کہ بس ابھی آپ مولوی صاحب کے نام خط لکھیں کہ آج سے آپ انجمن کا کام نہیں کریں گے۔ اختر پر تو اس وقت کچھ ایسی کیفیت طاری تھی جیسے وہ سوچنے سے قاصر ہوں۔ قلم ہاتھ میں پکڑ کر بس یہ چند سطریں اس پر لکھ دیں۔

مکرمی تسلیم

امید ہے مزاج عالی بخیر ہوں گے۔ آپ کو مطلع کرنا چاہتا ہوں کہ اپنی تعلیمی مصروفیات کی بنا پر اب میں انجمن کا کام نہ کر سکوں گا۔ حمیدہ آداب گزار ہیں۔

راقم

اختر حسین

لفافہ ان سے لے کر میں نے بند کیا۔ ایک گلاس پانی ان کو دے کر کھونٹی سے کوٹ اُتار کر پہنا اور دروازہ کھول باہر آئی پھر لفٹ سے نیچے اُتر آئی۔ قریب ہی منٹ پر جو لیٹر بکس تھا اس کی طرف بڑھ گئی۔ دور سے مجھے ایسا لگا کہ اختر نے پکار کر کہا۔ "حمیدہ بیگم" میں نے اپنے قدم بہت تیز کر دیے۔ لپک کر خط ڈبے میں ڈال کر مڑی تو عین سامنے اختر

نظر آئے۔ کچھ وقفے کے بعد بولے "حمیدہ بیگم! آپ نے بُرا کیا جو خط پوسٹ کر دیا۔ آپ کو کچھ تو سوچنا تھا کہ جلد ہی ہم پر ایک بچے کی ذمے داری اور خرچ آنے والا ہے اور ہم پردیس میں بیٹھے ہیں۔ صرف وشواختر اخبار کے کالم کی آمدنی تمہیں کے لیے کافی نہیں ہو سکتی۔" میرا جواب یہ تھا "خدا رزاق ہے" انجمن نہیں۔ وہ ایک در بند کرتا ہے تو دوسرا در کھول دیتا ہے۔ بس خدا آپ کو' آپ کے قلم کو سلامت رکھے۔ مجھے تو ایک منٹ کو بھی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔" میری طرف دیکھ کر کڑوی سی مسکراہٹ آئی اور چند منٹ دیکھتے رہے۔ بس یہ کہا۔ "آپ بھی عجب شے ہیں۔"

کھانے کے بعد ڈکشنری لے کر بیٹھ گئے اور اُلٹ پلٹ کر دیکھا کیے۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اس کے ورق ورق پھاڑ کر پھینک دوں۔ ان کی نظر جب پرنٹنگ کی کوئی غلطی پکڑ لیتی تو کہہ اٹھتے "ایسا نہ ہونا چاہیے تھا۔" پھر بہت احتیاط سے کتابوں کی الماری میں کھڑی کر کے بڑے اطمینان کے ساتھ لیٹ کر "عمر خیام" (فرنچ ترجمہ تھا) پڑھتے ہوئے سو گئے' میں جاگتی رہی۔ اختر کے چہرے کے سکون کو دیکھ کر سوچنے لگی میرا شوہر' میرا ساتھی ایک عظیم انسان ہے اور میں بڑی خوش بخت ہوں۔

"جمیل بھیا! ذرا دیکھیے کہ دوسرا در کیسے کھل رہا ہے۔ اختر کے قلم کی شہرت ادھر اُدھر پیرس میں ہو ہی گئی۔ صبح جب اختر یونیورسٹی چلے گئے اور ہماری صاحب خانہ سودا سلف لینے جا چکیں تو دروازے کی گھنٹی بجی۔ اکیلی میں ہی گھر پر تھی۔ جا کر دروازہ کھولا تو ایک لمبا تڑنگا شخص سامنے کھڑا دیکھا۔ جس نے سلام کر کے انگریزی میں پوچھا کیا آپ بتائیں گی کہ موسیو اختر حسین یہاں رہتے ہیں؟" سوچا یہ کوئی امریکن ہے۔ کہا "جی" دریافت کیا وہ ان سے مل سکتے ہیں؟ میں نے بتایا کہ صرف شام کو ان سے ملاقات کر سکتے ہیں۔ میں ان کی بیوی ہوں۔ ان سے آپ کو کام کیا ہے؟ بتایا کہ وہ ایک امریکن ہفتہ وار اخبار کے نمائندے ہیں۔ اِدھر اُدھر پوچھنے پر لوگوں سے معلوم ہوا کہ مسٹر حسین ایک بہت اچھے ادیب اور صحافی ہیں۔ میں اخبار کے لیے ان سے ایک مضمون لکھوانا چاہتا ہوں۔" میں نے ان سے شام چھ بجے آنے کو کہہ دیا۔ شام کو وہ صاحب آئے تو اختر گھر پر تھے۔ میں اختر سے کہہ ہی چکی تھی کہ یہ آپ کے قلم کا طفیل اور رزق کے دوسرے در کا کھلنا ہے۔ آپ انکار نہ کر دیجیے گا۔ جب اختر کو امریکن صاحب نے بتایا وہ پوڈے

مہاراجہ پٹیالہ جو اس وقت سخت علیل تھے، اپنی اوباشی اور مظالم کے لیے اس قدر مشہور ہوئے کہ وائسرائے ہند نے ایک کمیٹی قائم کر کے ان کے کارناموں کی ایک خصوصی رپورٹ تیار کرائی۔ گو وہ رپورٹ اخباروں میں چھپی تو نہیں مگر جو بھی حالات اکثر اخباروں میں چھپا کرتے تھے وہ حیرت انگیز تھے تو رپورٹ میں اور جانے کیا کچھ نہ ہوگا۔ مہاراجہ پٹیالہ پر اس رپورٹ کی روشنی میں ایک تیس صفحوں کا مضمون لکھ دیں۔ اس کا جو بھی معاوضہ آپ طلب کریں گے دیا جائے گا۔ اختر نے صاف اِنکار کر دیا کہ اوّل وہ اس قسم کے مضمون لکھتے نہیں۔ دوسرے ان کو یہاں بیٹھ کر ایسا کوئی مواد دستیاب ہو نہیں سکتا۔ وہ اِصرار کرتے رہے اور یہ انکار آخر میں بیچ میں آ گئی اور کہا کچھ وقت سوچنے کا کیوں نہ دے دیں۔

اختر نے بڑی قہر آلودہ نظروں سے مجھے دیکھا اور مسٹر روبرٹ نے جیب سے نکال کر پچیس پونڈ بطور ایڈوانس میز پر رکھ دیے اور یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ اب تین ہفتے بعد وہ پھر آئیں گے۔ اختر باہر تک پونڈ پکڑے ہوئے ان کے پیچھے اِصرار کرتے ہوئے گئے کہ یہ واپس لے لیں، مگر وہ بڑی تیزی سے لفٹ بند کر کے نیچے اُتر گئے۔

واپس آ کر بگڑ کر کہا۔ "بعض وقت آپ عقل اور سمجھ کا دامن چھوڑ کر جو سمجھ میں آتا ہے کہہ بیٹھتی ہیں۔ میں ایسا مضمون بغیر اس رپورٹ کی موجودگی کے لکھ نہیں سکتا۔" "پھر آپ نہ لکھیے گا، کوئی آپ نے ان سے ہامی تو بھری نہیں۔"

رات گئے میں دل میں سوچا کی مجھے کرنا کیا چاہیے؟ کیسے یہ رپورٹ یا کوئی مواد اس سلسلے کا حاصل کیا جا سکتا ہے؟ ایک دم مجھے یاد آیا کہ اختر کے وہ دوست حبیب اللہ، وائسرائے کی سکریٹریٹ میں ہیڈ کلرک ہیں جن کے ہاں ہم دونوں کوٹ گڑھ جا کر رہے تھے، شاید وہ اس سلسلے میں کچھ کر سکیں اور سعادت حسن منٹو تو اخبار میں کام کرتے ہی ہیں۔ ان سے بھی تو کہا جا سکتا ہے مگر کہے تو کون کہے؟ بھلا اختر کبھی اپنے منہ سے کہیں گے۔ پھر کرنا مجھی کو ہے۔ صبح ہو لے تو ان دونوں کو تار دوں۔

دوسرے دن جیسے ہی اختر یونیورسٹی گئے۔ میں اپنا "اشد ضروری" والا لفافہ بٹوہ میں ڈال پوسٹ آفس گئی۔ ایک تار تفصیلی حبیب اللہ کو، ایک منٹو کو بمبئی ارجنٹ دیا۔ اختر تو وہ پونڈ ایک لفافے میں "مسٹر رابرٹ" لکھ کر کل ہی بند کر چکے تھے پھر انہوں نے اس کے

بارے میں کوئی بات نہ کی۔ نہ میں نے ہی اس کا کوئی ذکر کیا۔ نہ تاروں کے بارے میں ان کو کچھ بتایا۔

دس دن بعد دہلی سے حبیب اللہ کے خط کے ساتھ اس رپورٹ کی کاپی کا پیکٹ میرے ہاتھ میں تھا۔ خوش بھی بہت ہوئی۔ پر اختر کے بگڑ اُٹھنے کے خیال سے گھبرا بھی رہی تھی۔

اختر جب شام کو آئے تو میں نے وہ پیکٹ ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ "یہ ہے کیا؟" "آپ خود دیکھ لیں۔" کاغذ نکال کر پڑھنے لگے بار بار مسکرا بھی رہے تھے۔ پڑھ کر لفافے میں کاغذ رکھ کر پھر میرے ہاتھ میں تھما کر بولے "یہ آپ کو کیا سوجھی، آخر حبیب اللہ کو تار کیوں دیا؟ آپ سمجھی ہوں گی کہ یہ رپورٹ مل گئی تو میں وہ مضمون لکھ دوں گا۔ بس مجھے یہ لکھنا ہی نہیں حبیب کو ایک خط شکریے کا کل ہی لکھ دیں۔" "بہت اچھا۔"

پھر ہم دونوں خالدہ خانم کے ہاں چلے گئے۔ مجھے دیکھتے ہی گھبرا کر پوچھا "شگر پارے تم ٹھیک ہو۔ آج سیر کو چلنے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ "یہ مفکر لوگ جانے کس طور انسان کے دل و دماغ میں جھانک لیتے ہیں۔

دوسرے یا تیسرے دن منٹو نے مختلف اخباروں سے خبریں جو مہاراجہ پٹیالہ کے متعلق چھپتی رہی تھیں۔ اس نوٹ کے ساتھ۔

"مہاراجہ پٹیالہ کو کان پکڑ کر، حسب فرمائش، حاضر خدمت کر رہا ہوں۔

منٹو

شام کو یہ پیکٹ بھی اختر کے سامنے رکھ دیا۔ کٹنگ پڑھنے میں محظوظ ہوتے رہے۔ سب کو قاعدے سے تہ کر کے پیکٹ میں ڈال، تیوری پر بل ڈال، ناگواری کی مسکراہٹ کے ساتھ بولے "میرا پالا جانے کیسی لڑکی سے پڑ گیا ہے، میری عادت نہیں کہ کچھ کسی سے کہوں۔ دوسرا کوئی ہوتا تو کہتا سر پھری ہے۔" میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تو گھبرا کر بولے "غریب منٹو نے آپ کا کیا بگاڑا تھا کہ اس کو اتنی زحمت دی۔ اب کل آپ شکریے کا خط تو ڈال دیجیے گا۔"

دوسرے دن جب خالدہ خانم کے ساتھ ایک پارک میں جا کر بیٹھ گئی تو ان کو ڈکشنری کا قصہ سنایا اور اختر سے مولوی صاحب کے نام خط لکھوا کر پوسٹ کرنے کا۔ پھر اختر کے یہ کہنے کا کہ ایسے وقت پر میں نے حد درجہ بلاوائی سے کام لیا اور اپنا جواب بھی بتایا "راز ق

اس میں کچھ وقت تو لگے گا۔

اس دوران میں ہم ایک بیٹے کے والدین بن گئے تھے۔ اختر کو اپنی تھیسس کے سلسلے میں مزید مواد درکار تھا' اس کے لیے لندن میں کچھ عرصے رہ کر وہاں کی لائبریری سے لینا تھا۔ خالدہ خانم کے سامنے والے فلیٹ میں ان کی ایک فرانسیسی دوست جو بیوہ تھیں عرصہ دراز سے رہا کرتی تھیں۔ ان کے دو بیٹے تھے جو موٹر کے حادثے میں فوت ہو گئے تھے۔ وہ ایک بچہ کسی نہ کسی طالب علم لڑکی کا نگہداشت کے لیے اپنے پاس رکھ لیا کرتیں۔ اس طرح ان کی آمدنی کا ذریعہ اور دلچسپی کا سامان بھی ہو جاتا۔ اس بچے سے دونوں ہی دوست اپنا دل بہلایا کرتیں۔ خالدہ خانم نے ان سے بات کر رکھی تھی۔ ہمارے بیٹے کا نام کامران' خالدہ خانم نے رکھا اور اس کے کان میں اذان بھی خود دی تھی۔ اسپتال سے سیدھا اس کو وہاں لے گئیں۔ میں بھی پندرہ دن ان کے پاس رہی۔ میرے لیے ان کا فیصلہ یہ تھا کہ اختر کے ساتھ لندن جاکر مونٹیسوری کا چھے ماہ والا کورس کرلوں۔ عدنان بے نے بچوں کے امراض میں اسپیشلائز کرکے ڈگری لی تھی۔ یوں کامران ہروقت ایک ڈاکٹر کی زیر نگرانی رہے گا۔ گو مجھے معلوم تھا کہ خالدہ خانم جس شفقت سے اس کو رکھیں گی جو میں اپنی ناتجربے کاری کی وجہ سے کہاں کر سکوں گی' مگر پھر بھی بو جھل دل سے ان کے فیصلے کو قبول کرلیا۔ ایک دن باتوں میں مجھ سے کہا "میں نے اکثر سوچا کہ مولانا نے اختر کے ساتھ اتنی بڑی اخلاقی زیادتی کیسے کی اور کیوں کی؟ میری سمجھ میں ایک بات آئی ہے کہ انھوں نے اپنے ذہن میں ایک بات بٹھالی کہ ان کو انجمن کے لیے حسب منشا جانشین مل گیا' پھر ساتھ ہی ان کو اختر سے بیٹوں والی محبت بھی ہو گئی۔ پھر تم ان کے پاس آگئیں اور تم سے بیٹی جیسا پیار بھی ہو گیا۔ اختر نے جب دہلی جانے کی ضد کی انھوں نے منع کیا' مگر تم دونوں چل پڑے۔ ان کا دل ٹوٹ گیا ہوگا۔ وہ اختر کو کوئی ایسی ہی سزا دینے کی سوچ بیٹھے جس سے اختر کے دل پر کاری ضرب لگے اور وہ ایسی بات کر گئے۔ اختر کبھی ان سے اس کے متعلق کچھ بھی نہ پوچھیں گے اور نہ شکوہ کریں گے مگر تم جب ان سے ملو تو ضرور پوچھنا اور جو بھی وہ اس بات کا جواب دیں مجھے ضرور لکھنا۔"

اتنی عظیم خاتون ہماری محبت میں اگر ایک بچے کی نگرانی کرنے کی ذمّے داری قبول کر رہی ہیں تو مجھے فکر کی ضرورت نہیں۔ ہم دونوں لندن آگئے۔ میں نے داخلہ لے لیا۔

ان کا برابر پیرس سے فون آتا۔ کبھی خط کہ کامران بخیر ہے۔ ہم کوئی فکر نہ کریں۔

تین ماہ بعد لکھا کہ بچہ کچھ بیمار ہو گیا تھا' تو ایک ماہ اس کو اسپتال میں رکھنا پڑا اور ساتھ ہی یہ کہ میں پیرس آہی جاؤں وہ کسی معمولی بات پر ہرگز یوں نہ کہتیں۔

میں دوسرے روز پیرس آگئی۔ کامران اب بھی اسپتال میں تھا۔ کوئی بھی دودھ ہضم نہ کرپاتا۔ اب بہتر کچھ ضرور تھا۔ میں ایک ہفتہ پیرس ان کے پاس رہی۔ ایک دن ترکی کے سفیر میرے رہتے ان کے گھر آئے۔ مجھے ملایا کہ ان کو بیٹی بنایا ہے اور وہ بیمار بچہ میرا ہے۔ کچھ دیر میری طرف دیکھ کر یوں' انگریزی میں کہا خالدہ خانم ترکی واپس جانے کو یوں ابھی آمادہ نہیں کہ انھوں نے ایک بچے کی ذمّے داری لے رکھی ہے۔ میرے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی کہ جب چودہ سال کا ہن باس کٹنے اور حسن اور حُسین کو دیکھنے کا وقت آیا تو یہ عظیم خاتون اتنی بڑی قربانی محض اس بچے کی خاطر دینے پر آمادہ ہو گئیں۔ اسی منٹ میں نے دل میں فیصلہ کرلیا کہ کامران کو لے کر لندن چلی جاتی ہوں اور اس کے بہتر ہونے پر ہندوستان لوٹ جاؤں گی تاکہ اختر کے دماغ پر کوئی فکر و پریشانی نہ رہے اور وہ یکسوئی سے ڈگری لے سکیں۔ ان کے ہزار منع کرنے پر میں نے ان دونوں کو خدا حافظ کہا۔ میرے پاس الفاظ تو نہ تھے جن سے ان کی شفقت اور محبت کا شکریہ ادا کر سکتی۔ ہاں آنسوؤں کا نذرانہ ہی تو تھا وہ پیش کردیا۔

—○—
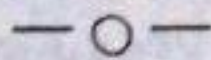
یورپ سے واپسی

لندن آتے ہی سیدھی وہاں کے ایک اسپتال میں جو بچوں کے امراض کے لیے تھا اس میں داخل کیا۔ جہاں تین ماہ رہنے کے بعد وہ سفر کرنے کے قابل ہوا اور میں کامران کو لے کر ہندوستان روانہ ہو گئی۔ یورپ کی فضا اس قدر مکدر ہو چکی تھی۔ لگتا تھا کچھ ہی ماہ میں لڑائی چھڑ سکتی ہے۔ میں اختر سے دور اور دور ہوتی جا رہی تھی۔ دماغ میں ایک ہی خیال کہ جانے مستقبل میں کیا لکھا ہے؟ اختر ڈگری لے سکیں گے۔ کہیں یورپ کی رنگا رنگی میں وہ گم تو نہ ہو جائیں گے۔ ہم دونوں پھر ملیں گے یا نہیں۔ بڑی اداسی' بوجھل دل اور پریشان خیالات اور ایک بیمار بچہ لے کر میں جہاز کی سیڑھیاں چڑھ اوپر ریلنگ کو پکڑ کر کھڑی ہوئی' نیچے کی طرف دیکھ کر نظروں نظروں میں اختر کو تلاش کرنے لگی۔ سب بھیڑ بھاڑ سے ہٹ کر دور کھڑے نظر آئے۔ مسکرا کر ہاتھ ہلا رہے تھے۔ میں نے لمحہ بھر میں اپنے پر قابو پالیا اور اسی حالت میں ان کو خدا حافظ کہا۔

وہ سب رجسٹر جو ترجمہ کرکے مولوی صاحب کو روانہ کرنے تھے۔ میرے سوٹ کیس میں تھے۔ رات کا کھانا میں نے کیبن ہی میں منگا لیا کہ بچے کو اکیلا نہ چھوڑنا چاہتی تھی۔ مجھے یہ خبر کیسے ہو سکتی تھی کہ اوپر کسی فرشتہ خصلت انسان نے یہ نوٹس لیا ہے کہ میری کھانے کی کرسی خالی رہی اور میں کھانا کھانے نہ آئی۔ کھانے کے بعد ایک ڈاکٹر آکر دریافت کرتا ہے کہ بچے کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔ کسی دوا کی ضرورت تو نہیں؟ "شکریہ" وہ چلے گئے اور میں حیران کہ ان کو کیسے خبر کہ میرا بچہ بیمار ہے۔ صبح ناشتے کی گھنٹی بجنے سے پہلے' وہی ڈاکٹر ایک نرس کے ساتھ آئے۔ کامران کو آلہ لگا کر دیکھا' تھرمامیٹر لگایا۔ مجھ سے کہا کہ نرس بچے کو لے کر ڈیک پر آپ کے ساتھ جائے گی۔ وہاں ایک بچے کا پلنگ رکھوا دیا گیا ہے۔ آپ اطمینان سے ناشتہ جاکر کریں۔ اتنی دیر نرس اس کے پاس رہے گی۔ لنچ تک بچے کو اوپر ڈیک پر ہی رہنا چاہیے کہ سمندر کی ہوا اور سورج کی کرنیں اس

کے لیے ہر دوا سے بہتر کام کریں گی۔ کوشش کرنا چاہیے کہ کیبن میں کم سے کم رہے' یہ کہہ کر وہ خود تو چلے گئے' نرس نے بڑی مہارت کے ساتھ جلدی جلدی ہر وہ چیز یکجا کی جو کامران کو پانچ گھنٹے اوپر رہتے وقت درکار ہو سکتی ہے۔ پھر مجھ سے اوپر چلنے کو کہہ کر بچے کو اپنی گود میں اٹھا کر اوپر آئی۔ ایک کاٹ ایک ایسی جگہ رکھا تھا کہ تیز ہوا کا جھکڑ نہ لگ سکے' اس کے قریب ایک کرسی اور میز رکھی تھی۔ گھنٹی بجی تو مجھ سے کہا۔ آپ جائیں وہ بچے کے پاس بیٹھی ہیں۔ میں کیبن سے آتے وقت وہ رجسٹر لے آئی تھی جو دو تین ماہ اختر انجمن کے لیے کام کرکے رکھتے رہے تھے۔ سوچا ان سب کو صاف کرلوں تاکہ ہندوستان پہنچ کر فوراً" مولوی صاحب کو بھیج سکوں۔ میں کھانے کے کمرے کے لق و دق ہال میں آئی۔ یہاں ساٹھ ستر چھوٹی چھوٹی میزیں چار چار آدمیوں کے لیے لگی ہوئی تھیں۔ دو تین کنارے کی میزیں ایسی بھی تھیں جو صرف دو ہی کے لیے تھیں۔ بیرے نے آگے بڑھ کر پوچھا۔ آپ مسز حسین ہیں؟ "ہاں" "آپ کی جگہ وہ سامنے والی دو کرسیوں کی میز جو درمیان میں وہاں ہے" میں کیوں کہ رات کے کھانے پر نہ آئی تھی' کیبن میں کھانا گیا تھا۔ شاید اس لیے اس کو میری جگہ کس میز پر ہے' معلوم ہو گیا ہوگا۔ اس میز پر ایک ہندوستانی صاحب شیروانی زیب تن کیے' کلف دار شلوار' جناح ٹوپی پہنے پہلے ہی سے بیٹھے تھے۔ کرسی کے پاس آئی تو کھڑے ہو گئے "السلام علیکم" کہا۔ میں نے جواب دے دیا۔ اپنا نام بتایا "میاں محمد شفیع" کہا آپ مسز اختر حسین ہیں۔ آپ کا نام مجھے رات کے کھانے پر معلوم ہو گیا تھا" میں بغیر کچھ کہے بیٹھ گئی۔ پیز' جام' پھل اور جوس پہلے سے رکھا ہوا تھا۔ میں جوس پینے لگی تو سامنے بیٹھے صاحب کی طرف نظر پڑی۔ گول سا چہرہ جو چیچک کے داغوں سے بھرا ہوا تھا۔ گندمی رنگت' جسم بھرا بھرا' قد درمیانہ سا' ناک موٹی سی' کشادہ پیشانی' آنکھوں میں شرافت اور انسانیت کی جھلک کا احساس ضرور ہوا' پر ایک وحشت سی محسوس کی کہ بہتر ہوتا کہ میری میز پر اور کوئی نہ ہوتا۔ بیرا گرم پلیٹ میں دو انڈے ساتھ میں تلا ٹماٹر اور کلیجی کے دو ٹکڑے گرم گرم توس ہم دونوں کے سامنے رکھ گیا۔ میں سر جھکائے ناشتہ کرنے لگی کہ شفیع صاحب نے دریافت کیا "آپ کے بچے کی طبیعت ٹھیک ہے نا"۔ "جی' مگر آپ سے مطلب؟" وہ خاموش رہے کہ ان بیگم سے بات نہ کرنا ہی بہتر ہے۔

بلند کر کے اوپر لگا دی گئی۔ نرس کا شکریہ ادا کر کے میز سامنے رکھ کر قلم ہاتھ سے
نکالا اور سر جھکا کر اختر کے لیے ڈیڑھ صفحہ کاپی پر اتارنے لگی تو بس ایسا لگتا رہا کہ اختر
میرے آس پاس ہی ہیں۔ بیٹھے بیٹھے تھک گئی۔ ریلنگ کے پاس آ کر دور سمندر کی بے
کرانی اور دیو قامت لہروں کو دیکھنے لگی۔ ایک ہندوستانی خاتون پاس آئیں بتایا کہ وہ بیگم
محمد لطیف خاں ہیں۔ رائے پور کی رہنے والی ہیں۔ ان کے میاں کوئی کورس کرنے لندن
دو سال کے لیے آئے تھے۔ اب واپس ہندوستان جا رہی ہیں۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ اختر
کی ہم وطن ہیں۔ پھر میں کرسی پر جا کر بیٹھ گئی۔ دو ایک بار ایسا لگا کہ شفیع صاحب قریب
سے گزرتے ہوئے لمحہ بھر کو پیچھے رکے اور یہ دیکھنے کی کوشش کی کہ میں کیا لکھ رہی ہوں۔

لنچ کے وقت سے کچھ پہلے ایک دوسری نرس آ گئی کہ وہ بچے کے پاس رہے گی تاکہ میں
کھانا کھا لوں۔ پھر وہ کیبن میں میرے ساتھ بچے کو لے جائے گی۔ وہ صاحب پہلے سے
کرسی پر ڈالے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر کھڑے ہوئے۔ پھر بیٹھ گئے پوچھا کہ آپ کیا لکھ رہی
تھیں۔ میں جل اٹھی "جو دل چاہ رہا تھا، وہ لکھ رہی تھی" چپ ہو گئے۔ شاید اب یہ سمجھ
میں آیا ہو کہ یہ بہت اکھڑی قسم کی انسان ہیں۔ ان سے مخاطب نہ ہونا ہی بہتر ہے۔

تیسرے دن لنچ کے وقت مجھ سے پوچھا کہ "پرسوں جب جہاز دن بھر کو اٹلی کی بندرگاہ
جا کر رکے گا تو کیا آپ بھی "پومپیائی" وغیرہ دیکھنے اتریں گی۔

"جی نہیں، میں اپنے بیمار بچے کو دن بھر کے لیے کیسے چھوڑ سکتی ہوں۔"

دوسرے دن بیگم لطیف خاں نے مجھ سے پوچھا تو ان سے کہا۔ دل تو میرا بے حد چاہ رہا
ہے کہ پرانے شہر کو جو ہزاروں سال پہلے آتش فشاں کے پھٹتے ہوئے لاوے سے زیر زمین
چلا گیا تھا جس کو اس دور میں انسانوں نے انتہائی کمالات سے زمین کے اندر سے نکالا
ہے۔ قدرت خدا نے اس شہر کو کس طور سے قائم و دائم رکھا کہ انسانوں کے لیے جائے
عبرت رہے۔ مگر میں بچے کو دن بھر کیسے چھوڑ سکتی ہوں۔

انہوں نے جب مجھے یہ بتایا کہ جہاز میں ایک اسپتال ہے جس میں ڈاکٹرز اور نرس ہر
وقت موجود رہتے ہیں۔ ان کے ذمے کر کے بے فکر ہو کر جا سکتی ہیں۔ ان کے ساتھ
اسپتال جا کر دیکھا۔ دل کو اطمینان ہوا۔ ڈاکٹرز اور نرسوں سے بات کر لی۔

بیگم لطیف خاں نے بتایا کہ "ہم بارہ ہندوستانی ایک گروپ کی شکل میں چار موٹروں

میں جائیں گے آپ بھی چلیں ہمارے گروپ کے ساتھ۔"

جہاز صبح نو بجے "نیپلز" بندرگاہ پر رکا۔ ہم لوگ نیچے اترے تو معلوم ہوا کہ سارا
انتظام میاں محمد شفیع کے ہاتھ میں ہے۔ یہ مجھے ذرا اچھا نہ لگا کہ کل ہی ان صاحب سے
خاصی گرما گرمی ہو چکی تھی۔ جب کھانے کے وقت بیچارے نے یہ کہا کہ اگر وہ رجسٹر میں
ان کو دے دوں تو وہ صاف کر دیں گے۔

ہم سب ٹیکسیوں میں روانہ ہوئے۔ گھنٹہ بھر سڑکوں سے گزرتے وقت دو طرفہ سربلند
سبز لبادے میں ملبوس درخت سر جوڑے اور جیسے ہاتھ پکڑے کھڑے تھے۔ جابجا فوارے
چل رہے تھے اور تھوڑے تھوڑے فاصلے سے سڑک کے دونوں طرف سنگ مرمر کے قد
آور مجسمے کھڑے ملتے رہے۔

اب ہم اس مقام پر پہنچ گئے جہاں دو ہزار سالہ شہر "پومپیائی" زیر زمین دفن رہنے کے
بعد پھر سے نمودار کیا گیا۔ کئی فرلانگ باغ کی روشوں پر چلنے کے بعد بے شمار در و بام میں
سے گزر کر اس محل کے محرابوں والے برآمدے سے ہوتے ہوئے ہال اور کمروں میں پہنچ
کر دیکھتے ہیں کہ دو ہزار سال پہلے آتش فشاں پھٹنے کے وقت جو انسان جس طرح کھڑا یا
بیٹھا تھا اور جو بھی کر رہا تھا ہماری نگاہوں کے سامنے تھا۔ کوئی ہاتھ بڑھا کر گلاس میں جام
لے رہا ہے۔ کوئی کوچ پر آرام کر رہا ہے۔ کہیں میز پر سے لوگ چل اٹھا رہے ہیں۔ کوئی
بچہ ماں کی طرف جھک کر ہاتھ بڑھا رہا ہے۔ یہ سب اصل سے پتھر کے ہو کر آج بھی موجود
ہیں۔ ہماری آنکھوں کے سامنے قدرت خدا اور انسانی کمالات کی کرشمہ گری ہے کہ کس
طور ان کو ثابت اور سالم نکالا ہے۔

چند گھنٹے بعد ہم لوگ نیپلز سے واپس آ گئے۔ میں نے ہیڈ بیرے سے کہہ دیا تھا کہ ایک
الگ میز رات سے میرے لیے لگا دے۔ دوسرے دن صبح میں اپنے نیچے والے پلنگ پر بیٹھ
کر بوتل سے دودھ دینے کے لیے کامران کو اس کے کاٹ سے اٹھانے کے لیے کھڑی ہوئی
رہی تھی کہ اوپر کے پلنگ کی لوہے کی ریلنگ خدا ہی جانے کس طور اپنے کھٹکے سے نکل
پڑی اور آ کر سیدھی میری آنکھ کی بھوں پر ایسے لگی کہ وہ پھٹ گئی اور خون منہ پر سے بہتا
ہوا میری گود میں یوں گرنے لگا جیسے نل کھول دیا ہو۔ گھبراہٹ میں اتنا ہوش رہا کہ ہاتھ
سے گھنٹی کے بٹن کو دبا دیا جس کی گھنٹی سیدھی اسپتال میں بجتی تھی۔ دو منٹ میں نرس

اور ڈاکٹر بھاگے ہوئے آئے اور مجھے لے کر اسپتال کے کمرے میں گئے۔ چار ٹانکے لگے
مجھے بتایا کہ کس قدر اچھا ہوا کہ مسز شفیع کے کہنے سے یہ گھنٹی آپ کے کیبن میں لگوا دی
تھی۔ کہا کہ "مسز شفیع کے کہنے سے" "جی ان کو اپنی بہن اور آپ کے بیمار بچے کا بہت ہی
زیادہ خیال لگا رہتا ہے۔ ان ہی کی درخواست پر صبح شام معائنہ کرنے کے بعد وہ ہم سے
پوری رپورٹ لیتے ہیں۔ آپ کا ملک خوش قسمت ہے جہاں اب تک رشتوں کا اس قدر
خیال رکھا جاتا ہے۔ ہماری بڑی بدنصیبی ہے کہ انسانی خوبیاں بڑی تیزی سے ختم ہو کر
انسان کو مشین کا کل پرزہ بنا دیا ہے۔"

اگرچہ بہت ہی کم کھلے دل اور کھلی زبان سے اپنی کوئی کمزوری مانتا ہے پھر وہ بھی کسی
حد تک حقائق سے، دن کے کھانے پر اوپر نہ گئی تو شفیع صاحب کو معلوم ہو گیا۔ شام کو ڈیک پر
اوپر آئی تو وہ میرے پاس ایک چھپا ہوا فارم لے کر آئے اور کہا کہ اس پر دستخط کر دوں۔
کیوں کر دوں؟ یہ ہے کیا؟ پڑھا تو معلوم ہوا کہ دوران سفر اگر کسی کو چوٹ جہاز والوں کی
غفلت کی وجہ سے لگ جائے تو اس کا ہرجانہ وصول کیا جا سکتا ہے۔ چہرے کی چوٹ کا سب
سے زیادہ!! مجھے بڑا غصہ آیا کہ یہ کس قسم کی باتیں کرتے ہیں "میں ہرگز ایسا نہ کروں
گی۔ "بھلا جہاز والوں کی اس میں کیا خطا؟ اوپر کی ریلنگ کو تو آرش لڑکی کو نیچے اترنے پر
کس طرح ہک میں لگا جانا چاہیے تھا۔

"دیکھیے حمیدہ بہن آپ کو دستخط کرنا ہو گا۔ وہ یہ کہ میں اختر کو کیا جواب دوں گا۔ میں
نے جب ان سے کہا تھا کہ "اپنے دوست شوکت عمر کی بہن کا سفر میں ہر طرح کا خیال
رکھوں گا تو ان کا یہ کہنا تھا کہ شوکت کی بہن نہ سمجھ کر بلکہ اپنی چھوٹی بہن کی طرح آپ
پورے سفر میں بچے اور حمیدہ کا خیال رکھیں۔"

"ہو سکتا ہے کہ آپ کی دوستی شوکت عمر سے ہو، مگر آپ اختر کو کیسے جانتے ہیں۔ ان
کی زبان سے میں نے کبھی آپ کا نام نہیں سنا۔"

"میری ان سے ملاقات پہلی بار سر عبدالقادر کے ہاں ہوئی اور پھر بارہا انڈیا آفس
لائبریری میں، کبھی کسی کیفے یا ہاؤس میں، اور پھر کئی بار سر عبدالقادر کے ساتھ ہوئی۔ یوں
میں ملے بغیر ہی اختر صاحب کو آپ کی شادی سے پہلے سے ان کی تحریروں کے ذریعے اور
شوکت اور جمیلہ بیگم کے ذریعے بہت اچھی طرح سے جان چکا تھا۔"

"اگر آپ یہ بات مجھے پہلے ہی بتا دیتے تو میں آپ سے وحشت زدہ اتنی کیوں ہوتی؟
اور شائستگی کے باہر ہو کر بات چیت نہ کرتی اور نہ ہی آپ کے متعلق بُرے خیالات لاتی
کہ بظاہر چہرے پر شرافت ہے اور پڑھے لکھے بھی ہیں مگر ایک تاجر ہونے کے ناتے اور
امرتسر میں سکھوں کی صحبت میں رہ کر موقع محل اور مناسب اور نامناسب کی تمیز سے
بالکل بے بہرہ ہو چکے ہیں!!" اس پر وہ خوب ہنسے اور پھر کہا کہ اس فارم پر دستخط اب تو کر
دیں، مگر میں نے صاف انکار کیا کہ آپ کو معلوم نہیں کہ اختر کو یہ بات کتنی ناگوار گزرے
گی۔ میں ہرگز کوئی غلط بات نہیں کروں گی۔ آپ ٹھہرے تاجر لوگ، جو دو کو چار کرنے
میں لگے رہتے ہیں۔"

ان کو سمجھ میں یہ کسی طرح سے نہ آئے کہ اگر مجھے دو تین ہزار پونڈ مل سکتے ہیں تو میں
انکاری کیوں ہوں۔ میں نے پھر ان کو سمجھایا۔ وہ اس لیے کہ قصور تو اس آرش لڑکی کا
تھا۔ ہرگز جہاز والوں کی غلطی نہ تھی۔ آخرکار ان کو چپ ہو جانا پڑا۔

صبح تڑکے پورٹ سعید پر وہ سب مسافر اتر گئے جو مصر کے عجائبات اور پیرامڈ دیکھنا
چاہتے تھے۔ ہم اسی طرح سولہ کی پارٹی بنا کر موٹروں سے روانہ ہوئے۔ سڑکیں بہترین،
جیسے یورپ وغیرہ کی، دو طرفہ ہونے کے وجہ سے بڑی اسپیڈ سے دو سو میل کے قریب کا
فاصلہ ڈھائی گھنٹے میں طے کر کے قاہرہ پہنچ گئے۔ یہاں پہنچتے پہنچتے پر ہزارہا سال پرانی تواریخ
کے جیسے ورق بکھرے ہوئے محسوس ہوتے رہے۔ ایک میوزیم جہاں ممی رکھی ہوئی تھی
دیکھی۔ اس وقت یہاں کا معاشرہ کس قدر سائنس پر قدرت رکھتا تھا۔ وقت اس قدر کم
تھا اور کچھ دیکھنے کا سوال نہ تھا۔ پیرامڈ تک جانے کے لیے چالیس میل کے قریب سفر کرنا
تھا، موٹریں تب وہاں تک نہ جاتی تھیں۔ سڑک سے دو میل، اونٹ پر جانا تھا، بھاگم بھاگ
وہاں پہنچے۔ اونٹ پر بیٹھنے کا پہلا موقع پڑا، بڑی ہی بے ڈھب سواری۔ اس کا اٹھنا اور
بیٹھنا دونوں ہی دل دہلا دینے کے انداز رکھتے ہیں۔ آخر وہاں تک پہنچ گئے۔ وہاں پہنچ کر
انسان ششدر رہ جاتا ہے کہ ہزارہا سال پہلے جب کہ پہیے کی ایجاد بھی نہ ہوئی تھی اور
کوئی پہاڑ کئی کئی سو میل وجود نہ رکھتا تھا تو یہ پتھر لائے کیسے گئے اور ایک دوسرے پر رکھے
کیوں کر جبکہ سب سے اونچے والے پیرامڈ کی اونچائی ساڑھے چار سو فٹ سے کچھ زیادہ
ہے۔ پھر دوسرا اس سے کچھ چھوٹا، تیسرا کچھ اور کم۔ ایک ایک پتھر دو میٹر لمبا اور ایک میٹر

کے قریب پورا گھومو۔ وہ کون سا مسالہ استعمال کیا کہ آج بھی اس پر کوئی اثر نہ پڑا۔ اس
کے اندر جانے کی سیڑھیاں بے تحاشہ اونچی اونچی کہ چڑھتے میں گھٹنے چٹخ جائے جائے۔
اندر جا کر ایک دو کمرے دیکھے اور نیچے اتر آئے۔ اس وقت دوسرے والے کمرے میں
ایک "ممی" تھی اور اس زمانے کے ظروف اور زیورات وغیرہ۔ اب کا معلوم نہیں کہ وہ
گی اب وہاں ہے یا نہیں۔ واپسی کے وقت شام ہو گئی۔ چند لوگوں کی فرمائش پر دریائے
نیل کا شہر کے اندر سے گزرتے ہوئے رنگا رنگ بتیوں کا جھلملاتا شہر کی دو طرفہ بلند عمارتوں کی
تجلیاں جو پانی پر اپنا عکس ڈالتے ہوئے لگتا ہے کہ ہر رنگ کی چند مچھلیاں پانی پر تیر رہی
ہیں "منظر ایک نظر دیکھتے چلیں۔ دریائے نیل کے کنارے ایک میل تک جا کر واپسی کی
سڑک پکڑی۔ پچاس میل جا کر موٹر کا ٹائر برسٹ ہوا۔ پورا قافلہ رک گیا۔ اب چلے تو
دوسری موٹر کے دو ٹائر ایک ساتھ پنکچر ہو گئے۔ ان خصوصی موٹروں کے ساتھ ایسا ہوا
نہیں کرتا۔ ڈرائیور لوگ خود بھی حیران۔ پھر کچھ دور گئے۔ ایک دوسری موٹر کا ٹائر گیا۔ دیر پر
دیر ہوتی جائے اور میں لرزی جاتی کہ اگر وقت پر نہ پہنچے اور جہاز چل پڑا تو کیا ہو گا۔
"حضرت کو مارنے شتابہ اڑ" کہ جب دس میل رہ گئے تو ایک اور موٹر انجن کی خرابی سے
رک گئی۔ اس میں بھی تھوڑا وقت نکل گیا۔ جب ہم نہر سویز کے اس مقام پر پہنچے جہاں
سے ہم کو موٹر لانچ میں بیٹھ کر نہر کے بیچ کھڑے جہاز پر سوار ہونا تھا تو معلوم ہوا کہ جہاز جا
چکا ہے۔ ایک میل دور ہے اس کی بتیاں جگمگ کرتی چیونٹی کی چال سے رینگتا چلا جا رہا
ہے۔

جمیل بھائی! سوچیں تو آپ کہ میری کیا حالت ہوئی ہو گی کہ میرا بیمار بیٹا جہاز میں اکیلا
رہ جائے اور میں کنارے کھڑی رہ جاؤں۔ مجھ پر تو ایک جنون سی کیفیت طاری ہو گئی۔
زور زور سے صرف رو ہی نہیں رہی تھی بلکہ بالکل گاؤں والی عورتوں کی طرح بے آواز
اٹھائیں تشتائیں ایک بھی رہی تھی۔ سارا زور تھا بیچارے شفیع صاحب کی طرف۔ گو
بیٹی خوشی خوشی خود اپنی مرضی سے جانے پر آمادہ ہوئی تھی۔ کسی کی ترغیب یا زبردستی نہ
تھی۔ پر اس وقت تو سارا قصور ان کے سر منڈھ کر ہی کہے جاتی کہ "میرا بچہ مر جائے گا
اور خون آپ کی گردن پر ہو گا۔"

شفیع صاحب تو بوکھلا گئے پر حواس باختہ نہ ہوئے۔ باقی مسافر بھی چاؤں چاؤں کرکے

ان ہی سے مخاطب' وہ بیچارے مجھ سے کہے جائیں "ذرا سی دیر خاموش تو ہوں' یہ رونا
چلانا بند تو کریں۔ کچھ سوچنے کا موقع تو دیں۔" کچھ شاید سوچا ہی ہو گا۔ بھاگتے ہوئے
"واچ ٹاور" پر جا۔ فون کے ذریعے کیپٹن سے بات کی کہ وہ پندرہ پسنجر کو جہاز میں
چڑھوالیں۔ کوسٹ گارڈ کی لانچ سے بلوالیں۔ کیپٹن صاحب نے جواب دیا کہ جہاز کے
قانون کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے۔ جب سیڑھی ایک بار اونچی کر لی جائے تو کسی صورت
میں سوائے بندرگاہ کے وہ پھر نیچے نہیں ڈالی جا سکتی۔ ادھر سے یہ جواب کہ "پھر آپ ہرگز
قانون کے خلاف بات نہ کریں۔ جہاز کی سیڑھی ہرگز نیچی نہ کریں۔ وہ جھابے جو موٹی
رسیوں میں بندھے ایمرجنسی میں مسافروں کو نیچے کر دینے کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔
ایک کو نیچے کروائیں۔ کوسٹ گارڈ سے کہیں تاکہ وہ ان کو کشتی میں لے کر جہاز تک
آجائیں۔ کیپٹن اس پر بھی نہ مانا۔

جمیل بھیا! ذرا سنیے تو یہ ایک عجیب و غریب روحانی کرامات کا واقعہ۔ شفیع صاحب واچ
ٹاور سے ذرا سا منہ لیے اتر کر میرے پاس آئے اور بہت سیریس ہو کر کہا "حمیدہ بس غور
سے میری بات سنیں' یہ سب ہائے وہلا بند کریں۔ دنیاوی طریقوں سے فیل ہو گیا۔ جو
ذات سب سے بڑی ہے' اب میں اس سے رجوع کروں گا' بشرطیکہ آپ خود اپنے رحیم و
کریم کی ذات پر دل سے بھروسہ کرکے میری دعا میں شامل ہوں' بس آپ اسی جگہ کھڑی
رہیں اور خداوند تعالیٰ کی رحمت پر یقین کرکے "چودھویں کا شاید چاند تھا' چاندنی ہر طرف
بکھری ہوئی تھی۔ وہ ہم سب سے کوئی دس گز دور جا کر کھڑے ہو گئے' آنکھیں بند کر لیں'
اپنے ہاتھوں کو کس کر ایک دوسرے کو پکڑ لیا۔ سر ذرا اونچا آسمان کی طرف کیا اور جسم ہلکا
سا کانپتا محسوس ہوا۔ دس منٹ وہ اسی کیفیت میں رہے اور ہر مسافر دم بخود ان کی طرف
دیکھتا رہا۔ توبہ توبہ میرے دماغ میں یہ خیال گزرے جائے کہ یہ صاحب اب کوئی شعبدہ
بازی کر رہے ہیں۔ دل کرے کہ ان کا منہ جا کر نوچ لوں' مگر شفیع صاحب ایک مورت کی
طرح اسی کیفیت میں کھڑے رہے۔ کسی نے کہا ایسا لگتا ہے' جہاز رک گیا۔ میں نے مڑ کر
جہاز کی طرف دیکھا تو پانی پر جو جہاز کی بتیوں کی روشنی پڑ رہی تھی وہ ساکت اسی جگہ
محسوس ہوئی۔ ہاں جہاز تو رک گیا۔ اُدھر سے کپتان صاحب فون پر کوسٹ گارڈ اور ٹاور پر
شاید یہ اطلاع کرتے ہیں کہ "ڈریجر" جو نہر کی ریت کو ہر جہاز کے گزرنے سے پہلے ہٹاتا

جاتا ہے اس کو بھیجو کہ جہاز کے آگے ریت ہونے سے وہ چل نہیں سکتا۔ ڈریجر پانچ منٹ میں پہنچ کر ریت کو ہٹا کر پھر کنارے پر آگیا۔ جہاز اب بھی نہ چلا تو کیپٹن کو یقین کہ کچھ انجن میں خرابی آگئی ہے تو اس کی جانچ پڑتال کی۔ کہیں خرابی نہ ملی۔ اس سب میں ڈیڑھ گھنٹہ ضرور لگ گیا ہوگا۔ اب شفیع صاحب اپنے مراقبے سے باہر آئے۔ اوپر "واچ ٹاور" پر جا کر کیپٹن سے پھر بات کی "نہ ہی ریت آئی تھی اور نہ انجن خراب ہوا ہے۔ یہ میری دعا کا نتیجہ ہے۔ اگر آپ اس بیمار بچے کی ماں کو اُوپر بُلا نہ لیں گے تو چار دن تک جہاز جنبش نہ کرے گا اور پیچھے پچاسوں آنے والے جہاز رُکے کھڑے رہیں گے۔ نہر سوئز اس قدر پتلی ہے کہ صرف ایک ہی جہاز اس میں سے گزر سکتا ہے۔ اس لیے آٹھ گھنٹے تک جہاز اِدھر کے اُدھر جاتے ہیں۔ پھر آٹھ گھنٹے دوسری طرف والے جہاز گزرتے ہیں۔ ہر جہازی بڑا توہم پرست ہوتا ہے شاید اسی لیے ان کا فون آیا کہ اچھا اس ماں کو جھابے کے ذریعے اوپر کر لیں گے۔ موٹر لانچ زیادہ بڑی نہ تھی۔ سات لوگوں کو اور بھی بٹھا کر بولے۔ "ابھی میں آپ سب کو بھی لینے آتا ہوں" جہاز سے بالکل قریب موٹر لانچ کھڑی ہو گئی۔ چار رَسّیوں سے بندھی ایک جھابہ نما شے نیچے کو آگئی۔ ڈرتے ڈرتے کسی طور اس میں بیٹھ گئی۔ اب جو وہ اوپر کھینچی جا رہی ہے تو دَم نِکلا جاتا کہ رَسّی ٹوٹ جائے گی' جھابہ پھٹ جائے گا۔ خیر اوپر آ ہی گئی تو اب میں نے کپتان سے کہا جس طور آپ نے ایک مسافر کو اوپر لے ہی لیا تو دوسروں کو بھی اُوپر بُلا ہی لیں۔ نیچے سے شفیع صاحب نے کیپٹن کا شکریہ ادا کیا اور کہا اب عدن پر آپ سے ملاقات ہوگی۔ آخر کیپٹن نے کہا کہ یہ جو باقی مسافر لانچ میں ہیں ان کو بھی اوپر لے لیں اور جو باقی کنارے پر ہیں ان کو دوسری لانچ لے آئے گی۔ سب ہی اوپر جب آگئے تو جہاز پھر بے چون و چرا چل پڑا۔ ہم سب ہی اب شفیع صاحب سے جانے کیا کیا سوالات کرنا چاہتے تھے اور ہم سب سے بڑھ کر کپتان صاحب' مگر وہ تیزی سے ہم سب سے دُور ہوئے اور اپنی کیبن میں چلے گئے۔ دوسرے دن ہم میں سے جس نے بھی جہاز روک لینے کے حوالے سے بات کرنا چاہی تو وہ خاصے بگڑ کر کہتے' نہ میرے سامنے اور نہ کسی کے بھی سامنے اس واقعے کا ذکر ہرگز نہ کریں۔ مگر میں عرصے تک سوچا کی یہ کون سی طاقت ان صاحب میں تھی۔ مگر پھر زندگی بھر جو اُن کو بے حد قریب سے دیکھنے کے مواقع رہے تو قائل ہو گئی کہ ایک مومن بندہ ہیں جن کو قربِ خداوندی

نصیب ہے کہ شفیع بھائی کی زندگی کا ہر پل خدمتِ خلقِ خدا چھپ چھپ کر کرنا میں نے اور اختر نے دیکھا۔

جہاز کا سفر ختم ہوا اور ہم بمبئی پہنچ گئے۔ اختر کے بھائی شمیم صاحب موجود تھے۔ شفیع بھائی ان سے مل کے بہت خوش ہوئے کہ جب وہ لاہور میں مقیم تھے تو گاہے گاہے ان سے ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ شمیم بھائی کے ایک دوست ولی محمد صاحب کے ہاں ٹھہرایا۔ یہ اس وقت بمبئی کے اچھے فلم ڈائریکٹر تھے۔ ان کی بیگم صاحبہ ممتاز شانتی اپنے وقت کی نامور فلم ایکٹریس تھیں۔ ولی صاحب کی بنائی ہوئی بہت سی فلموں میں کام کر چکی تھیں۔ پہلی بار زندگی میں میرا واسطہ چند دن کے لیے فلمی دنیا کے لوگوں سے ہوا۔ ممتاز شانتی کیسی عظیم ہستی تھیں۔ ان کی زندگی کی کہانی بھی عجیب و غریب تھی۔ کاش میں کبھی اس کو قلم بند کر سکوں۔ ممتاز شانتی کے لیے اختر نے بارہا یہ الفاظ کہے کہ یہ ایسی خاتون ہیں جن کے پلّو پر خواتین کو نماز پڑھنا چاہیے۔

علی گڑھ پہنچ کر اطمینان کا سانس لیا۔ مولوی صاحب کو وہ سب تراجم ایک خط کے ساتھ بذریعہ رجسٹری روانہ کیے۔ ان کو جلد علی گڑھ آنے کو لکھا اور کامران کی بیماری کا حال بھی۔ جواب جلد ہی آگیا۔ بڑے حیران کہ یہ کامران حسین کہاں سے آگئے۔ نہ کبھی اختر نے لکھا نہ تم نے لکھا۔ ان کا پہلے سے پروگرام لمبے دَورے کا بنا ہوا تھا۔ اس لیے صرف چند گھنٹوں کو فلاں تاریخ کو آسکیں گے۔"

مولوی صاحب حسبِ وعدہ علی گڑھ تشریف لائے۔ جُھک جُھک کر کامران کو بڑی حیرانی سے دیکھتے رہے۔ پھر بولے کہ "حمیدہ تم بچے کو لے کر حیدر آباد میرے ساتھ چلو۔"

"مولوی صاحب آپ یہ بات کس طور مجھ سے کہہ رہے ہیں۔ اختر کے ناتے۔ جس اختر کو آپ نے اتنی شفقت اور محبت دینے کے بعد اس قدر زیادتی کی کہ آپ کا ضمیر خود ہی آپ کو جانے کس کس طور بُرا بھلا کہتا ہوگا۔ آخر آپ نے کس قصور اور کس غلطی کی بنا پر اختر کے ساتھ وہ ظلم کیا جو آپ جیسے عظیم شخص کو زیب دے ہی نہیں سکتا۔"

مولوی صاحب کی آنکھیں دُھندلا سی گئیں اور چہرہ تمتما اُٹھا۔ مجھے گھور کر دیکھا اور بولے "اس وقت جب تم دونوں مجھے چھوڑ کر چل پڑے تھے' تب یہ سوچا تھا کہ مجھے کیا دُکھ اور تکلیف ہوئی۔ میں منع کرتا رہا اور تم دونوں نے ایک نہ سُنی۔ میں نے بھی اسی وقت

سوچا کیا تھا کہ اختر کے دل کو اسی قدر ٹھیس لگنے سے نہیں رہوں گی۔"

"حقیقت تو یہ مولوی صاحب آپ تو بچوں والی باتیں کر رہے ہیں۔ ہمارا آپ کے پاس سے کہیں جانے ضمیر کے لیے جانا کبھی ہوا تو نہ تھا لیکن آپ جیسے مفکر، معظم اور ادب پرور ہستی کے لیے کسی کی بیوی حق تلفی کرنا اچھے آپ کو دستبردار کر لیتا تھا۔ اختر کبھی کوئی حرف شکایت حرف زبان پر لائیں گے۔ آپ نے ان سے ایک باپ کو چھین لیا۔ ان کو تو پہلی بار باپ کی شفقت ملی اور ایک گھر ملا۔ آپ نے کس طور سے باپ کا گلا گھونٹ دیا اور گھر کو ڈھا دیا اور اب آپ مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ ساتھ چلو۔"

مولوی صاحب کا سر کچھ جھک سا گیا۔ اپنی آنکھوں کی نمی کو پوشیدہ رکھنا مقصود تھا۔ بولے "تم بیٹھ مجھ سے جھگڑا کر رہی ہو۔ ٹھیک ہے "ٹھیک ہے نہ چلو میرے ساتھ۔ مجھے بچے کو کھو ہی نہ چاہیے تھا۔" میں رونے لگی۔ ان کے گلے سے لگ گئی۔ وہ آنسو تو برداشت ہی نہ کر سکتے تھے۔ مجھے بہلانے کے لیے اپنے پرانے ٹیپ کے بند پڑھنے لگے۔

"تم کوئی ہم سے بہتر سادھا"
"ہم بھی اس سے بہتر سادھا"
"تم جو کوئی ہم سے تیز تر نکالا"
"تو ہم بھی اس سے تیز تر نکالا"

اس پر ہم دونوں ہنس پڑے۔ میں نے مولوی صاحب کو بتایا کہ آج ہی مجھے خالہ لبیب خانم کو خط لکھ کر آپ کی کہی باتیں بتانا ہیں کیوں کہ انھوں نے یہی کہا تھا کہ جب بھی مولانا صاحب سے پوچھوں گی تو وہ یہی جواب دیں گے کہ اختر کے دل کو ٹھیس لگا تھا۔ مگر کر لیا "کام بہت ضروری ہے۔"

اختر لندن میں کام مکمل کر کے واپس آئے اور تھیسس لکھنے بیٹھ گئے۔ اس کو مکمل کرایا۔ جب "وائیوا" کا وقت آیا تو لڑائی چھڑ گئی۔ ان کے پروفیسر صاحب بھی ہر شخص کی طرح لام پر بھیج دیے گئے اور یونیورسٹی میں بحث کرنے لگے۔ کئی ماہ دیر سویر خط آتے رہے مگر لڑائی کے دوران ہر کام تاخیر ہی سے ہوتا تھا۔ مجھے یہ خیال کہ کر دی سب رقم یہاں خرچ ہو گئی کہ لڑائی شروع ہونے سے ایک ماہ پہلے سو کرایے اور آسٹریا (ویانا) سیر کو ایک ماہ کے لیے چلے گئے تھے۔ شکر ہے ان کا کام پہنچا ہوا تھا، دی رقم آتی ہوگی۔ ہر

ہفتے دس روز پر خاموشی سے پوسٹ آفس جا کر جو بھی بھیج سکتی تھی منی آرڈر کر دیتی کہ کوئی نہ کوئی تو مل ہی جائے گا۔

ہاں آپ کو یہ بتانا بھول گئی کہ میرے آنے کے ایک ہفتے بعد ہی شفیع بھائی اپنی بیگم صاحبہ اور ایک چار سالہ اپنے بیٹے ریاض شفیع کو لے کر علی گڑھ آئے تاکہ اماں اور ابا سے ملاقات کریں اور اس طرح ایک اور نیا بیٹا، بہو اور پوتا لبیبی قطار میں شامل ہو گئے۔ چند روز رہنے کے بعد بھائی شفیع نے اماں سے اجازت مانگی کہ وہ مجھے اور کامران کو لے کر چنیوٹ جائیں تاکہ شفیع بھائی کے والدین اپنی نئی بیٹی کو دیکھ لیں۔ دہلی رُک کر کامران کو اسپیشلسٹ ڈاکٹر کو بھی دکھالیں۔ اماں نے اپنی نئی بہو اور پوتے کے ساتھ بڑے پیار سے لین دین کی۔ جانے ان کی زنبیل میں سے ہر موقع پر مناسب چیزیں کہاں سے فوری نکل آیا کرتی تھیں۔

بھائی شفیع (بیگم شفیع کو یہی کہتی تھی) دہلی میں اپنے چھوٹے خالو چودھری محمد علی (جو بھی پاکستان کے وزیراعظم بھی ہوئے) کے ہاں تین دن قیام کیا۔ کامران کو دکھایا۔ پھر ہم لوگ لاہور سے چھوٹی ٹرین سے چنیوٹ (یہ خالص تاجروں کا شہر تھا) پہنچے۔ شفیع بھائی کی تینوں بیاہی بہنیں ادھر اُدھر کے شہروں سے ایک نئی بہن سے ملنے آچکی تھیں۔ کس قدر اللہ والے اور نیک لوگ، سادہ رہن سہن۔ ان کی یہ پشتینی حویلی دیکھنے کے قابل تھی۔ در اور دروازے، نفیس کٹاؤ دار جالیاں، اور گل بوٹوں کو اس طرح پیش کر رہے تھے جیسے سچ سچ کے ہوں۔ برآمدے محرابی نازک کھمبوں کا سہارا لیے کسی نفیس لکڑی پر دستکاری کے وہ نمونے پیش کر رہے تھے کہ دل کرے کہ ان کاریگروں کے ہاتھ چوم لے جائیں۔

میاں صاحب کا خاندان صدیوں سے چرم، کپاس اور چاول کے ایکسپورٹ کی تجارت کرتے آئے تھے۔ دنیا کے سب ہی بڑے ملکوں میں ان کے دفاتر اور ایجنٹ موجود تھے۔ ماشاءاللہ دولت کی اس ریل پیل کے باوجود جس سادگی کی رہائش اور جس طور کنبہ پروری کے ساتھ ساتھ مختلف اسکول، غریبوں کے لیے کئی ایک ڈسپنسریاں اور اسپتال کھولے ہوئے۔ بےکس بیوائیں اور یتیم بچے اس خاندان کی زیرِ نگرانی رہتے۔ کرّوفر کا نام و نشان نہیں، دکھاوا، اور ظاہرداری کسی فرد کو چھو کر نہ گئی تھی۔

وہیں باورچی خانے میں پیڑھیوں پر بیٹھ کر اماں جی اور بھائی شفیع کے بنائے گرم گرم

پراٹھے یا روٹی بس ایک ہانڈی پک کر چولھے پر رکھی ہوئی۔ آتے جاؤ اور کھاتے جاؤ۔ دن کے کھانے پر بیشتر مکئی کی موٹی گرم روٹی پر گھر کا تازہ تازہ مکھن، سرسوں کا ساگ یا آلو کا بھرتہ ساتھ میں اسٹیل کے اونچے سے گلاس میں تازہ لسّی۔ بھلا اس کھانے کے آگے اور کوئی کھانا کیا مقابلہ کر سکتا ہے۔ سارا گھر روزے نماز کا پابند ہی نہیں، ہر کسی کا عمل ایک مومن بندے والا۔

پورے خاندان نے عجیب پیارے انداز سے بیٹی اور بہن کا مقام دیا کہ بعض وقت میں خوشی اور ایک عجیب قسم کے روحانی سکون کو کچھ اس شدّت سے محسوس کرتی کہ آنکھوں میں آنسو آجاتے۔

آتے وقت اماں جی اور ابا جی نے مجھے بالکل اس طور رخصت کیا جو دیہاتوں اور قصبوں کا رواج ہوا کرتا تھا ڈھیر سارے جوڑے، ایک ایک ہر ایک کی طرف سے، ساتھ اختر اور کامران کے لیے بھی۔ دو تین گڑ کی بھیلیاں۔ ایک ٹین گھر کا خالص گھی، ایک بوری چاول کی، گڑ کی بنی باجرے کی ٹکیاں، چنیوٹ، اپنی دست کاری جو پیتل اور ہاتھی دانت کے میل ملاپ کے ساتھ لکڑی پر کیا جاتا ہے۔ سارے ہندوستان میں مشہور رہا ہے۔ جانے کتنی چیزیں قسم قسم کی میرے ساتھ کرنے کے لیے پیک کرکے رکھی گئیں۔ شفیع بھائی نے مذاق میں یا سچ مچ اماں جی سے کہا "یہ سب آپ کیوں کر رہی ہیں۔ آپ کی یہ لڑکی پیرس اور ولایت کی ہوا کھا کر اور وہاں کا پانی پی کر آئی ہے۔ یہ سب ریل کے ڈبے سے باہر اچھالتی، ہلکی پھلکی ہو کر چلی جائے گی۔" "کس قدر بھولے انداز سے اماں جی نے کہا "لڑکی پہلی بار میکے آئی ہے۔ اس کو خالی ہاتھ بھیج کر جوائیں (داماد) سے طعنہ دلوانا چاہتے ہو!!

"اور سن لے شفیع محمد اس لڑکی کو بہن بنایا ہے تو آخری سانس تک بھائی بن کر نہ نبھایا تو میں تجھے دودھ نہ بخشوں گی۔" الٰہی، کیا پھر تیری قدرت کبھی ایسے لوگ پیدا کرے گی؟

واپس علی گڑھ آئی، یقین تھا کہ اختر کا ضرور خط آیا رکھا ہوا ملے گا۔ بیس دن سے اوپر ہو گئے کوئی خیر خبر نہ ملی۔ جانے اختر کہاں ہیں، کس حال میں ہیں، مجھے کیسے معلوم ہو؟ ابا خود ہی سر عبدالقادر کو خط لکھ چکے تھے کہ وہ پیرس سے اختر کی خیر خبر ا۔میسی کے ذریعے معلوم کروائیں۔ پھر بھی مجھے قرار نہ آرہا تھا۔ ایک دم خالدہ خانم کا خیال آیا۔ ان کو

لکھا۔ اب وہ ترکی واپس جا چکی تھیں کہ وہ خود پیرس میں ٹرکش سفیر سے کہہ کر اختر کی خیریت معلوم کروائیں۔ ایک ہفتے کے اندر ان کا تار مجھے ملا کہ اختر وہیں پیرس میں ہیں اور بخیر ہیں، جب ان کے پروفیسر میدان جنگ سے واپس آئیں گے تو وائیوا کے بعد ڈگری ملے گی۔

مارچ ۱۹۴۰ء میں اللہ اللہ کرکے وہ دن آیا۔ اختر ساتھ خیریت کے ڈگری لے کر واپس آئے۔ یہ پورا ایک سال مجھ پر کس قدر بھاری گزرا۔ اختر واپس آکر وہ اختر نہ لگے جن کو میں لندن میں چھوڑ کر آئی تھی۔ اداس اداس، گم سُم اور مردم بیزار۔ کئی کئی دن اختر اوپر سے نیچے نہ آتے۔ بعض وقت مجھے برا بھی لگتا کہ اماں اور ابا کے آداب کے لیے بھی نیچے اُتر کر نہ آتے۔

والدہ صاحبہ میری پریشانی کو سمجھ گئیں۔ پاس بُلا کر بٹھایا اور بولیں "ایک حساس دل پر جنگ کی ہولناکی کا ایسا ہی اثر ہونا چاہیے۔ اختر نے پیرس جیسے جگ مگ کرتے شہر کو تاریکیوں میں ڈوبتے، اُجڑتے اور لٹتے دیکھا ہے۔ ہزاروں کو بے گھر ہوتے اور لاکھوں کی بھگدڑ بھی دیکھی۔ بچوں کو بے سہارا، عورتوں کا لٹتا سہاگ اور ماؤں کی گود خالی ہوتے دیکھی۔ پیرس جو شہروں کی دلہن کہا جاتا وہ اندھیروں میں ڈوب کر ماتمی لبادہ اوڑھے ان کی آنکھوں کے سامنے آگیا۔ تم خدارا اپنی طرف سے کوئی بچکانہ پن ظاہر نہ کرنا۔ اختر کے زخمی دل و دماغ کو صحت مند ہونے کے لیے تنہائی اور سکون ہی مرہم کا کام دے سکتا ہے۔

میں غور سے ان کی باتیں سنتی اور حیرت سے ان کو دیکھتی رہی کہ میری اماں جو ساری عمر گھر کی چار دیواری میں رہیں، کسی اسکول میں قدم نہ رکھا، گیارہ سال کی عمر میں شادی ہوئی۔ تیرہ سال کی عمر میں ماں بن گئیں۔ انگریزی پڑھنا جانتی نہیں۔ پھر اس قدر معلومات رکھتی ہیں۔ انسانوں کی جزئیات اور کیفیات کو کس قدر صحیح طور سے سمجھ کر کس قدر گہرائی میں جا کر ایک عالم اور فلسفی کے انداز میں باتیں کرتی ہیں۔ مجھے خاموش اور ششدر دیکھ کر مسکرا کر بولیں "معلوم ہوتا ہے کہ تم کہیں اور ہو۔ میری باتیں تمہارے پلّے نہیں پڑیں۔"

اختر کے یورپ سے لَوٹنے سے پہلے اخبار میں ایک آسامی انفارمیشن آفیسر کی پڑھی۔ سوچا یہ تو میں اختر کی کوالیفکیشن کے مطابق ہے۔ انگریزی، ہندی اردو کے تراجم کر سکتے

ہیں۔ کیوں نہ ان کی طرف سے درخواست بھیج دوں۔ اَبا سے مشورہ کیا۔ ساتھ اختر کے ہندی' اردو انگریزی کے مضامین کی کٹنگ بھی رکھ دینا۔ میں نے جھٹ سے درخواست لکھ کر یہ بھی لکھ دیا کہ فلاں تاریخ تک واپس آجائیں گے۔

انٹرویو کے لیے خط آگیا۔ مگر اس تاریخ تک واپس نہ آئے تھے۔ میں نے ابا سے پوچھا کہ کیا میں دہلی جاکر انٹرویو دے آؤں۔ مجھے چڑھاوا دے کر ہنسے اور کہا "ضرور چلی جاؤ" اور میں سچ مچ دہلی چلی گئی۔ سکریٹریٹ کے چودہ نمبر کمرے میں پہنچی تو ایک انگریز مسٹر لیوس مجھے دیکھ کر حق دق رہ گئے۔ پوچھا آپ کو کس نے بلایا تھا۔ بتایا کہ بُلایا تو اختر حسین کو تھا مگر ان کو بیٹ اگلے جہاز میں ملی ہے' تو میں خود آگئی۔ انگریز ذرا مشکل سے ہی زور سے ہنستا ہے مگر وہ بے اختیار ہنس پڑے۔

دس دن بعد اختر کی تقرری کا خط آگیا۔ میں دل میں بڑی خوش کہ اختر کو جب آتے ہی بتاؤں گی کہ ان کے لیے ملازمت موجود ہے تو خوش ضرور ہوں گے' لیکن اس کے برعکس وہ تو بہت ہی بگڑے کہ آپ نے مجھے کیا سمجھا ہے کہ "میں انگریز کے انفارمیشن کے محکمے کی ملازمت کرلوں گا۔ ضرور یہ آپ کے ابا' والد صاحب قبلہ کی رائے ہوگی۔" زندگی بھر یوں ہی ہوتا رہا کہ ان کی خاطر اپنی سمجھ کے مطابق کچھ الٹی سیدھی بات یہ سوچ کر کر ڈالتی کہ اختر خوش ہوں گے لیکن اختر نے اپنی بگڑ اُٹھنے کی عادت نہ بدلی۔ پر مجھے ان سے کبھی شکوہ ہوا ہی نہیں۔

ریڈیو اسٹیشن میں کام کرتے ہوئے خوش یوں تھے کہ اس وقت یہاں کرشن چندر' ن م راشد اور سعادت حسن منٹو جیسے لوگ موجود تھے۔

ہم چند مہینوں بعد دریا گنج سے اُٹھ کر پرانی دہلی کی ایک کوٹھی میں آگئے جس کے بازو میں صدیوں پرانا "قدسیہ باغ" اور پشت پر جمنا ندی گزرتی تھی۔ کوٹھی بہت بڑی تھی۔ کرایہ پورے پچاس روپے تھا۔ اتنا کرایہ اکیلے کیسے دیا جاسکتا تھا تو آدھی کوٹھی کرائے پر پہلے پریم بھاٹیا کو اور پھر ان کے جانے کے بعد مسٹر اوما شنکر صاحب کو دی ہوئی تھی۔ یہ دونوں بھی ریڈیو میں کام کرتے تھے۔ اکثر راتوں کو جمنا کے کنارے کنارے ہم دونوں میلوں کی سیر کر آتے۔ قدسیہ باغ کے صدیوں پرانے نیم حکیم گھنیرے پیڑوں کے سائے تلے' چھٹی والے دن' گھوم پھر کر لیٹ کر گھنٹوں کتاب پڑھ کر تازہ دم ہو کر گھر آجاتے۔

اکثر چاندنی راتوں کو دوستوں کے ساتھ کشتی پر دور نکل جاتے۔ جنگلات' پہاڑ' دریا اور سمندر ہمیشہ روحانی غذا کا کام کرتے رہے۔

جون ۱۹۴۲ء میں اختر نے ملازمت سے استعفےٰ دے دیا۔ پھر کچھ سوچ بچار میں رہے کہ آگے کیا کرنا ہے۔ امرتسر سے ان کو وائس پرنسپل کی جگہ کی پیش کش کی گئی تو اس کو فوراً یوں منظور کرلیا کہ پنڈت سندرلال جیل جاتے جاتے اپنے رسالہ "وشوانی" کی ادارت اختر کے سُپرد کر گئے تھے۔ دو سال تک وہ جیل میں رہے اور اختر اس ذمّے داری کو بڑے شوق سے نبھاتے رہے۔ امرتسر میں اس وقت اتفاق سے میرے دو بھائی شوکت عمر اور زاہد عمر کی سرکاری محکموں میں تعیناتی تھی۔ ان کی وجہ سے اکثر والدین علی گڑھ سے امرتسر آتے اور میاں محمد شفیع امرتسر میں ہی مقیم اپنے کاروبار کی دیکھ ریکھ کرتے۔ یوں میرے تو تین بھائی ایک ہی شہر میں تھے اور میرے تو مزے ہی مزے تھے۔

کچھ دن کو والدہ صاحبہ ہمارے گھر بھی آکر رہیں۔ اَماں ابھی تک بے خبر تھیں کہ ان کی بیٹی اپنا گھر کیوں کر رکھتی ہے اور ہم دونوں آپس میں کس طرح کا سلوک ایک دوسرے سے کرتے ہیں۔ چند دن چپ چاپ ہمارے گھر کے ماحول کو دیکھا کیں۔ ایک شام مجھے اپنے پاس بٹھا کر کہا "یہ جو تم بچوں کے معاملے میں اختر سے ضدم ضدا کرتی ہو' یہ بہت ہی نادانی کی حرکت کر رہی ہو۔ بچے بڑے سمجھ دار ہوتے ہیں۔ اگر رات کو اختر ان کو کہانیاں سناتے ہیں اور وہ دیر سے سوتے ہیں تو تم چراغ پا ہو جاتی ہو کہ بچوں کو جلد سو جانا چاہیے مگر اختر تو اس وقت تک دل سے گڑھ گڑھ کر ان کو کہانیاں سنائے جاتے ہیں جب تک بچے پست ہو کر سو نہ جائیں۔ صبح اسکول جاتے وقت وہ اپنے لڑکوں کے ہاتھ میں اکنّی دوَنّی دینا چاہتے ہیں تو تم دینے نہیں دیتی ہو تو وہ پھاٹک کے باہر جاکر ان کے ہاتھ میں ہر روز تھما دیتے ہیں۔ بچے ہمیشہ بچے تو نہ رہیں گے۔ ایک دن بڑے ہو ہی جائیں گے۔ جب ان کے دماغوں میں یہ بات جم چکی ہوگی کہ اس گھر میں بات تو صرف باپ کی چلتی ہے' اماں کی کوئی حقیقت نہیں تو اس وقت تم کو کیسا صدمہ ہوگا۔ اگر وہ بے تحاشہ کھلونے لاکر دیتے ہیں تو دینے دو۔ اصل میں اختر یہ سب باتیں اس لیے کرتے ہیں کہ اس طور وہ اپنے بچپن کی محرومیوں کو پُر کرتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر اَن سُنی اور اَن دیکھی نہ کروگی تو ایک وقت آئے گا کہ بہت پچھتاؤ گی۔"

اس کے بعد سے میرا نقطۂ نظر بدل گیا۔ ایسے موقعوں پر نظر انداز نہیں کرتی جیسے ہم کبھی
بے جا ضد بچوں کی اٹھاتی نہ رہے ہوں۔ میں آج اپنی والدہ کی کتنی شکر گزار ہوں کہ
بروقت انہوں نے مجھے باخبر کر دیا۔ یہ میرے چاروں بچے جس طرح میری دلداری اور جیسا
ادب کرتے ہیں۔ اختر کی جدائی کے بعد ہی نہ سکتی تھی۔

اختر نے شاید ان بچوں کی خاطر ان کو بھگ کر کام کرتا ہے اور کسی ایک لائن پر چلتا ہے'
تو وہ ایجوکیشن تھا۔ اس میں کام کرتے ہوئے وہ اپنے لکھنے پڑھنے کو بھی جاری رکھ سکیں
گے۔

امرتسر میں کئی بڑے عزیز دوست ہے جن میں ایک دوست پروفیسر محمد رشید تھے' جو عمر
میں کئی سال ان سے چھوٹے تھے جو بعد میں لاہور گورنمنٹ کالج کے پرنسپل اور پھر پنجاب
کے ایجوکیشن سیکرٹری ہوئے۔ ان پر اختر کی شخصیت کا وہی اثر تھا جیسا اختر پر [illegible]
کا ہوا تھا۔

یہاں کے قیام کے دوران شفیع بھائی اور بھابی شفیع کی ذات نے ہم دونوں پر ایسا اثر کیا
کہ ہر خون کے رشتوں سے بڑھ کر رہا۔ اس بات کو پچاس سال گزر گئے وہ تعلق جوں کا
توں برقرار ہے۔ اب شفیع بھائی کے انتقال کو بیس برس ہو چکے ہیں۔ بھابی شفیع اور ان کے
سب بچوں اور ان کے بھی بچوں کے لیے میں پھوپی اور دادی ہوں۔ ہمارے شفیع بھائی
میں دنیا کی ہر خوبی موجود تھی مگر ایک معاملے میں وہ بالکل ہی دیہاتی رہے۔ لڑکوں کی
شادیاں سترہ اور اٹھارہ سال کی عمر میں کر دیں اور لڑکیوں کی چودہ سال کی عمر میں۔ اختر کہا
کیے ان سے اس بات پر بگڑ بگڑ جاتے کہ آپ پڑھے لکھے روشن خیال ہو کر کیوں کر ایسا ظلم
بچوں پر روا رکھتے ہیں۔ بس اس معاملے میں ہم دونوں کی ایک نہ سنی۔ پاکستان بننے کے
بعد تو ان دونوں کا اور ہمارا ساتھ جیسے ہر وقت کا رہا ہو۔ ہاں جب باہر کے ملکوں میں ہوتے
تب اور بات ہوتی۔

اختر کو کوہ پیمائی کا شوق دیوانگی کی حد تک تھا۔ دہلی سے ایک بار چترال کے لیے روانہ
ہو گئے۔ شوکت بھائی کو پکڑ لیا تھا۔ وہاں سے "کافرستان" تب تک وہاں آمد و رفت کے
کوئی ذرائع نہ تھے۔ پیدل سفر کر کے وہاں پہنچے تو یوں ان کو لگا کہ کوہ قاف آ گئے ہیں۔ اختر
کا ایک افسانہ "کافرستان کی شہزادی" آپ پڑھیں تو لگے گا خود اس حسین علاقے کو دیکھ

رہے ہیں۔ میں ان کے بعد واپسی پر وہ بے حد خوش' مگن اور تر و تازہ تھے۔ مجھ سے کہا
کہ کاش تم بھی ہوتیں کہ آپ کی آنکھیں ساتھ لے جا سکتا۔ اکیلے وہ مناظرِ حسن کی فراوانی
بغیر آپ کو ساتھ دیکھے کر پوری طرح لطف اندوز نہ ہو سکا۔ میں اس بات پر خوشی سے پھول
اٹھی کہ چلو یوں میں ان کے ساتھ ہی تو تھی۔

امرتسر کے قیام میں گرمیوں کی چھٹیوں کے دوران والد صاحب سری نگر میں ڈل لیک
میں ایک ہاؤس بوٹ تین ماہ کے لیے کرائے پر لے لیتے۔ ہم سب وہاں چلے جاتے۔ اختر
میرے بھائی شوکت عمر اور زاہد عمر کو ساتھ لے کر سولہ ہزار فٹ تک بلند و بالا پہاڑوں پر
کوہ پیمائی پر نکل جاتے۔ جب بیس پچیس روز بعد واپس آتے تو ناک اور کانوں کی جلد
دھوپ سے غائب' داڑھیاں بڑھی ہوئی' کئی کئی روز تھکن سے پست' بالکل چت پڑ
جاتے۔ ایک بار پروفیسر رشید اور عزیز عمر کا ساتھ رہا۔ اختر کتابوں سے پڑھ کر وہ بیانات
دیتے کہ راضی ہو جاتے۔ کیسے کیسے جان لیوا مقامات پر گئے۔ قدرت نے جانیں بچائیں۔
ہم سب کے دل دہلے رہتے تاوقتیکہ بخیریت واپس نہ آ جاتے۔

ہم سب بھی اپنے طریقے سے کشمیر کی سیریں یوں کرتے کہ ہاؤس بوٹ ڈل لیک سے
نکل کر دریا میں کبھی چند دن یہاں اور کبھی وہاں کھڑا کروا لیتے۔ کشمیر کا چپہ چپہ حسین ہے۔
مجھے تو دریا کے اندر دس دس فٹ چوڑے بیس فٹ لمبے کھیت' جن کو دریا میں اگے ہوئے
گھاس پھوس جمع کر کے بنا کر کچھ مٹی اوپر بکھیر کر کھیت بنا کر اس پر سبزیاں لگائی جاتیں۔ یہ
ننھے ننھے کھیت رسیوں میں کھونٹے ٹھوک کر باندھ دیے جاتے۔ جب کسان کا دل کرتا اپنی
کشتی سے ان رسیوں کو باندھ کر کسی اور مقام پر لے جا کر باندھ لیتا۔ ان پر اگی ہوئی چھوٹی
چھوٹی تازہ سبزیوں کے مزے کا میں بیان دے نہیں سکتی۔ سبزیاں تو ہمیشہ میری کمزوری
رہیں۔ ہاؤس بوٹ کی چھوٹی کشتی پر جا کر دن میں کئی کئی بار خرید لاتی۔ شام تک سبزیوں کا
انبار لگ جاتا۔ اماں اور جمیلہ بھابی ان بے شمار سبزیوں سے تنگ آ جاتیں۔ اکثر اماں کی
ڈانٹیں پڑتیں کہ "اختر کی کمائی کا ڈھیر پیسے کی ہے جس کو بے دردی سے مٹاتی ہو کہ
سبزیاں پھینک دی جائیں مگر تم اپنا شوق پورا کرتی رہو۔"

— ○ —

پاکستان

جولائی ۱۹۴۵ء میں اختر محکمۂ تعلیمات سے وابستہ ہو کر شملہ، جہاں ان کا ہیڈ آفس تھا، چلے گئے۔ جب گھر لے لیا تو میں تینوں لڑکوں کو لے کر پہنچ گئی۔ دہلی سے بیشتر دفاتر گرمیوں میں یہاں آجاتے۔ ملک کی سیاست عروج پر تھی۔ وائسرائے کے ساتھ میٹنگوں میں ملک کے سبھی سیاست دانوں کا آنا جانا ہوتا۔

شملہ ہی میں پہلی بار جناح صاحب اور مِس جناح سے میری ملاقات ہوئی۔ جناح صاحب کی شخصیت سحر انگیز تھی۔ انتہائی دُبلے پتلے، لمبا قد نہ ہونے کے باوجود لمبے لگے۔ ناک نقش کے بجائے شاید ہر انسان نے ان کی آنکھوں کی طرف پہلے دیکھا ہوگا۔ ان میں کچھ ایسی بات تھی کہ اُوپر دیکھ کر دوسرے کی نظریں نیچے کی طرف جھک جاتیں۔ ایسا لگتا کہ آدمی کو اندر سے پڑھ رہے ہوں۔ کسی میٹنگ میں جا رہے تھے، چند منٹ ہی ہم کو دے سکے (میری بہن رشیدہ بھی میرے ساتھ تھیں) ہم سے کہا کہ بہنوں، بیٹیوں اور ماؤں کو پاکستان بنانے کے لیے اصل کام کرنا ہے۔ گھر میں بیٹھ کر اور گھر سے باہر ہر ہر منٹ آپ سب بڑی مستعدی سے کام کرتی رہیں گی تو ہر مسلمان مرد سینہ سپر ہو سکے گا اور یہ بچے ان کو چھوٹا اور نا سمجھ نہ سمجھیں۔ ایک دن ان کو ملک چلانا ہوگا۔ ان کے کانوں میں ابھی سے ایسی باتیں ڈالیں کہ یہ پاکستان کے سپاہی بن سکیں (میرے ساتھ کامران اور سلمان بھی تھے) وہ تو چلے گئے، مس جناح نے بڑے اخلاق کے ساتھ باتیں کیں اور چائے پلوائی۔ ہم آگئے مگر قائد اعظم کی تصویر ہمارے دل و دماغ پر جم سی گئی۔

رات کو اختر کو بتایا کہ آج شام لڑکوں کو ساتھ لے جا کر میں اور رشیدہ جناح صاحب سے مل آئے۔ ان کا بس وہی جملہ کہ "بس جو دل میں آئے وہ کر لیتی ہیں۔ وہ اس قدر مصروف انسان ہیں، بغیر وقت لیے پہنچ گئیں۔ نہ ملتے تو؟" "تو ہم واپس پلٹ آتے۔ ہمارا

کچھ بگڑ تو نہ جاتا۔"

۱۹۴۶ء میں ہم دہلی آئے اور قرول باغ میں ایک گھر عین اجمل پارک کے مقابل لے لیا۔ دس سال کی کوشش کے بعد میں ماموں حبیب الدین بینرجی کو اپنے گھر بلانے میں کامیاب ہو گئی۔ پتہ تو میرے ہاتھ حیدر آباد میں لگ ہی گیا تھا۔ دوسرے تیسرے ماہ ان کو ایک خط خیریت دریافت کرنے کا لکھ دیا کرتی۔ یورپ کی واپسی کے بعد دہلی سے پھر امرتسر اور شملہ سے خط لکھا کہ کبھی آنے کی زحمت گوارا کریں۔ جب میں ایک سال پیرس سے آکر "نیلی چھتری" میں تھی تو پہلا خط مجھے ان کا ملا جس میں بڑے دُکھ سے لکھا "تمہاری شادی کے بعد میں نے اختر کو مبارکباد اور اپنی غلطیوں کا کھلے دل سے اعتراف کیا مگر اختر نے جواب نہ دیا۔ جس سے مجھے لگا کہ وہ کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتے۔ میں بھلا، شاکی ہونے کا حق ہی کیا رکھتا ہوں۔ تمہارے خط کبھی کبھی ملتے رہے۔ مجھے یقین تھا کہ تم اختر کی لاعلمی میں لکھتی ہو۔ ہر بار میں نے جواب ضرور لکھا مگر پھاڑ کر پھینک دیا۔ دل نے گوارا نہ کیا کہ اختر کی ناراضگی کا تم کو سامنا کرنا پڑ جائے۔ تم نے اپنے کسی خط میں شکوہ نہ کیا کہ جواب کیوں نہ دیا۔ اس کا میرے دل پر بڑا اثر ہوتا۔ خوشی بھی بہت ہوتی کہ میرے بھانجے کو بڑی نیک دل لڑکی مل گئی ہے۔ یقیناً" اختر زندگی بھر خوش رہیں گے۔" خط انگریزی میں تھا جس سے یقین سا ہو گیا کہ اردو شُدبُد سے زیادہ نہ ہوگی۔

دن کا وقت تھا اختر دفتر میں تھے۔ گھنٹی بجی، میں نے دروازہ کھولا۔ سامنے ایک انجانا شخص کھڑا ہے، صاف رنگ، کھڑا ناک نقشہ، آنکھیں بڑی بڑی جن سے ذہانت عیاں، بہترین کٹ کا سوٹ پہنے، قد درمیانہ اور جسم بڑا مناسب۔ دیکھتے ہی یہ خیال زن سے دماغ میں گزرا کہ یہ صاحب ورزش وغیرہ بہت کرتے ہوں گے۔ جوتوں پر نظر پڑی بہت اعلیٰ قسم کے جھم جھم پالش کیے ہوئے۔ کوٹ کی جیب میں سے رومال خاص انگریزوں والے انداز سے اوپر کو اُبھرا ہوا۔ ایک ہاتھ میں فیلٹ ہیٹ۔ وہ صاحب کچھ منہ سے نہ بولے بس مجھے دیکھتے رہے۔ سروجنی نائیڈو کا حبیب الدین کا کھینچا ہوا نقشہ میرے سامنے کسی طرح نظروں کے آگیا اور بے ساختہ منہ سے نکلا "ماموں آپ! اللہ کا شکر ہے کہ آپ آئے تو سہی" پھر آداب بعد میں کیا۔ ایک دم ہنس پڑے، میرے سر پر بڑے پیار سے ہاتھ پھیرا، اندر آکر بیٹھ گئے تو پوچھا۔ "تم نے مجھے آخر پہچانا کیسے؟" "ایسے کہ سروجنی نائیڈو نے آپ کا جو نقشہ

کھینچ کر مجھے بتایا تھا اور انہوں نے اختر کی والدہ کی ایک ننھی سی تصویر مجھے دکھائی تھی اور کہا کہ میں ایک پینٹر سے اس کو بڑا کروا کر دوں گی۔ آپ کی آنکھیں بالکل آپ کی بہن سے ملتی ہیں۔ میں وہ تصویر ابھی آپ کو لا کر دکھاتی ہوں۔

میں نے اندر سے لا کر وہ پینٹنگ جب ان کو دکھائی تو جھک کر اس کو پیار کر لیا۔ ان کی آنکھیں ڈبڈبا سی گئیں تو ایک منٹ کو آنکھیں بند کر لیں۔ خاصی دیر خاموش پینٹنگ کو دیکھتے رہے، پھر اٹھے اور سامنے والی کرسی پر کھڑی کر کے بولے "سروجنی جی نے اپنی زندگی میں سب سے اچھا کام یہی کیا کہ ممتاز النساء کی تصویر تم تک پہنچا دی۔"

کامران تو اسکول گیا ہوا تھا۔ سلمان اور عرفان کو گود میں اٹھا اٹھا کر پیار کرتے جاتے اور باتیں کرتے رہے۔ سلمان کو دیکھ کر بار بار کہا کہ بھائی صاحب (اختر کے والد) اور ھیم سے بہت ملتا ہے۔ میں گھوم پھر کر ان سے اختر کی والدہ کے متعلق باتیں کرنے لگتی تو اداسی سے کہتے کہ میرا اور ان کا ساتھ ہی کتنا رہا۔ میں کلکتہ میں پریم بڑا ماما جی کے پاس، ممتاز ناگپور اور پھر رائے پور میں والدہ کے پاس۔ سال میں ایک بار غیروں کی طرح ملاقات ہوتی۔ کلکتہ کے بعد یہ چھوٹے شہر مجھے بڑے حقیر سے لگتے۔ یہاں کی ہر بات مجھے دقیانوسی لگتی۔ رہن سہن میں زمین آسمان کا فرق محسوس کرتا۔ ممتاز کی شخصیت اور ان کی ساری ہی باتیں، مجھے لگتا کہ جیسے یہ مجھ سے بہت بڑی ہیں، باوقار بڑی بی لیے دیے۔ دل میں سوچتا کہ ایک چھوٹی سی لڑکی کو بڑی بی بنا دیا ہے۔ جب کلکتہ سے فرار ہو کر بمبئی آ گیا تو عیش و طرب میں مبتلا ہوا کہ کسی سے کوئی واسطہ ہی نہ رکھا بس اللہ کو پیاری ہو گئی، مگر یہ دو لڑکے تو تھے۔ بجائے کوئی توجہ اور شفقت دینے کے ان کی حق تلفی کرتا رہا۔

شام کو اختر آئے۔ ہم دونوں کمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ایک منٹ تک دروازے کو پکڑے کھڑے رہے۔ حبیب ماموں کو اختر دیکھتے رہے پھر دونوں ایک دوسرے کی طرف بڑھے اور لپٹ گئے۔ میری آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے۔

"ماموں آپ اتنے دنوں بعد کیوں آئے" وہ ہنس پڑے ان کے دانت بڑے ہی صاف اور خوب صورت نظر آئے۔ میں چائے لانے کے بہانے کھسک آئی۔ کچھ دیر میں دونوں کے قہقہوں کی آوازیں سنائی دیں۔ دو دن ماموں ہمارے ہاں رہے اختر نے دفتر سے ایک دن چھٹی لے لی۔ دونوں دہلی کی سیر دن بھر کر کے آئے۔ جب ماموں واپس ناگپور جانے لگے تو

ہم دونوں اسٹیشن پر ان کو سوار کروانے آئے۔ اختر بار بار ان سے کہتے رہے کہ وہ پھر جلد آئیں اور کم سے کم دو تین ہفتے تو قیام کریں۔ میں اس خیال سے کتنی خوش کہ میری امی سن کر مجھے شاباشی دیں گی۔

۱۹۴۶ء میں ملک کی فضا میں ہر طرف سے طوفان اٹھتا محسوس ہو رہا تھا۔ کلکتہ میں مار دھاڑ شروع ہو چکی تھی جس کے ہر طرف پھیل جانے کا یقین سا تھا۔ یوپی کا اندیشہ تھا۔ رات کے بارہ بجے کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ہم دونوں یوں ابھی تک جاگ رہے تھے کہ خالدہ خانم کا خط آج ہی کی ڈاک سے ملا تھا۔ اختر مجھے سنا رہے تھے۔ اختر نے پوچھا کون ہے؟ آواز آئی "میں اکبر حسین!" اختر نے دروازہ کھولا تو ان کے والد صاحب سامنے کھڑے تھے۔ "میں اپنی ان دیکھی بچی سے ملنے اور تمہارے بچوں کو دیکھنے آخر آ ہی گیا۔" اختر کا سر پہلے جھک گیا، پھر بڑھ کر ان کے سینے سے ایسے لپٹ گئے جیسے کوئی بچہ ماں سے چمٹ جاتا ہو۔ میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ان کے ہاتھ میں صرف ایک اٹیچی کیس اور اخبار تھا۔ اس کو میں نے پکڑ لیا۔ اختر سے مل کر ان کو جو خوشی ان کے چہرے پر تھی اور جو اختر کے چہرے سے عیاں ہو رہی تھی اس کا بیان کرنا مشکل ہے۔ شکر کہ میری دس سال کی کوشش بار آور ہوئی۔ شاید سترہ سال بعد باپ اور بیٹے یکجا ہو گئے۔ بچوں کو صبح دیکھا، نہال نہال ہوتے رہے۔ اختر دفتر چلے گئے۔ سارے دن مجھ سے باتیں کرتے رہے اور باری باری بچوں کو گود میں اٹھا لیتے۔

اختر کے والد کی صحت اچھی نہ تھی۔ کسی قدر ھیم بھائی ان کی ہم شکل تھے، بے حد دبلے پتلے اور کمزور، شام کو اختر کی واپسی کے بعد دونوں کی سیاست پر بات چیت ہوتی۔ اختر کی قابلیت پر جیسے ان کا چہرہ دمک سا جاتا۔ فجر کی نماز پڑھنے جس مسجد میں جاتے وہ کوئی دو میل تھی۔ واپسی پر بہت تھک جاتے۔ ہم دونوں ہزار کہتے کہ قریب والی مسجد میں چلے جایا کریں۔ مگر ان کو تو وہی مسجد زیادہ پسند تھی۔ اخبار کا ایک ایک حرف دن بھر میں پڑھ ڈالتے۔ ایک ہفتے بعد واپس چلے جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ ہم نے ہزار روکا نہ رکے کہ میں صرف دیکھنے کی نیت سے آیا تھا۔ چند کام وہاں کر کے جلد واپس آ جاؤں گا۔ مکان اور زمینوں کے کاغذات لیتا آؤں اور کچھ اس کا انتظام کر آؤں۔" اختر ہنس کر کہتے۔ "چھوڑیے بھی ان سب کو، ہم لوگوں کو زمین اور مکان راس نہیں آتے۔ اس کی

خاطر آپ کیوں جائیں۔" جس کا جواب ہنس کر دیتے کہ۔ "تمہارے لیے نہیں حمیدہ کے لیے اور ان بچوں کے لیے اتنا کم سے کم کروں" کبھی مجھ سے یوں بھی کہا کہ "بیٹی میری غیر ذمے داری کی وجہ سے تمہارے لیے جو اختر کی والدہ سیروں زیور چھوڑ گئی تھیں سب ہی غارت ہوا۔" میں جب اس کا جواب یہ دیتی کہ "آپ اور والدہ صاحبہ کا اصل دیا ہوا زیور اختر ہیں۔ خدا بس ان کو سلامت رکھے۔" تو وہ یہ سن کر آبدیدہ ہو جاتے۔"

اس وقت تو وہ ایک ہفتے میں واپس تشریف لے گئے، مگر حسب وعدہ مہینہ بھر میں پھر ہمارے پاس دہلی آگئے، ایک مہینے کے اندر ہی وہ بہت کمزور لگے۔ اختر سے بہت ہنس کر کہا۔ "تم ٹھیک ہی کہتے تھے۔ گھر اور زمین راس نہیں آتی۔ میں سب کاغذات ساتھ لے کر چلا۔ بریف کیس کب اور کہاں غائب ہوا، کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اب بعد میں تم پٹنہ جا کر پٹواری اور رجسٹرار سے نقلیں نکلوانے کی زحمت کرنا۔ ہمارے شاعر مظفر کے بس کا نہیں۔ میرے بھی بس کے یہ جھمیلے نہیں اور نہ ان چیزوں کی میری نظر میں کوئی اہمیت۔ خوش ہوئے کہ ہلکے پھلکے ہو گئے۔ یہ سب تو پاؤں کی بیڑی ہو جاتی ہیں۔"

ان کے آتے ہی بہار میں وہ خون خرابہ ہوا کہ خون کے دریا جیسے بہہ گئے ہوں۔ میں دل میں ہزار شکر کرتی کہ والد صاحب ہمارے پاس آچکے ہیں۔

دن میں ان سے میں نے بہت باتیں اختر کی والدہ کے متعلق، اختر کے بچپن اور لڑکپن کے بارے میں کیں۔ وہ میرے ہر سوال کا جواب بڑی مدھم مدھم آواز میں دے دیا کرتے۔ اختر کی والدہ کا ذکر جس انداز سے کرتے اس سے مجھے معلوم ہو گیا کہ ان کی شخصیت کچھ ایسی ہی بلند و بالا تھی کہ والد صاحب اپنے کو ان کے مقابلے میں کمتر محسوس کرتے۔ ان کی جائیداد سے بالکل بے تعلقی رکھی۔ جب اختر کی والدہ نے بیشتر جائیداد اپنے بھائی کے نام کر دی تو کچھ نہ کہا کہ ان کی چیز تھی جسے چاہے دے دیں۔ ان کی قابلیت سے بے حد مرعوب تھے۔ ان کی سوجھ بوجھ کی بے حد تعریف کرتے۔"

اختر کے بچپن کے بارے میں کہا کہ "مجھے تو اختر کبھی بچہ لگا ہی نہیں کہ شروع ہی سے اپنی عمر سے بہت بڑے لڑکوں کی سی باتیں کرتا۔ جس بات پر اڑ جاتا بس اڑا ہی رہتا۔ اس انداز سے قائل کرتا، کج بحثی کرتا کہ دوسرا زچ ہو جاتا۔ اسکول سے آتے ہی کتابوں میں جٹ جاتا۔ ہر ہر جگہ سے کتابیں حاصل کر لاتا۔ کورس کی کتاب کو ہاتھ نہ لگاتا اور دوسری

کتابیں پڑھتا اور اکثر کوئیں کی جگت پر پاؤں پسار کر بیٹھ جاتا۔ ادھر اُدھر چند دوست محلے کے لڑکے آس پاس جما کر بیٹھ جاتے اور یہ ہندی کی کتاب میں سے ان کو پڑھ کر سناتا۔ سورج غروب کا وقت ہونے لگتا تو بڑی بی ان کو کھینچ کر گھر لے آتیں۔

چھوٹی سی عمر میں بے حد نڈر اور بے دھڑک بحث کرتا اور اس انداز سے کہ جیسے اس کو سب کچھ معلوم ہے۔ کھانے میں بڑے مشکل پسند۔ بڑی بی اختر ہی کو زیادہ چاہتی تھیں۔ جو وہ کہتے وہی پکاتیں اور ان کی مرضی پوری کرتیں۔ اس پر اکثر مظفر کو غصہ آجاتا اور اختر کی ٹھکائی بھی کرتے۔ ایک بات مجھ کو اختر کی بہت عجب لگتی کہ جب کبھی مظفر مارتے تو تن کر مٹھیاں بھینچ کر خاموش کھڑے ہو کر ان کو گھور کر بس دیکھتے رہتے۔ کبھی کبھی یہ بھی کہہ اٹھتے کہ اور ماریں اور ماریں۔ میرے تو چوٹ ہی نہیں لگتی۔ بڑی بی شیرنی کی طرح مظفر پر جھپٹ پڑتیں اور اختر بڑے اطمینان سے مڑ کر چل دیتے اور کوئی کتاب اٹھا کر پلنگ پر لیٹ کر پڑھنے لگتے۔ کبھی کبھی میں سوچتا کہ آخر یہ پٹ کر بھی روتا کیوں نہیں۔ پلٹ کر مارتا کیوں نہیں۔ بھاگ کیوں نہیں جاتا۔ اس کو مار کا کوئی اثر کیوں محسوس نہیں ہوتا؟

جب کبھی بڑی بی کو والد صاحب نے ٹوکا کہ وہ اختر کی بیشتر بے جا طرف داری کرتی ہیں اور ان کی جا اور بے جا بات مان لیتی ہیں، اس طرح لڑکا بگڑ جائے گا۔ دو کوڑی کا بھی نہ رہے گا تو ان کو یہ جواب ملتا کہ "اگر لوگوں کی کوئی فکر ہوتی تو دوسرا بیاہ نہ رچاتے۔ اب یہ صرف ان کے لڑکے ہیں کسی کو کہنے کا کوئی حق نہیں۔"

جب میں نے کہا کہ آپ کبھی ان کو کچھ کہتے کیوں نہ تھے۔ ہنسنے لگے بولے "تم کیا جانو کہ بڑی بی ان دونوں سے کس قدر محبت کرتی تھیں اور اس قدر جفادری شے تھیں کہ اگر یہ کبھی کہہ دیتا تو وہ مجھے گھر میں کبھی گھسنے بھی نہ دیتیں کہ یہ گھر بچوں کی ماں کا ہے۔ یہاں صرف حکم بچوں کا ہی چل سکتا ہے۔

اختر کے والد حد درجہ شریف اور نیک انسان تھے۔ پٹنہ میں مکان اور زمین میں سب ہی کو مختار کے ذمے کر آئے تھے۔ ان کو خود کوئی دلچسپی نہ تھی۔ بچوں سے بڑے ہی پیار کے ساتھ باتیں کرتے۔ اس بات پر ان کو غم تھا کہ دونوں لڑکوں پر توجہ اس قدر کم دی۔ ان کی والدہ کی امانت لاکھوں روپے کے زیور کا بکس حفاظت کے لیے سوتیلی ماں کے بھائی

کے گھر رکھوا دیا جہاں سے وہ چوری ہو گیا۔ جو رقم دو رہیں اور منتظم بیوی نے بچوں کی باہر
کی تعلیم کے لیے بینک میں جمع کرا دی تھی وہ بزنس میں لگا کر سب ڈبو دی۔ ایک عجیب سی
ہنسی ہنسے جیسے کہ خود اپنے پر طنز کر رہے ہوں۔ تم کو معلوم کہ میں نے بزنس کی تو کس قسم
کی تھی۔ کچھ لوگوں کے مشورے پر سیمل کی روئی کے جنگلات ٹھیکے پر لے لیے۔ یہ کچھ
بھی نہ سوچا کہ یہاں سے ریلوے اسٹیشن ساٹھ میل دور اور جنگلات میں کوئی سڑک نہ
تھی کہ آخر وقت پر اس روئی کو اتنے اونچے پیڑوں پر سے توڑنے والے کہاں سے آئیں
گے۔ ریلوے اسٹیشن تک کس ذریعے سے اور کیوں کر پہنچایا جائے گا' جب موسم پر روئی
اتارنے کا وقت آیا تو میں حیران و پریشان سا چند دوستوں کے ساتھ ان جنگلات میں گیا۔
کچھ مقامی لوگ جمع کیے۔ ان مٹھی بھر آدمیوں کے بس کا تو نہ تھا مگر وہ تیار ضرور تھے' مجھ
سے بوریاں روئی رکھنے کو مانگیں۔ وہ میرے ذہن کے کسی کونے میں نہ آیا تھا۔ چند دن
سوچ بچار کرتا رہا۔ پھر کیا تماشہ ہوا جدھر گردن موڑتا اُدھر سفید روئی کے گالے اُڑ رہے
ہیں۔ آٹھ دن میں ہزاروں پیڑوں سے سفید براق روئی کے گالے اُڑتے' فضا میں بکھرتے
رہے اس طرح سب روپیہ اُڑن چھو ہو گیا۔ ہمارے خون میں تجارت کرنے کی کوئی
صلاحیت نہیں۔ تم کبھی کسی بھی لڑکے کو ادھر کا رخ نہ کرنے دینا۔"

ان کا مزاج نہ بزنس کا تھا نہ دنیا داری کا۔ نفسی شرافت قدرت نے کُوٹ کُوٹ کر ان
میں بھری تھی۔ منتظم قطعی نہ تھے۔ انگریزی دوا کے سخت خلاف تھے ہاں حکیم کی دوا پینے
پر راضی ہو گئے۔ کھانسی بے حد رہتی۔ بھوک بالکل نہ لگتی۔ جب میں خود ان کے لیے کچھ
پکاتی تو بہت خوش ہوتے مگر کھاتے بہت کم۔ کمرے میں ان کو گھٹن محسوس ہوتی۔
برآمدے میں لیٹتے۔ سیاست سے بڑی دلچسپی تھی۔ اخبار کا ایک ایک حرف پڑھ ڈالتے اختر
سے زیادہ مجھ سے محبت اور شفقت کا اظہار کرتے۔ بچے جو بھی کہیں وہ ان کو کرنے دو۔
اس کی برابر خواہش کرتے۔

۱۹۴۶ء دہلی میں بھی ادھر اُدھر مار دھاڑ شروع ہو گئی تھی۔ بار بار کہتے کہ میں لڑکوں کو
لے کر علی گڑھ چلی جاؤں" بھلا میں آپ کو اور اختر کو کیسے چھوڑ کر چلی جاؤں۔ کوئی ہندو
ہمارے گھر پر حملہ کیوں کرے گا۔ جس کا جواب ان کے پاس یہ ہوتا۔ مذہبی جنون میں
آدمی جانوروں سے بدتر ہو جاتا ہے۔"

اختر کو مولانا آزاد کے ساتھ شملہ جانا پڑا۔ بیٹے کی واپسی کا شدت سے انتظار رہتا۔
واپسی پر بہت خوش ہوئے۔ ستمبر کے آخر میں مجھے علی گڑھ جانا ہی پڑا۔ اس بیٹے کا نام میں
نے عدنان بے کے نام پر عدنان رکھا' مگر اختر نے نوید کر دیا کہ وہ "من" کے قافیے سے
تنگ آ گئے۔ اب تو بس خاص دان اور پان دان باقی رہ گئے ہیں۔ جنوری ۱۹۴۷ء میں
واپس دہلی آئی تو بے حد خوش ہوئے۔ اب گھر' گھر لگنے لگا۔ نوید کو پاس پلنگ پر لٹا لیتے۔
بڑے غور سے اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں اور پیروں کو اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر اور
جھک کر دیکھا کرتے۔ ایک بار کہا کہ یہ ضرور انجینئر بنے گا۔ مگر تعمیرات کا نہیں' نقشہ
ڈیزائن کرنے کا اور ساتھ ہی ستار کا شوق ہوگا۔ میں نے پوچھا آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا؟
بولے اس کی انگلیاں بتا رہی ہیں اور یہ سچ بھی نکلا کہ نوید صرف ایک اچھے آرکیٹکٹ ہی
نہیں بلکہ بے حد عمدہ ستار بھی بجاتے ہیں۔ ہفتے میں دو بار استاد اور طبلہ نواز ہمارے گھر
آتے ہیں اور یہ ان کے ساتھ بجاتے ہیں۔ گو ماشاء اللہ ان کو اب استاد کی ضرورت تو
نہیں۔ مگر وضع داری میں بھلا استاد فدا خاں سے یہ بات کیسے کہی جائے۔ اختر کو اتوار اور
بدھ کی شام کا انتظار رہتا۔ پہلے سے آ کر کمرے میں اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ جاتے۔ بیٹے کو
اس قدر اچھا ستار بجاتے ہوئے سن کر شاد ہوتے۔ چہرہ دمک جاتا۔

فروری ۱۹۴۷ء میں اختر کی تقرری امریکہ میں ہوئی' مارچ میں روانہ ہونا تھا' مگر روک
دی گئی۔ قرول باغ میں خاصی گڑبڑ مچ گئی۔ راتوں کو گولیاں چلنے کی آوازیں آتی رہتیں۔
مجھے یہ کہہ کر کہ "میرا پہلا اور آخری حکم ہے کہ آپ بچوں کو لے کر علی گڑھ چلی جائیں۔
آخر میں ہوں نا' یہاں اختر کے پاس" میں مجبوراً" چلی گئی۔ اختر کے والد صاحب دو ماہ بعد
چند ہی روز بیمار رہ کر بڑے سکون کے ساتھ اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ یوں اختر کا
بچپن ان کے ساتھ دفن ہو گیا۔

جمیل بھائی! اختر نے اپنے والد کے انتقال کی خبر مجھے خط کے ذریعے دی۔ وہ خط میرے
پاس کہیں موجود ضرور ہے۔ مل جائے گا تو آپ کو پڑھنے کو بھیجوں گی۔ آپ کی مرضی ہو تو
"ہم سفر" میں شامل کر دیجیے گا۔ اختر کے ہزار منع کرنے اور والدین کی ناراضگی کے باوجود
میں علی گڑھ میں رک نہ سکی تھی کہ اختر کو اس صدمۂ عظیم کو اٹھانے کے لیے اکیلا کیسے
چھوڑ دوں' میں دہلی آ گئی۔ راتوں کو ہر طرف سے گولیاں چلنے کی آوازیں آیا کرتیں۔ دن

میں ایک ہو کا سا عالم رہتا۔ قرول باغ کی مار دھاڑ سب سے زیادہ تھی اور افراتفری کا زور
زورا بڑھتا ہی جاتا تھا۔ اختر اب روز صبح دفتر جاتے وقت لڑکوں اور مجھ پر ایسے نظر جما کر
ڈالتے جیسے خدا حافظ کہہ رہے ہوں۔
جون ۱۹۴۷ء میں پاکستان بننے کا اعلان ہو گیا۔ افراتفری اور مار دھاڑ نے اور شدت
پکڑلی۔ اختر نے آپشن بڑے حیص بیص کے بعد دیا۔ ان کو تعلیمی محکمے کا انچارج بنانے کا
فیصلہ کیا گیا کیونکہ یہی سب سے سینئر تھے۔ چند ہی دن بعد چودھری محمد علی نے اپنے خالو
خلیفہ اسد اللہ صاحب کو جو ساری عمر کلکتہ لائبریری کے لائبریرین رہ چکے تھے ان کو یہ
عہدہ عطا فرما دیا۔ اختر کو بڑا ملال ہوا مگر منہ سے کچھ نہ کہا۔ میں سوچتی کہ آخر لوگ ان
کے ساتھ ناانصافیاں اور حق تلفیاں کیوں کرتے ہیں۔ کیا ایک نئے ملک کی بنیاد کی پہلی
اینٹ آڑی ترچھی رکھنا ستم نہیں۔ تعلیم جیسی سب سے ضروری چیز کو ان جانے ہاتھ میں
تھمادینا کہاں کی عقلمندی ہے۔ پاکستان پر اپنے ہی آدمی نے ضرب لگادی۔ اللہ خیر کرے۔
۱۵ اگست کو ہم ایک اسپیشل "ٹرین" سے پاکستان کے لیے روانہ ہوئے۔ ریاست پٹیالہ
کے علاقے سے جب ہماری ٹرین گزری اور ..... اسٹیشن سے آگے آئی تو بم سے اڑا دی
گئی۔ انجن ٹرین سے کٹ کر آگے نکل گیا۔ کئی ڈبے الٹ گئے گھپ اندھیری رات تھی۔
دو طرفہ گولیوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ اختر نیچے کی سیٹ پر اٹھ کر بیٹھ گئے۔ میں ہزار
کہوں کہ خدارا نیچے فرش پر بیٹھ جائیں۔ شیشہ توڑ کر خدانہ کرے کوئی گولی نہ لگ جائے"
مگر ایک نہ سنی باہر کی طرف دیکھا کیے۔ میں نے جلدی جلدی ململ کا دوپٹہ پھاڑ کر پٹیاں
لپیٹنا شروع کیں۔ نکال کر ڈیٹال کی بوتل نکالی" روئی اور قینچی سب تولیے کے ایک بچکی
میں الگ باندھ کر رکھ لیں کہ خدانہ کرے جب کوئی زخمی ہو جائے تو فوری یہ سب یک جا
مل سکیں۔ لڑکے گھبرا کر پوچھیں اب کیا ہو گا۔ میں نے کہا شاید دشمن ڈبے میں گھس کر
حملہ کریں۔ لو یہ چاقو ہاتھ میں رکھو۔ ایک قینچی دے دی کہ جب تم پر حملہ کرے تو تم بھی
کرنا۔ مسلمان کبھی ڈرا نہیں کرتے۔ ریل رکی کھڑی۔ گھپ اندھیرا۔ ہر طرف سے گولیوں
کی آوازیں! آدھے گھنٹے بعد گولیوں کی آوازیں کم ہونا شروع ہو گئیں۔
تھوڑی دیر بعد ہمارے دروازے کو کسی نے زور زور سے کھٹکھٹایا کہ ڈاکٹر صاحب
جلدی اتریں زخمیوں کی مرہم پٹی وغیرہ کے لیے۔ میں نے جھنجھلا کر کہا کہ اختر صاحب

میڈیسن کے ڈاکٹر نہیں مگر میں نرس ہوں آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔ وہ روئی، پٹیاں اور
ڈیٹال اٹھا پیچھے اترنے لگی تو اختر نے کہا "یہ کیا حرکت ہے۔ آپ کہاں کی نرس ہیں گھر میں
ان سنا کر کے اتر ہی گئی۔ ابراہیم بھولی بھر بھر لے ڈبے میں آ گیا تھا (یہ اختر کا چپراسی تھا۔
اس کو میری والدہ نے پالا تھا۔ ہمارا وہ خانساماں جس کو مولوی صاحب نے کڑک مرغی کا
لقب عطا کیا تھا یہ اسی کا لڑکا تھا۔ ابراہیم مع دو عدد بھائیوں کے اس طور "ٹیلی پھوری" کے
بورڈنگ ہاؤس میں آ گیا تھا کہ ایک روز کسی نے دروازے پر آ کر کہا "بیگم صاحبہ آپ کے
گھر بہت سے لڑکے لڑکیاں رہتے ہیں۔ ان کو بھی آپ رکھ لیں۔" جب والدہ نے پوچھا
کہ "کیا ان کی ماں مر گئی۔" "تو بہت شرما کر کہا "جی نہیں، ایک تیلی کے ساتھ تشریف لے
گئی" پھر چھ ماہ بعد وہ سرے دو لڑکوں کو بھی پہنچا گئے! ۱۹۴۳ء میں اختر نے ابراہیم کو اپنا
چپراسی لگا لیا۔ یوں وہ جب سے ہمارے پاس تھا۔ ۱۹۵۸ء میں پاکستان میں جب یونیسکو کا
ریجنل آفس کھولنے پیرس سے کراچی آگئے تو گورنمنٹ سے ابراہیم کی سروس کو یونیسکو
میں کروالیا۔ اختر کو ابراہیم سے ایسی پر خلوص محبت ہوئی کہ آخر دم تک وہ اس کے کیے
ہوئے ذاتی کام سے مطمئن ہوتے۔ اس کی ٹریننگ انھوں نے ایسی کی کہ آپ اس کو کسی
بھی کام سے "کسی بھی دفتر میں بھیج دیں" وہ اس کام کو کروا ہی کر آئے گا۔ جب بھی ابراہیم
اپنے گھر پر دعوت کر کے بلاتا کبھی خوشی خوشی جاتے۔ اس کے ہر لڑکے اور لڑکیوں کی
شادی پر ہمیشہ خوشی خوشی گئے۔ کسی سکریٹری یا منسٹر کے ہاں جانے سے کتراتے۔ آنکھوں
کی بینائی ختم ہو جانے کے بعد تو جمیل بھائی صرف آپ کے ہاں اور میری بھانجی مسعود مہر
کے اور ایک دوست جی۔ ایم ملک کے ہاں بیٹھک خوشی سے چلے جاتے۔
جب دو گھنٹے بعد میں کمپارٹمنٹ میں واپس آئی تو کہا "بندی خدا کبھی سوچ سمجھ کر کچھ
کہیں اور کریں۔ اللہ حافظ ہے ان زخمیوں کا جن پر آپ ہاتھ صاف کر کے آئی ہیں۔"
صبح ایک ٹرین بہاول پور سے آئی اور ہم اس میں منتقل ہو کر روانہ ہوئے۔ ..... پر
جو لوگ شہید ہوئے تھے۔ ان کو دفن کیا گیا۔ نماز جنازہ اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر پڑھی
گئی۔ لوگوں کے جذبات اور عقیدت کی تعداد کا کیا حال بتاؤں کراچی تک جو بھی اسٹیشن
آیا۔ بڑا یا انسان جس پیار اور جذبے سے آئے اور جس کو جو بھی کھانے پینے کی چیز میسر
تھی جو ڈبہ ان سے بھر گیا۔ گڑ کی بھیلیاں، نان، باجرے کی روٹیاں، لسی کے مٹکے، بھنے،

امرود، سبزیاں اور تلے ہوئے پکوان اور گنے۔ پکی ہوئی سبزیوں کی ہانڈیاں، دہی اور اُبلے ہوئے انڈے۔ میری تو آنکھیں آنسوؤں سے لب لبا جاتیں۔ رات کے گیارہ بجے کراچی پہنچے۔ اسٹیشن پر اندر اور باہر ایسا جم غفیر تھا کہ ٹرین کو ایک دُور کے شیڈ میں روک دیا۔ صبح پلیٹ فارم پر آکر لگی۔ کیا اچھا انتظام تھا، ہر افسر کو گھر کا پتہ نمبر اور چابی، راشن کارڈ، کوئلے کا راشن کارڈ دیا گیا۔

اس باقاعدگی پر دل خوش ہوا۔ میرے ایک بھائی امرتسر سے کئی روز ہوئے کراچی آئے ہوئے تھے۔ وہ موجود ملے ہم کو نیپئر بیرک ۹ نمبر الاٹ ہوا تھا۔ یہ قطار در قطار دس دس کمروں کے گھروں کی بیسیوں بیرکیں تھیں جو جنگِ عظیم کے دَوران انگریزوں نے اپنی گورا پلٹن کے افسروں کے لیے بنوائی تھیں۔ آمنے سامنے دس دس کی قطار اور بیچ میں بہت بڑا میدان سلسلہ در سلسلہ جا رہا تھا۔ اب تو ان کا وجود بھی نہ رہ گیا۔ ہم کو ۹ نمبر گھر الاٹ ہوا تھا۔ دس نمبر چونکہ کونے کا تھا بڑا اس طور سے تھا کہ سامنے کا جعفری دار برآمدہ اُلٹے ہاتھ کو گھوم گیا تھا اس کے سامنے ایک سلامی لیے ہوئے ریمپ برآمدے سے ملا ہوا بنا تھا۔ بڑا سا دروازہ کھول کر موٹر اندر لاکر اس موڑے ہوئے برآمدے میں کھڑی کی جاسکے۔ سامنے اس کے ایک کمرے کی دیوار، اچھا بڑا کمرہ اور ساتھ میں ایک غسل خانہ یوں دس نمبر نو نمبر سے زیادہ بڑا اور ہوادار تھا کچھ بلب اس میں لگے رہ گئے تھے۔ رات ہوئی تو وہ جل رہے تھے۔ خلیل نے گھوم پھر کر دیکھا اور دل میں ٹھان لی کہ کل جیسے اختر بھائی دفتر جائیں گے تو فوراً" نو نمبر کو خالی کر کے کونے والے دس نمبر میں اُٹھ آئیں گے۔ جیسے ہی اختر دفتر گئے تو ہم دونوں بہن بھائی نے ابراہیم اور باورچی کے ساتھ مل کر دس نمبر میں اپنا سامان جمالیا۔ اس میں تالا اتفاق سے بس لٹک رہا تھا۔

شام کو جب اختر آئے تو سخت ناراض کہ ہم دونوں نے کیا حرکت کی۔ خلیل عمر تو اختر کے سامنے نہ پڑے۔ میری کچھ سمجھ میں نہ آیا منہ سے یہ جانے کیسے نکلا کہ "بات یہ ہے نو نمبر میرے لیے بہت منحوس ہے۔ کئی بار زندگی میں اس کا تجربہ ہو چکا ہے۔ میں حشر تک نو نمبر میں نہ رہوں گی۔" "میں یہ بے قاعدگی ہرگز برداشت نہ کروں گا۔ جانے دس نمبر کس کو الاٹ ہوا ہے۔ جب بھی وہ صاحب مکان کا قبضہ لینے آئیں گے۔ میں آپ کو بتائے دیتا ہوں کہ ان صاحب سے کہہ دوں گا کہ آپ دس نمبر سے سامان نکال کر باہر پھینک

دیں۔" اور واقعی ہوا بھی یہی۔ ایک داڑھی والے مصطفےٰ صاحب دوسرے دن صبح جب اختر، دفتر جانے کے لیے نکل رہے تھے، تشریف لے آئے اور دس نمبر کے گھر کے دعوے دار ہوئے۔ اختر نے ان سے صاف کہہ دیا "آپ بالکل صحیح بات کہہ رہے ہیں۔ یہ حرکت میری بیگم صاحبہ نے کی ہے۔ آپ کو میری اجازت ہے بخوشی سامان باہر کروا کر اپنا گھر لے لیں۔" یہ کہہ کر خود تو چل دیے، اب وہ صاحب میرے سر ہوگئے۔ میں مصطفےٰ صاحب سے یہی کہے جاؤں کہ نو نمبر میرے لیے منحوس ہے آپ کی فیملی بھی چھوٹی ہے۔ آپ دو میاں بیوی ہی تو ہیں۔ کیا فرق پڑتا ہے نو نمبر کو لے لیں، مگر ان کو جیسے ضد سی آگئی۔ بات آگے جا پہنچی۔ اختر کو گورا قبرستان کے ساتھ لگی ایک کوٹھی جس کا باغ بہت بڑا اور گنجائش بہت زیادہ تھی دی گئی تو انھوں نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ قبرستان کی چوکیداری کرنے سے رہا۔ جب مصطفےٰ صاحب سے کہا گیا تو وہ خوش ہوگئے میری اس حرکت پر اختر مجھ سے واقعی بڑے ناراض رہے۔

دفتر جو ملا تھا وہ چند کمروں پر مشتمل بالکل ڈھنڈھار تھا۔ ایجوکیشنل ڈپارٹمنٹ کا کوئی فائل نہ آیا کہ وہ سب دہلی سے آتے میں کسی جگہ نذرِ آتش کردیا گیا تھا۔ ایک ٹوٹی میز، چند ٹوٹی کرسیاں اور ایک الماری، بس یہ ہماری وزارت تعلیم تھی۔ گھر سے چار کرسیاں اور ایک میز چلی گئی۔ اسی طرح دوسرے افسران سے کہہ کر ان کے گھروں سے بھی میزیں کرسیاں منگوالیں۔ فائل اور کاغذ بازار سے خود پہلے خرید لائے اور پھر سب کو ترغیب دی کہ آپ سب بھی یونہی کریں۔ ببول کے کانٹوں سے پنوں کا کام لیا گیا۔ سمندر کے کنارے سے گول مٹول پتھر چن چن کر ان سے پیپر ویٹ کا کام لیا گیا۔ پھر کام بڑی پھرتی اور تیزی سے شروع کردیا اور سب افسران کو لگا لیا۔

مختلف بلڈنگوں کو اسکولوں اور کالجوں کے لیے الاٹمنٹ کرا کر ٹھیک ٹھاک کروانے کے لیے پی ڈبلیو ڈی کو صرف پندرہ دن کی مہلت کا نوٹس بھی جاری کردیا اور یہ کہ اگر اس مدت میں کام تکمیل کو نہ پہنچا تو کسی ایک بھی پی ڈبلیو ڈی کے محکمے والوں کے لڑکے "لڑکیوں کو داخلہ کسی بھی کالج یا اسکول میں نہیں دیا جائے گا۔ دن اور رات ان بلڈنگوں پر کام کرنے پر وہ مجبوریوں تھے کہ اختر راتوں کو بھی جگہ جگہ چکر لگاتے کہ ہر صورت میں پانچ ستمبر ۱۹۴۷ء کو داخلہ شروع ہو کر دس تاریخ کو پڑھائی شروع ہو جائے۔ کس عزم اور

ولولے سے ہر شخص ملک کی تعمیر میں تن من سے لگ گیا تھا۔ ہائے اب کس بے دردی سے وطن کی بربادی پر سب ڈٹ گئے ہیں۔

میں نے نیشنل گارڈ میں شامل ہو کر ٹریننگ لینا شروع کر دی۔ لٹے پٹے قافلے ہندوستان سے بہتے سمندر کی طرح آرہے تھے۔ کیمپوں میں جاکر کام بھی کرتی۔ یہ ایک ایسا موقع تھا کہ اختر نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ چھ ماہ بعد میں نے گھر کے برآمدے میں ایک چھوٹے بچوں کا اسکول کھول لیا۔ اس پر اختر کو سخت اعتراض یوں تھا کہ وہ محکمۂ تعلیم میں ہیں۔ لوگوں کو اعتراض ہو گا کہ بیوی سے اسکول کھلوا دیا ہے۔ صرف چوبیس بچے ہی اس ننھے منے اسکول میں سما سکتے تھے۔ اختر کی روز روز کی بڑبڑ سے تنگ آکر میں ہاشم رضا صاحب کے پاس گئی۔ وہ اس وقت کراچی کے چیف کمشنر لگے ہوئے تھے۔ ان کے خاندان سے ہمارے خاندانی تعلقات تھے۔ میں نے جاکر جب ان کو بتایا کہ ایک چھوٹے بچوں کا اسکول گھر میں کھول لیا ہے۔ اگر وہ کوئی ڈھنگ کی جگہ الاٹ کر دیں تو انشاء اللہ جلد ہی یہ ننھا سا اسکول بڑے اسکول کی شکل اختیار کر لے گا۔ انہوں نے اسی وقت اپنی دراز سے ایک گچھا بڑی بڑی چابیوں کا نکال کر ایک سپاہی کو بلا کر اس کے ہاتھ میں تھما کر کہا۔ "بیگم صاحب کو جمشید روڈ کی کوٹھیاں لے جاکر دکھاؤ' جو یہ اسکول کے لیے مناسب سمجھیں اس کی الاٹمنٹ کر دی جائے۔" صرف یہی نہیں بلکہ اپنی موٹر میں مجھے بھیج بھی دیا۔ بہت سی کوٹھیاں دیکھنے کے بعد مجھے ایک کوٹھی برنٹ روڈ پر جو دو منزلہ کسی وکیل صاحب کی تھی پسند آئی اس میں بڑی بڑی الماریاں کثرت سے تھیں۔ بہت خوب صورت' ہر جگہ سنگ مرمر کے فرش اور کھمبے' جمشید روڈ سامنے سے گزرتی ہوئی۔ کوٹھی کونے والی اور بڑا سا باغ' کچھ گھنے اونچے اونچے پیڑ بھی جن کے نیچے سنگ مرمر کی بیٹھنے کی بینچیں بھی تھیں۔ باغ میں دو فوارے بھی۔ بس مجھے تو یہ کوٹھی جان و دل سے پسند آگئی۔ واپس آکر ہاشم رضا صاحب کو بتایا۔ انہوں نے اسی وقت الاٹمنٹ اور چابی مجھے دیتے ہوئے کہا کہ آج ہی آپ کچھ سامان وہاں رکھوا بھی دیں۔ ابراہیم جب اختر کا کھانا لے جانے کو دفتر سے آیا تو اس سے کہا کہ جھٹ پٹ دفتر سے چھٹی لے کر آجائے۔ پھر سامان کچھ برنٹ روڈ کی کوٹھی میں رکھ آئے۔ شام کا مجھے بے چینی سے انتظار کہ اختر آئیں گے جب ان کو بتاؤں گی تو ضرور خوش ہوں گے کہ ایسی شاندار موقع کی جگہ پر کوٹھی مل گئی اور اب ان کے گھر سے

اسکول کا چکر ختم ہو جائے گا۔ میں ساری ہی عمر اس خوش فہمی میں رہی کہ یوں تو اختر خوش ہوں گے۔ شام کو جب وہ آئے میں نے بڑے خوش ہو کر الاٹمنٹ ہاتھ میں دیا اور چابی دکھا کر کہا کہ وہاں کچھ سامان بھی رکھ دیا ہے۔ اللہ اللہ کیسا چہرہ سرخ پڑا اور کس قدر بگڑ کر کہا کہ کیا ہم پاکستان اس لیے آئے ہیں کہ لوگوں کی جائیداد پر قبضہ کریں۔ الاٹمنٹ کے چار ٹکڑے کر کے پھینک دیے' کنجی دور اچھال دی۔ نہا دھو کر غصے کے مارے گھر سے چلے گئے۔ رات کو بارہ بجے پلٹے جو پہلی بار ایسا کیا۔ میں تو کانپ گئی۔

دوسرے دن دفتر جاتے وقت کہا "آپ ابھی جاکر کنجی اور یہ الاٹمنٹ کے ٹکڑے ہاشم رضا صاحب کو دے کر آئیں میں تو پہلی بار ان سے ڈر گئی۔ جب دفتر جاکر چابی اور الاٹمنٹ کے چاروں ٹکڑے بھی واپس کیے تو ہاشم رضا صاحب ہنسنے لگے کہ "دیکھ لیجیے گا پاکستان کی ہسٹری میں یہ واحد واقعہ رہے گا کہ کسی نے اتنی بڑی جائیداد کی چابی اور الاٹمنٹ واپس کیا ہو۔" میں نے بھی یہ کہا کہ اختر حسین پاکستان کے وہ واحد شخص کہلائے جاسکیں گے جس نے اپنا کوئی کلیم داخل نہ کیا۔ اختر کی شخصیت کے ہر پہلو میں بڑائی اور بے نیازی کی جھلک دیکھ کر مجھے کیسی مسرت ہوتی۔ میں نے اس برنٹ روڈ کی کوٹھی سے وہ چند کرسیاں' میز اور دری وغیرہ بھی واپس نہ اٹھوائیں۔ اسی طرح جب پیر الٰہی بخش کالونی میں گورنمنٹ زمین بغیر پیسے لیے ایک ایک مکان صرف چار ہزار روپے میں بنوا کر دے رہی تھی۔ ممبرشپ صرف سو روپے تھی اور چھ ماہ کے اندر تیار مکان دے رہی تھی۔ اس پروجیکٹ کے چیف انجینئر سلیمان صاحب جو میرے والد کے عزیز دوست تھے' ایک دن ڈاکٹر لطیف کے ہاں ملے تو کہا "بیٹی دو ملے ہوئے مکان بک کروالو' بیچ کی دیوار ہٹوا لینا تو بہت بڑا سا مکان ہو جائے گا۔ کل ہی ممبرشپ کا فارم میرے دفتر آکر بھر دو۔" میرے والد صاحب ان دنوں ہمارے پاس آئے ہوئے تھے۔ ان سے ذکر کیا تو کہا "ہاں یہ خیال ٹھیک ہے۔" میں کچھ سوچ میں پڑ گئی کہ اتنے ڈھیر سے روپے کہاں سے آئیں گے۔ وہ فوراً" سمجھ گئے۔ اسی وقت آٹھ ہزار کا چیک لکھ کر یہ کہتے ہوئے دیا۔ "بھئی دیکھو ایک مکان میرا اور ایک تمہارا ہو گا۔" تو میں اس پر فوراً" راضی ہو گئی۔ دوسرے دن پہلے جاکر فارم بھر آئی پھر شام کو اختر کو خوش ہو کر بتایا تو وہ تو چراغ پا ہو گئے۔ کہنے لگے یہ مکانات ان لوگوں کے لیے حکومت بنوا کر دے رہی ہے جن کو گورنمنٹ مکان نہ دے سکی ہو۔ مجھے

بڑا تعجب ہے کہ آپ کے دماغ میں خود یہ خیال نہ آیا۔ کبھی کبھی آپ کی حرکات سے مجھے دلی صدمہ ہوتا ہے۔ یہ سن کر واقعی مجھے بڑی شرم آئی کہ آخر میں نے خود یہ کیوں نہ سوچا اور اپنے کو اختر کی نگاہ میں کم کرلیا۔

اختر پر بیک وقت تعلیمی محکمے کی مختلف ذمّے داریاں ڈالی جاتی رہیں۔ ایک وقت میں کئی کئی کام اور وہ بس پُھرتی، حُسن و خوبی اور بڑے شوق سے کرتے رہے۔ ان کے کاموں میں کوئی رکاوٹ کیسی بھی کوئی لے کھڑا ہو تو ان کی عظیم شخصیت اور اپنے کیس کو پیش کرنے کا انداز دوسرے کو روڑا بننے ہی نہ دے سکتا تھا۔ ہر سکریٹری کو معلوم ہوچکا تھا کہ اختر حسین نہ پیچھے ہٹنے والا ہے، نہ دبنے اور نہ ہی رعب کھانے والا ہے۔ ہر ماتحت کے ساتھ لطف و کرم کا سلوک کرتے کہ سب کے دلوں میں اپنی جگہ بنا لیتے۔ نئے نئے اسکول اور کالج اور یونیورسٹیاں کُھل رہی تھیں جو بھی جگہ کی اہلیت رکھنے والا یا رکھنے والی ہوتی اسی کا تقرر کرتے رہے۔ کسی نے بھی اوپر سے سفارش کی تو کبھی سن کر نہ دی۔ منسٹر سے کتنے موقعوں پر صاف کہہ دیا کہ کام اس طور سے میرا قلم تو نہ کرے گا۔ یہ میرا استعفیٰ ہے۔ آپ اپنے قلم سے کرسکتے ہیں۔ ایک بار فضل الرحمٰن جو ایجوکیشن منسٹر تھے ان کی بیگم نے کوئی تقریر لکھنے کی فرمائش کی تو پہلی بار لکھ تو دی، مگر منسٹر صاحب سے کہہ دیا کہ آپ اپنی بیگم صاحبہ سے کہہ دیں کہ آئندہ کبھی مجھ سے ایسی فرمائش نہ کریں۔ یہ میری ڈیوٹی نہیں، ہاں آپ کی تقاریر لکھنے کے لیے پابند ہوں۔

دہلی میں اور یہاں جب بھی بابائے اردو نے انجمن ترقّی اردو کے لیے کچھ بھی کروادینے کی فرمائش کی اس کام کو اوّلیت دے کر جلد سے جلد کروادیتے۔ مولوی صاحب مہینے میں دو ایک بار ہمارے ہاں کا چکر ضرور لگا جاتے۔ لڑکے اختر کے ساتھ ضدیں کرتے اور وہ اس کو بے چون و چرا مان لیتے تو مولوی صاحب دیکھ کر مسکراتے اور جیسے ہی اختر ذرا ہٹتے تو ہر بار مجھ سے آہستہ سے یہ ضرور کہہ دیتے۔ "دیکھنا یہ لڑکے ان حضرت کو کیسا ٹھیک کریں گے کہ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔" میں ہر بار کہتی "خدارا ایسا تو نہ کہا کریں۔ اور مجھے ہر بار یاد آتا کہ ہمارے مولوی صاحب اب تک اختر کی ضد حیدر آباد سے دہلی آنے کو ہنوز بھولے نہیں ہیں۔ ایک بار مجھ سے یہ بھی کہا کہ اختر نے اب تک اشارے کنائے سے ڈکشنری کا ذکر تک نہ کیا اور تم مجھ سے خم ٹھوک کر خوب خوب لڑیں! میں نے جواب

دیا کہ وہ بہت بلند انسان ہیں اور میں بچاری تو فقط ایک ادنیٰ سی شے ٹھہری، ہر بات منہ پر آجاتی ہے، دل صاف ہو جاتا ہے۔ اختر کے دل و دماغ پر بچپن سے صدموں کی تہیں بچھا ہی کرتی رہی ہیں۔ وہ ضبط کے عادی ہیں اور میں کچھ بھی برداشت کرسکتی نہیں۔" بولے "ہاں، تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔"

حکومتِ پاکستان نے اپنے افسران کے لیے پی۔ ای۔ سی ایچ کی ایک زمین ایک سوسائٹی کی شکل میں کردی تاکہ یہاں پر ہر افسر کو مکان کے لیے پلاٹ الاٹ کیا جائے اور ہر ممبر کو ساتھ ہی ایک کمرشل پلاٹ بھی دیا جائے۔ ان کے محکمے کے ہر افسر نے ممبر شپ کے لیے پانچ سو روپے داخل کردیے سوائے اختر کے۔ جب سب کو الاٹمنٹ کے کاغذات پہنچ گئے تو میں نے خاصی بحث کی کہ آپ اگر دو ہزار گز کا پلاٹ نہیں لیتے تو ہزار گز کا ہی لے لیجیے۔ کہا کہ "میں حبیب الرحمٰن کے ساتھ جاکر اس علاقے کو دیکھ آیا ہوں۔ ہرگز ایسی اجاڑ، جھاڑیوں اور ریت کے تودوں میں گھر بنانے کا تصوّر بھی نہیں کرسکتا۔

امام صاحب میرے شوکت عمر بھائی کے دوست تھے اور اس سوسائٹی کے کرتا دھرتا۔ بھائی جان کے ساتھ جاکر امام صاحب سے کہا آپ اختر پر کسی طرح زور ڈال کر ایک ہزار گز کا پلاٹ لینے پر مجبور کریں۔ انھوں نے کس مزے سے بات بنا کر یوں کہا کہ ان کو تو ہر افسر کو ایک پلاٹ الاٹ کرنا ہی ہے۔ مجھے اپنا کام کرنا ہی ہے۔ بعد میں آپ جس کو چاہیں دے دیجیے گا۔ ممبر شپ کا فارم بھر کے بھیج رہے ہیں۔ اس کو پر کرکے ان کے دفتر فوراً" بھیج دیں۔ شام کو گھر آکر مجھ سے کہا کہ یہ خوب زبردستی ہے کہ دل چاہے یا نہ چاہے۔ پلاٹ اس بیابانے میں لینا ضرور ہے۔ میں نے بے نیازی کے انداز سے کہا۔ واقعی اس جگہ کون رہنا چاہے گا۔ پہلے تو میں ان کے سر ہوتی رہی کہ پلاٹ لے لیں۔ پر جب جاکر خود اس ویرانے اور بیابانے کو دیکھا تو وحشت ہوئی کہ توبہ توبہ یہاں اور ہم گھر بنائیں، لیکن اگر آپ کو قانوناً" لینا پڑے گا تو لے لیجیے۔ بعد میں بچّوں کے چھوٹے سے پارک کے لیے دے دیجیے گا۔ اختر کو میری یہ بات پسند آئی۔ ممبر شپ کا فارم بھر کر پانچ سو روپے کا چیک بھر کر امام صاحب کے دفتر بھیج دیا۔ چند روز بعد الاٹمنٹ آرڈر آگیا۔ مگر ساتھ ہی یہ خبر بھی ملی کہ ایک کمرشل پلاٹ بھی دیا جائے گا جس کے لیے پانچ سو روپیہ مزید چیک کے ذریعے بھیج دیں۔ شام کو جو آئے تو بڑی ناراضگی کے ساتھ کہا۔ سوسائٹی والوں نے سمجھا

کیا ہے' میں کوئی بنیا بقال ہوں' دکان داری کرنا ہے مجھے؟ میں نے انکار کردیا۔ "ہاں یہ آپ نے ٹھیک کیا' مگر اور سب کو بھی دیا گیا تو کیا ایجوکیشن والے دکان لگا کر تھوڑا ہی بیٹھ جائیں گے۔ بولے کل سب سے معلوم کروں گا۔

دوسرے دن اپنے محکمے کے سب ہی افسروں سے جانے کس انداز سے سب کے بے آبرو ہوجانے کے خدشات بیان کیے کہ سب ہی نے کمرشل پلاٹ واپس کردیے۔ سوائے ڈاکٹر حبیب الرحمٰن کے۔ ہنس کر بھی کہا' یہ جو ہمارے حبیب صاحب ہیں نا وہ جب دکانیں بنوالیں گے اور ان کو کرائے پر چڑھائیں گے تو لوگ کہا کریں گے کہ حبیب الرحمٰن کی دکان سے گوشت' ان کی دکان سے جوتے خریدے۔ حبیب الرحمٰن کی دکان سے بال کٹائے۔ اب تو وہ سب ایک کے بعد ایک کرکے اللہ کو پیارے ہوگئے۔ زندگی بھر جب مل بیٹھتے تھے تو اختر سے شکوہ ضرور کرتے۔ "واہ ڈاکٹر صاحب آپ نے خوب ہی ہم سب کو پاگل بنایا' وہ وہ بھیانک بدنامی کے نقشے کھینچے کہ ہم سب کمرشل پلاٹ سے دست بردار ہوگئے۔ بڑا ہی نقصان آپ نے کروادیا۔ اس پنشن میں کیا بنتا ہے۔ کمرشل پلاٹ کی دکانوں کی آمدنی ہوتی تو وقت اچھا گزر جاتا۔" سوسائٹی بڑی تیزی سے ڈیولپ ہونے لگی۔ لوگ مکانات بنوانے لگے۔

۱۹۵۶ء میں یونیسکو کے ڈائریکٹر جنرل چند روز کے لیے کسی میٹنگ میں کراچی آئے۔ اختر کو محکمۂ تعلیم کی طرف سے سب انتظام کرنا تھا۔ بعد میں میٹنگوں کی رپورٹ تیار کرنی تھی۔ ہر میٹنگ میں پاکستان کی ضروریات اور خاص طور پر موہنجو دڑو کو تباہ و برباد ہونے سے بچانے کے لیے یونیسکو کی اولین توجہ اُجاگر کرکے امداد حاصل کرنا تھی۔ اختر کی شخصیت ان کی لیاقت اور سوجھ بُوجھ کے ساتھ ہی فرانسیسی زبان پر عبور کا کچھ ایسا اثر ڈائریکٹر جنرل پر ہوا کہ واپس پیرس پہنچ کر ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ سے اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ اختر کو یونیسکو میں کام کرنے کے لیے اجازت دے دی جائے۔ گو دستور کے مطابق ہر ملک کے لیے کوٹا مقرر ہوتا ہے۔ اس وقت پاکستان کا کوٹا پورا تھا قاعدہ یہ ہے کہ کسی ملک سے کسی کو نام لے کر بلایا نہیں جاتا ہے بلکہ منسٹری سے اپنی ضرورت کے مطابق اس کا نام اور کوائف مانگے جاتے ہیں اور اگر اس کو اہل سمجھا گیا تو اس کی تقرری عمل میں آتی ہے۔

محمد شریف سکریٹری تعلیم تھے گو وہ اختر کی بڑی قدر اور عزت کرتے' مگر ان کی لیاقت اور قوت فیصلہ سے ایک طرح کی جلن بھی رکھتے۔ انہوں نے پیرس لکھ بھیجا کہ منسٹری کو خود اختر کی بڑی ضرورت ہے۔ ہاں ایک خالد حسن صاحب جو اُن کے عزیز دوست اور پنجاب سروس میں تھے' ان کا نام بھیج دیا اور ساتھ ہی ان کے کوائف بھی۔ یہ یونیسکو کی ضروریات پر پورے نہ اترتے تھے' تو وہاں سے انکار کا خط آگیا۔ اختر نے مجھے جب یہ بات بتائی تو ان کے چہرے پر ملال کی کیفیت تھی۔ اختر سے میں نے کچھ نہ کہا مگر دل میں ٹھان لی کہ ایسی حق تلفی ہونے نہ دوں گی۔ میرے بھائیوں نے پاکستان بنتے ہی ایک کنسٹرکشن کمپنی کھول لی تھی۔ بہت بڑے بڑے پروجیکٹ پر کام کر رہے تھے۔ اس طرح تین بھائی کراچی میں' ایک ڈھاکہ اور ایک پنجاب آفس کے انچارج تھے۔ بھائی شوکت عمر اس وقت کراچی میں تھے۔ سہروردی صاحب پرائم منسٹر تھے جو ان کے بڑے عزیز دوست تھے۔ رات کو میں ان کے گھر گئی۔ ان کو یہ سب معاملہ تفصیل سے بتایا کہ کل صبح مجھ کو لے کر ان کے دفتر چلیں' میں ان سے بات کروں گی کہ وہ خود کہہ کر وہ فائل منسٹری سے منگا کر دیکھیں اور اپنے قلم سے فائل پر لکھیں کہ اختر کو ڈپارٹمنٹ بھیج سکتا ہے۔ بھائی جان نے مجھے اطمینان دلایا مگر یہ کہ تم کو میں ہرگز نہ لے جاؤں گا۔ میں ابھی ان سے کل کا وقت لے لیتا ہوں میرا کہنا کافی ہوگا۔ اختر کو اگر تمہارے جانے کی بھنک بھی لگ گئی تو شاید وہ پیرس جانے سے انکار ہی نہ کردیں۔ میں نے کہا۔ "ہاں آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔ میرا مطلب اگر یوں حل ہوجاتا ہے تو اختر کی ناراضگی کیوں مول لوں۔"

جمیل بھائی! اس بات کی خبر مجھے تھی یا بھائی جان کو اور آج آپ سن رہے ہیں۔ آپ بھی خوب آدمی ہیں کہ جانے کیا کیا ڈھکی چھپی باتوں کو مجھ سے لکھوالیا۔ چند دن بعد شریف صاحب نے اختر کو بُلا کر کہا کہ ان کی تقرری یونیسکو میں ہونے کی منظوری وزیر اعظم نے خود دے دی۔ شام کو مجھ سے بہت ہنس کر خبر سنائی۔ میں نے بڑی حیرت کا اظہار کیا۔ آخر شریف صاحب نے خالد صاحب کا نام واپس کیوں لے لیا۔ یونیسکو کی ضرورت کو وہ پورا نہ کرسکے تو شاید پیرس سے سہروردی صاحب سے کہا گیا ہو مگر ایسا ہوتا نہیں۔ یہ بات میری سمجھ میں آئی نہیں۔"

یکم مارچ ۱۹۵۶ء کو اختر کو اپنی نئی ملازمت کا چارج پیرس میں لینا تھا۔ روانگی میں پندرہ

روز باقی تھے۔ ایک دن میں نے یونہی پوچھا۔ "جب کبھی آپ اپنا گھر بنوائیں گے تو آپ کے ذہن میں کوئی نقشہ اس کے متعلق کبھی آیا؟" "ہاں ایک دو بار سوچا ضرور۔" ایک کاغذ اور قلم ان کے سامنے کر دیا کہ مجھ کو ذرا لکیریں کر کے دکھائیں تو۔ کچھ اچھے موڈ میں تھے۔ کاغذ پر لکیریں کر کے بتایا "دیکھیں یہ تو سامنے کا برآمدہ' اس کے سیدھے ہاتھ پر اسٹڈی' پھر بڑا ہال آدھا بیٹھنے کا اور آدھا کھانے کا کمرہ ہو گیا اس کے سامنے پتلا برآمدہ اسٹڈی کو جاتا ہے اور پھر یہ سامنے کو ہو جاتا ہے اندر یہ بڑا سا برآمدہ ہے۔ پتلا برآمدہ اُلٹے ہاتھ کو گھوم کر میرے کمرے کے سامنے ختم ہو جائے اور بڑے برآمدے کے ساتھ دو بیڈ روم' لڑکوں کے دوسری طرف آپ کا یہ کمرہ بن گیا۔ پیچھے اِستری کا کمرہ' پینٹری اور پھر باورچی خانہ۔" "آپ نے اندر کا برآمدہ اتنا بڑا کر دیا کہ اور کمرے چھوٹے بنائے۔" ہنسنے لگے کہ آپ کا بڑا تخت جو یہاں ہو گا۔ تو ظاہر ہے سب کی بیٹھک اسی میں تو ہو گی اور پھر یہاں کے موسم کے حساب سے کمرے تو سوتے وقت ہی استعمال ہوتے ہیں۔" "ہاں یہ بھی آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔ آج میں مان گئی کہ آپ ڈرائنگ بھی کر سکتے ہیں۔" چپکے سے وہ کاغذ دہرا کر کے رکھ دیا۔

بڑے دو لڑکوں کامران اور سلمان کو لندن میں پڑھنے کے لیے وہاں لے جا کر داخل کرانا تھا۔ اس لیے فروری کے آخری ہفتے میں یہاں سے اختر کو روانہ ہونا تھا۔ تین چھوٹے لڑکے عرفان' نوید اور شاہد کے امتحانات جون میں ختم ہوں گے' اس لیے میری روانگی پانی کے جہاز سے سامان کے ساتھ ہونا طے پائی۔

مجھے اب بہت سے کام کرنے تھے۔ دوسرے دن یونیورسٹی کے انجینئر مغل صاحب کو وہ کاغذ لے جا کر دیا کہ اسی کے مطابق ایک ہفتے میں مجھے مکان کا نقشہ بنا دیں۔ سوسائٹی کے دفتر جا کر پلاٹ کی پیمائش کروا کر عارضی پانی کا حوض اور چوکیدار کے لیے کوٹھری کا بندوبست کروانے کے لیے بنے ہوئے بلاک منگا لیے مگر بہت کچھ اور جو اَزم شرم بھی تو چاہیے ہے۔ رات کو "ڈملوٹی" سے سب سے چھوٹے بھائی انیس عمر ملنے آ گئے (ڈملوٹی کراچی سے کوئی اٹھارہ میل پر ہے۔ کراچی کے پانی کی زیرِ زمین بڑی پائپ لائن گھارو سے لانے کا ٹھیکہ ملا تھا جس کے لیے عمر سنز کا کیمپ وہاں تھا۔ انیس کو اپنا ارادہ بتایا مشورہ کیا۔ فکر نہ کریں۔ کل صبح ہی ایک اور یئر' تمبو اور کھدائی کا سب سامان پلاٹ پر آ جائے گا۔ میرے

بہنوئی خواجہ محمد سوی جو عمر سنز کے انجینئر تھے وہ بجائے کیمپ کے کراچی میں مقیم تھے' سُن کر بے حد خوش ہوئے اور باقی بھائیوں سے خفیہ رکھا کہ پہلے دن کہہ چکے تھے کہ تین ماہ ستر دن میں مکان کا بنانا ناممکن ہے۔ ان سب کا کہنا کہ ہم ٹھیکے داری چھوڑ دیں گے اگر اس مدت میں کوئی کوٹھی بن سکے میں صرف یہ کہہ کر چپ ہو گئی کہ "تماں نے تو ہم سب کو یہ بتایا کہ ناممکن کوئی بات نہیں۔ خیر آپ سب یہ سمجھتے ہیں تو ایسا قدم نہ اُٹھاؤں گی مگر قدم تو اُٹھا چکی تھی۔ اب اور بھائیوں سے خفیہ رکھ کر شروع کر دوں گی۔

اختر دو بڑے لڑکوں کو لے کر روانہ ہو گئے۔ میں سرکاری مکان چار ماہ تک رکھ سکتی تھی مگر جھٹ پٹ سامان بند کیا۔ اس کو خالی کر کے زاہد بھائی کے گھر شفٹ ہو گئی۔ موٹر فرج' وغیرہ بیچ کر مکان شروع کرا دیا۔ گھرداری کی یا بچوں کی کوئی فکر نہ رہ گئی۔ اب تو وہ بھابی جانیں۔ صبح چھ بجے پلاٹ پر آ جاتی' شام کو چھ بجے واپس گھر آتی' تھکاوٹ سے پست پڑ جاتی۔ پھر رات کو گیارہ بجے واپس آتی کہ پانی اس وقت آتا تھا۔ ترائی وغیرہ کو دیکھ کر گھر جا کر سو جاتی۔

اس وقت فارن ایکسچینج ایک بڑا مسئلہ تھا۔ چند دوستوں کے بہت کہنے پر ان سے روپے لے لیے کہ جب وہ پیرس آئیں تو ہم ان کو فرانک دے دیں۔ اس طور سے میرا کام بن گیا۔ اختر کو تو بتانا تھا ہی نہیں کہ میں کر کیا رہی ہوں۔ ان کی تو وہ خوشی اور حیرت دیکھنا چاہتی تھی کہ ان کا گھر بن گیا۔ دماغ پر بغیر کوئی بوجھ کے۔ پچھے تین ماہ سولہ دن میں گھر میں بجلی' پانی لان اور پھول وغیرہ سب ہی کچھ ہو گیا۔ میری روانگی کو صرف ایک دن باقی رہ گیا تو میں نے پہلے بھائیوں کو لا کر دکھایا اور کہا اب چھوڑ دیں گے نا ٹھیکے داری؟ ان سب کی آنکھوں میں وہی چمک مجھے نظر آئی جو میں نے والد کی آنکھوں میں فخریہ اور خوشی کی چمک دیکھی تھی۔ جب چنڈت چنچھے سے پاسپورٹ لا کر ان کے ہاتھ میں دیا تھا۔ جب کہا کہ آج نقشہ پاس کرواتا ہے۔ "جب بغیر نقشہ پاس کرائے گھر بنا ہی لیا تو پھر یہ زحمت کیوں کرتی ہو۔ عزیز عمر نے بتایا کہ ان کے دوست محمد حکیم نقشے پاس کرنے کے انجینئر ہیں۔ سیدھی ان کے کمرے میں چلی جاؤں ان کے ہاتھ میں دوں تو شاید آج یہ کام ہو جائے۔

حکیم صاحب کو میں نے نقشہ دیا ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ گھر تو بنا چکی ہوں اور کل پیرس کے لیے روانگی ہے اس لیے آج ہی کارروائی پوری کر دیں۔ مسکرانے لگے۔ نقشہ

دیکھ کر بولے کہ کارروائی تو میں جس طور ہو گا کروں گا مگر جو مالک صاحب ہیں ان کے دستخط نقشے پر ہونا ضروری ہیں' اس کو کہاں سے لاؤں؟ کچھ دیر کو میں سوچ میں پڑ گئی کہ اب کروں تو کیا کروں۔ "میں ایک ماہ کے اندر دستخط کروا کر بھیج دوں گی۔" جب کوئی افسر کوئی کام کرنا چاہے تو رستہ بھی نکال لیتا ہے۔ اوتھ کمشنر سے اوتھ دلوا کر نقشہ پاس ہونے کا رجسٹروں میں اندراج ہوا اور کتنوں کے دستخط کرائے گئے۔ دو گھنٹے میں نقشہ میرے ہاتھ میں تھا۔ وہ بھی کیا اچھا زمانہ تھا کہ لوگ صرف اَڑنگے ہی نہیں لگاتے تھے بلکہ کام کروا دیتے تھے۔

—○—
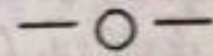
یونیسکو کی ملازمت

میں وقت مقررہ پر دوسرے دن پانی کے جہاز سے روانہ ہو گئی۔ اختر پیرس میں بہت اچھا سا فلیٹ کرایہ پر لے چکے تھے۔ ہمارے پہنچنے کے ہفتے بھر بعد ان کو چند روز کے لیے کراچی آنا تھا' میں ان کے دوستوں کو بتا گئی تھی۔ سب دوستوں نے ہمارے ڈھنڈھار گھر میں فرش بچھوا کر گانے اور کھانے کی محفل کا بڑا انتظام کیا۔ اختر کو اپنے ساتھ لے کر دعوت میں آئے۔ پھر سب ہی نے ان کو مبارک بادیں دیں کہ گھر مبارک ہو۔ اختر حیران کہ یہ کس قسم کا سب دوست ان سے مذاق کر رہے ہیں اور اللہ بہتر جانے کس کے گھر کو ان کے منھ منڈھ رہے ہیں۔ واپس آ کر مجھ کو بتایا کہ دوستوں نے اب کی ایک خوب ہی مذاق کیا' کسی کے نئے خالی گھر میں محفل موسیقی اور کھانے کا بندوبست کیا اور ہر دوست مبارک باد دے کہ یہ آپ کا گھر ہے۔ "ہو سکتا ہے کہ وہ گھر آپ ہی کا ہو۔" چونک کر بولے "اب آپ بھی اس مذاق میں شامل ہو گئیں' گھر اگنے سے تو رہا پیڑ پودے تو اگا ہی کرتے ہیں۔ اس سائنس کے زمانے میں کیا گھر بھی اگنے لگے ہیں؟" آخر میں نے بتا ہی دیا کہ وہ آپ ہی کا گھر تھا جس کو میں بنوا کر آئی۔ نقشہ تو آپ نے بنا ہی دیا تھا ان کے چہرے پر مسرت اور خوشی کے آثار دیکھ کر میری ساری محنت وصول ہو گئی۔ "یہ آپ کی ہمت ہے۔ ورنہ میں تو بیچ وہاں ہرگز گھر نہ بناتا۔ چلیے بچوں اور آپ کے لیے گھر ہو گیا۔"

یونیسکو جب "South East Asia" کے لیے ہندوستان میں ایک ریجنل آفس کھولنے لگا اور اختر کو اس کا ڈائریکٹر بنا کر بھیجنے کا فیصلہ کیا تو اختر نے کس کس طور پر پاکستان کے حق میں اس کیس کو سمجھایا کہ اس دفتر کو ہندوستان میں کھولنے پر وہ سہولت حاصل نہیں ہو گی جو پاکستان میں کھول کر آسانی رہے گی اور ان کی بات مان لی گئی اور اختر کی تقرری پاکستان میں ہو گئی۔

ہمارا گھر ایک امریکن نے کرائے پر لیا ہوا تھا۔ سُوئے اتفاق کہ دو ہفتے پہلے ان کا ٹرانسفر ہو چکا تھا۔ اس طرح ہم سیدھے اپنے گھر آکر اُترے۔ بہت درمیانے درجے کا فرنیچر خرید کر رہائش کے قابل بنالیا۔ اختر کے مزاج میں طمطراق یا نمائش ذرا نہ تھی۔ اس کا لحاظ مجھے ہمیشہ رہا۔

پاکستان میں یونیسکو کی طرف سے تقرری چار سال کے لگ بھگ رہی۔ وہ بار بار ہندوستان، سیلون، برما، انڈونیشیا، ایران، وغیرہ کے دَوروں پر جاتے رہے۔ بار بار پیرس جانا ہوتا رہا۔ جب ہر سال ایک بڑی کانفرنس مختلف ممالک میں کرنا ہوتی، جس میں دنیا کے ہر ملک کے ڈیلی گیٹ ہزار کے اوپر آتے۔ کانفرنس شروع ہونے سے چند ہفتے پہلے اس ملک میں چلے جاتے۔ ہر انتظام ان سب کے لیے کرتے۔ ایک ماہ تک کانفرنس چلتی۔ جس نے بھی ان کانفرنسوں میں شرکت کی ان کے ہر انتظام اور باقاعدگی کے ساتھ ہر شام اور رات کو تفریحی انتظام کی بڑی تعریف کی۔

اس طرح جب ہم چار سال اپنے ملک میں اپنوں کے درمیان یونیسکو کی ملازمت میں وقت بڑے مزے میں گزار چکے تو اختر کا صومالیہ تبادلہ اس لیے کیا گیا کہ وہاں یونیسکو کی کارکردگی سالہا سال سے تسلی بخش نہ ہو سکی تھی۔ جانا ہی پڑا مگر بوجھل دل سے گئے۔ کہ میں اور لڑکے ساتھ نہ جا سکتے تھے۔ مگر جب وہاں پہنچ گئے اور یہ دیکھا کہ یہاں تو بہت بڑے بڑے مسائل ہیں، اور صومالیہ کی گورنمنٹ کے پاس وسائل بالکل نہیں ہیں اور نہ اس ملک کی اب تک کوئی تحریری زبان طے پائی ہے اور اگر کوئی اسکول ہے تو نہ کورس کی کتابیں نہ کوئی ٹرینڈ استاد یعنی ان کو میدان بالکل کورا ملا۔ ایسے موقعوں پر اختر کی خداداد صلاحیتیں اور بھی بڑھ جایا کرتیں اور وہ ہر ناممکن کو ممکن کر دکھاتے۔ اب تو ان کا دل وہاں بہت لگ گیا تھا۔

گرمیوں کی تعطیل میں ڈھائی ماہ کو ان تین لڑکوں کو لے کر وہاں چلی جاتی۔ پہلے سے سارا پروگرام بنا۔ اپنی سالانہ پانچ ہفتے کی چھٹی اسی موقع پر لے کر ہم سب سفاری پر چل پڑتے۔ ("سفاری" کے لیے ہزاروں ایجنسیاں افریقہ میں انگریزوں نے بنا کر جنگلات میں موٹروں، ویگنوں اور پک اپ پر جا کر دیکھیں اور سرِشام پچاس پچاس میل کے فاصلے پر رہائش کے لیے کاٹیج اور ہٹس بنائیں تھیں۔ کیا کیا انتظام شاہی طریقے کے کر رکھے

تھے۔ کیونکہ یہاں صرف یورپین ہی تفریح کے لیے آیا کرتے۔ بحرین شائیں کرتی سڑکیں۔ بس آپ کسی بھی ایجنسی کے ذمے کر کے اتنا بتادیں کہ کتنے دنوں کا ٹرپ کرنا چاہتے ہیں۔ گھنٹہ بھر میں آپ کے ٹرپ کا وہ کاغذ ہاتھ میں دے دیا جاتا، جس پر آپ کے لیے ایک ایک منٹ کا پروگرام لکھا ہوتا۔ بس آپ کو بیٹھ کر روانہ ہو جانا ہے۔ کھانا، پینا، سونا اور موٹریں سب ان کے ذمے۔ ہفتہ دو ہفتے کا ٹرپ لگا کر واپسی پر اپنے اخراجات کا حساب چکادیں)۔

یوگینڈا، تنزانیہ اور کینیا وغیرہ۔ پورے وقت ہم قدرت سے کس قدر قریب، اس کی بنائی دوسری مخلوق یعنی جانور اور ان کی دنیا، وہاں کے جنگلات اور حسین پرندے جگہ جگہ جھیلیں جن کا پانی کم نظر آتا کہ آبی پرندوں کی کثرت سے پُر ہوتیں۔ دریائے نیل جس میں پڑے ہزار ہا مگرمچھ کیا کیا ان آنکھوں سے دیکھا کبھی یادداشت سے فراموش ہو ہی نہیں سکتا۔ ہم کس قدر جانوروں کی اصل فطرت سے ناواقف ہیں اور انسان ان کو جانور کہتا ہے جن کے اصول اور فطرت میں کیسا بھائی چارہ ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں ہاتھی، زیبرا، ہزارہا جنگلی گائیں، ہرن اور بارہ سنگے شیر اور چیتے اپنے اپنے بچوں کے ساتھ کھاتے پیتے، کلکاریاں بھرتے پھرتے۔ نہ لڑائی نہ جھگڑا، نہ چیخ نہ پکار، نہ ہی کوئی چھینا جھپٹی۔ ہاں جب شیر کو بھوک لگی ہوتی تو کسی بھی غول کے کسی بوڑھے کمزور جانور کا انتخاب کر کے اس کا پیچھا کرتا۔ دوسرے جانور اس کا راستہ چھوڑ کر پرے ہو جاتے۔ وہ اپنا شکار مار کر انتظار کرتا کہ شیرنی اور بچے بھی آجائیں۔ اپنا حصہ کھالیتا تو شیرنی بچوں کو لے کر خراماں خراماں آتی اور بڑی شائستگی کے ساتھ کھاتی اور بچوں کو کھلا کر دُور جا کر پیڑ کے نیچے لیٹ جاتی۔ شیر تو پہلے لیٹ چکا ہوتا۔ اب سارے جانوروں کو یقین کامل رہتا کہ چند دن کسی کی طرف نگاہ نہ ڈالے گا۔

ایک بار جب ہم نے دو شیروں کو بیک وقت ایک زیبرا کا تعاقب کرتے دیکھا اور کچھ فاصلے پر دو شیرنیاں دوڑتی ہوئی تو گائیڈ سے کہا کہ لینڈ روور کو ان کے پیچھے لے چلے تاکہ ہم پورا شکار کرتے آنکھوں سے دیکھ سکیں۔ زیبرا برق رفتاری سے ایک پہاڑی پر چڑھ کر دوسری طرف کو اُتر گیا اور دونوں شیر بھی۔ بس ہوشیاری سے ڈرائیور لینڈ روور کو چوٹی تک لے گیا اور پھر روک لی۔ اب ہمارے سامنے کوئی بیس گز پر زیبرا گرا پڑا تھا ایک شیر

نے گردن سے خون پیا اور پیچھے کو ہٹ گیا اپنی شیرنی کے پاس دس گز دور جا کھڑا ہوا۔ پھر دوسرے شیر نے جب گردن سے خون پی لیا تو اس نے اور شیرنی نے مل کر زیبرا کی کھال بڑی صفائی سے اس کے گوشت پر سے کھینچ کر ایک طرف کی اور گوشت کھانا شروع کر دیا۔ چند منٹ میں آدھا زیبرا ہضم کر لیا۔ شیر پہلے پیچھے کو ہٹا مگر شیرنی ہنوز ادھر اُدھر سے نوچم ناچی کر رہی تھی کہ شیر نے اپنی بیگم کو آہستہ سے دھکا دیا۔ جب دیکھا کہ یہ اشارہ کا کوئی نوٹس نہیں لے رہی تو اس پر غرایا۔ اب وہ زیبرا سے دور ہٹ گئی تو دوسرا شیر اپنی شیرنی کے ساتھ بڑے اطمینان کے ساتھ چلتا ہوا زیبرے کے پاس آیا۔ ایک جھٹکے میں زیبرے کو اُلٹ کر اس کی کھال دونوں نے مل کر نوچ کر الگ پھینک دی اور گوشت کھانا شروع کر دیا۔ دور دور پر گیدڑ منتظر کھڑے ہوئے اور اُوپر گدھ اور چیلیں منڈلاتی رہیں۔ جیسے ہی شیر اور شیرنی نے پیٹھ موڑی تو گیدڑ ڈھانچے پر ٹوٹ پڑے۔ ساتھ ہی گدھ اور چیلیں ادھر اُدھر سے بوٹی لے کر اُڑ جاتیں۔ اس شائستگی اور حق اور انصاف کے ساتھ اپنا اپنا آدھا حصہ کھاتے دیکھ کر اختر نے گائیڈ سے حیران ہو کر پوچھا کہ یہ شکار اس قدر باقاعدگی سے کیوں کھایا گیا تو کس معصومیت سے اس نے جواب دیا۔ دو شیروں نے مل کر ایک ہی جانور کا شکار کیا تو دونوں کا آدھا آدھا حصہ تو بنتا تھا۔ اختر نے پھر پوچھا کہ اگر ایک زیادہ کھا لیتا تو؟ ایسا وہ کیسے کر سکتا تھا کوئی وہ انسان تو نہ تھا کہ دوسرے کا حق مار لیتا! سچ ہی تو کہا بے چارے نے۔

لنچ کے ڈبے، پانی اور چائے، کافی سب ساتھ ہوتے۔ بس نیچے کوئی اُتر نہ سکتا تھا۔ یہ قانوناً منع ہے۔ نہ ہی کسی بھی قسم کا ہتھیار اپنے ساتھ رکھ سکتا، سوائے گائیڈ کے۔ جانوروں کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ یہ لینڈ روور وغیرہ کوئی بدبودار شاں شاں کی آواز کرتا جانور ہی ہے۔ ایک دن اور عجیب تماشہ دیکھا کہ چار بڑے پھیلے ہوئے پیڑوں کے سایہ تلے پانچ شیرنیاں ہاتھ پاؤں پھیلائے ہوئے آرام سے لیٹی ہوئی تھیں، ان کے چاروں طرف دس شیر کے بچے موٹے گدبدے سے کھیل رہے ہیں۔ کبھی شیرنیوں پر چڑھ جاتے، کبھی دودھ پینے لگتے۔ غور سے دیکھا کہ ابھی اس شیرنی کا دودھ پیا پھر وہی دوسری کا پی کر ہٹا تو ایک بچے کو دُم پکڑ کر کھینچ کر ہٹا تیسری والی شیرنی کا دودھ پینے لگا۔ بیس گز کے فاصلے پر بند موٹر سے بہت دیر یہ تماشے دیکھتے رہے۔ اختر نے پھر گائیڈ سے سوال کیا کہ یہ بات سمجھ میں نہ

آئی کہ جانور چاہے کوئی ہو کسی دوسرے کے بچے کو دودھ پینے نہیں دیتی؟ پھر یہ پینے دے رہی ہے۔ افریقن گائیڈ کا بڑا سیدھا سا جواب تھا "یہ پانچوں شیرنیاں ایک شیر کا حرم ہیں۔ جب بچے ایک باپ کے ہیں تو بھلا شیرنیوں کو کوئی اعتراض کیوں کر ہو سکتا ہے!!

شام کے ٹھیک چھ بجے تک سیاحوں کو سفاری لاج میں پہنچ جانا ہوتا۔ یہ عین جنگلات میں ہوتے۔ بیس تیس بیٹھیں ہر سفاری لاج میں ہوتیں۔ ہر ایک میں پانچ گز کا فاصلہ، بہت کافی جگہ چھوڑ کر خوب ہی موٹے خاردار تمروں سے دس فٹ کی اونچائی سے گھرا ہوا۔ لوگ جنوبی جنگلات کے جانوروں کی چال پھرت کو دیکھ سکتے۔ یہاں کی بیٹھیں بہترین ساز و سامان سے سجی ہوئی دنیا کے بہترین ہوٹلوں سے آپ مقابلہ کر سکتے ہیں۔ کھانے کے انتظام پر حیران ہو جاتے، ان جنگلوں میں جہاں پر کئی کئی سو میل کسی دکان کا نام و نشان نہیں، کہیں کوئی آبادی نہیں پھر یہ لوازمات کیسے مہیا کرتے ہیں!

ان علاقوں میں جون، جولائی اور اگست سردی کا موسم ہوتا ہے۔ کچھ علاقوں میں اس قدر سردی ہوتی کہ تین تین کمبل اور گرم پانی کی بوتلیں بستر میں رکھی ہوئی۔ کھانے کے اور بیٹھنے کے کمروں میں آگ بھی جل رہی تھی۔

یوگنڈا میں ایک مقام ایسا بھی ہے جہاں صدیوں پہلے آتش فشاں پہاڑ کے پھٹنے سے ایک کریٹر یوں بن گیا کہ چاروں طرف اونچے اونچے پہاڑ اور کوئی سو فٹ کی گہرائی پر جیسے سات میل زمین ہموار ہے۔ جس کے درمیان میں جھیل۔ اس میں ہزارہا جانور قید، مل جل کر رس بس رہے تھے۔ یہ ایسا حیران کن سماں کہ بیان سے باہر ہے۔ ساتھ میں چند دوربینیں بھی تھیں، اختر دوربین لگائے کافی دیر سامنے کا حیرت ناک تماشا دیکھتے رہے پھر کہا لیجیے اب آپ اس کو لگا کر دیکھیں۔ میں ایک محویت کے عالم میں دیکھ رہی تھی تو میرے شانے کو ہاتھ سے ہلا کر بولے "حمیدہ بیگم، صد افسوس کہ ہم اپنے ملک میں مل جل کر رس بس نہیں سکتے۔ اس کی ذمے داری ہمارے لیڈروں پر ہے۔ ورنہ ہمارے عوام بڑے معصوم اور محنت کش ہیں۔ اگر میرا بس چلے تو چن چن کر ایک ایک کو یہاں لا کر ان سے کہوں کہ یہ دیکھیں اور ان سے سبق حاصل کریں اور پھر عوام کے حال پر رحم کریں۔"

دو سال بعد صومالیہ سے جب اختر کا تبادلہ ایران کا کیا گیا تو اختر یہاں سے جانا نہ چاہتے تھے۔ بڑے بوجھل دل سے افریقہ سے روانہ ہوئے۔

عظیم بھائی ۱۹۵۱ء میں بمبئی سے کراچی ہمارے پاس آگئے تھے۔ دو سال بعد جانے کیوں بڑی ضد کر کے دو سال کے لیے ناظم آباد میں ایک گھر لے کر اس میں رہے جہاں کئی بار چوریاں ہوئیں تو پریشان ہو کر ہمارے پاس آگئے۔ بھتیجوں کے عاشق تھے۔ ان جیسے مشفق چچا کی نگرانی میں چھوٹے بیٹے شاہد اور نوید کو کراچی میں چھوڑ کر ایران چلے جانے میں فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ پھر ساتھ ہی سلمان بھی موجود تھے کہ وہ ڈھاکہ سے عمر عزیز کی ملازمت چھوڑ کر کراچی میں "اے۔ پی۔ پی" میں کام کرنے لگے تھے۔ ہر سال دسمبر کے مہینے میں ہم دونوں ایران سے پانچ ہفتوں کو آجاتے اور گرمی کی چھٹیوں میں لڑکے ڈھائی ماہ کے لیے ہمارے پاس ایران آجاتے۔ ان کے آنے سے پہلے اپنے دوروں کا پروگرام اختر اس طرح سے ترتیب دیے رکھتے جس طرح انہوں نے پیرس کے رہائش کے دور میں یورپ کا ہر ہر ملک دکھایا تھا' اب ایران کا چپہ چپہ ہم سب کو دکھایا۔ افریقہ کا ہر ملک دکھا چکے تھے۔ یہ صرف سیریں نہ ہوتی تھیں بلکہ ہسٹری اور ہر ملک کی تہذیب اور کلچر کے بارے میں اس انداز سے ان کا بیان ہوتا جیسے ہم صدیوں پیچھے کی طرف پلٹ گئے ہیں اور سب کچھ اپنی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔

رضا شاہ پہلوی کی تاج پوشی ہم نے ایران کے قیام میں دیکھی۔ پندرہ روز پورا ملک روشنیوں سے جگ مگ کرتا رہا۔ تہران کو بڑی خوبصورتی اور نفاست سے سجایا اور چراغاں کیا گیا تھا۔ راتوں کو روشنی کا یہ عالم تھا کہ موٹروں کی بتیاں جلانے کی ضرورت نہ ہوتی۔ ہر طرف رنگا رنگ فوارے آسمان سے باتیں کرتے ہوئے۔ دس بجے رات سے آتش بازی چھٹنا شروع ہو جاتی' جدھر کو آسمان کی طرف نظریں کریں کیسے کیسے عجوبے اور نرالے نقش و نگار اور سین آسمان پر نظر آتے۔

پھر ہمارے وہاں کے قیام میں ایرانی بادشاہت کا ڈھائی ہزار سالہ جشن "پارسی پولس" جو شہر شیراز سے دس بارہ میل پہلے اس کے آثار قدیمہ ہیں' وہاں پر منایا گیا۔ اس آثار قدیمہ کے کھنڈرات جو میلوں تک پھیلے ہوئے تھے اس کی دیکھ ریکھ پہلے ہی سے یوں ہوتی رہی تھی کہ قابل تعریف اور دیدنی تھی۔ اور اب جو ایرانیوں نے اس کو ڈھائی ہزار سال پہلے کے انداز سے سجایا تو اس وقت کی ساری تصویر آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ مشعل اور مشعل بردار اسی طرح کے لباسوں میں۔ وہی پرانی گاڑیاں جن کو انسان' گھوڑے اور

بیل کھینچ رہے۔ دنیا کے ہر ملک کے سربراہ مہمان آئے ہوئے۔ ان کی رہائش کے کیا ہی پر تکلف انتظامات۔ چار پانچ ہزار اور دوسرے مہمان اور کئی سو اخبار والے۔ میلوں میں سب کی رہائش کے لیے عین اسی زمانے کی بناوٹ پر خیمے' جن کے باہر چوب دار اس وقت کے لباس میں بت بنے کھڑے ہوئے۔ ایسا لگتا جیسے ہم سچ مچ ڈھائی ہزار پہلے کے زمانے میں چل پھر رہے ہیں۔ کیا کیا موسیقی اور ناچ کے پروگرام تھے۔ دنیا بھر کے ممالک سے باورچی بلائے گئے تھے۔ ایک ڈش ایک روز بلبل کی زبانوں سے تیار کی گئی تھی۔ اختر نے مینو کارڈ پر اس ڈش کا پڑھا تو ان کا چہرہ تمتما اٹھا' میں نے محسوس کیا جیسے ان کو کرنٹ سا لگا ہے۔ کرسی کا ہتا ہاتھ میں کس کر دبایا' تھوڑا سا اٹھے پھر بیٹھ گئے۔ میں خوب سمجھ گئی کہ ان پر کیا گزر گیا کہ جب میرے ایک بارہ سالہ بھائی خلیل عمر نے ایئرگن سے ایک بلبل کی چونچ توڑ دی تھی تو اس سے برسوں بات نہ کرتے۔ کہتے "بھئی خلیل تم تو میرے پاس سے دور چلے جاؤ' تم نے تو بلبل کی چونچ توڑ دی تھی۔ میں نے کئی بار کہا کہ "اتنے برسوں میں اگر کوئی خون کر بیٹھا ہو تو وہ بھی معاف کر دیا جائے۔' یہ بچے سے جوان ہو گیا اور آپ کی ناراضگی ہے کہ چلی ہی جاتی ہے۔"

یہ ڈھائی ہزار سالہ جشن کروڑہا روپیہ خرچ کر کے جس کرو فر سے منایا گیا تو ساری دنیا کے اخباروں نے لے دے شروع کر دی۔ سچ پوچھا جائے تو جب ہی سے رضا شاہ پہلوی کے عروج کا گراف نیچے کو گرنا شروع ہو گیا۔ "کاخ مرمر" نامی محل شاہ نے اپنی لاڈلی ملکہ شاہ بانو فرح کو تحفے میں دے دیا تھا۔ اس میں وہ ہر سال اپنی سالگرہ کا جشن منایا کرتیں۔ صرف دو سو مخصوص مہمان بلائے جاتے۔ اس میں ہم دونوں بھی ضرور ہوتے۔ یہ تیسرے سال کی بات ہے کہ اختر کو دیکھ کر شاہ بانو فرح مسکراتی ہوئی پاس آئیں حال چال پوچھ کر بڑے طریقے سے کہا "آقائے دکتر حسین۔ میں آپ سے ایک بات کو سمجھنا چاہتی ہوں کہ وہ جو خانہ بدوشوں کے لیے یونیسکو کی طرف سے آپ کا تعلیم بالغاں کا پروگرام چل رہا ہے' بہت ہی خوب ہے' لیکن اگر وہ چلتے پھرتے اسکول ایک ہی جگہ پر مستقل قائم رکھے جائیں تو کیا بہتر نہ رہے؟" وہ خانہ بدوش ہر دس پندرہ دن میں یہاں سے وہاں چل پڑتے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ آپ بڑی سختی سے اس خیال کے مخالف ہیں کہ اسکول ایک ہی جگہ پر لگے رہیں' آخر کیوں؟

اختر کا جواب کچھ یوں تھا "آپ ٹھیک فرما رہی ہیں۔ مجھ سے وزیر تعلیم اور شہزادی اشرف نے بار بار اس خواہش کا اظہار کیا اور میں نے ہر بار انکار کیا۔ وہ اس لیے کہ میں ان آزاد منش، اللہ کے انسانوں کی آزادی کو اسی طرح رکھنے کے حق میں ہوں۔ وہ جیسے ان کا وجود ہی گم ہو گیا ہے۔ اسکولوں کو ان کے ساتھ ساتھ نہ جانے پر اور ایک ہی جگہ مستقل قائم رکھنے سے خدشہ ہے کہ یہ ایک ہی جگہ کے ہو کر نہ رہ جائیں اور ان کی آزاد منش فطرت تبدیل نہ ہو جائے اور یہ بھی عام سے انسان ہو کر رہ جائیں۔ ان کی صحرا نوردی میں بڑا حسن ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ آپ کی خواہش بھی ضرور ہے۔ میں یہاں سے [illegible] کہ ان کا [illegible] بھی کسی جگہ آئے" آپ اس کے قلم سے ایسا کر دیکھیں۔ "شہزادہ [illegible] شخصیت کی [illegible] تھیں۔ [illegible] میرا ہرگز یہ مطلب نہیں۔ آپ اپنا [illegible] نہ کریں۔ آپ نے ہمارے ملک میں جس انداز سے تعلیم بالغاں کا پروگرام شروع کروایا ہے۔ چند ہی سال میں ایران سے جہالت [illegible] ختم ہو جائے گی۔" [illegible] سوچ کو دور سے [illegible]

اس وقت جب اس کا ذکر بھی کیا تو میں یہ کہے بغیر نہ رہ سکی کہ تعلیم بالغاں کا پروگرام اختر کی [illegible] نے کس طور پر جاری و ساری کیا۔ ہوتا یہ تھا کہ فوجی سروس ایران میں لازمی تھی۔ ہر [illegible] لڑکے کو یہ سروس کرنا لازمی تھی۔ یہ دو سال کا کورس کرنا ضروری تھا۔ مگر اس کورس کی تکمیل کے ارادے [illegible] "انجینئر اور ڈاکٹر" [illegible] لوگوں کے لڑکے [illegible] کے مطابق پڑھنے کا بہانہ کر کے اس سے پہلے نکل جاتے۔ ہاں یہ فوجی سروس لڑکیوں کے لیے بھی ضروری تھی۔ اختر نے یہ کیا کہ جو یہ دو سالہ سروس نہ کرنا چاہے "وہ سپاہ دانش" کی سروس لے سکتا ہے خواہ لڑکا ہو یا لڑکی۔ پہلے تین ماہ کی ٹریننگ "ٹیچر ٹریننگ" [illegible] سے لے۔ پھر ہر ہر گاؤں میں یہ نوجوان معلم اس انداز سے روانہ کیے جاتے کہ ایک [illegible] ایک [illegible] چٹائیاں، ایک بلیک بورڈ۔ ایک بکس میں کاپیاں، چاک، قلم، پنسلیں اور کتابیں وغیرہ۔ بانسوں اور چٹائیاں لپیٹ کر ایک بنڈل۔ گویا یہ ایک اسکول ہو گیا اور اس کے دو لڑکے استاد۔ اسی طرح دوسرا اسکول جس کی دو لڑکیاں استانیاں۔ ہر ہر گاؤں میں دو اسکول پہنچ "کھلتے" ہو گئے ہوتے۔ ایک لڑکیوں کے لیے ایک

مردوں کے لیے پہنچ جاتے۔ گاؤں پہنچ کر بڑے مہذب انداز سے یہ لڑکے لڑکیاں گاؤں والوں سے دس گز لمبی دس گز چوڑی زمین کے لیے دست سوال دراز کر کے کوئی مناسب جگہ حاصل کر لیتے۔ گاؤں والوں کی مدد سے مل کر بانس گاڑ کر چٹائیوں کی چھت گیری ڈال دیتے اطراف میں چٹائی لگا کر دو تین چٹائیاں نیچے زمین پر بچھا کر تھوڑے تھوڑے فاصلے سے مردوں اور عورتوں کا اسکول کھڑا کر کے بلیک بورڈ رکھتے۔ کاپی کتابیں نکال کر بیٹھ کر چند دن تو کہانی قصوں کے ذریعے تعلیم کی اہمیت بتاتے۔ دن اور وقت مقرر ہوتا کہ اسکول کا افتتاح کیا جائے گا۔ ایک فیتہ اسکول کے دروازے کے سامنے باندھ کر گاؤں کے بزرگ سے اس کو کٹوا کر کسی اور بزرگ سے صورت اقرأ پڑھوا کر استاد صاحب چٹائی والے اسکول کے کمرے میں بسم اللہ کہہ کر داخل ہوتے اور تختہ سیاہ پر "آپ سب کو علم کی روشنی مبارک" لکھ دیتے۔ گاؤں میں ایک دو ضرور شُدبُد پڑھنا جانتے وہ زور سے پڑھ کر بتاتے۔ معصوم گاؤں کے بچوں، بچیوں، بزرگوں، عورتوں کے خوشی سے چہرے دمک اٹھتے۔ یوں یہ اسکول چالو ہو جاتے۔ یہ چاروں معلم گاؤں والوں کے ساتھ رہتے اور ان کے ساتھ ہی کھاتے پیتے۔ عورتوں اور مردوں کے اسکول مقابلہ پر چلتے کہ کس میں زیادہ طالب علم پڑھ رہے ہیں۔

اسکول کی دو شفٹیں ہوتیں صبح اور سہ پہر۔ صبح کی شفٹ میں کم عمر لڑکے اور لڑکیاں۔ سہ پہر میں بڑے۔ راتوں کو کہانیوں کی شکل میں تعلیم حاصل کر لینے کے فوائد اور باقاعدہ پکی عمارت میں اسکول بنا لینے کی ترغیب دیتے۔ ہوتا یہ کہ چند ہی ماہ میں گاؤں والے خود فیصلہ کر لیتے کہ ہاں جی ہم اپنے گاؤں میں اپنا اسکول خود بنائیں گے۔ ہر کوئی اپنی بساط بھر اس کے لیے سامان مہیا کرنے لگتا۔ زمین بھی دے دیتے۔ جب اسکول کی بنیاد پڑ جاتی تو گورنمنٹ سے امداد ملنے پر دو ننھے منے اسکول بن کر کھڑے ہو جاتے! زرعی علاقوں میں کتابیں زراعت سے تعلق رکھتیں۔ کاروباری اور دستکاری والے علاقوں کی کتابیں اور ہوتیں۔ واپس آنے سے پہلے یہ دو لڑکے اور دو لڑکیاں۔ چار مردوں اور چار عورتوں کی پڑھانے کی ٹریننگ بھی دے دیتے اور یوں فوجی ٹریننگ کی جگہ "سپاہ دانش" کا سرٹیفکیٹ حاصل کر لیتے۔ شہر کے رہنے والے لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے یہ ایک نیا تجربہ ہوتا۔ اپنے ملک کے لوگوں کی غربت، زبوں حالی کا ان کے درمیان رہ کر دل پر کچھ ایسا اثر

لے کر واپس آتے کہ یہ بہترین شہری بنتے ملک سے باہر چلے جانے کے بجائے ملک میں رہ کر کچھ کرنے کی اُمنگ دل میں بھر جاتی۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ ہزاروں لوگ تھوڑی بہت علم کی روشنی حاصل کر رہے ہیں۔ اس انقلاب کے دس سالہ دور کو جس عزم' ہمت اور حوصلہ سے ایرانیوں نے سہا ہے اس میں اختر حسین کا کچھ حصہ بھی شامل رہا۔

ایران میں ایک رسم بڑی پیاری تھی کہ جس دن گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد سارے ملک میں ایک ہی تاریخ کو اسکول کھلتے اس دن رضا شاہ خود' ملکہ فرح' شاہی خاندان کے افراد' منسٹر' سیکریٹریز اور ہر ہر محکمے کے افسران مختلف اسکولوں کے پھاٹک پر بچوں کو کھڑے خوش آمدید کہتے اور ان پر سے گلاب کے پھولوں کی پتیاں نچھاور کی جاتیں۔ جب پہلے سال تعلیم بالغان کے اسکولوں کا اسی تاریخ کو افتتاح ہونا تھا تو رات کو مجھ سے کہا کہ "صبح پانچ بجے ہم دونوں کو "کیمپین سی" جانا ہے" "میں نے پوچھا کیوں کر؟ کل چھٹی تو ہے نہیں آپ کیسے جا سکتے ہیں؟ بولے بہت ضروری جانا ہے آپ خود دیکھ لیں گی کہ کیوں آئے ہیں"' "کیمپین سی" جانے کا راستہ انتہائی اونچے پہاڑوں سے گزرتا ہے' سڑک بہت ہی پُر پیچ اور خطرناک ہے۔ موٹروں کی رفتار بہت آہستہ رکھی جاتی ہے۔ آدھے رستے پر پہنچنے کے بعد میں نے دیکھا کہ ڈرائیور دو پہاڑوں کے درمیان ایک نہایت پتلی سی سڑک پر موٹر موڑ کر آگے بڑھنے لگا۔ میں گھبرا اٹھی "دیکھیے' دیکھیے یہ کدھر کو چل پڑا" ہنس کر کہا ٹھیک وہیں جا رہا ہے جہاں ہم کو جانا ہے۔ کچھ دور جا کر موٹر روک لی۔ اوپر ایک پگ ڈنڈی سے پہاڑ پر ڈرائیور اور ان کے ایک ایرانی افسر کے ساتھ ہم چڑھنے لگے۔ سامنے ہی ایک چھوٹا سا گاؤں جس میں تیس چالیس ننھے ننھے ایک یا دو کمروں کے مکان تھے جو پہاڑ کے دامن میں اونچائی نیچائی پر قریب ہی قریب بنے ہوئے' ہر ایک کے سامنے چھوٹے موٹے باغ اور ہر طرف پھلوں کے درخت سارے ہی ایران میں ہر دیہات ہر قصبہ اتنا صاف ستھرا ہے کہ بعض وقت آپ کو خیال گزرے کہ شاید ان گلیوں میں سے کوئی گزرتا نہیں۔ ایک گھر کے پیچھے صحن میں ایک چھوٹا سا فوارہ اور چند گلاب کے پیڑ از بس ضروری ہیں غریب سے غریب کے کمرے میں ایک قالین ضرور بچھا ہوا ہوتا۔ ہر شے کس قاعدے اور صفائی سے رکھی ہوئی۔ ایک طرف سماوار جو ہر وقت چائے سے تیار

بھاپ دیتا ہوا۔ مہمان نوازی اور شائستگی کس قدر۔ جہالت اور غربت کے باوجود ہر ایرانی کی طرزِ گفتگو پڑھے لکھے امیرو کبیر میں آپ فرق نہ پائیں گے۔

ایک طرف ایک اسکول اور کچھ فاصلے سے دوسرا اسکول چٹائیوں سے بنے ہوئے نظر آئے۔ سارے ہی گاؤں والے بزرگ' جوان اور کم عمر' ان کے آس پاس موجود تھے کہ ہم بھی پہنچ گئے۔ وہاں ان افسر صاحب نے دونوں لڑکوں اور دونوں لڑکیوں کو آگے بڑھ کر بتا دیا کہ "رئیس سازمان ملی ڈاکٹر حسین" آئے ہیں۔ انہوں نے باآواز بلند اعلان کر دیا۔ ان سب کی خوشی دیکھنے والی تھی۔ ان کی خواہش ہوئی کہ اختر اسکول کے سامنے کا فیتہ قینچی سے کاٹ کر افتتاح کریں۔ اختر نے بڑھ کر سب سے زیادہ ضعیف خاتون کے ہاتھ میں قینچی دی کہ وہ بسم اللہ کریں۔ نازک لمبی سی جھکی کمر کی یہ ضعیفہ کس قدر فخریہ انداز سے بڑھ کر آگے آئیں اور اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے انہوں نے اقراء کی پہلے پوری سورت پڑھی پھر فیتہ کاٹا اور اپنی چادر سے آنکھوں کے آنسو پونچھتے ہوئے دعائیں دیتی ٹولی میں جا کر کھڑی ہو گئیں۔ میں سوچ رہی تھی کہ اپنی جوانی میں یہ کس قدر حسین ہوں گی۔ اسی طرح مردانے اسکول کا افتتاح ایک بزرگ مرد سے کروایا پھر بلیک بورڈ کو آگے کروا کر اختر نے چاک ہاتھ میں پکڑ کر لکھا ع۔ ل۔ م۔ کہا یہ ان کے نام ہیں اور ان کی آواز ہے ا۔ ل۔ م۔ دیکھیے اب یہ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر دوست بن کر تھوڑی سی جگہ پر کھڑے ہوتے ہیں "علم"! ہر طرف سے سب نے زور زور سے کہا "علم"۔ پھر ان سے کہا اب آپ لوگ پڑھانا شروع کریں۔ دونوں اسکولوں کے دس بارہ لڑکے اور آٹھ دس لڑکیاں کس شوق سے اپنے چٹائی والے اسکول میں داخل ہو گئے یہاں پر حُسن کی فراوانی کا احساس شدت سے ہوا۔ یہ وہ علاقہ تھا جس میں سے جب تیمور لنگ کی فوجوں کو گزرنا تھا تو فوج کو اس علاقے میں پڑاؤ کرنے سے منع کیا گیا تھا کہ کہیں فوج ہمیشہ ہی کے لیے یہاں پڑاؤ کر کے رک نہ جائے!!

دوسرے دن اخباروں میں یہ خبر چھپ گئی۔ شام کو ملکہ فرح نے فون کر کے اختر کا بے حد شکریہ ادا کیا اور ساتھ ہی کہا کہ انشاء اللہ چند سالوں میں ملک کے گوشے گوشے میں یہ آپ کے چٹائی والے اسکول پختہ عمارت والے اسکول ہو جائیں گے۔

اختر کی ایران کے ساتھ والہانہ محبت کا کیا حال بتاؤں؟ شیخ سعدی' حافظ اور عمر خیام

کے مزاروں کے ہم دونوں نے بے شمار چکر لگائے۔ ہر بار اختر پر عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ ایرانیوں نے' ان سب سے عقیدت' محبت اور احترام کے اظہار کے لیے ان کے مزارات جتنے حسین اور شان دار بنوائے ہیں ویسے دنیا کے کسی اور ملک نے اپنے شاعروں کے لیے نہیں بنوائے۔

ایران میں چار سال کی رہائش کے دوران ہم کو ایک منٹ کو یوں نہ لگا کہ ہم اپنے ملک میں نہیں ہیں۔ اصفہان کے چپے چپے پر تاریخ بکھری پڑی ہے۔ ایک سے ایک حسین عمارات محل اور مساجد ہیں۔ ان سب کی دیکھ ریکھ گورنمنٹ نے اس طور کر رکھی ہے کہ ان کی شان و شوکت اسی طرح قائم رہے۔ ایک بار پہلے اختر جب ایران گئے تھے تو "صائب" کی قبر کو ڈھونڈ نکالا تھا جو گمنامی میں کسی باغ کے گوشے میں ملی تھی۔ اس پر وہاں کی گورنمنٹ کو توجہ دلوائی تو اس باغ کو خرید کر حکومت نے قبر پر پہلے تو تختی لگادی پھر نقشہ بنا اور مقبرہ ہمارے وہاں کے قیام میں تکمیل کو پہنچا۔

مشہد میں امام رضا کے مزار پر دسیوں بار گئے۔ ہر بار ایک عجیب سی کیفیت ہوتی۔ آپ رات اور دن میں کسی وقت بھی جائیں ہزار ہا لوگ مزار کا چکر لگاتے اور نمازیں پڑھتے آپ کو ملیں گے۔ اسی طرح قم میں حضرت معصومہ کے مزار پر۔

جب ہم وہاں تھے' جس شہر بھی گئے' وہاں کی حسین مساجد میں ضرور ہر بار جاتے۔ حیرت ہوتی کہ کسی بھی مسجد میں کوئی نمازی نظر نہ آتا ہاں سیاح تصاویر لیتے ہوئے بے شک بہت ملتے۔ ہم دونوں مسجد کے کسی گوشے میں نماز پڑھ کر کچھ دیر بیٹھے رہتے۔ کبھی ان میں کیسی رونق ہوا کرتی ہوگی۔ اب تو صرف ان کا حُسن باقی ہے' پر نمازی غائب ہیں۔ اختر نے کئی بار ایسے موقعوں پر کہا کہ یہی ویرانی کسی دن بڑے طوفان کا پیش خیمہ بن کر ان کی رونقوں کو واپس لے آئے گی۔ اور ہوا بھی ایسا ہی کہ انقلاب کے بعد ایران کی مساجد نمازیوں سے پھر بھرنے لگیں۔

جب ہم ایران آئے تو اس وقت یہاں ہمارے ایک نامور شاعر ن م راشد بھی یونائیٹڈ نیشن کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ اختر کے ساتھ ان کی پرانی دوستی تھی۔ ہفتہ دس دن میں ضرور ایک بار وہ آجاتے یا ہم دونوں ان کے ہاں چلے جاتے۔ راشد صاحب کُھل کے جاتے۔ کبھی شطرنج کی بازی جم جاتی اور کبھی وہ اختر کو اپنی دو چار نظمیں ضرور سناتے۔ اختر

بے حد دلچسپی اور توجہ سے سنتے۔ اختر کی یہ عادت نہ تھی کہ کسی ایسی ویسی تخلیق پر جھوم اٹھیں اور تعریفوں کے پُل باندھ دیں' مگر راشد صاحب کی بیشتر نظموں کی بڑی تعریف کرتے اور کہتے راشد صاحب ابھی ہمارے زباں دانوں کو آپ کے کلام کی بڑائی کو سمجھنے اور ماننے میں وقت درکار ہوگا' خدا کرے آپ کی حیات میں وہ دن آجائے۔"

جمیل بھائی! آپ کو ایک بات اور بتادوں کہ یہ جو کہا گیا اور کیا گیا کہ ن م راشد کی وصیت تھی کہ ان کو وفات کے بعد جلا دیا جائے وہ غلط اور بالکل غلط ہے۔ راشد صاحب مرحوم کو چار سال ہم نے بہت قریب سے دیکھا۔ وہ بھلا ایسا کیسے کہہ سکتے تھے جس کی روح اپنے ملک' اپنی زبان کی شیدائی تھی۔ وہ تو اپنے دیس کی ڈھول' مٹی تک کا بڑے پیار سے ذکر کرتے۔ اسلام کو دنیا کا سب سے عظیم مذہب کہا کرتے۔ مومن بندہ کون ہے؟ اسلام کی روح کیا ہے؟ اس موضوع پر اکثر گفتگو کیا کرتے تھے۔

وہ بیچارے کتنے دُکھی انسان تھے۔ اپنی میم بیوی ہیلن کے ہاتھوں کتنے پریشان تھے۔ اس کا علم شاید بہت کم لوگوں کو ہوگا۔ عمر کا جو اتنا بڑا فرق تھا' اس نے ان کو دیوانہ ضرور بنادیا۔ وہ اس بیوی سے بہت دب گئے تھے۔ مگر دل سے ان کو اس کا غم بہت تھا۔ کسی ریسپشن میں جہاں ان کو مجھ سے اکیلے بات کرنے کا موقع مل جاتا تو ہر بار یہ ضرور کہتے "حمیدہ بہن! ہیلن کو خدارا آپ سمجھائیں کہ وہ ہر دم میرے ملک کے خلاف باتیں نہ کیا کریں۔ میرا لڑکا دو ماہ کی چھٹیوں میں آتا ہے تو اس کے ساتھ اتنا برا سلوک نہ کیا کریں۔

میں ہمیشہ ہی جب وہ اختر کے ساتھ شطرنج کھیل رہے ہوتے تو آہستہ آہستہ ہیلن کو ضرور سمجھاتی کہ ان کو ایک بہت بڑا شاعر شوہر ملا ہے' اس کا دل بہت نازک ہوتا ہے۔ یہ غیر انسانی سلوک اس کم عمر لڑکے سے نہ کیا کرو۔ اس کے ملک کو اچھا نہیں سمجھتی ہو تو کم از کم ان کے منہ پر بُرا نہ کہو۔ اپنا ملک اپنی زبان' اپنی موسیقی اور اپنا کھانا ہر انسان کو پسند ہوتا ہے۔ جو مذہب ان کو دل سے عزیز ہے اس پر یوں نکتہ چینی نہ کیا کرو۔ مگر وہ خاتون بڑی ہی بے حس' جابر اور ظالم تھیں۔ صد افسوس کہ مرحوم پر یہ تہمت رکھ کر کہ جلا دینے کی وصیت کی تھی۔ اس کا مقام ان کو ملنے نہ دیا۔ کاش ہم لوگ کسی بڑے مفکر پر کوئی الزام دھرنے سے پہلے اس کی نجی زندگی پر گہرائی سے نظر ڈالنے کی زحمت تو کیا کریں۔ اختر جب بھی لوگوں سے یہ اعتراضات سنتے تو ان کو بڑا دکھ ہوتا اور ہمیشہ کہا کہ ن م راشد نے

ہرگز یہ وصیت نہ کی ہوگی۔ کیا کسی نے اس کی تحقیقات کیں؟ کیا کبھی ان کا کوئی جملہ ایسا کسی نے سنا؟ کیا ان کی کسی تحریر میں کسی کی نظر سے ایسی بات گزری؟ میرے خیال میں حقیقت یہ ہے کہ ان بچارے کو جلوا دینے میں میم صاحب کی رقم کم خرچ ہوئی' دفن کرنے میں زمین اور کفن پر رقم زیادہ خرچ ہو جاتی اور کہیں ان کا وارث بڑا بیٹا اور بیٹیاں لاش کو پاکستان لانے کا اصرار کر دیتے تو؟

اس دوران میں اختر کی ایک آنکھ خود بخود سرخ سی ہونے لگی۔ گو تکلیف کا نام نشان نہ ہوتا۔ شاہ کے معالج آنکھوں کے ڈاکٹر کے زیر علاج رہے۔

چار سال پورے کرنے کے بعد یونیسکو نے اختر کو پیرس ہیڈ کوارٹر میں بلا لیا۔ ایران چھوڑنے کا رنج ہم دونوں کو کچھ یوں ہوا جیسے ہم اپنے ملک سے کسی اور ملک جا رہے ہیں۔

اختر تو ہر سال ہی دو تین بار پیرس آتے جاتے رہے۔ میں اب پندرہ سال بعد جو پھر آئی تو مجھے خاصا فرق لگا۔ ایک سب سے بڑا فرق یہ لگا کہ ان کے کلچر' لباس اور نشست و برخاست اور خوراک سب پر ہی امریکن انداز غیر معمولی طور سے نمایاں تھا جو اس قدر مہذب قوم پر ذرا زیب نہ دیتا۔ دل کو دکھ ہوا۔ پیرس کے اطراف میں ہمیں 'تمیں منزلہ' عمارات بھی کھڑی منہ چڑھاتی سی لگتیں۔ سوچتی کہ اتنی مہذب قوم نے اپنے سے اس قدر کم تر تہذیب کا ایسا اثر کیوں قبول کر لیا۔ بس یہی نا کہ وہاں روپے کی ریل پیل اور جنگ کے اثرات سے یہاں نقدی کی کمی!

گرمی کی تعطیل میں لڑکے لندن اور پاکستان سے آئے تو اختر اپنی سالانہ پانچ ہفتے کی چھٹی لے کر ہم سب کو لے کر سیر کے لیے ہالینڈ' بلجیم' جرمنی اور سوئٹزرلینڈ لے گئے۔ اب یہ سب بڑے ہو چکے تھے بہت لطف اندوز ہوئے۔ اس بار ہم پیرس میں قریب دو سال رہ کر اپنے ملک ۱۹۷۲ء میں واپس آ گئے۔ وہاں رہتے میں ہمارے ملک کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے جو کرب انگیز وقت ہم پر سے گزرا۔ مجھے وہ زندگی بھر نہ بھولے گا کہ میز کے ایک طرف میں اور دوسری طرف اختر بیٹھے ہوئے ان کے سامنے ریڈیو رکھا تھا فرانسیسی اسٹیشن سے خبریں سن رہے تھے۔ جب اعلان سنا کہ ہماری فوج نے ہندوستانی فوج کے آگے کس انداز سے ہتھیار ڈالے تو اختر کی ایک زوردار سسکی نکلی اور ساتھ ہی ناک سے کچھ خون بھی میز پر گرا۔ ماتھے کو میں نے چھوا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ میں نے ریڈیو بند کر

دیا۔ جلدی سے برف ان کے سر پر رکھی۔ وہاں کے ٹی وی پر جو کچھ ان آنکھوں نے دیکھا وہ جان لیوا تھا۔ اختر نے ایک ہفتے کی چھٹی لے لی اور گھر سے نہ نکلے۔ دس بجے رات کے بعد اپنی روزانہ کی واک کر آتے۔ کہتے مجھے لوگوں کا سامنا کرتے شرم آتی ہے۔

ہماری فوج کے بانوے ہزار جوان اور افسر ہندوستان کی قید میں تھے۔ حکومت ہر طرح ان کی رہائی کے لیے کوشاں تھی۔ ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل نے اختر سے درخواست کی کہ آپ بھارتی ادیبوں' شاعروں اور فنکاروں سے جنگی قیدیوں کے سلسلے میں ایک پیغام نشر کر دیں جو اختر نے فوراً جا کر نشر کیا۔ جس دل کی گہرائی اور انداز سے اختر نے بھارتی ادیبوں' شاعروں اور فن کاروں کو مخاطب کر کے اپیل کی وہ کچھ یوں تھی "آپ سب اپنے قلم کے زور سے تلوار کی دھار کو مات دے سکتے ہیں' انسانیت اور ضمیر کی آواز کو للکاریں جو کلنگ کا ٹیکہ آپ کی دھرتی ماتا کے لگا ہے اس کو آپ مٹا دیں" اختر کی آواز بار بار نشر ہوتی رہی۔ ہندوستان کے بیشتر ادیبوں' شاعروں اور فنکاروں نے اس قدر لکھا کہ اس کا اثر ہوا اور ضرور ہوا۔ اسلام آباد سے جو شکریے کا خط آیا اس کو نقل کر رہی ہوں:

"۲۸ فروری ۷۳ء

محترمی تسلیمات

میں بے حد ممنون ہوں کہ پاکستانی جنگی قیدیوں کے سلسلے میں' بھارتی ادیبوں' شاعروں اور فنکاروں کے نام پیغام نشر کرنے کے سلسلے میں' آپ نے ہماری درخواست کو قبول فرمایا اور نہ صرف ہمارے ساتھ تعاون کیا بلکہ اس نشریے کے لیے معاوضہ بھی قبول نہیں کیا۔

میں معترف ہوں کہ قومی زندگی کے ہر نازک مرحلے پر جب بھی ریڈیو پاکستان کو آپ کی آواز یا تحریر کی ضرورت محسوس ہوئی' آپ نے ہمیشہ اس ادارے کے ساتھ تعاون کیا جس کے لیے میں اور میرے رفقائے کار آپ کے ممنون احسان ہیں۔

امید ہے آپ کا تعاون ہمیں ہمیشہ حاصل رہے گا۔

آپ کا مخلص
خواجہ شاہد حسین

(ڈائریکٹر جنرل پاکستان براڈکاسٹنگ کارپوریشن (ہیڈ کوارٹرز) راولپنڈی)

تاریکیاں

اٹھارہ برس گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا۔ جی بھر کر پورے یورپ، افریقہ اور ایران کی سیریں کیں۔ اپنے ملک آکر اختر بے حد خوش کہ گھر جا بیٹھیں تو میں لکھنے پڑھنے کا کام کھل کے کروں۔ چند ماہ عرفان میاں کی شادی کی تیاری اور پھر شادی کی گہما گہمی رہی۔ عرفان کی دلہن فریدہ بے حد پڑھی لکھی اور ساتھ ہی اپنی تہذیب و تمدن کی دلدادہ بڑی ہی کمال قسم کی لڑکی۔ لاہور میں پڑھاتیں، لیکن جب بھی چند دنوں کو آجاتیں تو اختر شاد ہو جاتے۔ بیٹی کیا چیز ہوتی ہے اس کا احساس ان کو پہلی دفعہ ہوا۔ اختر کے ذہنی لیول کے مطابق باتیں کرتیں اور جھپ سے اکثر اختر کے لیے کچھ پکا بھی آتیں جو بے حد لطف لے کر کھاتے۔

دوست احباب کو جمع کرنا اور ان کی صحبت سے لطف اندوز ہونے کا موقع اٹھارہ سال بعد میسر ہوا۔ یہاں آکر بھی اختر کو گاہے بگاہے آنکھوں کی تکلیف ہوا کرتی۔ اردو بورڈ میں لغت کی تیاری ایک طویل عرصے سے ہو رہی تھی۔ شان الحق حقی صاحب نے ۱۹۷۳ء میں اختر کو نظرثانی کے فرائض ادا کرنے پر تیار کرایا۔ میں نے بہت کہا کہ نظر پر زور پڑے گا مگر بڑی خوشی خوشی اس کام میں جت گئے۔ جب ایک آنکھ کی بینائی بہت خراب ہو گئی تو وہاں جانا چھوڑ دیا۔ شاید ۱۹۷۵ء تھا کہ یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر مقرر کر دیے گئے۔ اختر نے نہ کبھی اپنی کوئی تقریر لکھی نہ لکھی۔ لیکن کچھ تقریریں اس قدر مدلل ہوتے کہ جب بھی جس نے بھی کبھی سنا وہ ان کو ہمیشہ یاد رہا۔

۱۹۷۶ء اور ۱۹۷۷ء میں بھٹو صاحب نے پاکستان کی ہسٹری پر انگریزی میں بڑی جامع اور رنگین تصاویر کے ساتھ نہایت خوبصورت بڑی موٹی سی کتاب تیار کروا کر باہر کے ملکوں کو پاکستان سے روشناس کروانے کے لیے چھپوائی اور اس کی پہلی کاپی جب اختر کے ہاتھ میں آئی تو بے حد خوش ہوئے۔ اس کتاب کی ایڈیٹنگ میں ہمارے بیٹے عرفان حسین کا بڑا ہاتھ رہا تھا۔ اختر کی خواہش ہوئی کہ اس کا ترجمہ بھی اس ٹھاٹ کے ساتھ ضرور چھپنا چاہیے۔

یہ بات جب بھٹو صاحب تک پہنچی تو اس کام کے لیے انہوں نے اختر کا انتخاب کیا۔ انتخابات میں وقت تین چار ماہ کا باقی تھا اور ان کی خواہش تھی کہ ترجمہ ہو کر اس سے پہلے چھپ جائے۔ اس قدر جلد اس کام کو اور کون انجام دے سکتا تھا۔ جمیل بھائی! آپ کو بھی خوب یاد ہو گا کہ اس کے کچھ چیپٹرز کے ترجمے کے لیے آپ کو بھی آمادہ کر لیا تھا اور آپ نے کیسی محنت اور پھرتی سے یہ ترجمہ کر دیا تھا۔ اسی طرح اور چند لوگوں سے بھی کروایا اور خود کیا تھا۔ اس کے پروف خود دیکھ رہے تھے۔ اور میں تڑپی جاتی کہ اللہ یہ خود نہ دیکھیں، آنکھ پر بہت زور پڑ رہا ہے، مگر اختر کا یہ جذبہ، شوق کہ اتنی معلوماتی اور حسین کتاب اردو میں ضرور چھپ سکے۔ اور سب صاحبان کو اس کا معاوضہ دلوایا اور خود کچھ نہ لیا۔ یہ چھپنے چلی گئی اور جب چھپ کر نکلی تو بھٹو صاحب معزول کیے جا چکے تھے۔ وہ تو زنداں کی کال کوٹھری میں تھے۔ ضیاء الحق صاحب نے اس کتاب کو تلف کر دینے کا حکم صادر کر دیا اور ساتھ ہی انگریزی والا ایڈیشن ہر سفارت خانہ سے ہٹوا دیا گیا۔ پبلشر جو انگلستان میں تھا اس کتاب کی بیشتر جلدیں وہیں تھیں، ان سب کو خرید کر وہیں تلف کروا دیں گئیں!! اور اختر کی ایک آنکھ ہمیشہ کے لیے اس کتاب کی نذر ہو گئی۔ اختر کو اپنی آنکھ کا وہ غم نہ تھا جو اس کتاب کو اس طور تلف کروا دینے کا تھا۔ بار بار مجھ سے کہتے ہماری قوم اور ملک کی بدنصیبی کا اندازہ تو لگاؤ کہ صرف انسانوں ہی سے بدلہ نہیں لیا جاتا بلکہ کتابوں تک کو سولی چڑھا دی جاتی ہے۔ یہ کتاب تو دنیا کے معیار سے اعلیٰ ترین تھی۔ اس میں ایک چیپٹر بھٹو صاحب کے دور حکومت پر بھی تھا۔ ہر حکمراں اپنے دور میں اچھے اور غلط کام کرتا ہے۔ ہسٹری ایسے ہی بیانات کا نام ہے۔ اگر ہر آنے والا حکمراں پہلے والے کو صفحۂ ہستی سے مٹاتا رہا تو کیا ہم اپنی آنے والی نسلوں کو پاکستان کی ہسٹری پڑھنے کے لیے سادے صفحوں کی کتاب پکڑا دیا کریں گے؟

صہبا لکھنوی کو خداوند کریم ہزاری عمر عطا کرے۔ وہ اختر سے آکر بار بار اصرار کرتے رہے کہ آپ اپنی سوانح حیات قلم بند کیجیے۔ ان کا اصرار اور ان کا انکار۔ میں جب گیٹ تک صہبا صاحب کو رخصت کرنے جاتی تو ان سے کہتی کہ بس آپ اصرار کرتے رہیں اور اکثر فون پر تقاضا کریں۔ شاہد احمد (ساقی والے) تو اختر کو کمرے میں بند کر کے باہر سے تالا لگا دیا کرتے تھے کہ جب تک افسانہ لکھ نہ دو گے قفل نہ کھولا جائے گا تو زچ ہو کر لکھ دیا

کرتے۔ آپ بھی اتنا اصرار کیے جائیں کہ زچ ہو کر ہامی بھر لیں۔ آخر کو اختر نے ہامی بھرلی اور اپنا قلم اُٹھالیا پہلی قسط "افکار" میں چھپی۔ جس کی ہر طرف سے بڑی پذیرائی ہوئی اس طرح ہر ماہ قسط چھپتی رہی۔ اختر کی بینائی کم سے کم ہوتی گئی۔ سات قسطیں لکھ پائے تھے کہ آنکھ کا آپریشن ہوا۔ ڈاکٹر کرمانی نے جس بے دردی سے کیا اس کے نتیجے میں آنکھ کی روشنی ہمیشہ کے لیے گل ہو گئی۔

جمیل بھائی! میں پوری تفصیل کے ساتھ آپ کو اس کرب ناک واقعہ کو اس امید پر سنا رہی ہوں کہ کاش ڈاکٹر کرمانی کی نظر سے "ہم سفر" کا یہ حصہ گزرے۔ اور پھر شاید وہ چلّو بھر پانی کی تلاش میں پھریں یا پھر ایک بار میرا آمنا سامنا تو کریں۔ ہوا یوں کہ جس روز ڈاکٹر کرمانی نے آپریشن کا وقت جناح اسپتال میں مقرر کیا تھا۔ اسی دن کرفیو لگ گیا تھا۔ ہم وقت مقررہ پر اسپتال اس لیے پہنچ پائے کہ سلمان بیٹے کے پاس صحافی کی حیثیت سے کرفیو پاس آچکا تھا۔ ڈاکٹر کرمانی موجود تھے' ہمیں بتایا کہ آج اسپتال کا عملہ نہ آسکا۔ تو ان سے کہا کہ پھر آج آپریشن ملتوی کر دیں مگر ان کا اصرار کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا وہ آپریشن اسی وقت کریں گے۔ کاش ہم ضد کر کے اختر کو واپس گھر لے آتے۔ مگر منظورِ خدا تو یہ تھا کہ وہ اپنی آخری عمر کے دس سال تاریکیوں میں ڈوب کر بسر کریں۔

آپریشن کے بعد ڈاکٹر کرمانی اختر کو اس لمبی گیلری میں چلاتے ہوئے لائے کہ کرسی میسّر نہ تھی۔ پیدل چل کر موٹر تک آئے اور پھر ڈاکٹر کرمانی کے پرائیویٹ اسپتال جو گارڈن روڈ پر تھا وہاں لائے گئے۔ شام کو جب ڈاکٹر کرمانی آئے تو اختر نے ان سے پوچھا کہ وہ صبح کو ورزش کرنے کے عادی ہیں۔ کیا ورزش کر سکتے ہیں؟ جی تھوڑی ورزش رُک رُک کر کرلیں! آنکھ کا آپریشن کرنے کے دس منٹ بعد ان کو اتنا پیدل چلایا گیا۔ ورزش کی بھی اجازت دے دی۔ صبح اختر نے میرے ہزار منع کرنے پر ہاتھوں اور پاؤں والی ورزش کروالی کہ "ڈاکٹر صاحب نے اجازت دے دی ہے۔ اور ہاتھوں' پاؤں کا بھلا آنکھ سے کیا تعلق؟"

چوتھے دن پٹی کھولی۔ اختر نے کہا ڈاکٹر صاحب جتنا مجھے پہلے نظر آتا تھا اب اس سے بہت کم نظر آرہا ہے۔ تو کیا دو ماہ بعد جب کالے پانی کا آپریشن کر دیں گے تو بینائی بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ دو ماہ بعد کالے پانی کا آپریشن اپنے اسپتال میں کیا۔ دو دن بعد گھر

آگئے۔ چوتھے دن پٹی کھولی جب کہا کہ ڈاکٹر صاحب ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے تو یہ جواب ملا کہ وہ جو کر سکتے تھے کر چکے۔ اب آپ میرے پاس آنے کی زحمت نہ کریں! ہمارے ملک کا ایک نامی گرامی ڈاکٹر اپنے ملک کے سب سے نامور عالم' ادیب اور مفکر سے اس بے رحمانہ انداز سے اس کی دنیا کو اپنے ہاتھوں تاریک کر دینے کے بعد فرماتے ہیں۔ دو حرف دلاسے اور ایک حرف ہمدردی کا ان کے پاس نہ تھا۔ اختر کے غم اور صدمہ کو ان کے ان الفاظ نے دس گُنا زیادہ کر دیا۔ وہ تو شکریہ کہہ کر کھڑے ہو گئے اور میری کیفیت ایک شیرنی جیسی ہو گئی۔ میرا دل چاہا کہ آگے بڑھ کر اس قصائی ڈاکٹر کی آنکھیں نوچ کر یہی جملہ کہوں کہ میں جو کر سکتی تھی کر دیا اور کبھی میرے پاس شکوہ' شکایت کو نہ آئیں۔ میری عمر بھر کی رفاقت میں پہلی بار یہ دیکھنے میں آیا کہ کسی کی مجال اختر سے اس طرح بولنے کی ہوئی ہو۔ اختر تو شکریہ ڈاکٹر صاحب کہہ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے اختر کا ہاتھ پکڑا تو محسوس کیا کہ وہ کپکپارہے ہیں۔ پورا سال جس طرح سے اختر پر سے گزرا ہو گا۔ وہ تو ضبط اور صبر کے بندے اور میں ایک معمولی انسان' ان کی حالت دیکھ اور سوچ کر تڑپ تڑپ اُٹھتی۔

جمیل بھیا! آگے ذرا اور بھی سنیے۔ ایک سال بعد امریکہ سے آدھے درجن بڑے بڑے ماہر چشم کی ٹیم پاکستان آئی۔ ہم اختر کو لے کر جناح اسپتال بڑی اُمیدوں سے گئے۔ ہم کو خبر نہ تھی کہ اس ٹیم کے کرتا دھرتا ڈاکٹر کرمانی ہیں۔ اختر نے اپنا کارڈ اندر بھجوایا تو جھٹ سے ڈاکٹر کرمانی نکل کر باہر آئے "مہربانی سے آپ تو تشریف لے جائیں جو زیادہ مستحق لوگ ہیں ان کے لیے یہ ٹیم آئی ہے۔ جس کو میں دِکھوانا چاہوں گا صرف ان کو یہ ڈاکٹر دیکھیں گے! دروازہ جھٹ سے بند کر لیا۔ کیا لڑکے اور میں چپ بیٹھ سکتے تھے۔ امریکن ڈاکٹروں کی ٹیم سے اپنے ذریعے سے وقت لے کر ان کے جہاز پر گئے۔ بہت ہی ہمدردی اور اخلاق سے ملے تو بڑی معذرت کے ساتھ کہا کہ "ہم بڑے مجبور ہیں کہ آپ کو یہاں دیکھ نہیں سکتے کہ جس کو ڈاکٹر کرمانی پیش کریں گے صرف ان کو ہی دیکھ سکتے ہیں۔ آپ امریکہ آجائیں ہم ہر سہولت آپ کو مہیا کریں گے اور بھی بڑے سے بڑے ڈاکٹروں کو دکھائیں گے۔ اس طرح اختر مارچ ۱۹۸۰ء میں نوید بیٹے کے ساتھ روانہ ہوئے وہاں ڈاکٹروں کی اسی ٹیم نے کئی دن تک ہر ہر طرح دیکھا اور چند اور ماہرینِ چشم کو دکھوایا۔

سب کی متفقہ رائے یہ تھی کہ آپریشن غلط کیا گیا ہے۔ آپریشن کے بعد کی احتیاط نہیں کرائی گئی۔ اب وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ اختر کے دل پر جو بھی بیتی ہوگی وہ آپ سمجھ سکتے ہیں۔ ہماری بہو اُن دنوں برکلے یونیورسٹی سے آرکی ٹیکچر کا کورس کر رہی تھیں۔ ان کے ذریعے یونیورسٹی میں بات پھیل گئی کہ پاکستان سے ایک بڑا اسکالر آیا ہوا ہے۔ ہر شام کچھ طالب علم ان کو گھیر کر بیٹھ جاتے اور فیض یاب ہوتے۔ شاہد ان دنوں "مِنی سوٹا" میں ملازمت کر رہے تھے۔ وہ اپنی ملازمت چھوڑ کر اپنے ابا کے پاس "برکلے" آگئے تھے۔

اختر دو ماہ بعد نوید بیٹے کے ساتھ واپس آگئے۔ ان کی تو صبر و شکر کی عادت تھی۔ چپ اور خاموش سے ہو گئے۔ ہاں شاموں اور چھٹی والے دن لڑکے اور ان کے دوست اختر کے چاروں طرف بیٹھ کر بحث اور مباحثے کرتے تو جچے تلے الفاظ اور بڑے سلجھے طریقے سے جو کبھی جواب دیتے۔

اختر کے ایک دوست کمانڈر انور سے میں نے کہا کہ کیوں نہ ہر ماہ ایک دو بار ادیب دوستوں کی بیٹھک ہمارے ہاں ہونے لگے تو اختر خوش ہو جایا کریں گے۔ پر آپ خود ہی جن کو چاہیں فون کر کے بتا دیا کریں۔ پھر ایسا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کیا ہی خوب وہ شام ہوتی جب چیدہ چیدہ احباب تشریف لاتے۔ سب ہی ایک دوسرے کی صحبت سے فیض یاب ہوتے اور اختر کئی دن تک اس بیٹھک کا ذکر کر کے خوش ہوا کرتے۔ میں اسی دوران میں برابر صہبا صاحب کو فون پر یاد دلاتی کہ آپ اختر سے سوانح عمری ختم کرنے کو کہتے رہیں۔ اللہ سلامت رکھے صہبا صاحب کو کہ اختر کے صاف انکار پر بھی انہوں نے ہمت نہ ہاری' کبھی تشریف لے آتے اور گاہے فون پر یاد دہانی جاری رکھتے۔

ادھر ایسا بھی ہوا کہ ایک خاتون لیلیٰ خورشید جو غالب پر ڈاکٹریٹ کر رہی تھیں' کسی نکتہ پر پروفیسر صاحب ان کی تشفی نہ کر سکے اور ان سے کسی نے کہا کہ کیوں نہ وہ ڈاکٹر اختر حسین سے مل کر تسلی بخش جواب حاصل کر لیں۔ یوں وہ اپنی اردو کی لیکچرار مس شمسہ اور میری ایک بھاوج نسیمہ مقال کے ساتھ ایک دن آئیں اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ اختر نے خوشی خوشی ہامی بھرلی کہ وہ کل سے صبح ۱۰ بجے آجائیں' اور جتنے دن چاہیں آتی رہیں۔ کئی دن وہ سوالات کر کے ان کے جوابات نوٹ کرتی رہیں' میں نے ایک دن جاتے جاتے ان کو "افکار" کے وہ سات عدد شمارے جن میں "گردِ راہ" کی سات قسطیں چھپ چکی تھیں

دیں کہ "لیلیٰ ان کو پڑھ لو۔ اگر تم کوشش کرو شاید اختر مان جائیں تو تمہارا قلم "گردِ راہ" ختم کروے تو بڑا کارنامہ انجام دے دو گی۔"

لیلیٰ نے گھر لے جا کر سب کو پڑھ ڈالا۔ دوسرے دن جب وہ آئیں تو اختر سے کہا "ڈاکٹر صاحب آج میں اگر کچھ اپنی پسند کی چیز پڑھ کر سناؤں تو آپ سنیں گے؟" "ضرور' ضرور آپ شوق سے سنائیں" انہوں نے انکار کھولا اور ساتویں قسط "پاکستان ناگزیر تھا" پڑھنا شروع کیا۔ خاموشی سے سنتے رہے' کبھی مسکرا دیتے۔ میں دور کرسی پر بیٹھی ان کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ کو دیکھا کی۔ میں نے خاموشی سے آگے بڑھ کر ایک رجسٹر اور قلم لیلیٰ کے آگے رکھ دیا کہ وہ لکھنے لگیں۔ قسط ختم کر کے صرف اتنا کہا "جی' آپ ڈکٹیشن دیں میں لکھ رہی ہوں" یہ سلسلہ جہاں سے ٹوٹا تھا وہیں پر ان کے خیالات کا برقی تار جیسے کسی نے جوڑ دیا۔ اختر بولنے لگے اور لیلیٰ لکھنے لگیں۔ گاہے وہ خاموش ہو جاتے' پھر بولنے لگتے۔ کبھی دس پندرہ منٹ کی خاموشی' ادھر لیلیٰ جیسے کوئی بت کی مورت' قلم پکڑے خاموش بیٹھی رہتیں۔ پھر بڑے آہستہ سے کہتیں "جی" اور پھر وہ سلسلہ شروع کر دیتے۔ اس طور "گردِ راہ" کی گرد حرفوں اور جملوں کی شکل اختیار کرتی رہی چار ماہ میں تکمیل کو پہنچ گئی۔ اختر کے دل کا بوجھ اُترتا گیا اور میں خوش ہوتی رہی۔

اس دوران میں صہبا صاحب اکثر تشریف لاتے رہے۔ ایک بار اس کو پورا سننے کے بعد جب صہبا صاحب آئے تو ان کے ہاتھ میں یہ کہہ کر دے دیا "لیجیے اپنی امانت" "گردِ راہ کی طباعت کا کام بڑی پھرتی سے ختم کروایا پھر پروف صہبا صاحب نے خود اختر کو پڑھ کر سنائے۔ ان کے چہرہ پر ایک عجیب خوشی کے آثار نظر آئے۔ اختر نے ان سے کہا اب آپ یہ پروف ایک ہفتہ کو میرے پاس چھوڑ جائیں۔

جمیل بھائی آپ کو خوب یاد ہوگا کہ آپ کو فون کر کے بُلوایا اور وہ پروف آپ کو دے کر کہا کہ آپ ایک نظر ڈالنے کی زحمت کریں۔ اور آپ نے کس قدر شوق سے ان کو دو دن میں ہی پڑھ کر اختر کو واپس لا کر دے بھی دیے۔

کیسی عجیب بات ہے کہ اختر کی آخری کتاب کے پُروف آپ نے دیکھے۔ اور مجھ سے جانے کیسے میری پہلی اور آخری کتاب "ہم سفر" لکھوا بھی لی اور پھر یہ بھی فرما دیا کہ جہاں آپ نے اس کو الف سے ے تک دیکھنے کی زحمت کی' اب اگر یہ چھپی تو پُروف آپ خود

دیکھیں گے! یہ اختر کی خوش بختی ہے کہ ان کے کیسے کیسے قدردان ہیں کہ ان کے طفیل میں اتنی مصروفیت اور قیمتی وقت کو "ہم سفر" کی نظر کردیا۔ میرے پاس شکریہ کے الفاظ نہیں۔

آخر ایک دن وہ آیا کہ صہبا صاحب نے اختر کے ہاتھ میں گرد راہ کی جلد رکھ دی۔ اختر ہاتھ سے ٹٹول کر کتاب کو ادھر سے اُدھر کر رہے تھے۔ میں پاس ہی بیٹھی دیکھ رہی تھی۔ ان کے چہرے کی جلد کا رُواں رُواں کچھ لمحوں کے لیے کھڑا ہو گیا۔ پھر ایک سکون کیفیت چہرے سے عیاں ہونے لگی۔ کتاب کے کاغذ کو چھو کر اندازہ لگا رہے ہوں کہ وہ کس قسم کا ہے۔ کتاب کی لمبائی چوڑائی کو بھی اپنے طور سے دیکھا۔ پھر کتاب کی ورق گردانی سی کی اور سامنے میز پر رکھ کر بولے "حمیدہ بیگم قدرت کی ستم ظریفی ہے ناکہ اس کو میں خود پڑھ نہیں سکتا" میری آنکھوں سے آنسو کے دریا بہہ رہے تھے اس میں غم اور خوشی دونوں ہی شامل تھے۔

چند دن کے اندر ہی ہر ہر اخبار میں "گردِ راہ" پر تبصرے چھپنا شروع ہو گئے۔ خطوں اور تاروں کی بوچھاڑ سی ہونے لگی۔ جب میں ان کو پڑھ کر سناتی تو آنسوؤں سے میری آنکھوں میں دھند سی چھا جاتی۔ پر اختر کے چہرے پر کوئی ایسی کیفیت عیاں ہوتے نہ دیکھی جس سے یہ اندازہ ہوتا کہ وہ کوئی بہت بڑا کام انجام دے گئے۔

حکیم سعید صاحب نے کیسے ذوق شوق سے "گردِ راہ کی ایک شام" کا اہتمام کیا۔ جمیل بھائی آپ ہی نے تو اس کی صدارت کی تھی۔ شہر کے سارے بڑے بڑے ادیب اور شاعر اس میں جمع تھے۔ بہتوں نے تقاریر کر کے خراجِ تحسین پیش کیا۔ مجنوں صاحب باوجود اپنی علالت اور کمزوری کے تشریف لائے۔ صہبا صاحب کا چہرہ مسرت سے دمک رہا تھا۔ اور کیوں نہ دمکتا کہ ان کی ہمت اور لگن تھی کہ "گردِ راہ" لکھی گئی اور شائع ہوئی۔ جانے کب تک یہ کتاب قوم کی راہ نمائی کیا کرے گی۔

یہ پورا سال اختر کے لیے خوش کن تھا گو منہ سے تو کبھی ایک حرف نہیں کہا مگر جو خراجِ تحسین سے سارے ملک اور باہر کے ملکوں میں بسنے اور ذوقِ ادب رکھنے والوں نے پیش کیا اور جس انداز سے قدردانی کی اس کی خوشی ان کو ضرور ہوئی۔

اختر صاحب نے کم ضرور لکھا مگر جو بھی وہ اپنے قلم سے لکھ گئے اس کا مقام کچھ ایسا رہا

کہ اس کی اہمیت کو ان کے مخالفوں تک نے مانا۔ میرے خیال میں یہی بڑا ادب کہے جانے کا مستحق ہوتا ہے۔

—○—

میری بیماریاں

میرے اُلٹے ہاتھ کی ہڈی دس سال پہلے گر کر ٹوٹ گئی تھی۔ سرجن جوکھیو نے آپریشن کیا۔ آٹھ ماہ تک پلاسٹر کٹتا اور پھر لگایا جاتا رہا اور بھی بہت کچھ طریقے اس ہاتھ پر آزمائے گئے' چھ آٹھ ماہ تک ریکسین کے ایک پٹکے میں رہا' روز فزیو تھراپی والے تشریف لاتے "اس بکٹر بندی سے کھول کر جب وہ مالش اور کھنچائی اور موڑ کرتے تو کرب میں میری چیخیں نکل نکل جاتیں۔ آخر کار ڈاکٹر جوکھیو اور میں نے ہار مان لی اور اس بے چارے ہاتھ کو پٹکے سے آزاد کر دیا گیا اور اب یہ میرے کسی کام کا نہ رہا تھا۔ کہنی سے نیچے کا آدھا ہاتھ اوپر والے سے بے تعلق ہو کر جھکولے لینے لگا۔ نیچے لٹکا دیا تو اوپر اٹھایا نہ جا سکتا تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ کیا ہمت ہار دوں؟ یا اپنی ہمت سے ڈاکٹر جوکھیو کے ہاتھ کو ہرا دوں؟ پھر وہی والدہ کے جملے یاد آئے کہ "ہمت اور حوصلہ ہمیشہ کامیاب کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے وقت بہت لگ جائے" میں نے اس الٹے ہاتھ سے دھینگا مشتی جاری رکھی۔ ایک سال کے اندر انگلیوں نے اپنا کام کرنا شروع کر دیا' یعنی اپنی اور گھر کی ضرورت بھر کا کام جیسے تیسے کرنے لگی۔ تو پھر ایک اور بلا آن پڑی۔ کینسر کا مرض انسان کو دہلا دینے والا مرض ہے۔ اس سے پہلے پیٹ میں ایک ٹیومر ہو چکا تھا جس کو سرجن قاضی نے نکالا تھا۔ یہ صرف ایک بہترین سرجن ہی نہیں ہیں بلکہ بہترین انسان ہیں۔ کس طرح دل کھول کر ہنستے اور مریض کو ہنساتے ہیں۔ کیا ہی مزے دار انداز کا مذاق مریض سے کرتا کہ وہ اپنی تکلیف اور مرض سب بھول جاتا ہے۔ ایک گٹھلی سی سینہ پر محسوس کی' خوشی خوشی سرجن قاضی کو دکھانے گئی کہ وہ اس کو آپریشن کر کے نکالیں گے تو چند دن ان کی مزے مزے کی باتیں سننے میں آیا کریں گی۔

شام کا وقت تھا' اپنی بھاوج نسالہ عمر کے ساتھ سرجن قاضی کے پاس گئی۔ انہوں نے دیکھا اور کہا کہ ابھی سرجن حمید کے پاس چلی جائیں یہاں سے بالکل قریب ہیں" لیکن میں

ان کے پاس کیوں جاؤں؟ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ اس کو نکلنا چاہیے تو آپ خود نکالیں گے۔ ہنسنے لگے کہ اب میرے ہاتھ کچھ کانپنے سے لگے ہیں دونوں ہاتھوں کو ہلا کر دکھایا۔ فون اٹھا کر سرجن حمید کو کر دیا کہ بیگم اختر حسین کو بھیج رہا ہوں۔ ان کو فوراً" دیکھ لیں۔ "میں تو ان کے پاس ہرگز نہ جاؤں گی۔" اچھا یوں کریں کہ بس ان کو میرا سلام دے آئیں۔ میرے خاطر اتنا تو کر دیں۔ سرجن قاضی کے خاطر میں چلی گئی۔ سرجن حمید نے ایک منٹ میں گٹھلی دبا کر دیکھی اور بڑا سوکھا سا منہ بنا کر اعلان کر دیا کہ مجھے کینسر ہے۔ کل ہی جناح اسپتال میں داخل ہو جاؤں اور پرسوں صبح وہ میجر آپریشن کر دیں گے' کل داخل ہوتے ہی فون کر دوں۔

میرے تو کینسر کا نام سن کر پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ گھر آ کر اختر کو بتایا۔ چند منٹ کو بالکل خاموش رہے۔ پھر وہ بولے کہ آخر ان کو ایک منٹ میں کیسے معلوم ہو گیا کہ کینسر ہے۔ اس کے لیے تو پہلے ٹیسٹ کے لیے گٹھلی نکالی جاتی ہے۔ سرجن حمید کو فون ملوا کر بات کی کہ پہلے ٹیسٹ کرنے کے لیے چھوٹا آپریشن کریں اور اس کا رزلٹ دس دن بعد جب آ جائے تو ہی میجر آپریشن کیا جائے گا۔ انہوں نے چند جملوں میں سمجھایا پر اختر نہ مانے اور نہ میرا اپنا دل مانا۔ میں تو اس سوچ میں پڑ گئی کہ یہ کیسے انسان ہیں کہ کسی سے کینسر جیسے مرض کا یوں دھڑلے سے اعلان کر دیا جیسے بتا رہے ہوں کہ آپ کو نزلہ ہو گیا ہے۔

میں دوسرے دن جناح اسپتال داخل ہو گئی۔ آپریشن کر کے گلینڈ نکالا۔ ٹیسٹ کی رپورٹ دس دن بعد آئی کہ درحقیقت کینسر ہے۔ چھ سات گھنٹے کا آپریشن ہوا پینتیس ٹانکے لگے۔ سرجن حمید روز زخم دیکھنے آتے' ایک دن بولے آپ کو کیا ملا کہ دو بار بے ہوش کیا گیا۔ دو آپریشن کروائے' ایک چھوٹا ایک بڑا۔ میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب آپ کے پاس جب دس منٹ فرصت کے ہوں تو ضرور آ کر مجھ سے اس سوال کا جواب لیجیے گا۔

وہ سچ مچ اسی دن شام کو اکیلے بغیر اپنے عملے کے تشریف لے آئے۔ میں نے ان سے کہا کہ کرسی کھینچ کر پلنگ کے قریب بیٹھ جائیں۔ جب بیٹھ گئے تو میں نے کہا "ہو سکتا ہے میرا جواب آپ کو ناگوار لگے۔ مگر میں تو سچی اور کھری بات کہوں گی' اس دن میں آپ سے پہلی بار ملی۔ آپ نے ایک منٹ دیکھ کر جس انداز سے اعلان کر دیا کہ کینسر ہے

پرسوں آپریشن کریں گے۔ بس' میرے اوپر ایک بجلی سی گری' اس مرض کا نام سن کر اور آپ کا انداز اعلان سن کر۔ آپ کے تیوروں پر بل اور دو ٹوک کہہ کر گھنٹی بجا کر دوسرے مریض کی طرف متوجہ ہو گئے۔ کاش آپ اسپیشلسٹ ڈاکٹر' انسان کو پتھر' لکڑ سمجھنا چھوڑ دیں۔ تسلی اور ہمدردی کے الفاظ کا استعمال پہلے کریں پھر نشتر زنی شوق سے کریں۔ میں تو یہ سوچتی ہوئی آپ کے کمرے سے نکلی کہ یہ سرجن نہیں بلکہ....... جملہ روک لیا۔ بولے کیا' کیا کہہ رہی تھیں آپ' بتا دیں؟ یہ زبان پر آرہا تھا کہ قصائی ہیں۔ چونک اُٹھے کہ یہ آپ نے کیا کہا؟" معاف کیجیے گا ڈاکٹر صاحب کہ کچھ میرے تجربے ایسے ہی ہوئے ہیں۔ ہاں ڈاکٹر قاضی ایک واحد ایسے ڈاکٹر ہیں کہ وہ اس بات کو دس منٹ ہنس کر اور ہنسا کر بڑے ہلکے پھلکے انداز سے یوں کہتے کہ میں بات مان جاتی۔ بغیر بایوپسی کی رپورٹ کے آپ کی بات کیسے مان لینے کو دل کر سکتا تھا۔ آخر آپ ماہرین ڈاکٹر لوگ بیچارے مریضوں کو گائے بکری کیوں سمجھتے ہیں۔ باہر کمرے میں پچاس پچاس مریضوں کو گھنٹوں بٹھا کر منٹ دو منٹ کو بلا کر ٹرخائے جاتے ہیں۔ مریض بیچارہ جیب آپ لوگوں کے سامنے خالی کر کے جاتا ہے۔ پھر جھڑکیاں' ڈپٹیاں فری میں اس کو مل جاتی ہیں۔ مسکراتا یوں نہیں جانتے کہ ایک زپ ہونٹوں پر کھینچ کر لگا رکھا ہے۔ ہمدردی کے دو بول اس لیے نہیں بول سکتے کہ اتنی دیر میں ایک مریض اور نمٹالیں۔ میں نے ان کو پورا قصہ ڈاکٹر کمانی کا سنایا کہ کس طور انھوں نے ایک مفکر' ایک عالم ایک ادیب کو اندھا کرنے کے بعد دو ٹوک کہہ دیا کہ جو کر سکتا تھا کر دیا اب ان کے پاس کبھی آنے کی زحمت نہ کریں۔ آپ حق انصاف سے بتائیں کہ اس تجربے کے بعد اور میں کیا سوچ سکتی تھی۔

یہ سب سن کر چلے تو گئے مگر جانے کھری اور سچی باتیں سن کر ان پر اس کا اثر ایسا ہوا کہ فرصت جس دن ملتی آبیٹھتے۔ خوب ہنس ہنس کر پوچھا کرتے تو اچھا بتائیں کہ مریض لوگ ہم کو اور کیا کیا کہتے ہیں؟ اب سرجن حمید ایک ہنسنے ہنسانے والے ڈاکٹر صاحب بن گئے تھے۔ جانے ان کو یہ خبر کیسے مل جاتی تھی جو میں دن میں اسپتال کے باغ میں پیڑ لگواتی یا کمنے بننے سے ایڈمنسٹر صاحب نے ٹوٹی پھوٹی ساری جالیاں بدلوا دیں یا یہ کہ کس طرح خود مزدور لگوا کر اسپتال کے پیچھے والے کمپونڈ کا برسا برس کا کوڑوں کا ڈھیر اور جھاڑوں کو کٹوا کر صفائی کروا دی۔ یا یہ کہ توجہ دلا کر بیچارے ایکسرے کی میز کو ٹھیک کروا لیا کہ مریض

کو نیچے گدے پر لٹا کر ایکسرے نہ لیا جائے۔ اسٹریچر اور کرسی کے پہیوں کے ربڑ بدل گئے۔ مریض اب اس پر کودتا اچھلتا آپریشن کرانے نہ آئے گا بلکہ سکون سے لایا جا سکے گا۔ کسی غسل خانے میں بالٹی' تسلا اور ڈونگا و لوٹا موجود نہ تھا۔ وہ منگا کر رکھوا دیے۔ خوش ہو کر مجھی کو بتاتے آج آپ نے یہ کام بڑا اچھا کیا اور کروا لیا۔ پھر تو سب ہی ڈاکٹر آتے بیٹھتے اور ہنستے ہوئے چلے جاتے۔ رہی بھی تو میں دو ماہ۔ اسپتال مجھے اپنا ہی بڑا سا گھر لگنے لگا تھا۔

ایک دن خیال آیا کہ چلو آج چل کر اُدھر جاؤں جدھر سرجن حمید باہر کے مریضوں کو دیکھ رہے ہوں گے۔ دن کے ۱۲ بجنے والے تھے۔ کوئی ڈیڑھ سو مریض ہنوز ان کے کمرے کے آگے والے برآمدے میں زمین پر بیٹھے اور کھڑے ہوئے۔ سوچ میں پڑ گئی کہ جانے صبح آٹھ بجے سے کتنوں کو دیکھ چکے ہوں گے۔ ایک ڈاکٹر پھر کیوں کر منٹ دو منٹ سے زیادہ مریض کو دے سکتا ہے؟ کیوں کر مسکرا کر کسی سے تسلی کے الفاظ لا سکتا ہے؟ پھر شام سے رات کے بارہ بجے تک اپنا ذاتی مطب بھی تو ان کو چلانا ہوتا ہے۔

کیا ہماری گورنمنٹ ان حالات سے اتنی بچ کر نظریں بند کیے ہمیشہ بیٹھی رہے گی؟ کیا ہم مریض ایک سرکاری اسپتال سے فیض اٹھانے کے ساتھ اپنی بساط بھر کبھی کچھ بھی ان حالات کو سدھارنے کے لیے زبانی جمع خرچ بھی نہ کریں گے۔

اب میں دراصل ڈاکٹر منظور زیدی کینسر اسپیشلسٹ کے زیر علاج تھی۔ یہ ملک کے بہترین ڈاکٹر ہی نہیں بلکہ بہترین انسان بھی ہیں۔ جب وہ کمرے میں آتے تو جیسے تازی ہوا ساتھ لے کر آتے۔ مسکراہٹ ان کے اوپر خوب ہی بجتی ہے۔ کاش ہر ڈاکٹر ان کے نقش قدم پر چل سکے۔ اسپتال سے چھٹی مجھے مل گئی مگر ہر ماہ ان سے معائنہ کراتا تھا۔ میں پہلی بار ان کے پرائیویٹ مطب پر نہ گئی بلکہ جناح اسپتال عام مریضوں کو دیکھنے والے دن گئی' صبح سات بجے پہنچ گئی۔ بیٹی مہر میرے ساتھ تھی۔ اتنے سویرے کوئی پچاس مریض موجود تھے۔ ہر ایک کے پاس نمبر کی پرچی تھی۔ اسی حساب سے مریضوں کے فائل ان کی میز پر رکھے جا رہے تھے۔ آٹھ بجے ڈاکٹر زیدی تیز تیز قدم لیتے ہوئے کمرے میں داخل ہو گئے۔ مریض اب قریب سو کے ہو چکے تھے۔ بہت بڑا ہال کھچا کھچ جب بھر گیا تو باقی آنے والے باہر' کھڑے ہو گئے۔ میں یہ ماجرا دیکھ کر حق حیران۔ دو دوسرے کمروں میں ایک چھوٹا ڈاکٹر اور ایک لیڈی ڈاکٹر اور بھی موجود تھے۔ جب تک میری باری آئی کوئی سو مریض اور

اور لکھنے کہنے کے لائق سمجھیں گے تب ہی لکھیں گے۔ ان کا ذہن اور قلم کسی کا بھی ڈکٹیشن لینے سے قاصر ہے۔ پھر تو کھلم کھلا اختر پر احباب نے اعتراضات کی بوچھاڑ سی ایک عرصہ تک جاری رکھی۔ اختر کو نہ کسی سے گلا ہوا نہ شکوہ ہاں یقیناً "غم ضرور ہوتا۔ ان کے حساس دل پر تقسیم ہند کے بعد کے واقعات نے بھی بڑا گہرا اثر چھوڑا اور پھر اپنے ہم خیالوں کی دوری اور نکتہ چینیوں نے ان کے قلم پر عرصہ تک کے لیے تالا قفل سا چڑھا دیا ہو۔

۱۹۸۶ء میں جب صہبا صاحب افکار کا "نذر اختر حسین رائے پوری" نمبر نکالنے کی تیاری میں لگے ہوئے تھے تو بار بار اختر سے دریافت کرتے کہ آپ اپنے چند ان دوستوں کے نام بتائیں جن کا ساتھ آپ کی جوانی کے دوران رہا ہو' تو ان سے آپ کے متعلق کچھ لکھنے کے لیے فرمائش کروں۔ کہتے کہ بیشتر تو اللہ کو پیارے ہو گئے اور کچھ ادھر اُدھر بکھر گئے۔ ہاں ایک بے حد عزیز دوست پروفیسر رشید ہیں' پر وہ صرف پڑھتے اور پڑھاتے ہیں' لکھتے نہیں۔ دوسرے دوست اختر امام کو ہنومان لنکا لے گئے اور ایک جگری دوست نے راہ میں ساتھ چھوڑ دیا۔ میں سوچ میں پڑی گئی کہ وہ کون سا دوست ہے کہ اس نے ساتھ چھوڑ دیا لیکن اس کا نام نہیں لیتے۔ اپریل ۱۹۸۶ء میں سلمان میاں اور میں اختر کو لے کر لندن روانہ ہو رہے تھے کہ سنا تھا کوئی حال میں ہی وہاں کوئی نیا طریقۂ علاجِ چشم دریافت ہوا ہے۔ اس کا سن کر ایک امید کی کرن دکھائی دینے لگی تھی۔ دن کے گیارہ بجے تھے' میں اور اختر باہر کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے دیکھا سبطِ حسن داخل ہوئے' میں منہ سے کچھ کہہ نہ سکی نظریں ان پر جم سی گئیں۔ ابھی وہ منہ سے کچھ بولے بھی نہ تھے کہ ان کی چال سے یا بوئے دوست سے اختر نے ایک دم کہا "سبطے تم" اور ہاتھ پھیلا کر کھڑے ہو گئے اور وہ لپک کر اختر سے چمٹ گئے۔ کتنی دیر اختر نے ان کو اپنے سینے سے لگائے رکھنے کے بعد کہا "یار آنے میں بڑی دیر کی" میرے آنسو نکلنے لگے۔ کمرے سے نکل آئی اور اندر برآمدے میں اپنے تخت کے کونے پر بیٹھی تو یک دم خیال آیا یہی تو وہ دوست ہے جو راہ میں ساتھ چھوڑ بیٹھا۔ ذرا دیر میں سبطے اندر آ گئے "چلو نہ ادھر' اتنے دن بعد تو ملے ہیں۔"

میں ایک بڑی کمزور سی انسان ہوں زبان اور سوچ پر کبھی قابو نہ پا سکی۔ میرا جواب یہ

تھا "سبطے تم پہلے پانچ منٹ یہاں بیٹھو تو سہی۔ وہ بیٹھ گئے آج تم مجھ کو سچ سچ بتانا کہ تم نے آخر یہ وتیرہ اختر کے ساتھ کیوں اختیار کیے رکھا۔ جب اور جہاں ہوا' تمہارے پاس اختر کے لیے صرف اعتراضات ہی کے الفاظ رہے۔ کس لیے؟ صرف اس لیے ناکہ انہوں نے زندگی بھر کبھی غیر ذمہ داری کا ثبوت نہ دیا۔ ان کے قلم نے کبھی بے سوچے سمجھے کسی کے سنے پر کوئی بات نہ لکھی۔ کبھی کسی کی دکھائی بتائی ڈگر پر نہ چل سکے۔ تم کو جب بھی کسی ملازمت کی سفارش کی ضرورت ہوئی۔ اختر سے دفتر جا کر کہا یا ایک فون کر دیا تو انہوں نے بڑھ کر بڑے پیار کے ساتھ کر دیا۔ اگر اختر نے جو اخلاقی ذمہ داری شادی کر کے اُٹھائی اس کو پورا کرنا ان کا اوّلین فرض تھا۔ تمہاری طرح کہ بیچاری بھائی اور معصوم نوشابہ کو ایک کونے میں ڈال کر ایک عرصہ تک بھولے رہے۔ ڈاکٹر اشرف نے بیوی بچوں کو دربدر کی ٹھوکریں کھلوائیں۔ یہاں تک کہ آخر تنگ آ کر عیسائی ہو کر لڑکوں کی تعلیم اور اپنے اوپر یتیم خانے میں ملازمت کر کے چھت کا سایہ حاصل کیا۔ اور اشرف بھائی لندن میں گل چھرّے اُڑاتے اور نام ور کمیونسٹ ماہرِ تواریخ کا تمغہ حاصل کرتے رہے۔ اور بچی بات ایک یہ بھی ہے کہ ادیبوں نے' جو مقام اختر کو دیا وہ برداشت نہ کر سکتے تھے۔ سبطے خاموش بیٹھے یہ سب سنتے رہے اور در حقیقت ان کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ مجھے اٹھ کر گلے لگا کر کہا "پرسوں میں ہندوستان ایک ہفتہ کے لیے جا رہا ہوں وہاں سے آ کر ان سب کوتاہیوں کی تلافی اس طرح کروں گا کہ تم دھکّے دے کر گھر سے نکالنے پر آمادہ ہو جایا کرو گی۔ سچ یہ ہے حمیدہ کہ نہ جانے کیوں میں کئی دن سے دل میں بڑا نادم ہو رہا تھا۔"

اختر نے ادھر سے آواز لگائی "ارے بھئی سبطے کدھر چلے گئے' آؤ نا ادھر۔" میرا ہاتھ پکڑ کر اختر کے پاس لے گئے "یار یہ تمہاری بیوی حمیدہ جو ہے نا' مجھے دل کھول کر برا بھلا کہہ رہی تھیں مگر ٹھیک ہی کیا کہ میری دھول جھاڑ دی۔ اب لکھنؤ سے واپسی پر خوب لمبی لمبی نشستیں کریں گے۔ آج تو عجلت میں ہوں' سر پر سفر سوار ہے' کچھ ملنا ملانا ہے۔" تھوڑی ہی دیر بیٹھے مگر ایسی گزری بیتی باتیں کیں کہ دونوں ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوئے جاتے تھے۔ میں سبطے کے ساتھ گیٹ کے باہر تک آئی تو ان سے کہا "جاتے جاتے اتنا ضرور کرنا کہ صہبا صاحب کو اختر کے متعلق جو من میں آئے لکھ کر دیتے جاؤ۔ اور لکھنؤ کے بڑے امام باڑے میں جا کر دعا کرنا کہ لندن میں کسی بھی علاج سے اختر کی آنکھوں میں

روشنی پھر سے آجائے۔ اس پر بیٹے دل کھول کر ہنسے "چلو اپنے دوست کی خاطر امام باڑہ بھی چلا جاؤں گا اور صہبا صاحب کو لکھ کر دے بھی دوں گا۔" ہائے افسوس کہ بیٹے کی یہ آخری تحریر بن گئی۔

اور یہ کسے خبر تھی کہ ہماری یہ ملاقات جس نے اختر کے دل کو باغ باغ کیا یہ تو آخری ملاقات ہے۔ بیٹے لکھنؤ روانہ ہوئے اور ہم لندن۔ وہاں پہنچ کر ایک ہی ہفتہ بعد یہ منحوس خبر ملی کہ ہمارے بیٹے نے دنیا کو خیرباد کہا۔ اختر نے بیٹے کے تعزیتی جلسے کی صدارت کی تو مجھے پہلی بار ان کی آواز میں کپکپاہٹ محسوس ہوئی۔ میں کافی دور پر بیٹھی ہوئی تھی، دیکھ تو نہ سکی مگر مجھے ایسا لگا کہ اختر کی بے نور آنکھوں سے ان کے ان مول آنسو کے دو قطرے گرے ہیں۔ ہم دونوں ہی پر بیٹے کی ابدی جدائی کا بڑا اثر ہوا۔ اتنے طویل عرصہ بعد ایک بچھڑا ہوا دوست ملا اور پھر ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا۔

—○—
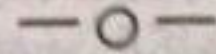
اختر کی شخصیت

لندن میں کئی اسپیشلسٹ نے اختر کی آنکھوں کو گھنٹوں وقت دے کر دیکھا۔ پر ہر ایک نے وہی بات کہی کہ اب وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ جو مایوسی ہوئی وہ آپ سمجھ سکتے ہیں۔ میرا بھی پورا چیک اپ کرایا۔ جب ڈاکٹروں نے یہ بتایا کہ بہت صحیح آپریشن ہوا اور بالکل صحیح دوائیں مل رہی ہیں تو مجھ سے زیادہ اختر کو اطمینان ہوا۔ لندن میں اپنے ادیبوں، شاعروں کی کمی نہیں۔ شاموں کو آجاتے اپنے لیے دیے انداز سے ادب، صحافت اور بہتیرے موضوع پر بات چیت کرتے۔

چھوٹا بیٹا شاہد پھر اپنی ملازمت امریکہ میں چھوڑ چھاڑ کر لندن اپنے ابا کے پاس آگئے تھے۔ ہم جب لندن پہنچے تو ایئرپورٹ پر بارہ گھنٹہ انتظاریوں کرنا پڑا کہ ایمسٹرڈم میں جہاز خراب ہو گیا۔ بس گھنٹہ بھر میں آجائے گا یہی اطلاع ملتی رہی اور شاہد وہاں کھڑے انتظار کرتے رہے کیونکہ شاہد نے پہلے سے بتایا نہ تھا کہ وہ لندن آرہے ہیں کہ اختر ان کو سختی سے آنے کو منع کر دیتے۔ اختر کے دل کو کس قدر ان کے اس طور آجانے کی خوشی ہوئی کہ آخری امید کی کرن بھی ڈوب جانے کا غم نہ ہوا۔ بڑے ہی خوش بخت باپ تھے۔ ان کو اپنے بیٹوں کی جو محبت اور عزت حاصل ہوئی وہ کم ہی دیکھنے میں آئی۔

دو ماہ لندن میں قیام کر کے ہم دونوں سلمان کے ساتھ واپس پاکستان آگئے۔ گو ہر امید پر پانی پھر چکا تھا۔ مگر ہم سب کے سامنے اسی طرح ہنس ہنس کر باتیں کرتے۔ ہم نے برابر ایسا انتظام کیے رکھا کہ دو گھنٹے دس سے بارہ بجے تک پڑھ کر سنایا جاتا لیکن کسی کو ڈکٹیشن دینے پر راضی نہ ہوئے۔ ان کے مزاج کی مشکل پسندی نے سوائے لیلیٰ خورشید کے کسی کو یہ اعزاز حاصل ہونے نہ دیا۔ میں نے ہزاروں بار کہا آپ مجھے ایک بار آزما کر تو دیکھیں، ہاں کا ہے اسٹے کی ہی تو غلطیاں ہو سکتی ہیں مگر میں لکھ تو سکتی ہوں مگر یہ کہہ کر انکار کرتے

رہے۔ آپ کا اپنا جو حال ہے اس کی مجھے خبر ہے' آپ کو کیسے زحمت دوں۔ مجھے کبھی بہت برا لگ جاتا کہ مجھے آپ اس قابل سمجھتے ہی نہیں تو جواب یہ دے دیتے آپ لکھنے بیٹھیں گی تو کوئی ملازم کچھ پوچھنے آجائے گا۔ کوئی ملنے آجائے گا' فون آتے رہیں گے اور خیالات کا تانا بانا ٹوٹ جایا کرے گا۔ یوں کوئی تحقیقی کام نہیں ہو سکتا۔

مارسل پروست (Marcel Proust) کی بارہ جلدیں پیرس میں ان کو سالگرہ پر تحفہ دیں۔ بہت خوش ہوئے۔ ایک دو جلدیں پڑھیں پھر اٹھا کر رکھ دیں کہ بس اب ریٹائر ہو کر پڑھوں گا' یہ ایسی کتاب نہیں کہ اس کو بھاگا دوڑی میں پڑھا جائے۔ یہاں آکر کچھ ذاتی معاملات اور مختلف مصروفیات نے ان کو اتنا وقت نہ دیا کہ سکون سے ان کو پڑھ پاتے۔ تین جلدیں بینائی جانے سے پہلے پڑھیں بہت لطف اندوز ہوئے۔ کہتے ایسا لکھنے والا کم ہی پیدا ہوگا۔ میں نے بھی پڑھنا شروع کی مگر دقیق اور انتہائی درجہ طول بیانی' اس کو پڑھنا میرے بس کے باہر تھا۔

سلمان جیسے پڑھاکو لڑکے نے ان کو پڑھ کر سنانا شروع کی۔ ایک جلد پڑھنے کے بعد چیں بول گئے اور ان سے کہا کہ اور ہر کچھ آپ کو پڑھ کر سنا سکتا ہوں مگر یہ نہیں۔ پھر دوسرے بیٹے نے سنانا شروع کی۔ ایک جلد کے بعد وہ بھی ہتھیار ڈال بیٹھے۔ پھر ایک خاتون پروین رحیم آئیں جن کا ذوق اردو ادب اور شاعری کے ساتھ انگریزی لٹریچر اور پوئٹری پر بھی یکساں تھا۔ پہلے تو انہوں نے (RILKE) "رلکے" کی پوئٹری ایک ماہ تک سنائی جس قدر اختر لطف اندوز ہوئے اسی قدر پروین خود بھی۔ پھر انہوں نے پروست (Proust) کی دو جلدیں بڑی دلچسپی لیتے ہوئے پڑھ کر سنا ڈالیں۔ ایک لمحہ کو وحشت زدہ نہ ہوئیں۔ دونوں حد درجہ محو ہو جاتے' کبھی کسی جملہ پر قہقہہ لگاتے اور میں باغ باغ ہوتی کہ اختر خوش ہو رہے ہیں۔ افسوس کہ یہ دَور جلد گزر گیا کہ پروین اپنے ذاتی جھمیلوں میں کچھ ایسا پھنسیں کہ برسوں لگ گئے۔ گاہے فون کر کے کہتیں تو ضرور کہ ڈاکٹر صاحب کو میرا سلام کہہ دیں اور یہ کہ بس جلد حاضر خدمت ہوں گی۔ مگر وہ دن نہ آیا اور اختر رخصت بھی ہو گئے۔ ہاں پروین بی بی اعلیٰ کلاسیکی موسیقی کا اچھا ذوق بھی رکھتی ہیں اور بہت اچھا گاتی بھی ہیں۔ اکثر ہم دونوں نے ان سے فرمائش کر کے گانے سُنے بھی۔ اس میں بھی اختر گاہے گاہے ان کی آواز کے اتار چڑھاؤ پر نکتہ چینی کر کے ایک استاد کا درجہ

حاصل کرتے رہے۔

صہبا صاحب نے کس قدر محنت اور پیار سے افکار کا ایک "نذرِ اختر حسین رائے پوری" نمبر نکالا۔ میں نے پڑھ پڑھ کر سنایا مگر مجال ہے جو تعریفی اور بہت بڑے ادیب ہفت زباں داں' مفکر' معلم اور ناقد ہونے کا سن کر ان کے چہرے پر کچھ ایسا عیاں ہوا ہو کہ ہاں وہ بڑے ادیب اور بڑے انسان ہیں۔ ایک صاحب کا ایک ایسا مضمون بھی تھا جنھوں نے اختر پر بڑے اعتراضات مدلّل طریقے سے کیے۔ اس کو سُنتے مسکراتے اور کبھی ہنس بھی دیتے' میں چراغ پا ہو کر بول اٹھی کہ اس کا جواب میں ضرور لکھوں گی۔ زوردار قہقہہ لگایا۔ "آپ اور لکھیں گی؟ کبھی ایسی حرکت کرنے کی کوشش نہ کریں۔ جب کہ مجھ کو سب سے زیادہ یہ مضمون یوں پسند آیا کہ انہوں نے تنقید کی ہے۔ ہماری بدنصیبی یہی تو ہے کہ ہم تنقید گوارا نہیں کر سکتے۔ ہاں جو کہے سب اچھا ہے' وہ ڈگر اختیار کر رکھی ہے" اختر بڑے ظرف کے مالک تھے' وہ خود جس طرح تنقید بے دھڑک کرتے اسی طرح ان پر کوئی اسکالر کی طرح' تنقید کرے تو اس کو بہت پسند کرتے۔

۱۹۸۶ء میں ہمارے بیٹے عرفان حسین واشنگٹن میں انفرمیشن منسٹر بنا کر بھیج دیے گئے۔ ان کی سروس آڈٹ اینڈ اکاؤنٹ کی تھی۔ اختر نے جب سنا تو بجائے خوش ہونے کے اعتراض کیا کہ گورنمنٹ نے یہ بات تو غلط کی کہ اکاؤنٹ کے آدمی کو انفرمیشن منسٹر بنا دیا جبکہ یہ پوسٹ انفرمیشن کے محکمے میں سے کسی کو دی جانی چاہیے تھی۔ ان کا مزاج ہی ایسا تھا کہ وہ کسی غلط کام یا سوچ کو برداشت نہ کر سکتا تھا۔ ڈیڑھ سال بعد جب عرفان کو واپس بُلا کر ان کے ڈپارٹمنٹ میں اکاؤنٹنٹ جنرل کر دیا گیا تو خوش ہوئے۔

عرفان میاں انگریزی کے اخبارات میں اپنے اصلی اور مختلف قلمی ناموں سے خوب لکھتے رہے ہیں۔ ان کی پوسٹنگ کراچی ہو گئی' گھر میں بڑی رونق رہنے لگی۔ ان کا حلقۂ احباب' بڑا وسیع ہے۔ شاموں کو کچھ ان کے دوست' کچھ سلمان کے اور کچھ نوید میاں کے دوست ہمارے گھر پر اکٹھے ہو جاتے۔ دوست تو لڑکوں کے مگر اختر میر محفل' ان کے گرد یوں جمع ہوتے جیسے شمع پر پروانے۔ اپنی اپنی جگہ ہر کسی کے مختلف خیالات مختلف پارٹیوں کے طرف دار۔ گرما گرم بحث مباحثے ہوتے۔ ہر ایک کو بڑے اطمینان سے تشفی بخش جواب دیتے۔ ہاں جہاں کسی نے ملک پر اعتراضات کیے' یا یہ کہ پاکستان بنانا برے

سے غلط کام کیا گیا یا اسلام کے خلاف کوئی نکتہ اٹھایا وہاں ان کے چہرے پر ناراضگی کے آثار نمودار ہوتے۔ طرح طرح ان نوجوانوں کو قائل کرتے کہ حکومت پر اعتراض کرنے کا حق ضرور وہ رکھ سکتے ہیں لیکن ملک کے خلاف کچھ کہنا یا ملک کو برا سمجھنا اور سوچنا ان کے لیے کفر کے برابر تھا۔ کہتے یہاں کی خرابیاں اور محرومیاں تو تم سب تعلیم یافتہ نوجوانوں کو درست کرنا چاہیے۔ اس ملک سے جو کچھ حاصل کیا ہے اور حاصل کر رہے ہو' اب وقت ہے کہ کھڑے ہو کر ملک کے لیے کچھ بے غرضانہ کام کرکے واپس دو۔ دونوں ہاتھوں لیا ہے تو ایک ہی ہاتھ سے ملک کو کچھ دے کر کچھ کرکے دکھاؤ۔ صرف اعتراضات کی زبانی جمع خرچ کرنا چھوڑ دو۔ اپنے ملک کے عوام جاہل ہیں' غریب ہیں بڑے مظلوم اور محنت کش ہیں۔ ہمارے سیاست داں کس کس طور سے ان کے جذبات سے اپنی غرض پوری کرنے کے لیے کھیل کھیلتے ہیں اور پھر ان بیچاروں کے حالات اسی طور رہتے ہیں۔ کبھی سمجھاتے کہ اسلام میں کوئی کمی نہیں۔ اگر اس کی اصل روح کو فراموش کرکے غلط طور طریقہ سے صرف اپنے اپنے مطلب کے لیے پیش کیا جاتا ہے تو وہ ان لوگوں کی خطا ہے۔

جب بھی موسیقی کا ذکر آجاتا تو گھنٹوں اس کی باریکیاں' اس کے مختلف راگ' سُر پر ہی بولتے چلے جاتے۔ کبھی یورپین میوزک پر ہی ساری شام کیا کیا بتاتے۔ دونوں طریقوں کی موسیقی کا مقابلہ کرتے کون سا ساز کس ملک سے نکل کر شکلیں بدلتا ہوا آج ہمارے سامنے ہے۔

عرفان میاں اپنے والد کی طرح صرف کھانے کے شوقین ہی نہیں بلکہ بڑا دل لگا کر وہ مختلف ممالک کا کھانا پکاتے بھی ہیں۔ کھانوں پر ان کی کتابوں کی لائبریری ہے۔ اس لیے گاہے گاہے کھانوں پر بات چھڑ جاتی تو اختر بڑے مزے لے کر بتاتے کہ کون سا کھانا کس ملک سے نکل کر دوسرے ملک میں اپنی شکل اور نام بدل کر داخل ہوا۔ کسی شام کو تصوّف پر گفتگو ہوا کرتی۔ سیاست پر اب جبکہ خود پڑھ نہ سکتے تھے' پڑھوا کر سنتے یا ریڈیو پر وہ اس طرح تجزیہ کرتے کہ یہ سب نوجوان لڑکے لاجواب اور بھونچکا سے ہو جاتے۔ اگر ہسٹری کی بات چھڑ جائے تو صدیوں پیچھے لے جا کر اس کا سرا پکڑ تاریخوں کے حوالے دیتے ہوئے بات کو آگے لاتے جاتے' پھر زمانۂ حاضر تک یوں آتے جیسے قدم بقدم ان سب جوانوں کو

لیے چلے آ رہے ہیں۔ وہ سب دَم بخود رہ جاتے اور اگر کہیں شعروشاعری پر بات آنکلتی تو اختر کی گل فشانی سننے سے تعلق رکھتی۔ ایک سے ایک اعلیٰ شعر پڑھتے جاتے' ساتھ ہی شاعر کی زندگی اور اس کا فلسفۂ حیات بھی بیان کر دیتے۔ ان کو ہزارہا شعر یاد تھے۔ صرف اردو کے ہی نہیں بلکہ فارسی' ہندی' سنسکرت' بنگلہ' گجراتی اور فرنچ کے بھی۔

ہمارے دَورانِ قیام پیرس میں ایک دفعہ اختر امام جو ہماری ایمبیسی میں فرسٹ سکریٹری تھے' اپنی سری لنکا کی بیگم کو پیرس کی سیر کرانے کے خیال سے ایک ہفتہ کو آگئے۔ ہمارے ہاں قیام کیا۔ اختر امام صاحب کو بھی اپنے دوست کی طرح ہزارہا شعر یاد تھے۔ ان کا مضمونِ خصوصی جرمن اور عربی تھا۔ اختر نے بھی چند روز کی چھٹی لے لی۔ ہوتا یہ کہ جب ناشتہ کرنے دونوں میز پر بیٹھتے تو کوئی شعر یہ پڑھتے تو اس کا ہم پلّہ (ہم ذات۔ یہ نام اختر نے ان کو دے رکھا تھا) جرمن یا عربی کا شعر وہ پڑھتے اور ساتھ ہی اس کا ترجمہ کرتے۔ اسی طرح اختر ان کے لیے فرنچ' سنسکرت' بنگلہ' فارسی اور گجراتی کے اشعار کا ترجمہ کر دیتے۔ کسی کسی شعر کی باریکیوں یا اس کے تیکھے پن پر دونوں مل کر خوب خوب داد دیتے۔ اس طرح دن کے کھانے کا وقت ہو جاتا' میں سامنے کھانا لا کر رکھ دیتی۔ یہ دونوں دوست میرے اور ہونی کے وجود کو بھول ہی گئے تھے۔ شعروشاعری کا سلسلہ چلتا رہتا۔ شام کی چائے پی لیتے دنیا مافیہا سے بے نیاز کرسیوں پر ڈٹے بیٹھے ہیں۔ کہیں آنے جانے کا خیال نہ آتا۔ لیجیے اب رات کا کھانا بھی سامنے دھر دیا گیا اور ان کا سلسلہ ٹوٹتا ہی نہ تھا۔ تیسرے دن میں نے "ہونی" سے کہا کہ آج میں گھڑی دیکھو لوں گی کہ ایک ہی موضوع پر کتنی دیر ان دونوں کے دماغی خزانہ سے اشعار نکل سکتے ہیں! تو جناب میں حیرت زدہ رہ گئی کہ آنکھوں' پلکوں اور بھوؤں پر دس مختلف زبانوں کے اشعار ایک دوسرے کو ناشتہ سے کھانے کے وقت تک سنا کر کس قدر محظوظ ہوا کیے۔ بیچاری سیلون کی رہنے والی "ہونی" بگڑ اٹھیں کہ وہ تو اب واپس بیلجیم جاتی ہیں۔ یوں یہ سلسلہ ٹوٹا۔

جب بھی اخباروں کا ذکر آگیا تو ڈیڑھ سو سال میں کس ملک میں اہمیت رکھنے والا اخبار نکلا۔ اس کی پالیسی کیا تھی؟ معاشرے پر اس کا کیا اثر پڑا؟ ڈراموں پر تو یوں بات چیت کرتے جیسے اسٹیج پر ہو رہا ہو اور ہم دیکھ رہے ہیں۔ اسی سلسلہ میں سارے بڑے ڈرامہ نگاروں کی زندگی کے حالات اور ان ڈراموں نے سوسائٹی پر اپنا کیا اثر چھوڑا یہ سب کچھ

زیر بحث ہوتا۔ سیاست دانوں کا ذکر آجائے تو ان کی گفتگو سننے کے لائق ہوتی۔ کس نے اپنی سیاسی دُکان چمکانے کی خاطر ملک کو کس قدر نقصان اور کتنا فائدہ پہنچایا۔ اختر کو سیاست دانوں کے فعل اور قول کے تضاد سے چڑھ سی تھی۔ ان کے نزدیک لوگوں کے جذبات سے کھیل کر اور جوش و ولولہ دلا کر جھوٹے وعدے کرنا اور جب اپنا کام بن جائے تو عملی طور پر کبھی کچھ نہ کرنا گناہِ عظیم تھا۔

جب بھی سیر و سیاحت پر بات ہونے لگے تو وہ کھل اُٹھتے۔ سیاحوں کے حوالے دیتے ہوئے کیسی خوش کُن گفتگو کرتے۔ اپنی ذاتی سیاحی کے قصے مزا لے لے کر سناتے۔ کتابوں کا ذکر آجاتا تو دیکھنے سُننے سے تعلق رکھتا۔ جب مذہب اور اس کے اثرات پر بات چل پڑتی تو ان انگریزی اسکولوں کے پڑھے جوانوں کی سوچوں کی گتھی کو بڑے ٹھنڈے دل سے سُلجھاتے۔ اسلام کے خلاف تو اشارتاً وہ ایک جملہ بھی سن نہ سکتے تھے۔ بڑے ہی دُکھ کے ساتھ یہ بھی کہتے جاتے کہ تم لوگ صرف انگریزی کتابوں کا مطالعہ کرکے بالکل ہی اسلام کی اسپرٹ اور اس کی اصل شکل سے بے بہرہ ہو۔ مولویوں اور مُلاؤں نے اگر اپنے یا حاکمِ وقت کی خوشنودی کے لیے فوائد حاصل کرنے کے لیے اس کی عظمت اور مطالب کو موڑ توڑ کر مسخ کردیا تو اس کی اصلیت اور اہمیت اپنی جگہ مُسلّم رہے گی۔ کبھی کبھی جُھنجلا اٹھتے کہتے۔ "میاں پہلے پڑھو اور سمجھو، کسی بات کو جب تک جان نہ جاؤ اس کی مخالفت کرنا جرم کے برابر ہے۔

فلسفہ تصوف اور رہبانیت پر نہ معلوم کس قدر معلومات کا ذخیرہ ان کے دماغ میں جمع تھا، اس پر بڑے دلچسپ انداز سے بولا کرتے۔ جب بھی ان کے ہم عمر یا ان سے کافی کم عمر کے ادیب اور شاعر جمع ہوئے ہیں تو وہ سب مجھ سے بہت بہتر بتا سکتے ہیں کہ وہ محفلیں ان کے لیے کس قدر خوش کُن اور معلوماتی رہی ہیں۔ ہر ایک ہی اپنے دامن کو بھرے ہوئے اٹھتا۔ کوئی بھی ادیب یا شاعر ملنے آگیا تو خوش ہوجاتے لیکن کچھ احباب ایسے تھے جن کے آنے پر بشاش ہوجاتے۔ جیسے پروفیسر رشید، ڈاکٹر احسان رشید، ڈاکٹر جمیل جالبی، شان الحق حقی، پروفیسر فرمان فتح پوری، پروفیسر مراد، صہبا لکھنوی صاحب، ڈاکٹر کلیم الرحمان، حکیم سعید صاحب، مختار زمن صاحب، محمد علی صدیقی صاحب، نقوی صاحب، طفیل صاحب، پروفیسر جعفری، حاذق الخیری، ڈاکٹر سلیم الزماں، ڈاکٹر حبیب الرحمان، بیگم اکرام

اللہ، رئیس امروہوی، شبنم رومانی، پروفیسر ریاض الاسلام، سعید جعفری، شوکت صدیقی، غلام عباس مرحوم، کمانڈر انور مرحوم، سلیم علوی، فاتح فرخ صاحب، لطف اللہ صاحب، جنرل شاہد حامد، سحر انصاری صاحب، ادیب سہیل صاحب، محمد شاہین صاحب، گزدر صاحب، ذکاء اللہ خان، کاظمی صاحب، فضل رحیم صاحب، ڈاکٹر مزمل علی، رفعت عثمانی صاحب، ابن انشا صاحب مرحوم، سلمہ بیگم، مشہدی صاحب، ڈاکٹر متین، محسن بھوپالی، اسلم فرخی، نامی صاحب، قادری صاحب، علی احمد تالپور صاحب، ن م راشد، نورالحسن جعفری صاحب ان کی بیگم ادا جعفری صاحبہ اور نصراللہ خان صاحب۔

بیٹے حسن کے دور ہوجانے کا ان کو غم سا رہا۔ خود تو منہ سے کبھی کچھ نہ کہا مگر وجوہات میں جو سمجھتی تھی اس کو سچائی سے لکھ دیا ہے۔ شکر کہ لکھنؤ جانے سے پہلے آئے ایک دوسرے سے گلے لگے بہت دیر کھڑے رہے اور ساری دوریاں درمیان سے ختم ہوگئیں مگر ایک بات میں سمجھنے سے قاصر رہی۔ وہ علاؤالدین خالد صاحب کا رویّہ (اردو اکیڈمی سندھ والے) ان کو اختر نے مثل اپنے چھوٹے بھائی کی طرح سمجھا۔ دوست گردانا۔ ایک راہی کی طرح ان کو اپنا کام جمانے کے لیے راہیں بتائیں، ساتھ ہی ایک اتالیق کا درجہ بھی اختیار رکھا۔ پاکستان بننے کے شروع دس سال میں ہر ہفتہ چار پانچ دن شاموں کو ان کا آجانا، ہمارے کمسن لڑکے ان کو ماموں یوں سمجھتے تھے کہ وہ میرے چھوٹے بھائی بن گئے تھے۔ ایک بار جو وہ کسی وجہ سے ایک ہفتہ نہ آئے تو عرفان جن کو خالد صاحب نے بیٹا بنا لیا تھا عرفان کی عمر ساڑھے چھ سال کی تھی، بڑے پریشان ہوئے کہ کیا وہ ہم سے خفا ہوگئے؟ کاغذ پر ایک نظم لکھ کر لائے۔ کچھ ایسا سا تھا خالد ماموں اب تو کبھی آتے نہیں۔ کتابیں ہماری وہ لاتے نہیں۔

میں نے نظم کی تعریف کی تو کچھ اس کا ایسا اثر پڑا کہ ایک چھوٹی سی اپنی لال نوٹ بک پر ایک ہفتہ میں چودہ نظمیں کہہ کر لکھ ڈالیں۔ ہر بار یہ کہیں کہ اب خالد ماموں ان کو چھاپ کر کتاب بنا دیں گے۔ ایک دن میں نے اختر کو خوش ہوکر سنائیں تو بجائے خوش ہونے کے سناٹے کے عالم میں ہوگئے۔ سخت پریشانی کی کیفیت سے بولے کہ "اب یہ حضرت اپنی زندگی کا وہی حشر کریں گے جو ہمارے حکیم صاحب نے سات سال کی عمر میں شاعری کا شوق شروع کیا تھا۔ میں اب کل ہی ان کو اس اسکول سے نکال کر گرامر اسکول

میں داخل کروادوں گا۔" ہوا یہ تھا جب میں نے دیکھا کہ یہ دو بڑے لڑکے جو گرامر اسکول میں جا رہے ہیں، وہاں تو اردو کا وجود نہ ہونے کی وجہ سے بس انگریزی ہی کتابیں پڑھتے ہیں۔ پکڑ دھکڑ کر اردو پڑھانا چاہی تو ہتھے لگتے نہیں۔ جب ان کے داخلے کا وقت آیا میں نے خود لے جا کر قریب کے ایک سرکاری اسکول میں داخل کروادیا۔ ایک سال میں ان کی اردو اچھی خاصی ہو چکی تھی۔

میری ایک نہ سنی اور وہاں سے اُٹھا گرامر اسکول میں داخل کردیا۔ برسوں سے یہ خوب لکھ رہے ہیں مگر انگریزی میں، سرکاری ملازمت کی وجہ سے مختلف قلمی ناموں سے۔

خیر ذکر تو خالد صاحب کا تھا۔ اختر سترہ سال بعد ملک واپس آگئے۔ پر لگا کہ خالد صاحب کراچی میں ہوتے ہوئے شاید ملک میں نہیں ہیں۔ سال دو سال میں اختر سے چھپا کر ان کو فون کرتی کہ اختر کو شاید آپ بہت یاد آرہے ہیں خدا کے لیے ضرور آجائیں تو خالد صاحب آجاتے۔ یوں ان کا خود تو آنا نہ ہوا بلکہ کھینچ کر بلا لینا بھلا یہ کیا آنا ہوا۔

پھر میں نے فون کرنا چھوڑ دیا۔ دس سال قبل جب اختر کو معلوم ہوا کہ ان کی بیگم صاحبہ کے دل کا آپریشن ہوا تو کہا کہ ان کے پاس جاؤں گا۔ گھر معلوم نہ تھا تو خالد صاحب ہی کی موٹر منگا کر ہم دونوں وہاں گئے۔ کھانا بھی ان کے ہاں کھایا۔ تاریکیوں نے اختر کو گھیرنا شروع کردیا تھا۔ سال کے اندر بس وہ اس میں ڈوب سے گئے اور خالد صاحب پھر لاپتہ ہوگئے مگر اختر اور میری یادوں میں موجود رہے۔ میں ٹوٹ پھوٹ کی نظر ہوتی رہی۔ کبھی کسی میٹنگ میں اختر سے مڈبھیڑ ہو جاتی۔ پھر اختر کا آنا جانا ہی ہر جگہ کا ختم سا ہو گیا مگر جمیل بھائی وہ آپ کے ہاں جب بھی آپ نے یاد کیا کہ ہندوستان سے فلاں صاحب تشریف لائے ہیں تو جاتے رہے اور کیسے خوشی خوشی۔

اختر ہم سب کو چھوڑ کر اس دنیا کو خیرباد کر کے چلے گئے۔ یہ خبر ایسی تو نہ تھی کہ خالد صاحب کو خبر ہی نہ ہوئی ہو۔ میں تو چند دن تک دنیا سے بے خبر ہو گئی تھی۔ لڑکوں نے جب مجھ سے کہا "امی خالد صاحب کیوں نہیں آئے"؟ شاید وہ ملک سے باہر ہوں چالیسواں ہوا۔ برسی بھی ہو گئی۔ جو بھی اختر کا دوست اور جاننے والا آتا، میں نے ان سے کہا کہ اگر خالد صاحب ان کو مل جائیں یہ اتنا کہہ دیں کہ جب بھی میرے دل میں طاقت

پیدا ہو گئی تو میں خود ان کو اختر کا پرسا دینے آؤں گی۔" کیا کسی نے میرا یہ ایک سا پیغام نہ دیا۔ مشفق خواجہ صاحب سے بار بار کہا کہ آپ مجھے ایک بار ان کے گھر لے چلیے۔

میں اکثر سوچا کرتی ہوں کہ آخر ایسا کیوں ہوا۔ چلو انھوں نے ایک بھائی، ایک دوست اپنا رہبر، ایک اتالیق نہ گردانا تو کیا اختر کو ملک کا سب سے بڑا عالم اور مفکر مان لینے سے بھی منکر ہو گئے؟ میری بڑی خواہش ہے کہ ایک بار ان کو پُرسہ دے کر بس اُٹھ کر چلی آؤں۔ اللہ انسانوں کے کتنے چہرے مہرے ہوتے ہیں۔ لوگ تعلق جو برساہا برس میں بنا ہو، اس کا گلا کیوں کر دبوچ دیتے ہیں۔

جمیل بھائی! مجھے یقین کامل ہے کہ اگر "ہم سفر" میری زندگی میں نہ چھپ سکی تو میرے بعد آپ اور مشفق خواجہ صاحب ضرور چھپوائیں گے کہ اس سے تو اختر حسین رائے پوری کی شخصیت کو پوری طرح سمجھ لینے پر ان کے مقام کو سمجھ کر ان کی اپنی ذات سے بھی پیار کر سکیں گے۔ ان کی زندگی کا ہر پہلو کتنا دل کش ہے، پر خود اس سب پر کس قدر پردے ڈال کر رکھا کیے۔ اور آپ نے میری بے خبری کے عالم میں قلم ہاتھ میں تھا، وہ سارے پردے اُٹھوا دیے اور جو بھی سچی باتیں تھیں کم و بیش کیے بغیر لکھ ڈالا۔

اختر کے ہندو دوست بہت زیادہ تھے کہ لڑکپن اور شروع جوانی ان ہی کے درمیان گزری تھی اور اس عمر کی دوستیاں بڑی گہری ہوتی ہیں۔ ان کے انتقال کی خبر جب مل جاتی تو بڑی دیر خاموش بیٹھے رہتے۔

مول چند اگروال جی اور پنڈت سندر لال جی، دلّی میں جب بھی ہمارے ہاں آئے تو اختر سرتاپا مودّب ہو جاتے اور مجھے یوں لگتا کہ یہ استاد اور اختر ان کے شاگرد ہیں۔ رشید احمد صدیقی جن کا بڑا احترام ان کے دل میں تھا، ان کو اور اختر کو یک جا ہوتے، اتفاق ہے کہ میں نے نہ دیکھا۔ پروفیسر حبیب بھی ان کے استاد تھے جن کا ذکر بڑے احترام سے ہمیشہ کیا۔

اپنے بڑے بھائی مظفر حسین شمیم صاحب کو کس قدر عزیز رکھتے تھے، کس کس طور سے یاد کیا کرتے کہ کاش وہ حیات ہوتے تو ان کی یہ بے نوری کے دن مزوں سے گزر جاتے۔

غیور اور خوددار اتنے کہ کبھی کسی سے یہ نہ کہتے کہ اب تو رات و دن کا فرق نہیں

رہا۔ ہمیشہ یوں کہا کہ ان کی بینائی کمزور ہو گئی ہے۔ اسپتال جانے والے دن تک ان کی باقاعدگی کا وہی عالم رہا' جو جوانی میں ہوتا تھا۔ صبح پانچ بجے بستر سے اٹھ جانا' ایک گھنٹہ تک عبادت کرنا۔ اس کا انداز اپنی جگہ ایک ہی تھا۔ ہاتھ میں تسبیح' آنکھیں بند' پلنگ پر پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں' ایک مراقبہ کی کیفیت چہرہ پر عیاں ہوتی۔ مولا اور بندے کے درمیان جیسے کوئی پردہ حائل نہیں ہے۔ کبھی چہرے پر مسکراہٹ عیاں ہوتی تو کبھی تیوری پر بل۔ جیسے مولا سے دوبدو ہم کلامی ہو رہی ہو۔ ایک سکونی کیفیت طاری رہتی۔

اختر کا ہمیشہ یہ کہنا ہوتا کہ خداوند تعالیٰ نے بندہ کو مذہب کا پابند اس لیے کیا کہ وہ انسان بن کر رہے۔ نہ ظلم کرے نہ ضمیر فروشی' نہ ہی کسی کا حق مارے' نہ دروغ گوئی سے کام لے۔ اپنا ہر فرض ایمان داری سے ادا کرے۔ یہ محض ان کا فلسفہ نہ تھا بلکہ ساری عمر اسی طور زندگی گزاری۔

ہمارا سلمان بیٹا سچا مومن بندہ ہے۔ اسلامک ہسٹری کا شیدائی' ہزاروں کتابیں پڑھ ڈالی ہیں۔ اختر بڑے شوق سے سنا کرتے۔ اختر ادھر کئی سال سے رات کے ڈھائی بجے جاگ جاتے' پھر سلمان ان کے کمرے میں بیٹھ کر صبح کے پانچ بجے تک کبھی پوئٹری کبھی ہسٹری اور کبھی سیاحت پر کتابیں پڑھ کر سنایا کرتے ایک بار سلمان نے زمین بیچ کر انسائکلوپیڈیا آف اسلام کی پانچ جلدیں منگالیں۔ کئی ماہ تک وہی پڑھی جا رہی ہیں اور یہ بڑے ہی شوق سے سنا کرتے۔

صبح چھ بجے سے سات بجے تک ورزش کرتے۔ بینائی جانے سے پہلے میل بھر کی واک کرتے اب تو لان پر سلمان کے ساتھ چہل قدمی کرتے۔ ایک پیالی چائے پی کر شیو کرتے۔ کیسی حیرت کی بات ہے کہ دیکھ کچھ بھی نہیں سکتے تھے مگر کبھی شیو کرتے میں کٹا نہیں۔ غسل کرکے پتلون' قمیض' موزے جوتے پہن اور گھڑی باندھ کر ٹھیک آٹھ بجے برآمدے میں صوفے پر اپنی مخصوص جگہ بیٹھ جاتے۔ ناشتہ لگانے کو کہتے ہاتھ میں اخبار اس کو کھول کر ورق گردانی کرتے۔ کوئی نہ کوئی لڑکا کچھ انگریزی کا اخبار سنا اپنے اپنے کاموں پر چلے جاتے تو پھر میں ان کو "جنگ" میں سے پڑھ کر سناتی۔ نصر اللہ خان صاحب کا کالم ضرور سنتے اور تعریف کرتے۔ اختر ان کے استاد تھے۔ عزیز خاں خانساماں ان کے قریب آکر بیٹھ جاتے کہ "سرکار حکم کریں آج کیا پکاؤں" (میں نے کئی سالوں سے یہ کہہ

کر کہ میں تو ساری عمر بتاتے بتاتے تھک گئی۔ بس اب آپ پکنے کا بتا دیا کریں۔ یہ سوچ کر کہ اتنی دلچسپی کے ساتھ عزیز خاں کے ساتھ کھانے کے متعلق باتیں کرتے ہیں کہ کچھ وقت یوں کٹ جایا کرے) اس کو بتاتے کہ اس چیز کا جوڑ ہے کس کا نہیں۔ کھانے کے معاملہ میں بڑے مشکل پسند تھے' ذرا بھی کوئی اُنیس بیس کا فرق ہوا اور انہوں نے اس کی گرفت کرلی اور عزیز خاں کی غلطی ہوتی اس کو غلطی بتاتے۔ دس سے بارہ بجے تک ان کو پڑھ کر سنانے والی خاتون آجاتیں۔

سوا بجے کھانا کھا کر کمرے میں چلے جاتے کپڑے بدل کر پلنگ پر لیٹ ریڈیو سنتے سو جاتے۔ ٹھیک چار بجے اٹھ کر غسل کرکے پتلون قمیض اور جوتے پہن کر گھڑی عینک لگا کر برآمدے میں آجاتے۔ چائے پی۔ کچھ میں پڑھ کر سناتی۔ ساڑھے پانچ پر سلمان کے ساتھ لمبی واک کرنے چلے جاتے۔ ان کی واپسی پر کوئی نہ کوئی ان کا ملاقاتی یا لڑکوں کے دوست آجاتے' لیجیے محفل جم گئی۔ میں ٹوٹی پھوٹی اپنے تخت کے کونے پر بیٹھی یہ دلچسپ باتیں اور معرکہ آرائیاں سنا کرتی۔ لگتا اختر شمع ہیں اور باقی سب پروانے۔ عرفان میاں ہمیشہ ہی اپنا کالم یا مضمون اخبار میں بھیجنے سے پہلے اپنے اَبا کو ضرور سنا دیتے۔ اور اختر ہر ایک میں ان کی کسی جملے میں تختی یا طنز میں بہت کھلا پن' یا کسی تذکرے کی صحت پر اعتراض یا لفظ کا غلط استعمال وغیرہ وغیرہ ضرور نکال دیتے۔ کبھی کبھی عرفان میاں جز بز سے ہونے لگتے' اَبا آخر میں نے بھی کچھ پڑھا ہے۔ میں تو اس جملے کی تلخی کو جوں کا توں ہی رہنے دوں گا' کہتے "میاں یہی بات جب اس طرح بھی کہی جا سکتی ہے تو کیا ضرورت ہے کہ چبھتا ہوا طرز اختیار کیا جائے۔" وغیرہ وغیرہ گاہے سمجھاتے خدا نے تم کو سوچنے سمجھنے کا دماغ اور لکھنے کا انداز بھی دیا ہے بس بھی کرو یہ اخباروں میں دھڑا دھڑ کالم اور مضامین لکھنا۔ کسی سیریس موضوع پر کتاب لکھو۔"

ہمارے چاروں بیٹے مختلف خیالات کے اور ان کے دوست بھی۔ کبھی اتنی گھما گھمی کی گفتگو ہوتی کہ میں لرز اُٹھتی کہ خدا نہ کرے کسی لڑکے کے منہ سے کوئی گستاخانہ بات نہ نکل جائے۔ مجھے انجائنا کی تکلیف اکثر شاموں کو ہو جاتی۔ چھوٹے بیٹے شاہد کی پریشانی کہ امی تخت سے اُٹھ اندر پلنگ پر جا کر کیوں لیٹ جاتی ہیں۔ پیچھے پڑ کر مجھے ڈاکٹر حق کے پاس لے گئے۔ ان کا پہلا سوال یہ تھا اپنا حال مجھے ٹھیک ٹھیک بتائیں کہ کن باتوں یا موقع پر

ایسی کیفیت ہوتی ہے؟ جب میں نے کہا کہ اگر سچ سچ بتاتی ہوں تو آپ ہنسیں گے۔ اوّل تو یہ کہ ہمارے گھر میں سب ملا کر صبح و شام کے دس اخبار آتے ہیں' ان کو تہہ کرتے کرتے اب بڑی وحشت ہوتی ہے۔ اور جدھر آنکھ اٹھا کر دیکھو ہر طرف کتابوں کے انبار۔ جس کمرے میں جاؤ بس کتابیں ہی کتابیں' اب مجھے کچھ یوں سا لگنے لگا ہے جیسے چڑھی آ رہی ہیں۔ دوئم ہمارے گھر میں ہر شام مختلف خیالات کے اپنے بیٹے اور ان کے دوست جمع ہو کر بحث اور تکرار کرتے ہیں تو بڑی گھبراہٹ ہوتی ہے کہ کہیں باپ اور بیٹوں کے انگلچول دماغوں کا ٹکراؤ نہ ہو جائے۔ بس مجھے اکثر ایسے ہی موقعوں پر انجائنا کی تکلیف ہو جاتی ہے۔ گولی دوا کی زبان کے نیچے رکھ کر کچھ دیر خاموش لیٹ جاتی ہوں۔ یہ سن کر ڈاکٹر حق بہت ہنسے اور بولے کہ وہ ۳۵ برس سے پریکٹس کر رہے ہیں' یہ پہلا کیس اس نوعیت کا نظنے میں آیا۔

اختر کی اپنے دوستوں سے ذہنی قربت کے لحاظ سے الگ الگ سطح پر دوستی ہوتی۔ اس دوستی میں ہمیشہ پائیداری رہی۔ جو آگیا بے حد خوش ہوتے اور نہ آیا تو کبھی گلا شکوہ نہ ہوتا۔ کبھی بھی کسی دوست سے اپنی کوئی نجی بات نہ کرتے اور انداز کچھ ایسا رہتا کہ دوسرا بھی کوئی اپنا دکھڑا یا اُلجھن ان سے نہ کہتا۔ اس کے برعکس میرا تعلق سب سے ہی بے تکلفی اور اپنائیت کا رہا کہ اپنا اور اختر کا حال چال بتاتی اور بہت سے ان کے دوستوں کی زندگی کی اونچ نیچ کو سن کر اگر کچھ بھی کر سکتی تو کر دیتی اور مشورہ دیتی۔ دروازہ تک جب ان کو خدا حافظ کرنے جاتی تو کچھ باتیں ہو ہی جایا کرتیں۔ سب سے اصرار سے کہتی کہ گاہے گاہے تشریف لے آیا کریں کہ اختر بہت خوش ہو جاتے ہیں۔ اور آپ سے جمیل بھائی چلتے وقت بارہا کہا کہ یہ یاد رکھیے "کہ آنکھوں والوں آنکھیں بڑی نعمت ہیں۔ آپ آجاتے ہیں تو گویا ان کو اپنی آنکھوں کی روشنی سی مل جاتی ہے۔ ان کی تاریک دنیا کچھ دیر کو روشن ہو جاتی ہے۔"

اختر کی طبیعت میں بڑی صفائی تھی۔ کبھی کوئی پلیٹ یا پیالی میلی دیکھ لیتے تو ان کو اس سے بڑی گھن سی آتی۔ جانوروں کے پالنے کا ہمیشہ بڑا شوق رہا۔ ساری عمر ایک کتا ضرور رکھا۔ ان کے اپنے کمرے کے برابر میں ایک بڑا سا چڑیوں کا پنجرہ چڑیوں سے بھرا رہا۔ بس آخری دو سالوں میں چڑیاں یوں نہ رہیں کہ ایک دن دروازہ کھلا رہ گیا سب اڑ گئیں تو

پھر سے پالنے سے منع کر دیا۔

جب تک بینائی تھی خود صبح چڑیوں کو دانہ پانی ڈالتے۔ اپنے ناشتے سے پہلے کتے کو دودھ دیتے۔ پانی کا برتن خالی کر کے تازہ پانی ڈالتے۔ گرمیوں میں تو ایک پانی کا برتن برآمدے میں رکھا جاتا۔ نوکر کو تاکید کرتے کہ دو دو گھنٹہ بعد پانی میں کچھ برف ڈال دیا کرو۔ کبھی پیچھے کے حصّہ میں ایک بڑا سا حوض تھا۔ جس میں مچھلیاں ڈال دی گئیں تھیں۔ گھر پر بیٹھ کر صبح شام ان کو دیکھا کرتے۔ کافی عرصہ باغ میں خرگوش اور ایک کچھوا بھی رہا۔ ایک سال پہلے کتا مر گیا تو کہا کہ اب نہ پالوں گا۔ ہمیشہ کتا ان کے قدموں میں بیٹھا رہتا۔ پلنگ پر لیٹتے تو وہ پلنگ کے نیچے گھس جاتا۔ ان کے کمرے سے کبھی باتیں کرنے کی آواز آتی تو میں ادھر کو جاتی کہ کس سے باتیں کر رہے ہیں۔ پتہ یہ چلتا کہ کتے سے مخاطب ہیں۔ میں چوکھٹ پر کھڑی بڑی دلچسپ باتیں سنا کرتی۔ "میاں سندل تمہاری عقل کدھر کو چرنے چلی گئی۔ کتنا تم کو سمجھاتا ہوں کہ پلنگ کے نیچے گھس کر نہ لیٹو اور اگر ایسا کرنا ضروری ہے تو اس طور پر کھجایا تو نہ کرو۔ میری آنکھ کھل جاتی ہے" کبھی یہ کہ "بندۂ خدا میرے ہی رستہ میں لیٹنا کیا ضروری ہے۔ تم کو اتنا تو سوچنا چاہیے کہ کہیں میرے پاؤں تلے دب نہ جاؤ اچھا ذرا جانا اور سلمان میاں یا حمیدہ بیگم کو بلا لاؤ۔ ست آدمی تم کسی کام کے نہ کاج کے۔ بس اپنا دوزخ بھرا اور سو رہے!!"

صومالیہ سے آتے وقت ہم سب ان کو ایئرپورٹ لینے گئے' سیڑھیوں سے اتر رہے ہیں اور ہاتھ میں ایک بہت بڑا پنجرہ ہے جس میں سفید براق بڑا سا طوطا (کاکاتوا) ہے۔ کلغی بالشت بھر زرد رنگ کی۔ اس کو لانے میں اس کا ہیلتھ سرٹیفکیٹ لیا۔ کسی منسٹری کی اجازت کا فارم۔ کافی کرایہ بھی لگا۔ برسوں باغ میں املی کے پیڑ پر پنجرہ لٹکا رہا' ایک دن دروازہ کھلا رہ گیا اور وہ اڑ گیا۔ دوبارہ ڈھاکہ سے وہاں کی پہاڑی سیاہ رنگ زرد چونچ کی مینا لے آئے۔ چھ ماہ میں خوب بولنے لگی۔

ہر ذمہ داری جو بھی زندگی میں ذمے ہوئی' اس کی ادائیگی میں مستعدی اور ایمان داری برتی۔ کام کی اسپیڈ اور صحیح فیصلہ کرنے کی صلاحیت ایسی تھی کہ کبھی ان کی میز پر فائلوں کا ڈھیر جمع نہ ہونے پایا۔ کبھی کوئی فائل دفتر کا گھر پر نہ لائے اور نہ ہی کبھی دفتری الجھن کا ذکر گھر میں کیا۔ صبح دفتر چند منٹ پہلے پہنچ جاتے اور ٹھیک وقت پر کرسی سے خود ہی نہیں اٹھ

جاتے تھے بلکہ دفتر کا سارا عملہ بھی فراغت کر کے اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو جاتا چاہیے۔ دفتر کی موٹر بھی نجی کاموں یا آنے جانے پر استعمال نہ کی سوائے جب کسی سرکاری کام سے آنا جانا ہوتا۔ اپنے ماتحتوں کے ساتھ بہت جھکاؤ کے ساتھ پیش آتے۔ اور افسران اور وزیروں کے ساتھ برابری کے درجہ پر رہتے۔ صحیح اصول پر ہمیشہ ڈٹے رہتے' کسی اوپر والے کی مجال نہ ہو سکتی تھی کہ ان کے قلم سے کوئی غلط کام کروالے۔ دفتر میں اگر کبھی کوئی نجی خط لکھا تو اس کے ٹکٹ کے الگ سے پیسے دیے۔ میں نے پوری زندگی میں ان کے دفتر صرف تین بار فون کیا۔ کہہ چکے تھے کہ دفتر میں کام کرنے کا وقت ہوتا ہے' گھریلو فون کے لیے نہیں۔ ہمیشہ دفتر سے سیدھے گھر آجاتے۔

اولاد کی محبت بس ان کی سب سے بڑی کمزوری رہی۔ جو جس نے فرمائش کی فوراً" خرید کر پکڑا دیتے۔ کھلونوں اور کتابوں کے انبار لگے رہتے۔ جب لڑکا ڈھائی سال کا ہو جاتا تو اپنے بستر پر لٹا کر کہانیاں سنانے کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ یہ کہانیاں کبھی نظم کی شکل میں بھی ہوتیں۔ کیسی کیسی نت نئی دل سے گھڑ گھڑ کر سناتے۔ کاش میں نے یا کسی لڑکے نے ان کو ٹیپ کرلیا ہوتا۔ ایک بار سلمان کو کہانی سنا رہے تھے۔ "کسی بندر کی دُم میں کانٹا لگا تو وہ نائی کے پاس گیا کہ وہ اس کانٹے کو نکال دے۔ اس نے بندر کی دُم کاٹ دی۔" سلمان نے پوچھا" تو ابا اس کی دم کا کانٹا نکلا یا نہیں؟ پھر سے پوری کہانی سنا ڈالی کہ بیٹا اس کی تو دُم ہی کٹ گئی۔ ان کا پھر وہی سوال کہ کانٹا نکلا یا نہیں؟ بھئی دیکھو نا اس کی تو دُم ہی کٹ گئی۔ سلمان کا پھر وہی سوال اور اختر نے پھر سے کہانی سنانا شروع کر دی۔ اس طرح آٹھ بار سُنائی۔ میری چھوٹی بہن جو اپنا پلنگ کھینچ کر قریب لیٹ کر کہانی سن رہی تھی۔ جل بُھن کر ڈیڑھ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی' کانٹا اور دُم سنتے سنتے عاجز آگئی۔ سلمان سے کہا "اب کی اگر پوچھا کانٹا نکلا کہ نہیں تو میں تیری دُھنائی کروں گی" مگر اختر بار بار سنا کر خود ذرا بھی جز بز نہ ہوئے۔

خاندان کی کئی خوش نصیب بچیاں ایسی بھی ہیں جن کو اختر کے بڑے لاڈ اور دُلار حاصل ہوئے۔ ایک میری بھتیجی ثمینہ عمر' زاہد بھائی کی بیٹی جو ایک مِثل گڑیا کے ہوا کرتی تھی۔ بڑی بڑی چمکتی آنکھیں' گھونگھروالے بال' صاف رنگ اور گلابی ہونٹ اس کو پاس لٹا کر کہانیاں سناتے۔ ایک یہ بھی تھی۔

حجامت بنانے کو آیا تھا نائی
حجامت بناتے ہی مانگی رضائی
کہا میں نے اس سے کہ اَے میرے بھائی
اَدھیلے کی بُڑھیا ٹکا سر منڈائی
دُھوم یہ نائی نے مچائی
راجہ بکر کنا۔ راجہ بکر کنا

اپنی ہتھیلی پر دو انگلیاں کچھ اس انداز سے چلاتے کر چر چر کی آواز نکلتی۔ اور آخری بند کو جانے کس انداز سے کہتے کہ بچی ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ جاتی۔ اور بار بار اسی کہانی کی فرمائش کرتی اور یہ بار بار سنائے جاتے' تو میں اس کو ڈپٹ کر کہتی کہ بس بھی کر ثمینہ ورنہ میں آکر تیرے کان کاٹ دوں گی۔ اسی طرح ایک میری بھانجی رخسانہ رشید کو بہت چاہتے۔ لیکن جانے کیوں وہ تین سال کی عمر سے نوید جن کی عمر چھ سال تھی بے حد چڑتی۔ لندن میں رہتی تھی۔ کراچی آتے ہی فرمائش کرتی کہ اختر خالو کے پاس جانا ہے اور گیٹ پر کھڑی آوازیں لگاتی کہ پہلے نوید کو نکال دیجیے تو میں اندر آؤں۔ اختر کو اپنے بچوں سے دیوانہ وار محبت رہی۔ اگر کوئی اور یہ کہتا تو شاید تاحیات اس کا داخلہ بند کر دیتے۔ مگر رخسانہ کے یہ کہنے پر کہتے نوید تم چلے جاؤ نا باہر۔ کبھی وہ بگڑ جاتا کہ خوب رہی۔ آخر میں اپنے گھر سے کیوں چلا جاؤں؟ لیکن وہ اتنی عزیز تھی کہ نوید ایک دروازے سے باہر کر دیے جاتے اور دوسرے دروازے سے رخسانہ آتی۔ چاہے کوئی بھی وقت ہو وہ اختر کی انگلی پکڑ کر کمرے میں لے جاتی۔ بستر پر لیٹ کر ضد کرتی کہ بس اب کہانی سنائیں' یوں دو تین مزے دار کہانیاں ان سے سن کر دم لیتی۔ ابھی لاہور میں رخسانہ کی شادی پر گئی ہوئی تھی۔ کئی بار مجھ سے پوچھا کہ بتایے کہ وہ نوید سے اتنا کیوں چڑتی تھی۔

اسی طرح وہ میری ایک بھتیجی کی بیٹی ندا کو بے حد چاہتے تھے۔ لاہور سے جب آتی تو زیادہ وقت نانا کے پاس بیٹھی ہوئی دنیا جہاں کی باتیں کرتی جاتی اور ہاتھ سے ان کے بالوں کو چھوتی رہتی۔ اس کی اردو بہت اچھی ہے' اپنی عمر کے لحاظ سے۔ خط اردو میں لکھ کر بھیجتی سن کر بے حد خوش ہوتے۔ ماں کے ساتھ اسپین گئی تو ہر روز ڈائری لکھتی رہی کہ واپس جا کر نانا کو سب سنانا ہو ہے۔ سن کر بے حد خوش ہوئے۔

نوید کی بیٹی لیلیٰ ابھی نو سال کی ہے بے حد ذہین' دادا سے بڑے بڑے سوالات کرتی اور وہ ہر سوال کا جواب بڑے مدھم انداز میں دیا کرتے۔ انگریزی کا اخبار اٹھا کر سرخیاں پڑھ کر پوچھتی کہ کیا سنیں گے؟ بتاتے کہ یہ سناؤ اور سن کر بڑے خوش ہوتے۔ اس کے متعلق پیشن گوئی ہمیشہ کی کہ اگر اس بچی کو صحیح تربیت دی گئی تو یہ ضرور نام روشن کرے گی۔ ان کو چاہے کسی عمر کا بچہ کیوں نہ ہو اگر اس کے ذہن میں تجسس کی بھڑکتی ہوئی لَو محسوس کر لیتے تو بڑی توجہ اور خوشی سے اس کو تشفی بخش جواب دیتے۔

ہمارا پوتا عرفان کا بیٹا' تیرہ سال کی عمر مگر دادا سے بڑی کج بحثی کرتا۔ پہلے کچھ پوچھتا پھر ایسے اَڑتا جیسے دادا سے کچھ زیادہ ہی جانتا ہے۔ اس کو چپ ہونے کو کہے جاتی مگر مجال ہے جو خاموش ہو جائے۔ کمرے میں لے جا کر جب ڈانٹتی کہ شرم نہیں آتی کہ اپنے دادا سے تم کس طور سے بحث کیے جاتے ہو' تو ہمیشہ جواب یہ کہ "پوتا بھی تو ان ہی کا ہوں' وہ خود کبھی اپنا گراؤنڈ چھوڑتے ہیں' تو میں کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔" بعد میں مجھ سے خوش ہو کر کہتے مجھے ایسے لوگ بہت پسند آتے ہیں جو اپنے صحیح یا غلط موقف پر جمے رہنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

اپنے لڑکوں نے دوران تعلیم غلط فیصلہ کرکے ایک کو چھوڑ دوسرا مضمون پکڑ لیا۔ یا باہر کے ملک میں تعلیم حاصل کرتے میں ملک واپس آکر یہاں تعلیم کا سلسلہ شروع کر دیا۔ تو کبھی پلٹ کر ایک سوال ان سے نہ کیا' ڈانٹنا تو درکنار۔ مجھے بے شک بڑا غصہ آتا جو ہزاروں روپیہ پر پانی پھیر دیا۔ سخت تاکید کرتے کہ دیکھیے آپ کچھ نہ کہیے گا۔ اپنا راستہ خود نکال لیں گے۔ اور ہوا بھی یہی۔

ہم سب کے سیر سپاٹوں پر پانی کی طرح روپیہ بہا کر بے حد خوش ہوتے۔ بہترین ہوٹلوں میں ٹھہراتے اور جب دوسرے لوگ ہنستے کہ ڈاکٹر صاحب کس طور سے اپنی گاڑھی کمائی کو بہاتے ہیں۔ یہ نہیں کہ لندن یا پیرس میں ایک فلیٹ ہی لے لیں۔ جیسا کہ وہ سب کرتے۔ تو ان کو جواب یہ دیتے تعلیم کتابوں ہی سے حاصل نہیں ہوتی' روشن دماغی صرف ڈگری لے کر نہیں آتی' سیاحت اس کو جلا دیتی ہے' نظر میں وسعت پیدا کرتی ہے۔ میری تو ایک ہی خواہش ہے کہ انسان بنیں اور طبیعت میں اتنی سیری ہو جائے کہ روپیہ پیسے کو کبھی اہمیت نہ دیں۔

خود اس قدر سادہ مزاج تھے کہ کرّوفر اور طمطراق کو بری نظر سے دیکھتے۔ گھر میں ہر چیز کم قیمت والی رکھنا پسند کرتے۔ بس یہ کہ ضرورت پوری ہو اور گھر صاف ستھرا ہو۔ ان کا ہمیشہ یہ کہنا رہا کہ کوئی کسی کے گھر فرنیچر وغیرہ سے ملنے نہیں آتا بلکہ اس میں بسنے والے انسانوں سے ملنے آتا ہے۔ اس لیے ہمارے گھر کی ہر چیز بہت معمولی رہی۔ کبھی چھ سوٹوں (تین گرم اور تین ٹھنڈے) سے زیادہ نہ رکھے۔ آٹھ دس کرتے پاجامے اور تین جوڑے جوتے۔ اپنا ذاتی کام ہمیشہ اپنے ہاتھ سے کرتے' کبھی نوکر سے جوتے پر پالش نہ کروائی۔

دوستوں کی دعوتیں کرنے کا بڑا شوق رہا۔ خانہ پُری کرنے کو سرکاری لوگوں کو جب بلایا تو رسم کی ادائیگی کرنا ہی ہے تو کر لی۔ ہاں دوستوں کو بلاتے تو اس کا بڑا خیال رہتا کہ کوئی بے جوڑ نہ ہو۔ ایک ہی قسم کے لوگ بلاتے۔ اب تو نہیں پہلے کیا کیا موسیقی کی محفلیں ہمارے گھر پر ہوتیں' کبھی کبھی سمندر میں کھڑے جہاز میں بھی ہوئیں۔ اب تو بس نوید بیٹا جو ستار کے بڑے شوقین ہیں اور ستار بہت اچھا بجاتے ہیں' ہفتہ میں دو بار ان کے ستار کے استاد اور طبلہ نواز دو گھنٹہ کے لیے آتے۔ ہفتہ اور بدھ کا انتظار رہتا۔ وہ دونوں نوید کے آنے سے پہلے یوں آجاتے کہ اختر کی صحبت سے فیض یاب ہوں۔ ان سے موسیقی کی باریکیوں پر بات چیت ہوتی۔ کبھی ان سے فرمائش کرکے کوئی خاص راگ سنتے۔ کہیں بھی کسی کے ہاں گانے کی محفل ہوتی تو بڑی خوشی خوشی جاتے۔ پیرس اور یورپ کے جس شہر گئے وہاں کا "اوپیرا" ضرور دیکھتے۔ کوئی "بیلے" کوئی میوزک کنسرٹ نیا آیا تو ضرور دیکھا۔ پینٹنگ کی ہر گیلری کو اور نمائش کو دیکھنا از بس ضروری رہا۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں اور تھے جنہوں نے گاہے گاہے نجی محفلوں میں یہ اعتراضات کیے کہ خدانخواستہ وہ مذہب کے خلاف ہیں۔ کیمونسٹ ہیں وغیرہ وغیرہ۔ وہ تو سچے مومن انسان تھے۔ ان کی اسلام دوستی اور انسان دوستی میں قول اور فعل میں کوئی تضاد تھا ہی نہیں۔ سوشلزم پر عمل کرکے انسانوں کے دکھ درد کا مداوا سمجھتے تھے۔ وہ بالکل قنوطیت پسند نہ تھے۔ بلکہ اس کے برعکس دنیا اور انسان کی ترقی پر ایمان رکھتے تھے۔ انسان دوستی اور انسانیت بدرجۂ اتم ان کی زندگی کے ہر پہلو سے واضح ہوتی۔ فکر و عمل دونوں ہی طریقوں سے وہ ترقی پسند (Constructive) راستہ پر گام زن رہے۔

اپنے سے بڑوں کی تکریم اور چھوٹوں سے شفقت کرتے اور برابر کا درجہ دیتے۔ زندگی کے مختلف حادثات کے باوجود جو اُن کے، میرے اور اولاد کے ساتھ پیش آئے وہ ایک شجر سایہ دار کی طرح ہم سب کو اپنے دامن میں سمیٹ کر زندگی کی خوشیوں سے ہمکنار کرتے رہے۔ اپنے لڑکوں اور ان کے ان گنت دوستوں کے ساتھ ایسے پیش آتے جیسے ان کے برابر کے ہوں اور ان کو کبھی بھی کم مائیگی کا احساس ہونے نہیں دیا۔ بحث اور مباحثہ میں ہمیشہ میانہ روی، دلائل، فکری گہرائی اور آفاقی وسعت نظری نے ہمیشہ دوسروں کا دل موہ لیا۔ یہی ہوتا کہ سامع بغیر اس خیال کے کہ وہ اپنا کوئی اثر ڈال رہے ہیں، بہت متاثر ہی نہیں بلکہ اپنی جھولی بھر کر اٹھتا اور کوئی نہ کوئی سوچنے کا نکتہ ساتھ لے کر جاتا۔

وہ اشعار کا استعمال برمحل اور موزوں کرتے۔ تاریخ، فلسفہ، مختلف زبانوں کے ادب، اقتصادیات، عمرانیات اور دیگر فنونِ لطیفہ کے علاوہ بہت سارے علوم پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ان کے علاوہ مذاہب عالم بالخصوص اسلام کا گہرا مطالعہ تھا اور ہمیشہ اپنی نپی تلی اور مدلل گفتگو سے قارئین اور سامعین کو متاثر کرتے۔

کسی کے منصب سے کبھی مرعوب نہ ہوئے۔ ان کی نگاہ میں بڑا آدمی وہ تھا جو اچھا انسان ہو، اس میں مذہب، عمر اور تعلیم کی قید نہ تھی۔ کسی کے رتبے، حیثیت سے مرعوب ہوتے میں نے نہ دیکھا۔ ہاں اپنے سے چھوٹے افسران سے بے حد جھکاؤ اور برابری سے ملتے ضرور دیکھا۔

اکثر رمضان میں روزے رکھتے۔ بینائی ختم ہونے اور کمزور ہو جانے سے روزے کم رکھتے مگر ۷ رمضان اپنے بھائی شمیم صاحب اور ۲۷ رمضان والد کی وفات کی تاریخ کا روزہ کبھی ناغہ نہ کیا۔ ان دو روزوں کو مجھے اور لڑکوں کو بھی ضرور رکھواتے۔ عید اور بقرعید کو ہمیشہ وقت سے کچھ پہلے لڑکوں کو لے کر مع ملازمین کے نماز پر جانا، ان کو بہت ہی اچھا لگتا۔ اب کے سال اپریل میں جب اختر اپنے چاروں بیٹوں اور پوتے شاکر کو لے کر نماز پر جانے لگے تو پہلی بار میرے دل میں وہم سا آیا کہ میری والدہ اپنے پانچوں بیٹوں اور ابا کو ایک ساتھ جانے نہ دیا کرتی تھیں۔ اختر شاد و شاد اپنے پیاروں کے جھرمٹ میں گیٹ کے باہر نکل گئے۔ میں نے دروازے سے دل میں پڑھ کر دم کیا۔

جہاں تک میرا تعلق ہے۔ انہوں نے شاذ و نادر میرے سامنے کبھی تعریفی الفاظ کا

استعمال کیا ہو۔ ہاں پیٹھ پیچھے بہت تعریف، عزت اور احترام کے ساتھ ذکر کرتے۔ میری صحت کی طرف سے بے حد فکرمند رہتے۔ جب کینسر کا آپریشن ہوا اور سات ہفتے کے قریب وہاں رہی تو دن رات کی نرسیں رکھیں۔ دوست اکثر ہنستے اور مذاق میں اختر سے کہتے کہ آپ نے ناحق دو دو نرسیں رکھ چھوڑی ہیں۔ ذرا دن میں اسپتال آیے تو بیگم صاحبہ گھنٹہ دو گھنٹہ ڈھنڈوانے کے بعد ملیں گی کہ جانے باغ کے کس سمت کس کونے میں ہوں یا اسپتال کے کسی گودام میں ہوں۔ تو ہنس پڑتے بھئی یہ عمر خاندان کا خون بھی خوب ہے کہ جس کو جو دھن لگ جائے بس اس میں جٹ جائے گا۔ مجھ جیسا انسان بھی باز نہ رکھ سکا۔ گویا میری اس حرکت کو ناپسند نہ کیا، کیوں؟ اس لیے کہ ان کو لگا ہوگا یہ انسانی خدمت ہے۔

اختر کی شخصیت پر بابائے اردو کی چھاپ ان کی روزمرہ کی زندگی میں ہر روز نظر آتی۔ زندگی کا ہر قدم سوچ کر اٹھاتا۔ باقاعدہ صبح شام کی ہواخوری اور ورزش۔ گن کر حساب سے سگریٹ پینا جیسے مولوی صاحب حقہ حساب سے پیتے تھے۔ ہر صبح گرم پانی سے غرارہ کرنا۔ نیم کی مسواک کا استعمال کرتے ضرور، ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے کہ "مولوی صاحب کے حکم کی بجا آوری کرتا ہوں ورنہ یہ صبح صبح منہ کڑوا کر لینے میں کیا تک ہے" گھڑی کے کانٹے کے ساتھ کھانا کھانا۔

ریٹائر ہو جانے کے بعد بھی ٹھیک وقت پر نہا دھو، تیار ہو، آٹھ بجے ناشتہ کرنا۔ بینائی ختم ہو جانے کے بعد سے ناشتہ کے بعد برآمدے میں آ کر بیٹھ جانا۔ اخبار ہاتھ میں اٹھا کر اُلٹ پلٹ کرتے تا وقتیکہ کوئی بیٹھ کر اخبار سنانے نہ لگتا۔ ۶۵ سال سگریٹ پینے کی عادت کو ڈاکٹر کے کہنے پر "فوراً" چھوڑ دی۔ اور ایک بار نہ کہا کہ سگریٹ پینے کی خواہش ہو رہی ہے۔
رات کو سوتے وقت ایک کتاب تکیے کے پاس ضرور رکھ لیتے۔ جیسے کہ پڑھیں گے!

جب بھی کوئی مذاق یا تمسخر کیا ذرا دھیما چھپا سا۔ دعوتوں میں جانے سے کتراتے۔ شادیوں کا کھانا کھانے سے بہت کتراتے۔ شاعری سے زیادہ نثر کو اہمیت دیتے۔ یہ سب ہی باتیں مولوی صاحب کے ساتھ رہ کر دانستہ یا نادانستہ طور پر ان میں رس بس گئی تھیں۔ اکثر مجھ سے کہا کرتے "مولوی صاحب نے جانے کس طور پر، بغیر کچھ کہے، اپنا ایسا اثر ڈالا کہ مجھ جیسے لاابالی شخص کو زندگی طور طریقہ سے گزارنا سکھا دیا اور مول چند جی نے کام

کرنے اور کھٹ سے فیصلہ پر پہنچ جانے کا سلیقہ سکھایا۔

موسیقی سے والہانہ عشق تھا۔ اس کی بڑی بڑی محفلیں ہمارے ہاں ہوتی رہیں۔ قدرتی مناظر ان کے لیے روحانی غذا کی طرح رہے۔ پہاڑ، سمندر، دریا اور جنگلات جب قریب ہوتے تو چہرہ دمک اٹھتا۔ پہاڑی جھرنوں کی آواز تو ان کو موسیقی سے کم نہ لگتی۔ کبھی کبھی یہ کہا کہ کیا ہی خوب ہوتا کہ افریقہ کے کسی جنگل میں ان کی زندگی ایک "کیوریٹر" کے طور جانوروں کے درمیان گزرتی۔

قرض لینے اور دینے دونوں ہی کے خلاف تھے۔ جب کبھی کسی جاننے والے نے ان سے قرض مانگا تو جو بھی دے سکے دیا۔ مگر یہ کہہ کر کہ یہ قرض نہیں ہے، ہرگز واپس نہ لوں گا مجھے جو آپ سے تعلق ہے وہ زیادہ عزیز ہے۔

یونیسکو کی ملازمت میں جانے کے بعد سے ایک مقررہ رقم ماموں حبیب الدین بیرجی صاحب کو ہندوستان ناگپور جاتی رہی اور اسی طرح شمیم بھائی کے اکاؤنٹ میں یہاں آتی۔

شادی میں شرکت کرنے جانا اور کھانا کھانا ان کو ناگوار یوں لگتا کہ کہتے جدھر منہ موڑو دولت کا دکھاوا اور پیسے کی نمائش، اسے دیکھ کر طبیعت مکدر ہوتی ہے۔ اور جب لوگ گھی بہتا ہوا کھانا پلیٹوں میں بھر کر دھکا پیل کرتے ہیں مجھے متلی سی ہونے لگتی ہے۔ جب تک جا سکے تو کسی خاص دوست کی خوشنودی کے خاطر چلے گئے۔ پہلے تو یہ وتیرہ رہا کسی شادی پر گئے اور مجھے وہاں چھوڑ کر گھر لوٹ آتے۔ مجھ سے جو پوچھتا تو کہہ دیتی کہ کہیں ادھر اُدھر ہوں گے۔

ہاں چند احباب ان کے دل کے اتنے قریب تھے کہ ان کے گھر اب تک بڑی خوشی خوشی چلے جاتے۔ جیسے جمیل بھائی آپ۔ لطف اللہ خاں صاحب اور جی ایم ملک اور مہر مسعود کے گھر اور کھانا بھی پسند آتا اور کئی دن تک میری شامت آجاتی۔ بار بار کہا جاتا آخر ہمارے گھر کیوں ایسا کھانا نہیں پک سکتا؟ کھانے سے زیادہ ان گھروں کی محفل سے ان کے منہ کا مزا اچھا ہو جاتا۔

پچھلے آخری سالوں میں کئی بار میں نے اختر سے کہا کہ "آپ نے شادی کرنے میں بہت غلط قسم کا فیصلہ کیا ایک جاہل سی لڑکی سے شادی کرلی، اگر کسی پڑھی لکھی لڑکی سے کرتے تو اس وقت وہ آپ کے کتنے کام آتی۔ اور اگر آپ اب راضی ہو جائیں تو آپ کے دو

بول پڑھوا دوں۔ کس قدر ناراض ہوتے کہتے "کوئی وہ اب تک مجھ جیسے مزاج دار کے ساتھ ٹکی رہتی؟ کب کی بھاگ چکی ہوتی۔"

آخری دس سالوں میں سلمان کا ہر پل باپ کی خدمت کے لیے وقف رہا۔ اس کی انسانیت، انکساری، قابلیت اور جذبۂ قربانی کی بڑی ہی قدر کرتے تھے۔ ہمیشہ مجھ سے کہا کہ سلمان سچا مومن بندہ ہے۔

خواب بہت کم دیکھتے تھے۔ لیکن جب بھی خواب دیکھا وہ دیر سویر سچ نکلا۔ آخری چار ماہ میں انہوں نے دو بار عجیب خواب دیکھے۔ مجھے بتایا کسی بزرگ نے ان کو ہلا کر اٹھایا اور کہا "تمہارے گھر میں سلمان فارسی رہتے ہیں، ان کا احترام کیا کرو" دوسری بار خواب یہ دیکھا کہ کوئی بزرگ عبا میں کھڑے، اٹھ بیٹھنے کا حکم دے کر فرماتے ہیں "وہ جو ایک خدا کا برگزیدہ بندہ تمہارے گھر میں ہے اس کا بڑا خیال رکھا کرو" اس خواب کے بعد کئی روز فکرمند رہے۔ مجھ سے کئی بار کہا خدارا آپ سلمان کو کبھی کچھ نہ کہیے گا۔ یہ نبی حکم ہے، کیونکہ میں اکثر ان کے رات بھر جاگنے پر ناراض ہوا کرتی تھی۔

اندرا گاندھی کو گولیوں سے ختم ہونے سے چند ماہ پہلے انہوں نے عجیب خواب دیکھا کہ وہ کسی دریا کے پاس سے گزر رہے ہیں، وہاں زمین پر اندرا گاندھی زمین پر پڑی ہوئی ہیں۔ اختر کو دیکھ کر آواز دی، اختر صاحب میں کھڑی نہیں ہو سکتی، آپ مجھے گود میں لے کر دریا کے اس پار لے چلیں۔ اختر نے ان کو اُٹھایا، کمر کمر پانی سے گزر کر دریا پار کیا۔ اندرا گاندھی کو پاؤں پر کھڑا کرنا چاہا تو وہ پھر لد سے گر پڑیں اور تمام جسم سے خون بہنے لگا۔ صبح ہم سب کو اپنا یہ خواب سنایا۔ ہم سب خوب ہنسے اور اختر سے مذاق بھی کیا۔ خود بھی خوب ہنسے کہ بھلا کیا تک ہے ایسا خواب دیکھنے کی۔ جب مجھے اس خواب کا خیال آجاتا تو ان کو چھیڑتی۔ ہاں بھئی بڑے لوگ خواب میں بھی بڑے لوگوں کو دیکھتے ہیں۔ یا یہ کہ سچ سچ بتائیں کہ جب پہلی بار آپ اندرا نہو سے پیرس میں ملے تھے تو وہ آپ کو بہت اچھی لگیں تھیں؟ تو سیریس ہو جاتے کہتے "آپ میں حسد اور جلن کا مادہ کس قدر ہے کہ خواب میں بھی اجازت نہیں کہ کسی عورت کو دیکھ سکوں!" چند ماہ بعد جب خبر آئی کہ بچاری پر گولیاں چلائی گئیں اور وہ زمین پر گر کر خون میں لت پت ہو کر ختم ہو گئیں۔ بولے لیجیے میرے اس خواب کی تعبیر بھی سامنے آگئی۔

میں نے پوری ان کی حیات میں تین بار آہ یا سسکی سنی۔ ایک بار تہران میں اپنے بڑے بھائی عظیم صاحب کی وفات پر۔ ایک پریس میں ۱۹۷۱ء میں ریڈیو پر مشرقی پاکستان کے ٹوٹنے اور جس شرمناک انداز سے ہتھیار ڈالے گئے اس کا اعلان سنا تو اس وقت ایک زوردار ہائے اور پھر سسکی اور ساتھ ہی ناک سے خون کے قطرے۔ تیسری بار جب میں آج سے آٹھ سال پہلے ۱۹۸۴ء میں ان کی ہندی' سنسکرت' گجراتی اور فارسی کی کتابیں سلمان کے ساتھ یونیورسٹی بھیجنے کے لیے ڈبوں میں بند کر کے ان سے کہا کہ اب میں آپ کی فرنچ کی کتابیں عرفان میاں کے ساتھ لاہور جانے کے لیے ڈبوں میں بند کرتی ہوں تو کہا آپ جائیں میں خود ان کو پیک کروں گا۔ میں کمرہ سے باہر آکر تخت پر اداس سی اپنی جگہ بیٹھ گئی۔ تو میں نے عجیب سی آہ اور سسکی کی آواز سنی دوڑ کر ننگے پاؤں ان کے کمرے کے دروازے پر پہنچی تو دیکھا منہ الماری کی طرف ہے دونوں ہاتھوں سے پٹرے کو پکڑے ہوئے ہیں' ماتھا کتابوں پر ٹکا ہوا ہے' گویا ان کو خدا حافظ کہہ رہے ہیں۔ میں روتی ہوئی دبے پاؤں واپس لوٹ آئی۔ ذرا دیر بعد اپنی نارمل آواز سے مجھے بلایا کہ آپ خود ہی ان سب کو ڈبوں میں بند کر کے عرفان کے کمرے میں رکھوا دیں۔ صبح سویرے ہی ان کو لاہور جانا ہے۔ تو اس عظیم انسان کی ایک بار آہ اور سسکی نکلی بھائی کی موت پر' ایک بار ملک کے ٹوٹنے پر اور آخری بار کتابوں کو الوداع کہتے وقت!

اولاد سے انتہا درجے کی محبت کرتے تھے۔ میری بڑی بہن محمودہ بیگم کہا کرتیں۔ باوجود کہ اختر اتنی زیادہ عقل اور سمجھ رکھتے ہیں اگر لڑکے فرمائش کر دیں کہ ان کو آسمان کے تارے توڑ کر دے دیں تو اختر باہر نکل کر پھدک اور اچک کر ان کو توڑنے کی کوشش تو ضرور کریں گے!

اختر شطرنج بہت ہی اچھی کھیلتے تھے۔ انہوں نے آٹھ سال کی عمر سے کھیلنا شروع کر دی تھی۔ ان کے والد نے مجھے بتایا تھا کہ اکثر شام کو گھر سے چلے جاتے دیر تک واپس نہ آتے تو ان کی بڑی بی' بہشتی میاں ملازم کو ان کی تلاش میں روانہ کرتیں کہ کوئی بڈھا کھوسٹ میرے بچے کو پکڑ کر موئی شطرنج کی بازی لگائے کھیل رہا ہو گا! دہلی میں کئی ان کے ہندو دوست بہت اچھی شطرنج کھیلتے' وہ ہمارے ہاں آجاتے۔ کبھی خود چلے جاتے۔ ن م راشد صاحب سے' جب وہ کراچی میں تھے اور کمانڈر انور اور غلام عباس صاحب کے ساتھ

بازیاں لگا کرتیں۔ ہمارے بیٹوں میں صرف سلمان میاں اتنی اچھی شطرنج کھیلتے کہ اختر کو ان کے ساتھ کھیل کر مزا آتا۔ سلمان کے کئی دوست بھی جیسے زین العابدین اور ہارون صدیقی ان کے ساتھ بھی اکثر شطرنج کھیلتے مگر سب ہی تو اختر سے ہمیشہ ہار جاتے۔ پیرس میں تو بہت سے کیفیس میں شطرنج کی میزیں بھی لگی ہوتیں۔ ایک کیفے ایسا تھا کہ جہاں صرف شطرنج کھیلنے والے آسکتے تھے۔ وہاں پر انجانے میں کبھی کبھی ناموَر کھلاڑیوں کے ساتھ کھیلنے بیٹھ جاتے۔

میرے والد اور والدہ دونوں شطرنج کے شوقین تھے۔ ان کے ساتھ بھی کبھی کبھی کھیلی۔ اکثر کہا کہ سوائے آپ کی اماں کے میں نے کسی خاتون کو شطرنج سے دلچسپی نہ دیکھی اور نہ سنی۔ حیدر آباد میں کسی شام کو مولوی صاحب اور مجھے بتا کر شطرنج کے لیے نکلتے تو میرا موڈ خراب سا ہوتا۔ دیکھ کر بابائے اردو فرماتے "جاہل لڑکیوں کی طرح منہ تو کیا سا نہ پھلایا کرو۔ یہ تو دماغی ورزش کا کھیل ہے۔" جب بھی میں نے ان کو یوں جواب دیا۔ "جی یہ تو آپ نے ریل سے اُترتے وقت ہی اعلانیہ بتا دیا تھا کہ میں جاہل ہوں" پھر خوب ہنستے اور فرماتے "تو تم اب تک بھولی نہیں ہو۔"

جب بھی کوئی پرانا ملازم یا چپراسی ان سے ملنے آگیا تو ہمیشہ اپنے پاس کی کرسی پر بٹھاتے۔ بڑی شفقت کے ساتھ اس کا حال چال دریافت کرتے' اس کے متعلقین کے بارے میں دریافت کرتے اور بچوں کو تعلیم دلوانے پر زور دیتے۔ چائے شربت سے خاطر کرواتے۔

پھر ہمارے گھر جو بھی شام کو آجاتا' کھانا کھا کر جانے پر اصرار کرتے۔ لڑکوں کے دوستوں سے یہ کہنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی وہ تو سب ہی جیسے گھر ہی کے فرد ہیں اور کھانا کھا کر ہی جائیں گے۔ اختر کے دسترخوان کو مولا نے برکت سے نوازا ہوا تھا۔ وہی کھانا چار چھ کے بڑھ جانے سے کبھی کم تو نہ پڑتا۔

اور جہاں تک میرا تعلق تھا وہ بھی خوب ہی تھا۔ اپنے کمرے میں براجمان ہیں اور میں اپنے تخت کے کونے پر۔ کبھی کبھی میری رول کال ہو جاتی "حمیدہ بیگم! کچھ چاہیے ہے' کچھ کہنا ہے؟ نہیں تو بس دیکھ رہا تھا کہ آپ ہیں یا کہیں چلی گئی ہیں۔" میری تو زندگی بھر کی ساری ریاضت' محنت اور محبت کا پورا پورا صلہ "گرو راہ" کو اس جملے کے ساتھ

"حمیدہ کے نام" کر کے دے دیا "حمیدہ بیگم میری رفیقۂ حیات ہیں اور گو میں تا عمر پتنگ کی طرح دور، دور اُڑتا رہا لیکن نہ ڈور چھوڑی نہ کٹی کٹنے دی۔"

۱۳ جولائی ۱۹۸۶ء میں صہبا صاحب اور بہت سے ادیبوں نے مل کر "نذر اختر حسین رائے پوری" "افکار" کا نمبر کی تقریب کا بڑے شوق اور پیار کے ساتھ اہتمام کیا تو اختر خود اس تقریب میں یوں نہ گئے کہ ان کے ایک دوست حسن علی عبدالرحمان صاحب کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس میں شرکت کرنا ان کی انسان دوستی کا ثبوت ہی تو ہے۔ اپنے لیے تعریف کی ان کی نظر میں کوئی اہمیت نہ ہوتی۔

جب جلسوں میں صدارت کرنے کو کہا جاتا تو عذر پیش کر کے ہمیشہ یہ کہا کہ آپ کو مجھ سے بہتر لوگ شہر میں مل جائیں گے۔ بہت ہی اصرار پر کبھی کبھی چلے جاتے اور وہاں سب سے مل کر بہت خوش خوش آتے۔ پھر کچھ لوگوں کو ان سے یہ شکایت ہوئی کہ آپ فلاں جلسہ میں صدارت کرنے تو گئے تھے! اس کے بعد یکسر جانا چھوڑ دیا' کہتے میں کسی کو رنج پہنچانا نہیں چاہتا۔

جب ہمارے بڑے بیٹے کی شادی ۱۹۶۲ء میں ہوئی اس کا قصہ بھی آپ کو سناتی چلوں۔ میرے منہ بولے بھائی میاں محمد شفیع اور ان کی بیوی ایک روز جو آئے تو بھابی نے کہا کہ اختر ایک ضروری بات تم سے کرنا ہے۔ کہا "فرمائیں" "میری ماموں زاد بہن کی لڑکی ہے وہ کامران کے لئے بہت موزوں رہے گی۔ چلو ایک دن اس کو دیکھ لو" پہلے تو ان سے کہتے رہے کہ ابھی لڑکا کم عمر ہے صرف تیئیس سال کا ہے۔ کیسے اتنی بڑی ذمہ داری اٹھا سکتا ہے۔ اس پر شفیع بھائی نے کہا کہ جس طرح تم نے اسی عمر پر ذمہ داری اٹھائی تھی۔ آگے کیا کہہ سکتے تھے۔ ان دونوں سے کہا کہ اگر آپ کو پسند ہے تو آپ کامران سے پوچھ لیں اور پیغام دے دیں۔ جس پر انہوں نے کہا کہ ہم نے پہلے کامران سے خود پوچھ کر تب تم سے یہ بات کی ہے۔ تو بولے آپ دونوں پھر پیغام دے دیجیے۔ جب انہوں نے کہا کہ پیغام دینے تو ان کو خود جانا ہو گا تو صاف انکار کر دیا کہ یہ ان کی ذمہ داری نہیں۔ پال پوس کر پڑھا لکھا کر ملازمت دلوادی۔ بس اب وہ جانیں۔ شادی کرنا چاہتے ہیں تو خود کہیں۔ ہزار دونوں سمجھائیں کہ یہ تو ان کو کرنا پڑے گا۔ اختر کا کہنا کہ صاحب میں کیوں اس بیچ میں پڑ کر ساری ذمہ داری اپنے سر لے لوں کہ جب بھی حضرت کوئی غیر ذمہ دارانہ حرکت

کریں تو لڑکی کے والدین میرا گریبان پکڑنے آجائیں۔ میرے بھائیوں نے بہنوں نے سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر بس پیغام خود جا کر دینے پر بس نا سے ہاں نہ کر کے دیتے۔ کہہ دیتے جس کو شوق ہو وہ جا کر پیغام دے آئے۔ اچھا چلو لڑکی دیکھ آئیں تو کہتا یہ کہ جب شفیع بھائی اور بھابی نے کہا تو ٹھیک ٹھاک ہو گی۔ میں دیکھ کر کیا کروں گا۔ میرے بہنوئی شوکت علی کوئٹہ سے آئے تو ہم سب نے کیس ان کے ہاتھ میں دیا کہ وہ کسی طرح اختر کو راضی کریں۔ ایک شام اختر سے کہا ذرا چلنا میرے ساتھ ایک دوست سے مل کر آجائیں (یہ افکار اللہ صاحب کو خوب جانتے تھے) ان کے ساتھ چلے گئے جب ان کے گھر پہنچے تو وہ ان کے خود کے ملنے والے نکلے۔ جب دہلی میں ریڈیو اسٹیشن میں کام کر رہے تھے تو یہ بھی وہاں پر تھے۔ ادھر اُدھر کی پرانی باتیں رہیں۔ پھر آنے کے لیے کھڑے ہوئے تو شوکت علی صاحب نے کہا کہ بھئی اصل بات تو کرتے چلو۔ تو صاف کہہ دیا کہ ان کو تو کچھ نہیں کہنا ہاں اگر وہ خود کچھ کہنا سننا چاہتے ہیں تو شوق سے کہہ لیں۔ تو یوں ہمارے بھائی شوکت نے پیغام دیا اور ہاں بھی کروالی۔ اٹھ کر آگئے تو بہت ہنس کر مجھے بتایا کہ یہ شوکت علی مجھے کیسے بہانے سے لے گئے۔ سمجھتے ہوں گے کہ یوں مجھے پھنسا سکیں گے۔ میں بھلا پھنسنے والا بشر ہوں۔ اب یہ جانیں اور وہ لوگ جانیں!

پھر پندرہ دن بعد منگنی ہو گئی۔ تین ماہ بعد شادی کا وقت آگیا۔ ہمارے گھر کی پہلی شادی تھی تو سب نے بڑے پیار سے شرکت کی۔ مہمان انڈیا' ڈھاکہ' لاہور اور پنڈی سے آنا شروع ہوئے۔ ایک سوٹ کیس میں اپنے کپڑے وغیرہ ابراہیم سے رکھوا اپنے یونیسکو کے دفتر میں یوں شفٹ ہو گئے کہ شادی کے بے سُرے گانوں کو ان کے کان اول تو برداشت نہ کریں گے اور دوئم جب اڑوس پڑوس والے رات کی نیند حرام ہونے پر پولیس کو فون کر کے بُلالیں گے تو کس خوشی میں وہ اس شوروغل کے ذمہ دار ٹھہرائے جائیں۔ ہزار سمجھانے کی کوشش میں نے کی یہ تو' ہر گھر میں شادی کے موقعوں پر گانے ہوا ہی کرتے ہیں اور پولیس کو کوئی نہیں بُلاتا۔ آخر جل کر میں نے کہا کہ اصل بات کہیں کہ آپ کے اوقات میں فرق جو پڑے گا۔ مگر درحقیقت اختر کے دفتر شفٹ ہونے پر ہم سب دل میں بہت خوش ہوئے کہ اب دل کھول کر رت جگے کر سکیں گے۔ شام کو مہمان خصوصی کی طرح آجاتے اور ٹھیک دس بجے کھانا کھا کر چلے جاتے۔

مگر ابھی ایک بات تو اور آپ کے دوست کی بتادوں۔ جانے کیسے اختر کو یہ معلوم ہو گیا کہ دلہن کے والدین اپنی بیٹی کو فرنیچر وغیرہ بھی دے رہے ہیں۔ اب اختر کی ناراضگی کی حد نہ رہی کہ "ہمارے گھر صرف لڑکی کے پہننے کے کپڑے آسکتے ہیں اور کچھ یہاں نہ آئے گا مجھ کو یہ حکم دیا جاتا کہ میں جاکر ان کو منع کر کے آؤں کہ کچھ کاٹھ کباڑ ہمارے گھر نہ آئے گا۔

"جی اچھا" کہہ کر خاموش ہو جاتی۔ مگر دل میں ڈروں کہ یہ ایسا بھی کر سکتے ہیں کہ وہاں محفل میں کچھ کہہ دیں۔ اور جاکر کچھ کہہ کر آتی ہوں تو وہ لوگ چراغ پا ہو جائیں گے کہ وہ جو دے رہے ہیں اپنی لڑکی کے لیے دے رہے ہیں۔ دل میں سوچوں کہ میرے والدین جیسا ظرف اور دوسرے تو نہیں رکھ سکتے۔ کہ بابائے اردو چھڑی مار مار کر چیزوں کو گراتے رہے کہ کیا ہمارے گھر میں کچھ نہیں ہے۔ ہم یہ اَلم غَلم کچھ نہ لے جائیں گے۔ صرف پہننے کے کپڑے ساتھ جا سکتے ہیں۔

کہنا یہ چاہتی ہوں کہ دیکھیے کس حد تک اختر کے مزاج پر مولوی صاحب کا اثر پڑا تھا۔ اب ایک ترکیب مجھے سوجھی کہ کلیم عمر اپنے شوکت عمر بھائی کے بیٹے سے کہا "بچے خدارا ایک وعدہ کرلو کہ ہماری بہو کا کل جہیز اپنے گھر اٹھا کر رکھوا لینا۔ ہفتہ بعد جب دونوں سکھر جائیں تو چلا جائے گا۔ تو اس طرح جگاڑ جب بنا چکی تو اختر سے کہہ دیا کہ اب ان کو اس بات پر راضی کرلیا کہ ہم اپنے گھر کوئی ایسی ویسی چیز نہ لائیں گے۔ تب ان کو اطمینان ہو گیا اور میں نے خوشی خوشی اپنے بیٹے کی شادی کی ہر محفل سجائی۔ اب ڈر کس کا تھا اختر تو گھر سے شفٹ ہو گئے تھے۔

اختر کو جب لندن میں کہہ دیا گیا کہ اب کچھ بھی امید نہ رکھیں تو اس کا جو دھکا لگنا چاہیے تھا وہ یوں نہ لگا کہ چھوٹا بیٹا شاہد امریکہ سے نوکری چھوڑ اپنے ابا کے پاس جو آگئے تھے۔ لندن میں اس سال مارچ کے آخر میں بھی خوب برف باری ہو رہی تھی۔ رات کے کھانے کے بعد کی چہل قدمی تو روکی نہ جا سکتی تھی۔ شاہد کس پیار کے ساتھ اپنے ابا کو بڑا کوٹ پہناتے 'مظر باندھ' دستانے پہنا اور فیلٹ ہیٹ ان کے سر پر رکھ کر باہر لے کر چلے جاتے۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد دونوں کافی پی کر واپس آتے۔ دن ہوتا تو اختر بتاتے کہ بھئی آج فلاں مقام یا باغ میں لندن سے باہر جاکر لنچ کریں گے۔ یہ سب وہ جگہیں ہوتیں جہاں

وہ اپنے طالبعلمی کے دَور میں دوستوں کے ساتھ گئے تھے۔ یعنی اپنی اس حالت کے باوجود ان کو یہ خیال رہا ہو گا کہ میں اور دونوں لڑکے فلیٹ میں بیٹھ کر بور نہ ہوں۔ ہاں کسی کسی دن سلمان ہمارے ساتھ نہ گئے۔ بعد میں معلوم یہ ہوا کہ کیونکہ ان کے اَبا کو اچھی چھڑی کا شوق ہے۔ تو لندن بھر میں گھوم پھر کر پانچ عدد بے حد قیمتی چھڑیاں خریدیں۔

اختر کے پاس طرح طرح کی چھڑیاں تھیں۔ ایک ہاتھی دانت کی جس پر چیتا کا کام بنا ہوا ہے۔ یہ چھڑی ان کو مہاراجہ جودھ پور نے تحفہ دی تھی۔ یہ اختر کے ساتھ پیرس میں پڑھ رہے تھے۔ کہتے کہ یہ تو میں شاہد کو دوں گا وہ حفاظت سے رکھے گا اور اس کی قدر کرے گا۔ سلمان درویش ہے اور عرفان لاابالی ٹھہرے اور نوید بھولکڑ انسان ہیں۔

اختر بالکل ٹھیک ٹھاک تھے۔ بڑی خواہش کر کے میری چھوٹی بہن رشیدہ بیگم کو چند روز رہنے کو بلوالیا۔ اختر شام کو ٹہلنے گئے ہوئے تھے۔ ہم دونوں بہنیں لان پر ان کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ایسا بہت ہی کم ہوا ہے کہ ہمارے ہاں اس وقت کوئی نہ کوئی آیا ہوا نہ ہو۔ سیر کر کے واپس آئے 'کرسی پر بیٹھ کر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے پھر ایک دم رشیدہ بیگم سے پوچھا "رشیدہ یہ بتاؤ کہ تم کو یاد پڑتا ہے کہ کبھی زندگی بھر میں نے کسی سے کچھ مانگا ہو یا اپنے لیے کچھ کردینے کو کہا ہو؟ رشیدہ کا جواب تھا۔ "نہیں اختر بھائی۔" بولے "شکر ہے کہ میں نے کسی کا کبھی کوئی احسان نہیں لیا۔ اب دل میں یہ ٹھان رکھا ہے کہ جب لوگ مجھے نہلا دھلا کر تیار کردیں گے تو چار انسانوں کے کاندھوں پر لد کر ہرگز نہ جاؤں گا' بلکہ چلتا ہوا خود وہاں پہنچ جاؤں گا۔" رشیدہ کی اس تصور سے بے اختیار ہنسی نکل گئی اور کہا۔ "اختر بھائی ذرا سوچیں تو سہی کہ آپ آگے آگے جا رہے ہیں اور جو پہنچانے آئے تھے وہ پیچھے کے رخ بھاگے چلے جا رہے ہیں اور جب مڑ کر دیکھا تو وہاں کوئی نہیں ہے۔" کہا "یہ تو اور بھی اچھی بات ہو گی۔ بس پھر اندر لیٹ جانا ہی تو رہ جائے گا۔ میں خود ہی وہ بھی کرلوں گا تو اس احسان سے بھی بچ جاؤں گا۔" پھر خود قہقہوں سے ہنستے رہے کہ "رشیدہ سوچو کہ وہ کیا ہی سماں ہو گا۔"

اختر کی طبیعت اور فطرت کبھی کسی کے احسان کو گوارا نہ کر سکتی تھی۔ انہوں نے ضرور کسی وقت سوچا ہو گا کہ آخری بار تو چار کے شانوں کا احسان لینا ہی ہو گا۔ تو اس کے لیے یہ ترکیب ذہن سے گزری ہو گی۔

اختر دنیاوی چیزوں' مال' دولت' زمین اور مکانات کے ذکر کو سننا بھی گوارا نہ کرتے تھے
اس کی خواہش۔ جب ۱۹۴۸ء میں اپنے گھر میں ایک چھوٹے بچوں کے لیے جو ایک چھوٹا
اسکول کھول لیا تھا۔ جس پر روز ہی کوفت کیا کرتے تھے۔ میں نے چیف کمشنر کے پاس جاکر
بتایا کہ ایک اسکول کے لیے مجھے کوئی کوٹھی الاٹ کردیں۔ انہوں نے مجھے اپنی موٹر پر ایک
افسر کو چابیاں تھما کر کہا کہ جمشید روڈ کی کوٹھیاں لے جاکر دکھائیں اور جو پسند آئے وہ
اسکول کی لیے الاٹ کردی جائے۔ ایک دو منزلہ کوٹھی جو مجھے اسکول کے لیے مناسب لگی
اس کا الاٹمنٹ اور چابی مجھے دیتے ہوئے کہا کہ آج ہی کچھ سامان رکھوا دوں۔ وہ میں نے
گھر آکر فوراً" ایک میز کچھ کرسیاں' دری وغیرہ وہاں رکھوا دیں۔ شام کو جب دفتر سے
آئے بہت خوش ہو کر بتایا۔ ہاتھ میں الاٹمنٹ کا کاغذ اور چابی دی۔ اُف کیا ہی غصہ آیا'
الاٹمنٹ کے چار ٹکڑے کرکے سامنے چابی پھینک کر بولے "کیا ہم پاکستان اس لیے آئے
ہیں کہ لوٹ کھسوٹ کریں؟ آپ کل جاکر اس چابی اور ٹکڑوں کو ہاشم رضا صاحب کو
واپس کر آئیں" دروازہ کھول کر گھر سے باہر چلے گئے۔ میں نے اختر کو اب تک بھی اس
کیفیت میں نہ دیکھا تھا۔ رات کو بارہ بجے واپس آئے۔ صبح دوسرے دن جاکر واپس
کر آئی۔

جب میں نے پیر الٰہی بخش کالونی میں برابر برابر کے دو مکان بک کرالیے اور بتایا تو پھر
اس قدر چراغ پا ہوئے کہ دوسروں کا حق مارنے پر شرم آنی چاہیے تو پھر میں ان سے
دستبردار ہو گئی۔ جب پی ای سی ایچ سوسائٹی بن گئی اور تمام ہی گورنمنٹ کے افسران
کو مکان کے لیے زمین دی جارہی تھی تو انکار کردیا۔ میں نے جب یہ کہا کہ چڑیاں تک
اپنے بچوں کے لیے گھونسلہ بناتی ہیں اور آپ بچوں کے سر پر ایک چھت بنانے کے خلاف
ہیں تو مجبوراً" پلاٹ لینے پر رضامند ہوئے مگر ساتھ ساتھ جو ایک کمرشل پلاٹ بھی دیا گیا تو
ان کو لگا کہ ان کی عزت آبرو کے میں درپے ہو گئی ہوں کہ اصرار کررہی ہوں انکار نہ
کریں۔ جب میں نے ان کے والد کی پنڈی کی زمینوں اور گھر کے کاغذات نکالے اور کلیم
کا کاغذ بھر کر دیا کہ آپ اور ھمیم بس اب صرف اس پر دستخط کردیں تو بگڑ اٹھے۔ کہا ہم
پاکستان اس لیے تو نہیں آئے' اپنی خوشی سے آئے' کس لیے گورنمنٹ دوسروں کی
جائیداد ہم کو دے۔ وہ سب میں نے خود پھاڑ کر پھینک دیے۔ یہ ایک غریبانہ مکان جس کو

میں نے ان سے چھپا کر تین ماہ کے اندر پیرس روانگی سے پہلے بنوالیا ہاں اس کے لیے چند
بار یہ کہا" آپ نے ٹھیک کیا کہ میری بے خبری میں یہ مکان بنوالیا ورنہ میں تو ہرگز نہ
بنواتا۔ کئی سال پہلے مکان کو ان چار بیٹوں کے نام کورٹ جاکر گفٹ یوں کردیا کہ خود پر
کسی دنیاوی شے کا بوجھ نہ رہ جائے۔

چار ماہ پہلے ایک دن کہا "حمیدہ بیگم! آپ کل مسعود اور مہر (میری بہن محمودہ بیگم کی
لڑکی اور داماد) کو بلا کر اپنا وصیت نامہ لکھوا کر دونوں کے دستخط کروالیں" میں نے
کہا "صاحب! الٰہی خیر ہو آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میرے پاس رکھا کیا ہے؟ کس ملکیت کے
بارے میں وصیت نامہ لکھواؤں؟ یہ گھر لڑکوں کے نام ہے" کہتے ہیں کچھ نہ کچھ تو آپ
کے لوکر میں زیور تو ہوگا؟ پھر وہ جمشید روڈ کی زمین جو آپ کو کلیم میں ملی تھی اب مجھے بھی
بات بتانا ہی پڑی۔ پھر سنیں کہ سب لڑکوں کی دلہنوں کو دینے کے بعد جو بچی کھچی چیزیں
میرے نام کی پڑی رہ گئی تھیں کہ بس اب یہ پوتیوں کے لیے ہیں' ان کو کئی ماہ ہوئے
پچاس ہزار کا دکان پر جاکر بیچ کر سلمان کو روپیہ ان کتابوں کے لیے دے دیے جو آج کل
آپ سن سن کر خوش ہو رہے ہیں! وہ جمشید روڈ کی میری زمین' آج سے پانچ سال پہلے
سمیع بھتیجے کو زبانی مع کاغذات کے یوں دے دی تھی کہ ۳۵ سال کی مقدمہ بازی آپ کی
کوفت اور وکیلوں کی فیسوں سے میری جان عاجز آگئی تھی۔ میں نے سب کاغذات اس کو
دے دیے یہ کہہ کر اب ہرگز میرے سامنے اس زمین کا ذکر نہ کرے۔ وہ ۳۵ سال سے
مفت میں بیٹھا اس کی حفاظت کرتا رہا ہے۔ اس سے کہہ دیا کہ تم جانو اور وکیل جانے۔
اگر میری زندگی میں مقدمہ ختم ہو جائے تو اس کو بیچ کر آدھے خود رکھ لینا آدھے دام مجھے
دے دینا۔ میں نہ رہی تو تم لڑکوں کو دے دینا۔ اس کا مجھے یقین ہے کہ تمہاری نیت نہیں
بدلے گی۔ سنتے رہے کہ سلمان نے کتابیں لے لیں تو بہت اچھا ہوا۔ ہنسے اور یہ بھی
کہا" آپ نے دیکھا کہ یہ زمین کس قدر مصیبت کی چیز ہوتی ہے۔ تجسس کے طور پر پوچھتا
ہوں کہ پھر بے چارے سمیع اللہ کے سر سے یہ بلا ٹلی یا نہیں؟"

جب میں نے بتایا کہ سال کے اندر سمیع نے مقدمے کو نبٹ ہی نہیں لیا بلکہ بیچ بھی
دیا۔ بس اس دن کورٹ میں مہر اور مسعود کے ساتھ جاکر دستخط مجھے ضرور کرنا پڑے۔
سمیع نے ایمان داری کے ساتھ چھ لاکھ روپیہ مجھے لاکر دے دیے اور خود اسی زمین کے

سامنے کی بلڈنگ میں ایک بڑی سی دکان خریدلی اور لیاقت آباد میں ایک فلیٹ اور میں نے ان روپیوں سے سیونگ سرٹیفکیٹ لڑکوں' بیٹی مہر اور ان چھوٹے بچوں کے نام خرید کر لوکر میں رکھ دیے۔ ہاں ایک کاغذ پر مہر مسعود اور سب لڑکوں کے دستخط بھی کرا کر شاہد کو ذمہ داری دے دی ہے! آپ کے دماغ میں خیال آنے سے پہلے ہی اکثر میں وہ کام کرتی رہی ہوں کہ آپ کو کوفت اور وحشت نہ ہونے پائے۔

یہ سب سن کر بولے "یہ مسیح اللہ بھی خوب ہی انسان ہے۔ دنیا نیک لوگوں سے خالی نہیں ہوئی ہے۔" اختر مسعود اور مہر کو اپنے بچوں کی طرح عزیز رکھتے تھے۔ جب بھی صلاح مشورہ کسی اُلجھن میں کیا تو ان دونوں کو بُلا کر کیا۔ جب بھی مجھے دس سال میں ہر تیسرے ماہ کینسر کے ڈاکٹر زیدی کے ہاں گئی تو مہر کو ساتھ لے جانا ازبس ضروری ہوتا کہ تب ہی اختر کو اطمینان رہتا۔ اور جب بھی آپریشن ہوئے ہفتوں اور مہینوں اسپتال میں رہنا پڑا تو ہماری ماموں کی بیٹی (جرنل شاہد حامد کی بہن) عزیزہ حامد میرے پاس رہی تو اختر کو بے فکری ہو جاتی۔ ہماری یہ بہن کیا عالی انسان ہیں۔ اپنی ساری عمر سب کی خدمت کی نذر کر دی۔ قدرت نے ان کے ہاتھوں میں جانے کیا چیز عطا کی ہے کہ مریض کے اوپر انہوں نے رکھا اور درد غائب ہوا۔ اگر یہ یورپ وغیرہ میں پیدا ہوتیں تو ضرور نن بن جاتیں۔ گول سفید براق چہرہ' محبت اور ہمدردی سے چمکتی آنکھیں اور پیار بھری مسکراہٹ۔

جمیل بھائی! اختر تو بالکل ٹھیک تھے۔ دو روز ایسا ہوا کہ کھانسی کے بعد اُلٹی ہو گئی۔ غذا کا نام نہ تھا صرف جھاگ سے بس۔ شام کو حسبِ معمول ڈیڑھ میل کی سیر کر کے آئے۔ رات کو کھانے کے بعد لان پر نوید بیٹے کے ساتھ چہل قدمی کی۔ اندر آئے تو پھر طبیعت مکدر ہوئی۔ نوید گھبرا گئے کہ ایسا آخر کیوں ہو رہا۔ اختر بستر پر لیٹ گئے کچھ جسم پر کپکپی کی کیفیت سی محسوس کر کے نوید گھبرا گئے اور مجھے بھی وحشت سی ہوئی۔ نوید نے اپنے ابا کی خوشامد کی "چلیں ذرا آغا خاں اسپتال آپ کا چیک اَپ کرا لیں۔ راضی ہی نہ ہوتے تھے۔ پھر کہا اچھا ایک وعدہ کرو تب چلوں گا۔ پوچھا کیا؟ فرمایا کہ تم چاروں بھائی ہمیشہ عمر بھر ایک دوسرے کا ہاتھ پیار اور مضبوطی سے پکڑے رہو گے۔

نوید نے کہا "ابا یہ کوئی کہنے کی بات ہے۔ آپ اور اُمّی نے جہاں ہم کو انسانوں کی

طرح سوچنا اور جینا سکھایا ہے' وہاں آپس کے پیار کی دولت بھی دی ہے" اٹھ کر بیٹھ گئے اور کہا اچھا چلو۔ جب باہر کے برآمدے میں آئے تو اپنی اُنگلی سے انگوٹھی اُتار کر میری اُنگلی میں پہنا کر کہا یہ شاہد کو دے دیجیے گا' وہ گم نہ کرے گا۔ میرے دل پر ایک مُکّا سا لگا کہ ایسا کیوں کہا اور میں کچھ کہہ بھی نہ سکی۔

ہم ان کو لے کر اسپتال پہنچ گئے۔ دھڑا دھڑ ایکسرے' ٹیسٹ وغیرہ کر کے کہا کہ نمونیہ ہے۔ میں سوچوں کہ بغیر بخار کے نمونیہ کیوں کر ہے۔ دوسرے دن حلق سے ایکسرے مشین ڈال کر تصاویر لے کر کہا کہ پیٹ میں السر ہے۔ میں حیران کہ آج تک کبھی پیٹ میں درد' تکلیف تو بڑی بات کبھی کسک بھی نہ ہوئی۔ ناک منہ سے نلکیاں لگا کر ڈرپ دینا شروع کیا۔ آکسیجن لگا دی گئی۔ تیسرے دن منہ سے خون کی قے ہوئی۔ جانے کتنا خون بس نکلے چلا گیا۔ چوتھے دن سات گھنٹے تک آپریشن ہوا۔ پیٹ سے تین حصّہ آنتوں کو کاٹ کر پھینک دیا گیا۔ جب ہوش میں آئے تو اس طرح جیسے دیر تک سو کر بیدار ہوئے ہیں۔ ہر مزاج پرسی کرنے والے سے اس کے مزاج کے متعلق باتیں کرتے۔

شان الحق حقی صاحب آئے تو اشعار کے ذریعہ اپنا حال سناتے رہے۔ اگر ہسٹری کے پروفیسر آگئے تو ہسٹری پر باتیں کرتے۔ کوئی ادیب آگیا تو ادب پر بات چیت کر رہے ہوتے۔ سلمان کے دوست زین العابدین اور ہارون صدیقی کو تصوف کے بہت سے اشعار سنائے اور سمجھایا کہ اسلام کی اصل اسپرٹ کیا ہے اور صحیح طور پر سمجھ کر عمل کرنا بہت ضروری ہے' یوں تو ہر مذہب انسان کو انسان بننے کی ترغیب دیتا ہے۔ زین سے کہا آپ کی نظر ادب اور شاعری دونوں پر بہت اچھی ہے۔ بہت کچھ کام کرنے کا ہے' اس کو کیجیے۔ شاعری حالت سرور پیدا کرتی ہے' نثر بیداری کی کیفیت' سوچیے اور پھر لکھنا شروع کر دیجیے۔ ہارون صدیقی سے مخاطب ہو کر کہا "آپ کا مطالعہ بہت وسیع ہے' انگریزی اور اردو دونوں زبانوں پر عبور رکھتے ہیں۔ اب قلم کو استعمال کرنا شروع کیجیے۔ (یہی ہارون صدیقی اختر کی آخری کتاب "گرد راہ" کا انگریزی میں ترجمہ آٹھ ماہ سے کرتے رہے ہیں۔ کاش اختر کی زندگی میں ان کا قلم چل پڑا ہوتا۔

پچھلے دن پھر خون کی قے آئی۔ ساتھ ہی زخم سے خون رِسنا شروع ہو گیا۔ تو یہ کہا گیا کہ اندر کے ٹانکے ٹوٹ گئے ہیں۔ پھر سے پیٹ کھول کر اندر کے ٹانکے لگاتا ہیں۔ تین گھنٹے

تک پھر آپریشن کا عمل جاری رہا۔ جلد ہی ہوش میں آ گئے۔ آکسیجن کا کپ منہ سے ہٹا کر کہا کہ لاہور پروفیسر رشید کو فون کر دیا جائے کہ وہ آ جائیں اور یہ بھی خواہش ظاہر کی کہ دہلی پی این بھاٹیا سے ان کی بات کرا دی جائے۔

مجھے رونا آنے لگا کہ ان کا کاش کوئی اپنا ہوتا۔ ان کے تو صرف اپنے دوست ہی تھے۔ رشید صاحب دوسرے روز لاہور سے آ گئے۔ کمرے میں جوں ہی داخل ہوئے تو یہ شعر پڑھا۔

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

ایک دوسرے سے زیادہ تر اشعار کے ذریعہ بات چیت ہوئی۔ پھر بولے "شکر ہے تم نے قلم پکڑا تو سہی۔ اچھا لکھ رہے ہو۔ اس کو جاری رکھنا۔" آٹھویں دن ہمارے خانساماں عزیز خاں' اختر کو دیکھنے آئے۔ جب وہ جانے لگے تو کہا "عزیز خاں جب تک بیگم صاحب ہیں' ان کو چھوڑ کر آپ جایئے گا نہیں۔ ہاتھ اُٹھا کر سلام کیا اور یہ لفظ کہے "میرا سلام آخر لیجیے۔" جیسے ان کو یقین سا تھا کہ وہ اب دنیا کو خیرباد کہنے والے ہیں۔ دوپہر میں مجھ سے کہا "حمیدہ بیگم اپنا ایک پاؤں میرے ہاتھ کے پاس رکھیے۔ میں کچھ نہ سمجھی کہا کہ "صاحب میں تو یوں گر جاؤں گی" ہنس کر بولے کٹہرا پکڑ لیجیے۔ میں نے ایسا ہی کیا' پاؤں پر اپنا ہاتھ رکھ کر بولے "میری زیادتیوں کو معاف کر دیں۔" میرے آنسو بہنے لگے۔ شاید محسوس کر لیا۔ ہنس کر کہا "آپ گھبرایئے نہیں۔ شکر ہے کہ یہ چاروں بیٹے بڑے سعادت مند اور انسان ہیں جو اس دنیا میں آتا ہے' وہ جاتا بھی ہے۔"

رات ہوتے ہی بیٹوں کو حکم دیتے ہیں کہ بس اب اپنی اَمّی کو گھر لے جاؤ۔ وہ تو خود مریض ہیں' صبح سے بیٹھے بیٹھے تھک گئی ہوں گی۔ ہرگز مجھے ایک رات بھی اپنے پاس رہنے نہ دیا۔ لڑکے باری باری ان کے پاس رات کو رہتے گو سلمان ضد کرتے۔ کہ رات کو وہ ہی اَبا کے پاس رہیں گے۔ آخری رات سلمان ہی ان کے پاس تھے ان کو تصوّف کے ان گنت فارسی کے اشعار ترجمہ کر کے بتاتے رہے۔ دن میں مجھ سے سورۃ رحمان اور سورۃ مزمل وغیرہ کی فرمائش کر کے ترجمہ کے ساتھ سنا کرتے۔

ادھر کئی ماہ سے فرمائش کیا کرتے کہ قرآن پاک میں سے کچھ پڑھ کر سنایئے۔

چار بجے صبح کو یکایک سانس تیز ہو گئی۔ سلمان گھبرائے ضرور مگر گھر فون نہ کیا کہ وہ سمجھ ہی نہ سکے کہ ہو کیا رہا ہے۔ ڈاکٹروں نے ان کو کمرے سے باہر کر دیا تھا کہ پٹی وغیرہ بدلنا ہے۔ پانچ بجے اذان ہو رہی تھی' سب باہر آئے اور کہہ دیا کہ اب اختر دنیا میں نہ رہے۔

جمیل بیٹا اب میرے دل کی طاقت اور قلم سب ہی جواب دے رہے ہیں۔ آپ کے سامنے اب میرے عظیم شوہر' ساتھی' دوست اور ہم سفر کے ساتھ گزارا ہوا ہر ہر دن ہے۔ آپ کی خواہش اور اپنا وعدہ بڑی ایمان داری کے ساتھ بلا کم و بیش کے قلم بند کر دیا۔ یہ دو انسانوں کی زندگی کی سیدھی سادی اور سچی کہانی ہے۔ اختر کس قدر عظیم انسان تھے اور میں ایک ادنیٰ سی ان کی ساتھی۔ آپ کی بڑی شکر گزار ہوں کہ اس طور آپ نے اس روح فرسا دور کو اس بڑے خوش کُن زمانے میں پہنچا کر میرے دل کے درد اور کرب کا احساس کم کر دیا تھا۔

☆☆☆ ختم شد ☆☆☆

(ترجمہ)

ڈیر ظ۔ ع (ظفر عمر)

مجھے کل ہی آپ کا مورخہ ۱۰ جون کا خط موصول ہوا۔ یہ دوبارہ اورنگ آباد روانہ کیا گیا تھا۔ ہاں سید ا۔ ح (اختر حسین) میرے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ اس دَوران مجھے ان کو سمجھنے کا کافی موقع مِلا۔ میں یہ کہتے ہوئے بڑی خوشی محسوس کر رہا ہوں کہ میں نے ان کے کردار اور ان کی صلاحیتوں کے بارے میں بہت اعلیٰ رائے قائم کی ہے۔ یہ ایک عالمانہ ذہنی رجحان کے نوجوان ہیں اور ان تمام نوجوانوں میں جن سے زندگی بھر میرا سابقہ رہا ہے' ان میں یہ قابل ترین ہیں۔ یہ صرف انگریزی اور اردو ہی کے اچھے عالم نہیں بلکہ سنسکرت' ہندی' بنگلہ' اور گجراتی زبانوں کا بھی عِلم رکھتے ہیں اور اردو ہندی کے بہت اچھے لکھنے والوں میں ہیں۔ یہ انتہائی مہذب و شائستہ ہیں' نہایت روشن خیال نوجوان ہیں۔

یہ ادبی کاموں کے لیے فطری میلان رکھتے ہیں' میرے خیال میں اس کے لیے نہایت موزوں ہیں۔ سرکاری ملازمت اختیار کرنے کا کوئی رجحان نہیں ہے اور ان کو مجبور کرنا کہ کسی مقابلے کے امتحان میں بیٹھیں ان کی مکمل تباہی کا سامان ہو گا۔

فی الحال وہ میرے ساتھ اردو لغت کے کام میں مصروف ہیں۔ جو میری نگرانی میں ترتیب پا رہی ہے۔ اس کے بعد یہ بطورِ پیشہ صحافت کو اختیار کرنے کا سوچ رہے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اگر انھیں کافی مدد ملی جو میں انھیں دینے پر تیار ہوں' یہ بہت کامیاب ہوں گے اور ہندوستانی صحافت میں نام پیدا کریں گے۔

میں ان کے خاندان کے متعلق صرف اسی قدر جانتا ہوں کہ والد سے کوئی تعلق نہیں' مگر اس میں ان کا اپنا کوئی قصور نہیں بلکہ سوتیلی والدہ کا ہاتھ ہے۔ آپ چاہیں تو بہت آسانی سے اختر کے رشتہ کے ماموں وحید الحق صدیقی جو علی گڑھ یونیورسٹی میں لکچرار ہیں یا دوسرے

ماموں س۔ و۔ ا۔ رضوی سی' آئی۔ اے' جو سی' پی گورنمنٹ مجلسِ قانون ساز کے صدر ہیں' ان کے ذریعے ہر طرح کی معلومات اور تحقیقات کر سکتے ہیں۔

میں نے ان کے کردار اور صلاحیتوں کے بارے میں تچی اور صحیح رائے آپ کو بتا دی ہے۔ اختر اپنے ملک کی خدمت کی شدید لگن رکھتے ہیں اور میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کی اہمیت ان کے اندر بدرجہ اتم موجود ہے۔

میں تو ان کے اس اعلیٰ مقصد میں ہر طرح کی حوصلہ افزائی کروں گا۔ ہرگز اختر کو ان کی طبیعت اور ارادوں کے خلاف کوئی اور پیشہ اختیار کرنے پر مجبور نہ کروں گا۔ اپنی تمام آزاد رَوی اور روشن خیالی کے' وہ دل آویز ادب اور آداب کے مالک ہیں' بزرگوں کے لیے عزت اور احترام کرنے کا بڑا ڈھب بھی ہے۔ میں اختر کو دماغی اور دِلی صِفات کی وجہ سے بے حد پسند کرتا ہوں اور دل سے ان کی قدر کرتا ہوں۔

میں یہ سب آپ کو بڑی راز داری سے لکھ رہا ہوں جیسے حمیدہ میری اپنی ہی بیٹی ہو۔ میری رائے تو یہ ہے کہ آپ کو اس معاملے میں کوئی تامّل نہ ہونا چاہیے اور فیصلہ کر لینا چاہیے کہ اختر کو دامادی کا شرف بخشیں۔ اگر آپ ان کو باریابی کی اجازت دیں تو بلاشبہ ان سے مِل کر آپ میرے اندازوں کی تصدیق کریں گے۔

جناب ظفر عمر کا خط بابائے اردو کے نام

Orai, U.P.
June 27,35.

My dear Maulana Abdul Haq,

I am most grateful for your kind and affectionate letter of June 21. I am greatly touched by your entering into my feelings and advising me to make up my mind as if Hameeda was your own daughter. As you know I have very great respect for your judgement and under the circumstances I can have no hesitation in accepting your advice and decidin to marry Hameeda to Akhtar.

I do hope your reading of Akhtar's character and ideals will turn out correct and he will have a brilliant career in the service of his country as a journalist and a man of letters- Insha Allah.

I leave it to you to suggest, after consulting Akhtar, the time for the marriage which ought to be as simple an affair as possible as I do not believe in ostentation and waste.

With kind regards,

Yours sincerely,

Zafar Omar

(ترجمہ)

اورائی یوپی
۲۷ جون ۱۹۳۵ء

میرے عزیز مولانا عبدالحق

میں آپ کے ۲۱ جون کے شفقت آمیز خط کا تہہ دل سے مشکور ہوں۔ میں اپنے احساسات میں آپ کے شریک ہونے اور مجھے فیصلہ کرنے کا مشورہ دینے سے بے حد متاثر ہوا ہوں جیسے حمیدہ آپ ہی کی اپنی بیٹی ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں میں آپ کے فیصلوں کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں اور موجودہ حالات میں میں آپ کا مشورہ ماننے اور حمیدہ کی اختر سے شادی طے کرنے میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا۔

میں امید رکھتا ہوں کہ اختر کے کردار اور نظریات کے بارے میں آپ کی رائے درست ثابت ہوگی اور وہ ایک صحافی اور ادیب ہوتے ہوئے اپنے وطن کی خدمت میں ایک شاندار کیریر بنائے گا۔

اختر سے مشورے کے بعد شادی کی تاریخ تجویز کرنے کا فیصلہ میں آپ پر چھوڑتا ہوں جو کہ انتہائی سادہ تقریب کی شکل میں ہو چونکہ میں فضولیات اور ضیاع کرنے میں یقین نہیں رکھتا۔

بصد احترام
آپ کا مخلص
ظفر عمر

(ترجمہ)

ڈیر ظ۔ ع (ظفر عمر)

آپ کا خط مورخہ ۲۷ جون وصول ہوا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کی رضا مندی پر کن الفاظ میں اپنی خوشی اور تشکر کا اظہار کروں میں آپ کے فیصلہ پر بہت خوش ہوں۔ اختر آپ کے اس قدر مشفقانہ خط سے بہت متاثر ہوئے۔ کچھ دیر تو وہ کچھ ایسی خوشی و مسرت کے عالم میں رہے کہ میں ذرا گھبرا سا گیا۔ یہ حقیقت ان کے کردار کی عکاسی کرتی ہے در حقیقت اعلیٰ کردار کے مالک ہیں۔ آپ یقین رکھیں اور مطمئن رہیں وہ آپ کے لیے لائق داماد ثابت ہوں گے۔ میں آپ کو دلی مبارک باد دیتا ہوں۔ ہم دونوں آپس کی گفت و شنید کے بعد اس فیصلہ پر پہنچے ہیں کہ شادی کرسمس کے ہفتہ یعنی عید کے فوراً بعد یعنی ۲۹ دسمبر ۳۵ء کو اس صورت میں میں ان کے ہمراہ آکر اس پر مسرت شادی میں شرکت کر سکوں گا۔

میں اور اختر آپ کی اس رائے سے متفق ہیں کہ شادی کی رسومات تا حد امکاں کم سے کم ہونی چاہئیں ہر طرح کی نمود و نمائش کے اختر سخت خلاف ہیں۔

نیک خواہشات کے ساتھ۔

عبدالحق

فٹ نوٹ صفحہ نمبر ۴ء

میرے والد ظفر عمر (مرحوم) نے انیس سال کی عمر میں علی گڑھ یونیورسٹی سے B.A کیا اور نواب محسن الملک کے پرائیویٹ سیکریٹری مقرر ہوئے۔ دو سال کے بعد ریاست بھوپال کی حکمران بیگم صاحب کے پرائیویٹ سیکریٹری چار سال تک رہے پھر کمپیٹیشن میں بیٹھے اور انڈین پولیس سروس میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ ہو گئے۔ سب سے پہلا جاسوسی ناول "نیلی چھتری" لکھا۔ پھر بہرام کی گرفتاری، لال کھنور اور چوروں کا کلب لکھے۔ آخری ناول "بہرام کی رہائی لکھ لی مگر مسودہ چوری کر کے کسی صاحب نے اپنے نام سے چھپوالی۔ والد صاحب نے کبھی بہرام کی رہائی کے مصنف ہونے کا دعوا تک نہ کیا۔

فٹ نوٹ صفحہ ۲۸۔

ڈاکٹر رشید جہاں شیخ عبداللہ بانی "مسلم گرلس کالج علی گڑھ" کی بیٹی۔

فٹ نوٹ صفحہ ۳۱۔

خدیجہ اور رشیدہ۔ میری چھوٹی بہنیں۔

فٹ نوٹ صفحہ ۱۰۸۔

میری دادی کا نام حبیب الدین ہرنی ہے۔ مگر کسی کتاب میں ہرنی لکھا ہوا ہے۔

فٹ نوٹ صفحہ ۔۳۳۵

شاید تارا ناتھ مکرجی ہو۔ گو مجھے بنرجی یاد پڑتا ہے۔ ایک صاحب نے دعوا کیا ہے کہ مکرجی ہے۔ جو انھیں کسی کتاب میں لکھا ملا۔

فٹ نوٹ صفحہ ۔۳۳۶

ایک صاحب نے کسی انگریز کی لکھی کتاب میں "رائے بہادر سر آسوتوش مکرجی" پڑھا ہے اور اخبار میں بڑی ناراضگی کا اظہار کیا کہ میں نے شاید دل سے بنا کر نام بدل دیا۔ میں نے تو آج سے پینسٹھ (۶۵) سال پہلے یہ نام' سروجنی نائیڈو کی زبانی سنا تھا اور میری یادداشت میں بنرجی تھا' اب بھی وہی موجود ہے۔ بھول چوک ہو ہی جایا کرتی ہے۔

مبارکباد بموقع شادی کتخدائی نور چشمی حمیدہ عمر سلمہا واقعہ

۳۰ر دسمبر ۱۹۳۵ء بمقام اروئی ضلع ۔۔۔۔ جالون

خدایا خیر مقدم ہو مبارک ہم کو اختر کا
بڑھے اتنا کہ اک دن ہم ضیا ہو ماہ انور کا
شعاعیں اس کی پہنچیں ہر طرف دنیائے اردو میں
کہ جس سے جگمگائے ہر ورق اردو کے دفتر کا
جرائد میں رسائل میں کتابت میں صحافت میں
مضامین اختری سہرا بنے ہر ایک کے سر کا
تجسس میں بہت آگے ہیں نیوٹن اور بیکن سے
تخیل میں بہت پیچھے قدم ہے شیکسپیئر کا
ادیب اس وقت کے سب کہہ رہے ہیں یک زباں ہو کر
کہ قبضہ واقعی ساتوں زبان پر ہے اختر کا
صلہ میں قابلیت اور اس علمی تبحر کے
خطاب اختر میاں پانے کو ہیں سرکار سے سر کا
یہ دستار فضیلت یوں ہوئی زیب سر اختر
کہ سایہ سر پہ تھا مولائے عبدالحق کی چادر کا
بجا ہے ناز ہم لوگوں کو اپنی خوش نصیبی پر

ذخیرہ کتب:۔ محمد احمد ترازی

کیا اللہ نے ہم میں اضافہ ایسے ممبر کا

خدا کا شکر ہے احسان ہے اور خاص رحمت ہے

میاں اختر کو جس نے کر دیا نوشاہ اس گھر کا

مبارک یاالٰہی یہ تعلق دونوں جانب ہو

بلندی پر ستارا ہو مسز اختر و اختر کا

شریفانہ بسر ہو زندگی آرام و راحت سے

کبھی موقع نہ پیش آئے کسی کو شور اور شر کا

پھلے پھولیں ہمیشہ خوش رہیں اور چین سے گزرے

تر و تازہ رہے نخلِ تمنا باغِ اختر کا

میاں اختر اب اتنی بات سنیئے اپنے دادا کی

رہے پاسِ ادب عزت کا میری اپنی آنر کا

بیاں کچھ مجھ سے اوصاف حمیدہ ہو نہیں سکتے

قلم قاصر ہے اس میدان میں مشتاق احقر کا